

نچا کہاں آپ تیاں جگ تیاں

سگر گزشت

2017

مدان اعلیٰ
مسلحہ و صل



صاحب جی: سنہری خواب دیکھنے والی ایک دوشیزہ کی عبرت بھری سچ بیانی
مفسر ساز ہارو کے ایک بڑے شاعر کا زندگی نامہ جسے لوگوں نے کوئی مقام نہیں دیا
ہیملٹن، یورپ کے اس مسلمان ملک میں وہ چین چین کر مسلمانوں کو ذبح کر رہے تھے



آپ کی باتیں، آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحے میں مکمل ایک
نادر روزگار کا تعارف خاص



صدر مملکت کی
ٹارگٹ کلنگ کا احوال

علاقہ کی روایت کو توڑ کر اس
نے عالمی اعزاز حاصل کیا

ایک باکمال شاعر کا زندگی
نامہ جسے اس کا مقام نہ ملا



پاکستان کی ایک معروف
فلمی شخصیت کا تذکرہ

اس ملک میں مسلمانوں
کو چن چن کر قتل کیا گیا

دنیا بھر میں رائج
شادی کے انوکھے رسوم کا تذکرہ



جسٹس ان کی کاشمیر کا ایک
الگ آنڈاز کی داستان

وہ شہزادی تھی مگر
اپنوں سے بچھڑ گئی تھی

صرف ذہنی آسودگی کی خاطر لوگوں
کی جان لینے والوں کی کتھا

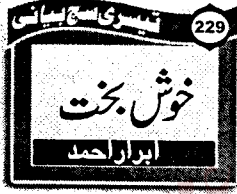
قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمتی سے محفوظ رکھیں۔



ایک معصوم نوجوان کی خون
رنگ لہو گر مائے والی داستان



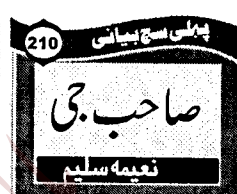
آرہ تصویر کشی کی
مختصر سی تاریخ



سچ کہ گیا ہے کہ دولت
عورت کی قسمت سے آتی ہے



دو بہنوں کی تشریحات
سے جسم لینے والی روداد



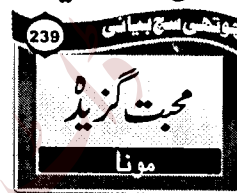
اس نے سراب
کو سچ سمجھ لیا



دو سہیلیوں کی روداد کہ
محنت ہی کامیابی دلاتی ہے



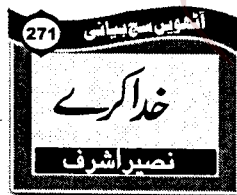
اس لڑکی کی روداد جس نے
محبت کے معنی بتائے



وہ محبت کی چاہ میں
دشمن محبت بن گئی



زن زر زمین کے
گرد گھومتی سچ بیانی



وہ بہانے خواب کے
پیچھے خود کو برباد کر رہی تھی



اس نے ثابت کیا کہ
محبت تشریفاتی مانگتی ہے

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق ملحق و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ ماسوائے ان کے ادارہ قانونی پارہ جونی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات یکدم سبکی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔



قارئین کرام!
السلام علیکم!

مدیر: علی: عذرار رسول
مدیر: پرین: بلگرامی
نائب مدیر: نبیلہ الظہر

◆◆◆
نجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆
سرکیشن نجر

سید میر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ: 60 روپے ♦ زر سالانہ 800 روپے



پبلشر و پریپر انٹر: عذرار رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایسٹیشن

ڈپٹی کنٹرل پرائیویٹ کورپوریشن

کلکتہ 75500

جیل حسن

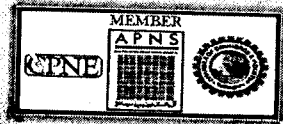
پرینٹر:

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیشن کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdggroup@hotmail.com



”اس گھر میں آئے ہوئے انہیں ایک ماہ ہو چکا تھا۔ گھر اب تک چمک رہا تھا۔ نھا کا شان ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑی پینسل سے دیوار پر پھول جتنی بنانا شروع کر دیا۔ ماں کی نظر پڑی تو وہ غصے میں بھری اس کے پاس آئی ہاتھ سے پینسل جھیننی اور اسے دور پھینک دیا۔ کا شان حیرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا پھر بولا ”امی میں پرانے والے گھر میں بھی تو دیوار پر نقشے بنایا کرتا تھا مگر آپ جب تو منع نہیں کرتی تھیں۔“

”بیٹا وہ گھر کرائے کا تھا یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔“ ماں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ مٹی کہانی ہماری آپ کی ہم سب کی کہانی ہے۔ ہماری سوچ اسی قسم کی سطحی ہو چکی ہے۔ ہم وطن کی محبت بھول کر صرف اپنا مفاد دیکھ رہے ہیں۔ ہر روز نیوی پرنٹاک شوز میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے۔ اداروں کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہ وطن ہمارا گھر ہے اور کرایہ کا بھی نہیں ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ہم سب کو سوچنا ہے۔ اس کی ترقی بھی ممکن ہے جب ہم مفاد سے بالاتر ہو کر سوچیں گے۔“

معراج رسول

بکریاں چرانے والا

سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے گاؤں کالا قادر۔ میں صاحبزادہ خان رہا کرتا تھا۔ دو وقت کی روٹی بھی اسے میسر نہ تھی۔ ہر صبح وہ گاؤں والوں کی بکریاں چرایا کرتا۔ اس کڑی مشقت کے بعد اسے صرف اتنا سا اناج ملتا جو اس کے گھروالوں کی بھوک کو کم کر دیتا۔ اس آدمے پیٹ کھانے میں سلطان محمد خان بھی شریک تھا وہ کچھ اور بڑا ہوا تو صاحبزادہ خان نے اسے بھی بکریاں ہانکنے پر مامور کر دیا۔ جب وہ مدرسے کے برابر سے گزرتا تو اس کا دل ترپ اٹھتا اور وہ ایک بار اندر جمائیک کر ضرور دیکھتا۔ قطار در قطار بیٹھے بچے اسے بہت اچھے لگتے۔ ایک دن اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں بھی مدرسے میں پڑھوں گا۔ باپ نے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد سلطان محمد خان نے بدو کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ خوب محنت کرتا دن رات کی محنت رنگ لائی اور اس نے فیل کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا پھر آگے کی پڑھائی کے لیے وہ لاہور آ گیا۔ رات گزارنے کے لیے اس نے ایک مسجد کو چن لیا اسی مسجد میں افغانستان کے سفیر بھی نماز پڑھتے آتے تھے سلطان محمد کے بارے میں امام صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ لڑکا بہت اچھی انگلش جانتا ہے تو انہوں نے فرمائش کر دی کہ سلطان ہر روز الیچ کے بیٹگلے پر آکر انہیں انگریزی کی تعلیم دے اور اس طرح وہ ایک معزز شخص کا نو جوان معلم بن گیا۔ اسی دوران 1906ء کا خوش نصیب سال آ گیا۔ شہنشاہ افغانستان نے سفیر سردار امیر محمد خان کو واپس کاہل بلایا جب وہ جانے لگے تو انہوں نے سلطان محمد خان کو بھی ساتھ لے لیا۔ کاہل کے بادشاہ امیر عبدالرحمن نے اسے بحیثیت مترجم اپنے یہاں مقرر کر لیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات حکومت برطانیہ کی سفیر ڈاکٹر ٹیلر ہملٹن سے ہوئی لیڈی ٹیلر ہملٹن نے بھی اس کی فہم و دانش کا لوہا مان لیا۔ دونوں میں خوب بیچنے لگی۔ ٹیلر ہملٹن نے ایک دن سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ کچھ لوگ بادشاہ کو اس سے بدظن کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی یورپا بستر ہاندہ لیا اور رات کی تاریکی میں کاہل سے فرار ہو گیا۔ وہ لاہور پہنچا ہی تھا کہ حکومت برطانیہ نے اسے لندن طلب کر لیا لندن پہنچنے پر اس کے استقبال کو لیڈی ٹیلر ہملٹن خود بندرگاہ پر آئی۔ وہ اس کے گھر میں ٹھہرا لیکن جلد اسے احساس ہو گیا کہ یہاں اس کے لائق کوئی کام نہ تھا اس لیے وہ دوبارہ حصول علم میں کوشاں ہو گیا۔ اس نے کیمبرج میں داخلہ لے لیا تھا۔ طلب علم کی لگن نے اسے جلد ہی فیلو آف رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کی سند دلا دی۔ سلطان محمد نے کیمبرج میں دو سال تک تعلیم حاصل کی، پھر اس نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیرمزی پاس کرنے کے بعد وہ واپس برصغیر آ گیا۔ پہلے اس نے جہلم میں پریکٹس کی لیکن وہاں جہ نہ سکا اور واپس اپنے آبائی شہر سیالکوٹ آ گیا۔ وہاں آکر اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی جی اس نے یکے بعد دیگرے پانچ شادیاں کی تھیں سب سے چھوٹی بیوی کے نو بچے ہوئے۔ طفیل احمد، عاتق اللہ، بشیر احمد، بیگم بی بی گل، بیگم محبوب اللہ خان، بیگم اعظم علی، بیگم حیدر، رشیدہ سلطانہ اور فیض احمد خان۔ بکریا چرانے والے سلطان محمد خان نے اپنے عزم و حوصلے سے تعلیم کا سہارا لے کر ثابت کر دیا کہ تعلیم ہی انسان کو ادب پر پہنچاتی ہے۔ شہرت دلاتی ہے۔ یہی سلطان محمد خان تھے جن نے بیڈ فیض احمد فیض نے اردو ادب میں ایک بڑا مقام پایا۔

☆☆☆

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ نثر ہمت افتخار نے ساہیوال سے پہلی بار تبصرہ ارسال کیا ہے لیکن اتنا بھر پور ہے کہ ایک لفظ بھی اضافی نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ ”پہلی بار محفل میں آئی ہوں۔ کون کون دہل کم کرے گا۔ اس بار کا شمارہ بروقت آیا تو سوچا میں بھی تبصرہ کرنے کی کوشش کروں۔ گو کہ یہ میرے لیے ایک مشکل امر ہے۔ کبھی تبصرہ کیا نہیں، دوسروں کا پڑھتی رہی ہوں اس لیے صرف کوشش کی ہے۔ اگر اندازیاں پسند نہ آئے تو خدا را خدا حق مت اڑا دیے گا۔ نئی آمد سمجھ کر درگزر کرو دیجیے گا تو جتاہ آتے ہیں کہانیاں کی طرف۔ زویا اعجاز کی رہائی نے مجھ پر جادو سا اثر دکھایا۔ قیام پاکستان کے وقت کی ٹیکڑوں کہانیاں پڑھی ہیں، امرت سر بل رہا ہے، کھول دو، خونی سے سنی ریل، اور انسان مر گیا۔ نہ جانے کتنے ناول، کتنی کہانیاں پڑھی ہیں۔ پڑھ پڑھ کر روئی ہوں کہ کس طرح مسلمانوں کا خون ارزاں ہو گیا تھا۔ کتنی قربانیوں کے بعد یہ وطن حاصل ہوا جسے یہ آج کے سیاست دان کتر کتر کر کھا رہے ہیں۔ لیکن اس سچ بیانی نے تو دہلا دیا۔ ایسی کہانیاں بھی بھی جتن لیتی ہیں۔ (ویڈیو زویا اعجاز) ”رہائی“ کے بعد جو ج بیانی پسند آئی وہ ”کی جاناں“ ہے۔ زبردست، قلم کا شاہکار کہلا سکتی ہے۔ ”عماقت“ کو عماقت کہہ کر میں نے پڑھنے کے بعد نظر انداز کر دیا۔ ”تریاق“ بس گزرا ہے لائق تھی۔ ”شیر کی خالہ اور زہر کا پیالہ“ کبواس کہی جائے گی۔ فرشتہ اور تیزاب افسانوی انداز کی ہے ”دل مشکل“ کچھ پڑھی پڑھی سی مگی تو ذہن پر زور دیا پھر اپنا سر پٹا کہ اتنی جلدی بھول گئی۔ یہ ابھی ایک ماہ قبل ہی تو ایک ڈائجسٹ میں پڑھی ہے۔ مدیران سے التماس ہے کہ ایسی کہانیاں سے اجتناب کریں۔ (حسب اشرف نے یہ ایک غلط حرکت کی ہے۔ ہم جہ کہانی لکھنے والوں پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ مصنف کی اس حرکت پر ہم معذرت خواہ ہیں کہ قارئین کو سہواً ایسی کہانی پڑھنے کو ملی۔) اب کچھ باتیں باذوق قارئین کے لیے لگائی جانے والی تحریر پڑھی ہو جائے۔ علامہ ابن جوزی پر ضیائیم بلکرائی نے خوب لکھا، اب تک مختلف تحریروں میں بطور حوالہ ان کا نام پڑھتی رہی ہوں پہلی بار ان کی حالات زندگی پڑھی۔ راشدی برادران سندھ کے ماتھے کا مجموعہ ہیں۔ انہوں نے وسائل نہ رہے ہوئے بھی جو تکنیکیات پیش کیں ان کا جواب نہیں۔ تنقید نگار بھی خاسے کی چیز ہے۔ محترم کھیل صدیقی اور کھیل اور لیس دونوں کی تخلیق قابل تحسین ہے۔ نسلی احوان کا کیا کہنا، وہ جو کچھ لکھتی ہیں دل کی آنکھوں سے میں پڑھتی ہوں، شاعر انقلاب خوب لکھا ہے۔ چرکی بہت مختصر تھی۔ شاہد لطیف کو اسے مزید طویل کرنا چاہیے تھا۔ آواز کا جادوگر، واہ جناب میرے پسندیدہ اناؤنسر پر تحریر، وہ صرف اناؤنسر نہیں ایک بڑے محقق بھی ہیں اور ایسے لوگ صدیقی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ”مرد بجران“ بھی پسند آئی لیکن دھرتی کا بوجھ مرحوم کاشف زہیر کی تحریر بہت عمدہ بہت اعلیٰ، زبردست تحریر ہے۔ اب آتی ہوں اپنی پسندیدہ تحریر کی طرف یعنی جس کا انتظار بڑی بے مبری سے کرتی ہوں۔ کہنے کو ”ششال سے ٹورنٹو“ ایک سفر نامہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طویل تحریر ہے۔ اگر نرسن کے کردار کو اور آگے بڑھایا جائے تو مزہ آ جائے گا۔ تقنین شاہ بھی پسند آئی۔ اب ڈراناسور کی بات... بھی کی جائے۔ یہ نیرس قط ہے اور کہانی ایک انج بھی نہیں پڑھی۔ کرداروں کا جمعہ بازار ہے۔ اگر برائے نامیں تو کہہ دوں کہ مجھے یہ کہانی بالکل پسند نہیں آ رہی ہے۔“

☆ امجد علی سید لاہور سے رقمطراز ہیں۔ ”میں کہانی لکھنا چاہتا ہوں طریقہ کار بتا دیں“ یہ پیرا پہلا سوال ہے۔ اب تبصرہ حاضر ہے پہلے ہی بتا دوں کہ میں بہت سارے رسالوں میں تبصرہ لکھتا رہتا ہوں۔ علامہ ابن جوزی پر ضیائیم بلکرائی نے اچھا لکھا ہے۔ ایک تحقیقی مضمون ہے راشدی برادران پر کھیل صدیقی نے انصاف نہیں کیا یہ تحریر مزید تحقیق باقی ہے۔ تنقید نگار بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔

شاعر انقلاب سہلی اجموان کی بھی ادھوری ادھوری تھی۔ یہ چرک تو بالکل سمجھ نہیں آئی۔ ”آواز کا جاوگر“ اتنی طویل تحریر، سید احمد سلطان نے صفحات ضائع کیے۔ مرد بخران بھی بس ایسی ہی تحریر ہے۔ اب کہانیوں پر بھی باتیں ہو جائیں۔ تیزاب اور فرشتہ جیسی کہانیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ ”کی جاناں“ سے اچھی کہانی تو ”رہائی“، ”مٹی لکین“ یہ کہانی بھی افسانوی سی تھی۔ زہر کا پیالہ بہت پسند آئی۔ (خدا کا شکر ہے کہ آپ کو کوئی کہانی پسند آئی۔ کہانی لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ سفید کاغذ اور قلم لیں ایک ایک لائن چھوڑ کر صاف صاف لکھیں، کہانی میں پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ جملے دلچسپ ہوں، کہانی میں روانی ہو اور کہانی بھی ہوم افسانے شائع نہیں کرتے۔“

☆ سحر شمس کا رای سہل ”میں رانسر ہوں، ایک مکمل ناول لکھ چکی ہوں جو کتابی شکل میں آنے والا ہے، ایک اور ناول بھی آن لائن شائع ہو رہا ہے۔ میں سرگزشت میں سلسلہ دار ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ آپ اس ناول کا مکمل مرکزی خیال اور ایک قسط پہلے بھیج دیں۔ اگر انداز تحریر اچھا ہو تو کہانی ضرور چھپ جائے گی۔“

☆ نادیہ غیر لومدی، لڑنے غیر خیریں ماچسٹریو کے لکھتی ہیں۔ ”میں عمر صد راز سے آپ کے رسالوں کی قاری ہوں، اور لکھاری بھی ہوں نیز اخبارات میں بھی لکھتی ہوں۔ اس رسالے سرگزشت کے لیے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سرگزشت لکھنا چاہتی ہوں۔ (غالب پر طویل تحریر شائع ہو چکی ہے)“

☆ خالد محمود کی آمد ملتان سے، اس دفعہ سرگزشت 25 تاریخ کو مل گیا۔ ”بے حد خوشی ہوئی۔ محرم کی چھٹیوں کی بدولت کافی وقت مل گیا تھا۔ محترمہ دیا اعجاز کی کہانی ”رہائی“ پڑھ کر کچھ بے چارے ہو گیا۔ وہاں دو قسط تھیں کہ محمد بن قاسم کو چند فراتین کی رہائی کے لیے فوج کشی کے لیے آنا پڑا اور اب ہم جیسے مکرور اور بدولت مسلمانوں کو ایسے برے دن دیکھنا پڑ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید یہ کہانی سمجھ نہ آ سکے مگر میرے جیسے لوگوں کے لیے مقام جہت ہے کیونکہ میں نے پاکستان بننے دیکھا ہے۔ جن لوگوں کو کی پکا کی لگتی ہے ان کو پاکستان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کو صرف دولت سے پیار ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے ہمیں کشمیر دے دیا اور جب وہاں کوئی دولت مند بے خوف سیاست دان حاکم بن کر عیاشی کرنے لگے گا تو وہ لوگ سوچیں گے کہ آیا انہوں نے ایسے ہانگوں کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں، یہی حال موجودہ پاکستان کے حاکموں کا ہے۔ اشعر جمال صاحب کی کہانی ”کی جاناں میں“ ایک اچھوتی کہانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی مخلوق کو معاشرہ میں جائز مقام ملنا ضروری ہے۔ میرے علم میں بات یہیں ہے کہ ایسی مخلوق کو چین، روس، یورپ اور امریکا میں کیا مقام دیا جاتا ہے۔ آخر وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہوں گے۔ اگر کوئی صاحب علم روشنی ڈالیں تو ممنون رہوں گا۔ حماقت بالکل حماقت ہی ثابت ہوئی۔ ”تزیاق“ بھی سبق آموز کہانی ہے۔ ”شیر کی خالہ“ واجبی کی کہانی تھی۔ فرشتہ ایک لا جواب حقیقت ہے۔ عبداللہ صاحب نے ہمارے سیاست دانوں کی چمڑی ادھیڑ دی ہے۔ مبارک ہو۔ ہم سوچتے تھے کہ آفاق صاحب کے جانے کے بعد قلم نگری کا کیا ہوگا لیکن انور فراد صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کے مضامین بے حد علمیت رکھتے ہیں اور خاص طور جو حقیقتیں وہ نکال کر لاتے ہیں لا جواب ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور طاقت دے۔ ندیم، وحید مراد، جاوید شیخ پر ان کی کہانیاں پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ”ناسوز“ کی سلسلہ وار قسط میں کریکٹر بڑھتے جا رہے ہیں جو مجھ جیسے بوڑھے کی یادداشت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ شمشال سے نو رنواب کی کسانیت کا شمار ہے مگر دلچسپ ہے۔ باقی مضامین ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی کراچی سے لکھتے ہیں ”چیف صاحب اجتماعیت کا اسلامی پیغام ہرگز ہرگز انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے طوفان بد تعبیری کی نذر نہیں ہوگا۔ ہر نئی چیز اور ایجاد کو وقتی اہمال ضرور ہوتا ہے۔ آج کی ماں ضرور اس سے متاثر ہے لیکن اگلی نسل کی ماں اس کی عادی ہوگی کہ وہ اس کی مہارت اپنے ساتھ لے کر اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان بیٹھی ہوگی۔ لاؤڈ اسپیکر ڈرامائی ویزن سے بھی ابتدائی طور پر یہ غشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ سب ہماری اسلامی اقدار کو متاثر کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ آج ہماری نوجوان نسل میں اپنے مذہب سے رنجیت پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے اور رہ گئی اجتماعیت کی بات تو آج بھی آپ جیسے شعل راہ لوگ ہمیں بجھاتے نہیں دیں گے۔ عثمان جامی کی خوبصورت قلم پر ان کا شکر ہے۔ ہاجرہ سرور نے ہمیں واقعی سرور کر دیا۔ تنقید مگر سے زیادہ ہم اکثر جمیل جالبی کو ایک مشفق استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کے ادبی احسانات اپنی جگہ لیکن کراچی یونیورسٹی کی خدمت ان کا عظیم اثاثہ ہے۔ راشدی برادران بھی قوم کا روشن چہرہ تھے۔ اپنے اپنے نفس کو مرغوبات سے جس نے بھی روکا وہ اللہ کا دوست بن گیا۔ امام ابن جوزی بھی ان میں سے ایک تھے۔ سہلی اجموان صاحبہ کی تحریریں ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ شاعر انقلاب بھی اچھی تھی۔ امام لطف کی چرک کی مناسب سی تھی۔ آواز کا جاوگر ریڈیو کے لیے صرف رضاعلی عابدی نہیں تھے بلکہ ان جیسے جاوگروں کی ایک فہم فہم ماہینا مسرگزشت

نے ریڈیو کو طلسماتی بنا دیا تھا۔ رضا علی عابدی کو صف اول کے لکھاری میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ عراق کے پس منظر میں دھرتی کا بوجھ انتہائی شاندار تھی۔ حارث جیسے غدار ہر جگہ موجود ہیں اور ایمین جیسی حب الوطن عورتیں بھی، کاش صدام حسین عراق کی اس حالت کے ذمہ دار نہ بننے، ندیم اقبال صاحب ”شمشال سے نورنشا“ تک میں اپنے وطن سے دور ہو چکی عید کی روادار سنا رہے تھے۔ انداز تو ہے ہی دل بھانے والا، اس مرتبہ کچھ افسانوی رنگ غالب تھا خاص کر بری جہاں والا واقعہ۔ تلقین شاہ کی شخصیت کو بلا تمبرہ بھی رہنے دیا جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نو ماہ بعد اپنے تخلیقی عمل سے گزر کر اپنے معاشرتی ناسوروں کو عملی شکل دینے میں جناب عبدالرب بھٹی کامیاب ہو گئے لیکن کہانی جہاں کی تھاں کھڑی ہے اب اسے آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ ہر ماہ کی طرح انور فرہاد اس مرتبہ بھی چھانگئے۔ مرد بخران جاوید شیخ کی ایسی سرگزشت ہے جو نہ صرف پڑھنے کے لائق ہے بلکہ اس میں بہت سی غلطیوں سے بچنے کا سبق بھی ہے۔ جناب ابن مثنیٰ کا عمران بلاشبہ جاوید شیخ ہی ہو سکتا تھا۔ کاش دھماکا کی بے قدری نہ ہوتی تو آج ہم جمہور باغی کی طرح عمران سیر پر بھی کئی فلمیں دیکھ چکے ہوتے۔ خدا کرے زینت منٹھی جاوید شیخ کو اپنی نگاہیں معاف کر دیں یہ سوچ کر کہ اگر وہ دکھ نہ اٹھائیں تو ہمیں جاوید شیخ بھی ملتا۔ شہر خیال میں حاصل تمبرہ رضا احمد اعوان کا تھا انہوں نے تو آئینہ دکھا کر افسردہ ہی کر دیا۔ اعجاز حسین ستھار، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری، قیصر خان، کلیم اللہ الیہ وکیٹ، نزابت افشار، عبدالجبار روری، سیف اللہ اور ندیم اقبال صاحب کا شکر ہے کہ انہیں ہمارا تمبرہ پسند آیا۔

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل کی تعریف آوری۔ ”سب سے پہلے شہر خیال میں حاضری دی۔ جناب رضا احمد اعوان کا طویل خط بہت زبردست تھا۔ اس کے علاوہ دوستوں میں قیصر خان، بھکر اور ندیم بھٹی ڈیرے وال کا خلوص نامہ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مرد بخران پر مبنی اس میں جاوید شیخ کے بارے میں تفصیل سے واقعات بیان ہوئے ہیں، بہت اچھا لگا۔ جاوید شیخ نے زینت منٹھی کے ساتھ جو سلوک کیا بہت ہی دکھ کی بات ہے۔ ایک تجربے کی بات ہے کہ جو شخص کسی اچھے انسان کی قدر نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس بے قدر شخص کو زندگی میں برے انسانوں سے بھی نکرانا ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں چیز کر سکے۔ شمشال سے نورنشا میں ندیم بھٹی نے نسرین کے بیٹے کی سالگرہ میں شرکت کر کے ان دونوں کو دلی خوشی عنایت فرمائی۔ نہ جانے اب نسرین بے چاری مستقبل میں کیا فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایران جانے کی کہ وہیں رہ جائے گی۔ ندیم بھٹی زبردست۔ ناسور میں مجس برقرار رہ گیا کہ نہ جانے زہیرہ ایڈووکیٹ کی گولی کی زد میں کون آگیا۔ سچی آپ بیتیوں میں ”رہائی“ ایک مکمل دکھ بھری داستان تھی۔ بلند پوشہ اور گلاب کورا پنے کیے کی سزا بھگت چکے مگر اگلے جہاں یعنی جہنم میں اس سے کئی لاکھ گنا زیادہ ترپیں گے۔ اس آپ بیتی سے یہ بھی سبق حاصل ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد پر اواران کے دوستوں پر یوں اعتماد بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ تریاق بہت ہی انوکھی عبت کی داستان تھی۔ دسم نے واقعی اپنی عبت کی سچائی کا ثبوت دیا۔ یہ سچ ہے کہ جو انسان کسی سے سچی عبت کرتا ہے تو وہ ہر حالت میں صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور یہاں اس کے محبوب کی خوشی اس کے اپنے شوہر کے ساتھ ہی تھی۔ جب محبوب خوش ہو تو ایک عاشق کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ ویڈیو وسم بھٹی۔ زہر کا پیا لہ اپنے آپ میں منفرد تحریر تھی۔ ملک نور کا یہ اقدام سرسراہٹ تھا اور ملا بھی خود شکی کر کے گناہ گیارہ کی مرکب ہوئی۔ فرشتہ میں بے خود سیاسی نے ہماری بیوقوف عوام کو بالکل ہی انوکھے اور زلے انداز میں بیوقوف بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تمام مسلمانوں کو ایسے بہرہ دیا ہے بجائے (آمین ثم آمین)۔ حیزاب میں رافدہ کے ساتھ واقعی ہم ظلم ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون نے اپنا کردار ٹھیک طور پر نہیں نبھایا مگر پھر بھی کوئی بھی شہری ہوا اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس دکھ اور آزمائش پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتی۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر کون سا فائدہ حاصل ہوا؟

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ ادارہ یہ میں عثمان جامی کی نظم پڑھ کر لیوں سے ایک آدمی نکلی، ہم عجیب تذبذب کا شکار ہیں۔ ایک طرف ہماری موجودہ نسل کی انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دیکھی تو دوسری طرف روٹھ گیا مسلمانوں پر توڑے جانے والے ظلم و ستم۔ ابھی تو شیر کے مسلمانوں کو کھٹکھٹا نہیں ہوا تھا کہ پھر سے امت مسلمہ پر ایک اور وار، ایک ناکہ، ایک نئی اذیت۔ خدا پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ”شہر خیال“ کے سبھی ساتھیوں کا تمبرہ کی پسندیدگی پر شکریہ۔ کلیم ایڈووکیٹ صاحب آپ کا یہ مختصر خط پڑھ کر مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ جیسے اچھے اور سچے لوگ ابھی بھی ہیں جو واقعی وطن عزیز کے دکھ کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنا کام ایسی طرح جاری رکھیے، شہر خیال کے سبھی ساتھی آپ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ ندیم اقبال ابھی تحریر اپنی جگہ ضرور بناتی ہے لیکن اس تحریر نے تو مسخو کر دیا ہے۔ میں امریکا سمیت بہت سے ملکوں کے حلقے نامے پڑھ چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ آپ جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے قانون کا احترام کرنا ضروری ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ

نے ایسا کیوں کہا۔ آپ کا بھی شکر ہے کہ آپ شہر خیال کے لیے بھی وقت نکالتے ہیں۔ لکھتے رہا کریں۔ اچھا لگتا ہے۔ ”تلقین شاہ“ جناب اشفاق احمد صاحب کا مختصر تذکرہ اچھا لگا۔ ”ناسور“ میں نعمان بڑی مشکوں سے اپنی بہن کو بچایا تھا اب قہیم کی گمشدگی سوا لہ نشان کی مانند آکھڑی ہوئی ہے۔ ”مرد وجران“ موجودہ دور کا ایک بڑا اداکار مگر جب میں نے اس کے گزرنے شب وروز کا احوال پڑھا تو میں حیران رہ گئی کہ اس نے موجودہ مقام پانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے سب کچھ پایا مگر زینت منگھی کو چھوڑنا اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش کہ وہ یہ غلطی نہ کرتا تو کوئی خلش کوئی کمی اس کے دل میں نہ رہتی۔ ”شش سال“ سے ”نورنژ“ ہمیشہ کی طرح دلوں میں اتر گئی۔ ندیم بھائی ملتی کی بہن کی بدولت آپ کی عید تو خوب گزری مگر مونے تازے بلے نے سرجی کی عید کا سارا مزہ کر کر اکر دیا۔ سنی احوال ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد انداز میں آئیں اور اپنی خوبصورت تحریر کے ذریعے ایک بار پھر اپنا گردیدہ کر گئیں۔ بہت اچھے سلی جی۔ ذوی اعجاز جی اس دفعہ تو رلا دیا آپ نے۔ پاکستان کی بیٹی کا درد اور کرب پڑھ کر دل دہل گیا۔ کتنے انفسوں کا مقام ہے کہ انہی خالوں کو ہم سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں خوشیاں اس وقت تک اداووری رہتی ہیں جب تک ہم ان کے گانے ہونے کا نوں کو نہ بجا لیں۔ کتنے بے حس ہیں ہم، وطن کی ہزاروں بیٹیاں ایسی طرح غلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ ”ترباقی“ میں دسم کے اقدام کو سراہنا چاہیے کہ اس نے محبوبہ کی خوشی کے لیے محبوبہ سے دستبردار ہونا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے جو کیا بہت اچھا کیا۔ محبت کا یہ انداز ہمیں بہت بھایا۔ ”فرشتہ“ اچھی تحریر ہے مگر بے خود صاحب کی خودی کے کیا کہنے، سیاست کا حصہ بننے کے لیے نیکی اور اچھائی کی آڑ لیتا انتہائی غلط عمل ہے۔

☆ نذیر احمد راجپوت نے شہداد پور سے انور فہادی کی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں ”میں ماہنامہ سرگزشت کا مستقل خریدار ہوں۔ آپ نے اداکار سدید، اداکار محمد علی، اداکار ندیم، اداکار وحید مراد اور اس مینیے جاوید شیخ پر مفصل مضمون لکھا۔ یہ مضمائیں بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں، پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ غالباً دسمبر 2015ء کے شمارے میں بابا عیسا علیہ السلام پر معلوماتی اور مفصل مضمون آپ نے تحریر کیا تھا۔ ایسا مضمون تو آج تک مفت روزہ نگار میں بھی شائع نہیں ہوا جیسا آپ نے لکھا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ براہ کرم اب آپ پنجابی فلموں کے فنکاروں پر دلچسپ معلوماتی اور مفصل مضمون تحریر کریں۔ مثلاً اداکار اکمل مرحوم، اداکارہ شیریں، ہدایت کار حیدر چہدری، گلوکارہ بیگم نذیر، موسیقار، ہدایت کار ایم جے رانا، ہدایت کار اسلم ابراہی، نغمہ نگار وارث لدھیانوی وغیرہ پر ان فنکاروں پر معلوماتی دلچسپ اور مفصل مضمون پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ امید ہے کہ آپ میری خواہش پوری کر دیں گے۔“

ہمارا نام محمد شاہد کا طلوس نامہ پورے وال سے۔ معراج رسول کے ادارے میں دو بائیں پڑھ کر اپنی ماں کی بہت یاد آئی۔ جب تک وہ زندہ تھیں ہم سب شادی شدہ بھائیوں اور بہنوں کے اکٹھے ہونے کی وجہ دہی تھیں۔ جب عید یا کسی بھی خاص موقع پر دوسرے شہروں سے بھائی آتے تو سب کو اکٹھے دیکھ کر ماں کی خوشی سنہالے نہ سنبھلی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں ایک ایسا مرکز ہے جو اولاد کو جوڑے رکھتا ہے۔ تعلیم کا دوسرا پہلو بھی وردنک ہے کہ آج کی دنیا میں انٹرنیٹ نے ہر شخص کی انگ دینا بسا دی ہے۔ گویا کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے اجنبی ہیں اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے کم ہی گفتگو ہوتی ہے جو بھینا بقول معراج رسول، اسلامی اور ہماری تہذیبی اقدار کے لیے لوٹو لکری ہے۔ ایک نئی سرگزشت میں معروف افسانہ نگار ہاجرہ سرور کی بچپن میں ادبی دنیا میں داخل ہونے کی کہانی بہت دلچسپ لگی۔ ایک کنڈو بہن بچی نے کس طرح ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔ میرے خیال میں بھینا مطالعہ اور خوب مطالعہ ہی اس کی وجہ بنی۔ اس دفعہ کئی صدارت پر موجود رضا احمد اعوان کا طویل خط تیرے سے زیادہ مختلف مسائل کا احاطہ کرتا کامل نگ رہا تھا۔ تمبرہ تو آخر میں چند لائنوں پر مشتمل تھا۔ آفتاب احمد نصیر اثرنی بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ سلیم رشیدی کی بات سے اتفاق ہے کہ اتحاد و اتفاق ایک ایسی قوت ہے جس سے بڑے سے بڑے مسائل سے نمٹا جاسکتا ہے۔ سدرہ ہالو ناگوری ایہ مقام انفسوں ہی ہے کہ ہم دنیاوی کاموں کے لیے تو ایک دوسرے کو لوٹنے اور دھوکا بھی دیتے تھے۔ اب حج جیسے مقدس فریضے میں بھی کام کرنے لگے ہیں۔ لوٹو لکریہ تو یہ بھی ہے کہ جب دھوکے اور فراڈ کو ہم زندگی کا معمول بنالیں گے تو پھر نیچے کی صورت کیسے اور کیوں کر بنے گی۔ حکیم اللہ ایلہ دوکت آپ نے صحیح لکھا، ہم تاریخ کو جتنا مرضی منہ کرنے کی کوشش کریں وہ کسی نہ کسی صورت حقیقت سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ آپ قوی معاملات پر لکھیں اور قارئین تک صحیح ضرور پہنچائیں۔ نزات اقبال، علامہ اقبال کے حوالے سے آپ نے جو لکھا اس حوالے سے تو سب سب کہیں گے کہ جو قوم اپنے محسنوں کو فراموش کر دیں، زوال ان سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس زوال کا سامنا ان کی کئی لسوں کو کرنا پڑتا ہے۔ عبد الجبار روری گزشتہ تجربہ کے آخری پختے میں لاہور میں تھا۔ آپ سے ملنے کا سوچا، پھر یاد آیا کہ آپ تو قصور میں ہوتے ہیں۔ ندیم اقبال اردو سے محبت کرنے والے جہاں بھی ہوں وہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہر وقت کام کرتے ہیں کہ زندہ قوموں کا بھی شیوہ ہے۔ اسلامی تاریخ کی ایک عظیم ہستی مفسر اور مؤرخ علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ضیاء تنسیم بلکرائی نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ ان ہستیوں کی زندگیوں تمام انسانوں کے لیے روشنی ہی روشنی ہیں۔ سندھ کے قابل فرسپوتوں پر کلیم صدیقی کی تحقیق قابل ستائش تھی۔ راشدی برادران کی ادب کے لیے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی زندگی کی کہانی پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے لیے بہت لکھا۔ بچوں کے لیے لکھی ان کی کہانیاں اپنے بچپن میں خوب پڑھی تھیں۔ رضاعلی عابدی اردو زبان کا ایک معتبر نام۔ جرنیلی سرگ پٹھان سے ملکت کابن پر سفر کیا گیا، سفر جہاں بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے وہیں رضاعلی عابدی نے اس خطے کی تہذیب و ثقافت کو بھی بخوبی جاننا شروع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پڑانے وقتوں کی سادگی، رواداری اور وضع داری کا آج کی نفسی اور تیز رفتار زندگی سے بھی خوب موازنہ کیا ہے۔ جاوید شیخ کا شمار بھی پاکستان فلم انڈسٹری کے بڑے اور نامور اداکاروں میں ہوتا ہے۔ انور فرہاد نے ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا۔ خصوصاً والدہ کے انتقال کے دو دن بعد سیت پڑا تھا ایک کرب ناک اور آزمائشی مرحلہ تھا۔ ”دھرتی کا بوجھ“ کے ساتھ مریم اے کا شرف کی آمد اچھی ہے۔ دلچسپ باتوں سے حریں ندیم اقبال کا سفر نامہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ افتخار مجاز کی تئین شاہ یعنی اشفاق احمد پر مختصر تحریر اچھی لگی۔ اشفاق احمد جیسے شفیق لوری جیسی باتیں کرنے والے صوفی اور درویش بھی معاشروں کو صدیوں بعد ملتے ہیں۔“

☆ منشی محمد عزیز مئے کا تبرہ لڈن واہڑی سے ”اداریہ تازہ ترین حالات کا بہترین عکاس ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ نے فاصلے ختم کر دیے ہیں لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس ایجاد نے اپنوں کے درمیان بہت فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ ایک مٹھی داستان ہاجرہ سرور کا مختصر تعارف تھا۔ شہر خیال کی صدارت رضا احمد خان اعوان کے نام تھی۔ آپ نے تبرہ کم کیا لیکن جن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے شاید ہم سب مجبوری طور پر اس سے کوئی طرح آنکھیں چراتے ہیں۔ آفتاب نصیر اشرفی، اعجاز شہار، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری اور سیف اللہ نے بھی مجھ پر تبرہ کیے۔ نزابت افشاں، ٹرائی اکین، شہر خیال میں ندیم اقبال سر کی آمد بھلی لگی۔ احمد خان وحیدی، بشری افضل کے علاوہ وحید ریاست بھی کئی کئی عرصہ سے غیر حاضر ہیں اور وحید صاحب کی مصروفیات کے پیش نظر میں سرگزشت کا ”سالانہ تجزیہ“ مرتب کر رہا ہوں۔ انشا اللہ اپنے وقت مقررہ پر بشرط زندگی پہنچ دوں گا۔ علامہ ابن جوزی پر مختصر مضمون لکھا گیا ہے۔ خوب مضمون لکھا ہے۔ راشدی برادران کا ذکر بھی خوب تھا لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکنی کرنے والی جمل جالبی حیرت انگیز شخصیت کا نام ہے۔ شاعر انقلاب پڑھ کر مرحوم حبیب جالب یاد آئے۔ آواز کا جادوگر، رضاعلی عابدی پر سعید دیا۔ جمیل جالبی حیرت انگیز شخصیت کا نام ہے۔ شاعر انقلاب پڑھ کر مرحوم حبیب جالب یاد آئے۔ آواز کا جادوگر، رضاعلی عابدی پر سعید احمد خان نے مجھ پر لکھا۔ انور فرہاد نے میرے پسندیدہ اداکار جاوید شیخ کے حالات زندگی کا بڑی باریک بینی سے احاطہ کیا۔ دھرتی کا بوجھ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ امین کی بے بسی کا پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار میمک جاتی تھیں۔ خس کم جہاں پاک، امین اپنے ساتھ کئی دندوں کو کیکفر کردار تک پہنچانے کا سبب بنی۔ اس کی عظمت کو سلام۔ شمسالے سے ٹوٹنوں کی یہ قسط کو گویا دو انگلی سی قسط تھی۔ سرین اور اس کے بچے سے ملاقات اور پھر ان کے گھر قیام۔ واہ جی واہ! کیا بات ہے۔ تئین شاہ میں بابا اشفاق احمد کی رحم دل فطرت کا ایک اور پہلو اجاگر کیا گیا تھا۔ ناسور کی اس قسط کا انجام سوالیہ نشان چھوڑ گیا ہے۔ سرور کی کہانی ”رہائی“ پڑھ کر دل غموں کے اٹھنا۔ سندھ میں ڈوب گیا۔ اف خدا! انتہی لاچار، مجبور اور بے بسی کی زبرد اور اس جیسی نہ جانے کتنی پاکستانی بیٹیوں کو قیامت چکانی پڑی ہے پاکستان بننے کی۔ اس بات کا اعزاز آج کی نسل کو شاید بلکہ ہمیں نہیں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کی نسل کو اس قیمت سے آگاہ کیا جائے تاکہ دوست اور دشمنوں میں تیز پیدہ ہو۔ آخری سچ بیانی میں ماں کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ماں تیری عظمت کو سلام۔ کتنا خوش نصیب ہے محبت جسے اتنی محبت کرنے والی ماں ملی ہے۔ سچ بیانیاں تو ساری پڑھ چکا ہوں لیکن جگہ کی کمی ہے، سوا حافظ۔“

☆ خواجہ حنیف ادیب کا غلط لاہور سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ ابھی ابھی رسالہ پڑھ کر اٹھا ہوں۔ سرگزشت کے مطالعہ کے سلسلے میں میں سب سے پہلے ”شخصیات“ کے صفحات کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک مٹھی سرگزشت میں ممتاز افسانہ نگار ہاجرہ سرور کا ذکر تھا۔ ہاجرہ سرور اور خدیجہ مستور دو بہنوں نے اپنے وقت میں دنیائے ادب بالخصوص افسانے کی صنف میں بڑا نام پیدا کیا۔ انہیں ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان سے متعلق ایک اچھی تحریر پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ قلم و قراط کے ایسے دینی لوگوں کا ذکر جب بھی آجائے وہ دنیا ہی ہوتا ہے، پرانا نہیں ہوتا۔ حرف و لفظ سے کھلاڑی امر ہوئے وہ بھلا کی کو کب بھولتے ہیں بلکہ اگر یہ کیا جائے کہ وہ تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں تو غلط نہیں۔ دیگر شخصیات کے ذکر میں اشفاق احمد جیسے عظیم دانشور، قلم کار، ڈراما نویس اور مصنف سے متعلق بھی پڑھنے کو ملا۔ اشفاق احمد میرے پسندیدہ دانشور، معنفین اور ادیبوں میں سے وہ منتخب شخصیت ہیں جن کا میں مداح ہوں۔ یوں تو ان کی کئی کتابیں ہیں البتہ اس وقت میرے گھر کی الماری میں ”زاویہ (نمبر 3)“ پڑی ہے جسے میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اس عظیم مصنف کی یہ تحریریں ہی کچھ ایسی ہیں کہ متعدد بار پڑھنے کے باوجود ہر دفعہ نئی معلوم ہوتی ہیں اور تالیف قلب کا باعث بنتی ہیں۔

پھر جمیل جالبی اور اقبال نزار کے متعلق پڑھا۔ یہ سب مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے ایک ایسے عظیم شاعر سے تعارف کرایا جس کے متعلق پہلے بھی پڑھنا نہ تھا۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کے قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر واقعہ ایک نئی طرز کی تحریر یا مضمون کے کر سامنے آتی ہیں جو اسے انداز ایک نیا انداز رکھتا ہے۔ اب کچھ اپنے متعلق محترمہ رضا اشرف اعوان صاحب نے میرے قلم کے شمارے میں شامل خط پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور مراسلہ نگار نے بھی اپنے مراسلے میں میرے خط کا توصیفی انداز سے حوالہ دیا ہے جس سے خط کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان دونوں کا شکریہ۔ کسی بھی لکھنے والے کی تحریر کی پسندیدگی کا اظہار اس کے قلم کا ہمیز دیتا ہے اور اس کی قلمی کاوش کو حیران کرنا اور صلاحیت بخشنا ہے۔ دونوں کی ذرہ نوازی ہے جس کے لیے مشکور ہوں۔ گزشتہ ماہ ایک تحریر ”غالبیات“ کے عنوان سے بھیجی تھی جس میں کچھ گفتگو باتیں تھیں مگر مایوسی ہوئی کہ شائع نہیں ہوئی شاید آپ اسے آئندہ شمارے میں شائع کرنا چاہتے ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آئندہ ماہ اسے جگہ دیں گے، بصورت دیگر شہر خیال کے صفحے پر جواب ڈالیں۔ (غالبیات میں آپ نے مشہور واقعات کو یکجا کیا ہے لیکن وہ یکجا ہو نہیں پائی۔ تسلسل ٹوٹا رہا ہے۔ اس لیے ان واقعات کو اقتباس بنا کر وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا) اب ذکر ہے اس شمارہ کی ایک کہانی ”حماقت“ کا۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کے ایسے قصص کی عکاسی کرتی ہے جسے دولت کے بے جا ہوس کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پیسے کی طلب اپنی جگہ جو زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں اور ایک خود قبیل زندگی بسر کرنے کی سہولت مہیا کرتی ہے۔ وہاں دولت کی بے جا طلب کی جاہ کاریوں سے بھی سرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں بشر لوگ خدا جانے پیسے کی طرف کیوں بے تحاشا دوڑتے پھرتے ہیں۔ بانی سب کچھ بھول کر ان لوگوں نے محض دولت کو ہی ”محل مشکلات“ سمجھ رکھا ہے۔ ایک بے وقاشے کی اتنی لگن نہ کیجیے کہ سب کچھ پیچھے رہ جائے۔ روشن پہلو کو مد نظر رکھا جائے۔ اس شمارہ کی مزید کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ جو کچھ اب تک پڑھا اس کے متعلق ہی لکھ رہا ہوں مگر قبولِ اقتدار رہے عز و شرف۔“

☆ راحت و فارا جہوت نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”خیریت بہ عافیت نیک مطلوب۔ ایک نئی کہانی ”شریف آدمی“ ارسال کر رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ زعمہ کرداروں کی کہانی ہے۔ آپ کے لیے بہت دعا گو۔ (کہانی مل گئی ہے۔ اس پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لوں گا)“

☆ سیف اللہ کی آمد ملک وال سے۔ ”معراج رسول صاحب کی نثری کہانیوں کی طرح نظم کہانی بھی اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ نئی نسل کی مصروفیات، انداز زندگی تبدیل شدہ معاشرتی اخلاقی قدروں و ہیں پرانی نسل کی غر مندگی، بے بسی، حسرت اور نہ جانے کیا کیا ہے اس نظم کہانی میں۔ اللہ وارث ہے آنے والے وقت کا۔ ایک نئی کہانی مصنفہ ہاجرہ سرور کے بارے میں ابھی ہے۔ علامہ امین جوزی ابھی کوشش ہے۔ تاریخی معروف ہستی کی سوانح عمری پڑھنے کو مل رہی ہے۔ سلمیٰ اعوان صاحب کی تحریر شاعر انقلاب نزار قربانی پڑھی۔ اچھی لگی لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ سلمیٰ اعوان صاحب کا قلم غیر ملکی شخصیات پر زیادہ لکھتا ہے۔ صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ ”جوابیا کہتے ہیں وہ دعا باز ہیں جو سوچتے ہیں کہ انہوں نے عورت تخلیق کی اپنی پسلیوں میں ایک سے۔ عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی۔“ لیکن اب تک تو یہی سنتے آئے ہیں کہ عورت پسلی سے ہی نکلی ہے۔ سلمیٰ صاحب جانتی ہوں گی اصلیت کیا ہے کیونکہ انہوں نے صریح سمجھا دیا۔ (دوبارہ پڑھیں، وہ سلمیٰ اعوان کے الفاظ نہیں نزار کی نظم ہے نزار کی شاعری معاشرے سے جنگ ہے اسی وجہ سے تو نزار کی شاعری پر پابندی لگتی تھی)۔ شاید لطیف صاحب کا چرچہ پر لکھا دلچسپ لگا اور اگر یہ سب کچھ ایسے ہی ہے جیسے لکھا گیا ہے تو حیران کن حد تک عجائبات زمانہ ہے۔ سعید احمد خاں صاحب، آواز کا جادوگر رضا عابدی صاحب کو ڈھونڈ لائے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے لوگ ریڈیو سے منسلک تھے خاص طور پر بی بی سی سنتے تھے اور عابدی صاحب کے پروگرام کا انتظار کرتے تھے۔ سعید احمد صاحب نے آخر میں چٹا کر کہہ دیا کہ وہ رچے تو خاندان سمیت برطانیہ میں ہیں لیکن ان کے دل میں پاکستان کے شہر کوپے قرے کا گڑ اور دیہات دھال ڈالتے رہتے ہیں۔ ندیم اقبال صاحب کا سفر نامہ جواب صرف سفر نامہ نہیں رہا بلکہ ادب پارہ بنا جا رہا ہے کوسرگزشت کی تحریروں میں پہلا نمبر کہنا پڑے گا کیونکہ سرخی شہبازی نوک جھوک کینیڈا معاشرے کی اچھائیاں اور سننے لوگوں کی مشکلات بتانے کے ساتھ ساتھ اب ندیم اقبال صاحب کوسرین کا سہارے کر قاری کو پوری طرح تحریر میں سمجھنے کا کر آ گیا ہے۔ آنے والی قسطوں میں ہوسکتا ہے ندیم صاحب کی ڈائری سے اور سرنیشیں بھی نکل آئیں۔ تفتیش شاہ تحریر میں شروع کی دس لائینیں ہی اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کافی ہیں۔ کیا بات ہے جی پہلے آپا نو قدسیہ صاحبہ اور اب اشفاق صاحب۔ عید الرب یعنی صاحب کی ناسور آہستہ رومی سے چل رہی ہے۔ کبھی تو تیری آئے گی۔ مرد بحران ذکر ہے جاوید شیخ کے قلموں تک پہنچنے کے لیے کوشش، ناکامیاں، مقدر کی سختیاں پھر قلموں تک پہنچنا۔ پچاس سے ماہنامہ مسرگزشت

زانہ غلاب قلمیں لیکن ساتھ ہی ڈار پوارڈ، کوڈک گولڈ میڈل ایوارڈ، گریجویٹ قلم ایوارڈ، بیٹل قلم ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ۔ جاوید شیخ خصوصی ایڈیشن، ہارڈ آف پرفارمنس، جاوید شیخ کی کام سے لگن اور منزل تک پہنچنے کا عزم ظاہر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انور فرہاد صاحب کی کوشش اور علم بھی قابل ستائش ہے۔ اس کے ساتھ ذہنیت لکھنے سے علیحدگی، سکلی آغا کے پیچھے بھاگنا، نیکی سے قربت، شائے تعلقات، عائشہ لکھی کو لگوں کی زندگیوں میں یہ چیز داخل ہے۔ ان باتوں کو یہ لوگ برا نہیں سمجھتے۔ یہ سب بھان کی زندگی میں ہونا ضروری ہے اسی لیے تو معاشرہ ان کو اچھا نہیں سمجھتا۔ آخر میں عرض ہے کہ بیت بازی صفحہ کے انچارج صاحب دو تین ماہ سے ناراض ہیں مجھ سے اور میری نالائقی دیکھیں کہ مجھے پتا بھی نہیں کہ کیوں۔ ان سے میری سفارش کر دیں پلیز۔ (آپ شعر تو اچھا منتخب کرتے ہیں لیکن کس شعر کا جواب ہے۔ یہ نہیں لکھتے)“

☆ منازبت افشاں، مہورہ، فتح جنگ سے رقم طراز ہیں۔ ”اکتوبر کا شمار بہترین سردیوں کے ساتھ 27 ستمبر کو ملا۔ ادارہ پڑھ کر مجھے مشہور انگریزی ناول ڈار جیو ہیڈ لے پیچ کا ناول ”نیا میری جیب میں“ یاد آ گیا۔ گو کہ آج جدید ٹیکنالوجی کی بدولت اسٹارٹ فون کی وجہ سے دنیا ہماری جیب میں ہے لیکن وہ اخلاقی قدریں جو کہ ہمارے اسلاف کا خاصا تھیں وہ آج مٹ رہی ہیں۔ اقبال نے مدون پہلے یہ حقیقت بیان کر دی تھی کہ ”ہے دل کے لیے موت مینوں کی حکومت، احساس مروت کو کھل دیتے ہیں آلات“ ہاجرہ سرور کا ذکر پڑھ کر اچھا لگا۔ ان کے شوہر پروفیسر حاجی بھی نامور لکھاری تھے۔ فیاض بنگلہ لکھی نے اس بار علامہ ابن جوزی کی سوانح حیات بیان کرنے میں بہت ہی تحقیقی اور نفاست سے کام لیا۔ علامہ ابن جوزی نے حصول علم کے لیے جو مشقت برداشت کی اس سے ان کی علم سے بھی لگن کا پتا چلتا ہے۔ راشدی برادران کا تذکرہ بھی دل کو بھایا۔ کھیل صدیقی سے گزارش ہے کہ اسی طرح خیر برادران، علی برادران اور بخاری برادران پر بھی لکھیں۔ کھیل اور لیس اس ماہ کی سب سے بہترین اور بھرپور تحریر لائے اور وہ بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے بارے میں۔ جمیل جالبی، سید جالب دہلوی کے قریبی رشتہ دار تھے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی، جوش ملیح آبادی جیسے مہم۔ پٹ آدی نے بھی اپنے سوانح حیات ”یادوں کی برات“ میں سید جالب دہلوی کا ذکر بہت محبت اور عقیدت سے کیا۔ ان کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے مختصر مگر بھرپور مضمون لکھا تھا جواب ان کی کتاب ”یاد فرنگس“ میں شامل ہے۔ سکلی اعوان اس بار عربی شاعر نزار قبانی کے ساتھ حاضر تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل اقتدار ہمیشہ اہل علم اور اہل قلم سے خوفزدہ اور بیزار رہے ہیں۔ رمضان علی عابدی کا ذکر بھی موثر اعزاز میں لکھا گیا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تین شاہ، اشفاق احمد عرف بابا جی پر بھرپور تحریر بھی مگر منفرد تھی سو ابھی لگی۔ ششال سے ٹورنٹو بہترین موز پر ہے۔ ایرانی نسرین کی ہنسی کے خاندان سے عدم صاحب نے معذرت کر لی۔ یہ اچھا ہوا۔ ناسور میں اب بارودھاؤ بدھ مت جاری ہے۔ ”ربانی“ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی، فرشتہ دوسرے نمبر پر رہی اور آج کی سیاست کو کہاں کرنی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ حماقت میں سائرہ کو اس کے لالچ کی سزا ملی اور اس کا فیصلہ اس کے اپنے گلے کا پھندا بن گیا۔ خیراب بھی سبق آموز کہانی تھی۔ رائفہ نے سکندر رنای درندے کے ساتھ باہل ٹیک کیا۔ شیر کی خالہ اور دل مشکل بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ شہر خیال کی صدارت رضا احمد اعوان بھکر کے نام تھی۔ طویل مگر دلچسپ تبصرہ تھا۔ آفتاب نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی اور میری ایڈیٹر سرسدرہ بانو ناگوری سب بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ بہاولپور کے کلیم اللہ ایڈووکیٹ نے جس حقیقت کو بیان کیا اس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں، اللہ کرے زور قلم بھٹل اور ڈاکٹر روبینہ نقیص انصاری اللہ جانے میری یہ دونوں ہمیشہ کدھر مگر ہیں۔ اللہ پاک انہیں قلم اٹھانے کی توفیق دے۔ (ادارہ کسی بھی قلم کار کا فون نمبر کی دوسرے کو نہیں دیتا اس لیے معذرت خواہ ہیں)“

☆ انور سلطان کی کراچی سے آمد ”رضا احمد اعوان اپنے بے لاگ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر فائز تھے۔ ممتاز احمد شاہد خوش نصیب ٹھہرے کہ ان کی ساتھیوں سے لگتی علیک سلیک، ہم تک پہنچی۔ سدرہ بانو اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تبصرے بہت پسند آئے جبکہ زہت افشاں نے صحیح بیانیوں کو اچھی طرح پرکھا۔ اعجاز حسین سیٹھار کا خط دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیلی ہے۔ روبینہ نقیص اور قرۃ العین غیر حاضر ہیں۔ یہ سفر تائے نہیں پڑے اس ضمن میں شوروہ ہے کہ کبھی عدم افغانی کو پڑھ کر دیکھیں۔ سلیم اللہ کے خط کی زبان کافی تیز ہے۔ فہیم خان آپ کی بے جا تنقید اچھی نہیں لگی۔ یوٹیوب دکھایا یا پڑھا نہیں، استعمال پر منحصر ہے۔ قیصر خان خوش آمد یہ آپ کا ہر مسرت خط سب پر بازی لے لیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمت نہیں ہارتے۔ کھیل اور لیس نے لیے وقف کے بعد شاعر اچھے مضمون کا شہوہ دیا۔ دس صفحات کے اس مضمون نے طویل زندگی کا خوبی سے احاطہ کیا کہ۔ جرکی، کے ساتھ شاہد لطیف نے بھی سکوت توڑا، مضمون قابلِ جلدی میں لکھا تھا لیکن پراسرار تحاریر کے شیدائوں کے لیے اچھا تنقید ہے۔ کھیل صدیقی کی پچھلی تحریر دل کو نہیں گتی تھی لیکن اب کی بار صاحب نے کمال کر دیا۔ باتوں ہی باتوں میں حالات زندگی اور جد مسلسل بیان کر گئے۔ آج جب بائیک پر روزانہ پچاس کلومیٹر کا سفر

ملے کرتا ہوں تو دل سے دعا کرتی ہے کہ کاش کراچی میں فرانچسورت کا مسئلہ حل ہو جائے۔ روشنیاں واپس آجائیں۔ یہ مضمون ای کو بھی بہت پسند آیا۔ انہوں نے مجھ سے بھی پہلے پڑھ لیا تھا۔ ٹیلی اور ٹی وی کے مخصوص انداز میں ٹیلی جالبی کے فن کا حق ادا کیا۔ خیامی الدین کی شخصیت پر تدریس کی یاد کی مانند ہے برٹش ٹیلی ویژن کی برآمد نہ ہوئی۔ کہہ نہیں سکتے خیامی الدین اصل میں ہیں کیا۔ کاشف ذہن کی تحریر سب پر بازی نہ لے جائے یہ ہو نہیں سکتا۔ تین شاہ مختصر اور جامع تحریر ہے۔ بلاوجہ کی تفصیلات سے گریزاں صفحات کو کہا بہت پر اثر بنادیا۔ اور فرہادی فلم عمر پسند آئی کچھ اداکار ایسے ہیں جن کی کثرت سے حکمران ہو رہی ہے۔“

☆ ندیم افضل کا جہلم سے شکوہ ”کسی سے صاحب نے پوچھا کہ کہاں کھو گئے تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تیسرا تیسرہ بھی ٹکڑا ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گیا۔ بوے ارمان کے ساتھ سرگزشت دیکھا تھا کہ لازماً ہوگا لیکن افسوس۔ یہ تیسرہ بھی امید اور ناامیدی میں لکھ رہے ہیں کہ شائع ہو جائے۔ رضا احمد اعوان اور آفتاب احمد نصیر اثرنی صاحب سے شروع میں ہی ملاقات ہو گئی تیسرہ پسند آیا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحب کیسا حال ہے آپ کا اور آپ کے بلکہ ہمارے شہر قائد کا کچھ تبدیلی کے آثار نظر آئے یا نہیں؟ نصرت احمد بہت مبارکباد۔ اللہ آپ کی حاضری کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ عمر شریف کے بارے میں تو کئی بار ذکر ہوا ہے اس لیے انکشاف تو مت کیسے۔ ناصر حسین کا مکتوب بھی اپنا رنگ بچانے میں کامیاب ہوا۔ باقی ساتھیوں کے تیسرے بھی اچھے تھے۔ باقی اس کے علاوہ قلم گہری ہمیشہ کی طرح خوبصورت رہی۔ حماقت میں بیوقوفی پر ماتم کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔ رہائی اور کی جاناں پڑھ کر احساس ہوا عرضہ دراز کے بعد اسے خوبصورت موضوعات کے ساتھ سرگزشت حاضر ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر ناگہانی موت نمبر شائع کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ تو ہمارے لیے واقعی حیران کن بات تھی۔ بہر حال شدت سے اس گھڑی کا انتظار رہے گا۔ برائے مہربانی زیادہ انتظار مت کروائیے گا۔“

☆ علی عباس لاہور سے لکھتے ہیں ”واہ بھی واہ، کمال ہو گیا، ہمارا پیارا سرگزشت بروقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ شہر خیال کی محفل عروج پر پہنچی نئے دوست محفل میں شامل ہو رہے ہیں۔ دلچسپی بڑھنے کے ساتھ نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ بشری افضل نے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر مبارکباد دی ہے۔ ”خاص نمبر“ کا اعلان پڑھ کر اندازے لگا رہے ہیں کہ اس بند بناری سے ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے کیا کچھ نکلا ہے، ابھی چند مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ رضاعلی عابدی، غیر معمولی شخصیت ہیں، انہوں نے ناممکن کو بھی ممکن بنالیا ہے جرنیلی سڑک گواہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں بھی بہت اور بناری سے لڑنے کا جذبہ عطا اور ہم بھی کچھ لکھ سکیں۔ مختلف کرداروں اور قصے کہانیوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ سچ بیانوں میں ”دماغی توازن“ زیادہ دھوم دھڑکے والی کہانی نہیں ہے۔ جب کسی کام کا وقت ہوتا ہے تب لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے معاملہ بگاڑ دیتے ہیں اور ایسی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہیں جن سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی ہے۔ اپنے مزاج کی ضد اور انفرادی فیصلوں سے دوسرے کی اذیت کا سامان کرتے ہیں۔ جب ہاتھ سے چھٹی اڑ جاتا ہے تب افسوس سے سر پٹنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا لیکن حالات میں تبدیلی نہیں آتی۔ ”شیر کی خالہ“ کی رقیہ ایار میں بے مثال ہیں۔ وہ سب کچھ کھودینے کے باوجود بھی پر عزم اور مطمئن ہیں لیکن میرالیقین ہے ان کو کبھی جین نصیب نہ ہوگا۔ ”تریق“ میں مرکزی اپنے وزن سے زیادہ اپنے دکھوں کا بھارا ڈھانچے بھرتا ہے جب جذلوں کو دولت کے ترازو پر تول جائے تو محبت جرم بن جاتی ہے۔ ”حماقت“ اپنے لاٹھی مزاج سے مجبور تھی لیکن جب وہ اپنی خواہشوں کی قبر تلے دب گئی ہے تو اس کو یہ قیہ بھلا کر اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا ثبوت دینا چاہتے تھا۔“

☆ طاہر مجاہد کا غلط نامہ منوال رائیجھ سے ”ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی بجائے تاریخی اور تصوف کی نامور شخصیت ضیاء نسیم کی کہانی شامل اشاعت تھی جس میں انہوں نے علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ان کے تعلیمی خدمات کے حوالے سے بڑی تفصیل بیان کی ہے جس کی تحریف نہ کرنا بھی رائیجھ جن عقلی میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے تو پورا ڈائجسٹ ہی ماشاء اللہ بہت خوبصورت تھا مگر مجھے سب سے اچھی کہانی جو میرے دل کو چوم گئی ہے وہ تھی ”کی جاناں میں“ کا عنوان شاید بیسے شاہ کے کلام سے لیا گیا۔ ”قلم عمر“ میں اس مرتبہ جاوید شیخ سے متعلق خوبصورت تحریر سامنے آئی۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

راجیلہ شعیب، ملتان۔ سعید سرفراز، کراچی۔ نعمان اشرف، ظہیر احمد تبسم، حیدرآباد۔ ثناء قابل، لد۔ مسلم علی خان، پشاور۔ رازی بڑی فیصل
آ۔ اہاریم، کوئٹہ۔ محمد اقبال، سرگودھا۔ نسیم الدین، پشاور۔ ساجد احسن، میرپور آزاد کشمیر۔ حمایت علی زیدی، فیصل آباد۔

سخن سلاو

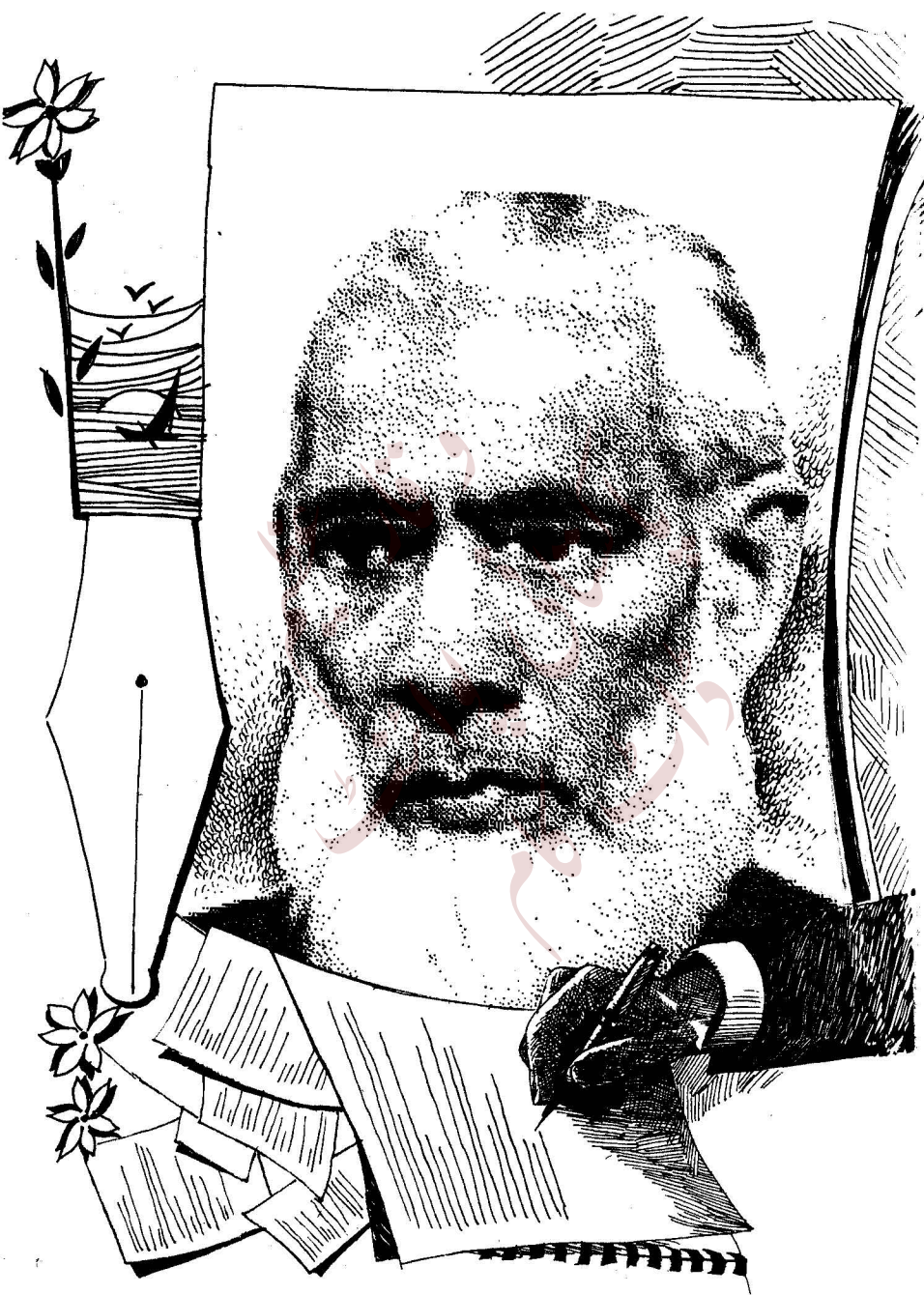
ڈاکٹر سلجدا امجد

حالات کا موافق نہ ہونا اور زمانے کی بے فہمی بھی اسے آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔ وہ ادب کی دنیا میں اپنا مقام تعمیر کو تا ہوا ترقی کے مدارج طے کرتا چلا گیا۔ وہ مقالاتی تھا ان ستاروں کا جو ادب کی دنیا میں ضیاء پاشی کر سکے جبکہ اسے علم تھا کہ اس جھولی میں سو سو چھید ہیں۔ یہ گروہ بندیاں ادب کو دیمک بن کر چاٹ رہی ہیں پھر بھی وہ خدمتِ ادب میں کوشاں رہا۔ اس کی محنت اس کی تحریر میں، اشعار میں بول رہی تھیں مگر اسے وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مقالاتی تھا۔

اردو ادب کے ایک اہم شاعر کا زندگی نامہ

”آپ بغداد ہی سے تشریف لارہے ہیں ناں۔“
 ”ہاں آ تو ہیں سے رہا ہوں۔“
 ”پھر تو آپ وہی ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”میرا نام شریف الدین ہے۔ میں بغداد میں آپ کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ پھر میں بمبئی آ گیا۔ اب میں یہیں ہوں۔“
 ”معاف کرنا بھائی۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا اب پہچان لیا۔“
 ”کمال الدین صاحب، یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ رہ گیا کہ بمبئی آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔“
 ”ایک تاجر تجارت ہی کی غرض سے آ سکتا ہے۔“
 ”آپ کا کاروبار تو بغداد میں خوب چمک رہا تھا۔“
 ”بس کچھ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے بغداد چھوڑنا پڑا۔ مال و متاع سمیت کر یہاں آ گیا ہوں۔“

عراق سے آنے والا جہاز منزلیں طے کرتا ہوا بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مسافروں کے جھوم نے خشکی پر قدم رکھنا شروع کیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن پھر بھی اتنا تو تھا۔ وہ کچھ دیر جہاز سے باہر جانے والوں کا تماشا دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے ہی جہاز سے باہر آیا ایک آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس اجنبی ملک میں اس کا شناسا کون نکل آیا، اس نے ایک مرتبہ پیچھے پلٹ کر دیکھا بھی تھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ آواز قریب سے آئی۔ اس آواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کمال الدین ہی ہیں ناں۔“
 ”ہاں میں کمال الدین ہی ہوں۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا۔“



”اچھے برے وقت سب اللہ کے بنائے ہوئے

ہیں۔ تم ہمیشہ میرے بیٹے رہو گے۔“

کمال الدین مطمئن ہو گئے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس اجنبی ملک اجنبی شہر میں رہنے کا ٹھکانا مل گیا، اچھے لوگ مل گئے۔ لیکن وہ کسی پر بوجھ بننے کے لیے نہیں آئے تھے۔

تجارت کا تجربہ تھا۔ اچھی خاصی رقم بھی ساتھ لائے تھے۔ چھوٹا موٹا کاروبار تو کر ہی سکتے تھے۔ دوسرے ہی دن سرخیں تاپنے، حالات دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ شروع میں کئی چھوٹے موٹے کاروبار کیے۔ پھر کپاس کا کارخانہ کھول لیا۔ اس کارخانے میں خدا نے برکت دی۔ شریف الدین کے گھر کو خیر باد کہہ کر اپنے لیے الگ مکان خرید لیا۔ ایک شریف گھرانے میں شادی بھی کر لی۔ خدا نے ایک بیٹا بھی دیا جس کا نام انہوں نے سید جمال الدین رکھا۔

وقت کا پہلا گردش کرتا رہا۔ سید جمال الدین جوان ہو کر باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کاروبار ترقی پر تھا۔ دولت کی ریل تیل تھی۔ سید کمال الدین کے بڑے بھائی بھی بسبھی آ گئے۔

سید جمال الدین کی اپنی تایا سے نہیں بنتی تھی۔ یہی تنازع اسے باپ کے سامنے لے آیا۔ باپ بیٹے آنے سامنے آ گئے۔ بات گھر کی تھی کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ تنازع کیا ہے۔ سید جمال الدین کی سعادت مندی نے بھی جھگڑے کو طویل دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک دن خاموشی سے بسبھی چھوڑ دیا اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہر دہلی آ گئے۔ جوانی تھی، حوصلہ تھا۔ اس شہر میں روزگار کے ذرائع بہت تھے۔ پہلے ریلوے میں ڈرائیوری کی۔ پھر ٹھیکہ داری کو روزگار بنایا۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ باپ سے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے تھے لیکن دوبارہ بسبھی جانا مناسب نہ سمجھا۔ دہلی ہی کو وطن بنا کر بیٹھ گئے۔ اس شہر میں انہوں نے نہایت محضر خاندان کے ایک فرد مولوی حفیظ اللہ کی صاحب زادی سے شادی کر لی۔ مولوی حفیظ اللہ کے مرید پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے۔

سید جمال الدین صاحب ان دنوں علی شاہ تارا اجیری گیٹ دہلی میں رہائش پذیر تھے۔ اسی یادگار مکان میں 17 جنوری 1906ء کی صبح ان کے گھر میں فرزند ولید پر نے جنم لیا۔ اس بچے کا نام انہوں نے سید جلال الدین رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر حیدر دہلوی کہلایا۔ شاعری کی دنیا میں ایسا باکمال ہوا کہ خیام الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔

”کیا بالکل۔“

”یہی سمجھو اگر کاروبار جم گیا تو یہیں کا ہو جاؤں گا۔“

”کاروبار کیونکر نہ ہے گا۔ یہ بسبھی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر۔ بشرطیکہ آپ کی تجارتی مطلقوں میں جان پہچان ہو۔“

”میں تو اللہ کے بھروسے پر یہاں آیا ہوں۔ جو کچھ کروں گا اپنے زور بازو پر کروں گا۔ یہاں کے دو تین لوگوں سے بغداد میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں بھی تلاش کر لوں گا۔“

”ابھی کہاں قیام کریں گے؟“

”کسی بھی سرائے میں ٹھہر جاؤں گا۔“

”سرائے میں کیوں، میرا غریب خانہ حاضر ہے۔“

”نہیں بھائی میرے لیے آپ کیوں تکلیف میں پڑتے ہیں۔“

”تکلیف کسی انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

سید کمال الدین نہیں چاہتے تھے کہ اس کے گھر جائیں لیکن وہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا۔ قلی کو بلا کر سامان بھی اٹھوا لیا۔ سواری بھی آگئی۔

”شریف الدین تم یہاں کیا کرتے ہو۔ کوئی کاروبار ہے یا نوکری۔“

”کاروبار ہی سمجھو۔ جہاز پر سامان لادنے والے قلیوں کا ٹھیکہ دار ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔“ سید کمال الدین نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ وہ شاید آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

بسبھی کی چوڑی سڑکوں اور بلند عمارتوں سے گزرنے کے بعد ان کی سواری ایک اوسط درجے کے مکان کے سامنے رک گئی۔ یہی شریف الدین کا مکان تھا جہاں وہ اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے گھر میں پردہ کرنے کو کہا اور کمال الدین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ ایک اوجیز عمر خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں مشروب کے گلاس تھے۔ کمال الدین انہیں دیکھ کر اتر اٹھا کھڑا ہو گیا۔

”یہ میری والدہ ہیں۔ پردہ کرتی ہیں مگر آپ تو ان کے بیٹوں کی طرح ہیں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ کبھی اچھا وقت آیا تو بیٹا بن کر بھی دکھا دوں گا۔“

روز سید کمال الدین کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ذکر بھی ہوتا رہا کہ اب ان یتیم بچوں کا کیا ہوگا۔ پھر بتایا نے یہ پیشکش بہو کے سامنے رکھ دی۔

”اب آمدنی کا کوئی ذریعہ تو رہا نہیں۔ ان بچوں کی تعلیم و پرورش تمہارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ یتیموں کی شادی کے دن بھی ہلکے جھپٹے آجائیں گے۔“

”بھائی صاحب سب اللہ کرے گا۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو پال لوں گی۔“

”لو بھئی، تمہیں ہمارے ہوتے محنت مزدوری کرنے کی کیا ضرورت۔ ان بچوں کو ہم پالیں گے۔ ہم انہیں بہت سے لے جاتے ہیں۔ تم سے ملوانے کے لیے لاتے رہیں گے۔“

”بھائی صاحب، آپ ایک ماں سے اس کے بچوں کو جچیں رہے ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم تو ان بچوں کے مستقبل کے لیے کھڑے ہیں۔“

”مجھ سے زیادہ ان کے مستقبل کی فکر کون کرے گا؟“

”کیوں کیا ہم غیر ہیں؟“

”یہ میں نے کب کہا۔“

جب والدہ کی طرح نہ مائیں تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ کچھ رقم دے کر بچے حاصل کر لیے جائیں۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچے جو تقریباً چار لاکھ روپے بنتی تھی والدہ کو دے کر بچے حاصل کر لیں لیکن والدہ نے اتنی بڑی رقم ٹھکرا کر بچے دینے سے انکار کر دیا۔

دادی اور تایا نے یہ صاف انکار سن کر سامان باغداد لیا۔

حیدر دہلوی کی والدہ نے وہ تھوڑی سی رقم جو شوہر نے چھوڑی تھی ایک بچے میں سی کر محفوظ کر دی کہ کسی آڑے وقت کام آئے گی اور خود سلائی پر کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلانے لگیں۔

اس طرح گھر کا چلو چلا رہا لیکن حیدر دہلوی کی تعلیم پر برا اثر پڑا۔

☆.....☆

ولی میں ایک بڑا طبقہ کارخانوں کے مزدوروں کا تھا۔ لوگ اعزاز انہیں کر خندار کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ کارخانے کیا گھریلو صنعتیں تھیں۔ مختلف قسم کی دستکاریاں تھیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو دن بھر کی مزدوری کے بعد شام کے وقت

یہ وہ دور تھا جب برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں جنم لے چکی تھیں۔ اسی سال 1906ء میں سر آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے ہندوستان کے انسرانے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ اس کے چند دنوں بعد ہی وحا کا میں علی گڑھ انجمن ایشیائی نسل کا کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وہیں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سیاسی جماعت بنانے کے لیے تحریک پیش کی گئی اور اس کے نتیجے میں مسلم لیگ کا قیام مکمل میں آیا۔ ولی کی تہذیب ان دنوں ایک نئی کر وٹ لے رہی تھی۔ سیاسی و سماجی جدیلیوں نے لوگوں کے اذہان و قلوب میں نا شعور جا کر کیا۔

دہلی کے شب و روز میں اگرچہ سیاسی اور تہذیبی ماحول میں قدرے تبدیلی آ رہی تھی مگر علمی و ادبی ماحول میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ راتوں کو علمی و ادبی محافل جتنی تھیں

شاعری کی محفلیں سائل دہلوی، بیجو دہلوی اور ساحر دہلوی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ ان اساتذہ سخن کے سیکڑوں شاگرد تھے جو ان کی محفلیوں کی رونقیں برقرار رکھے ہوئے

تھے۔ شرفا اپنے بچوں میں علم و ادب کا لگاؤ پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہمراہ علمی، ادبی

محاسن اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس بچے نے آنکھ کھولی۔

ایک مہذب اور پڑھے لکھے گھر میں پرورش ہو رہی تھی۔

والدہ ایک صاحب شریعت بزرگ مولوی حفیظ اللہ کی صاحبزادی تھیں لہذا لڑکیوں میں دینی تعلیم ہوتی رہی۔

پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ پھر زمانے کے دستور کے مطابق مولوی کرامت سے عربی اور مرزا

حیرت دہلوی سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم کا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا لیکن ایک روز ایسی آدھی چلی کہ گھر کا سب سے روشن چراغ بجھ گیا۔ گھر کا

اجالا اندھیرا اٹھنے لگا۔ سید کمال الدین تین بیٹیوں اور

اکھوتے بیٹے سید جلال الدین (حیدر دہلوی) کو ماں کے

سہارے پر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

سید کمال الدین کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ بتایا

اور دادی۔ بہت سے دہلی بچے تھیں۔ سید کمال الدین کی بیوہ کی

احار س بندگی کہ ان کے آنسو پونچھنے کے لیے سرال کی

طرف سے بھی کوئی آیا۔ وہ ساس کے کندھے پر سر رکھ کر

ہی رہتک روتی رہیں۔ تایا نے بھی بہت کچھ تسلی دی۔ چند

سہارا

سید کمال الدین کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ بتایا

اور دادی۔ بہت سے دہلی بچے تھیں۔ سید کمال الدین کی بیوہ کی

احار س بندگی کہ ان کے آنسو پونچھنے کے لیے سرال کی

طرف سے بھی کوئی آیا۔ وہ ساس کے کندھے پر سر رکھ کر

ہی رہتک روتی رہیں۔ تایا نے بھی بہت کچھ تسلی دی۔ چند

جامع مسجد کی میز جیوں پر جمع ہوتے تھے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ ٹولیوں میں نظر آتے تھے۔ شاعر بھی جمع ہوتے تھے۔ شاعری کے دور چلتے تھے۔ ایک دوسرے کو شعر سناتے جاتے تھے۔ داد کے ڈونگرے برستے تھے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں گونجتی تھیں۔ حیدر دہلوی کا گھر جامع مسجد کے قریب تھا۔ وہ بھی شام کے وقت گھر سے نکلتا اور ان تقریبات میں شریک ہو جاتا۔ کہیں تقریریں ہو رہی ہیں، کوئی مددس حالی ادبچی آواز میں گارہا ہے۔ کسی نے میر حسن کی مثنوی چھیڑ رکھی ہے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس کا بچپن ٹہل رہا تھا۔ جامع مسجد کی میز جیوں پر بیٹھے ہوئے شاعر اس کی مرکز نگاہ تھے۔ وہ جب ان شاعروں میں بیٹھتا، ان کے شعر سننا تو اس کے دل میں ایک شور سا برپا ہو جاتا۔ ابھی کبھی تو یہ شور اسے اتنا پریشان کرتا کہ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ جاتا۔ وہ اس شور کو کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اسی رات اس نے خواب میں خود کو جامع مسجد کی میز جیوں پر بیٹھے دیکھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ روز ہی وہاں جاتا تھا۔ نئی بات تو یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف شاعر جمع تھے اور وہ انہیں اپنے شعر سننا رہا تھا۔ اس نے کبھی ایک شعر نہیں کہا تھا لیکن خواب میں وہ شعر سن رہا تھا۔ بڑے بڑے شاعر اس کے شعروں کی تعریف کر رہے تھے۔ جب وہ شعر سن چکا تو کسی شاعر نے اس سے کہا۔ تم تو بہت اچھے شعر کہتے ہو۔ ساحر دہلوی کے مکان پر منعقد ہونے والے ماہانہ مشاعروں میں کیوں شریک نہیں ہوتے اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے دل میں اٹھنے والا شور ختم کیا تھا جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی ہو لیکن اب ایک دوسری حیرت اس کے سامنے تھی۔ مجھے وہ شعر کیسے یاد آگئے تھے جو میں سن رہا تھا۔ پھر وہ ہنس دیا، ارے خواب میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ اسے ایک شعر بھی یاد نہیں آیا جو وہ کالی پر اتار لیتا۔ اس نے ایک بھر پور اگلاڑی لی اور بستر سے اتر گیا۔ باہر صحن میں سلاخی مشین چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب ہے اماں اٹھ گئی ہیں۔ وہ صحن سے ملحق دالان میں آیا۔ اس کی والدہ بھی نہیں اس کی دو بہنیں بھی کام میں مصروف تھیں۔ والدہ کپڑے سی رہی تھیں اور دونوں بہنیں دوپٹوں پر گونا گارہی تھیں۔

”اٹھ گئے تم، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی میں جنہیں چائے براٹھا دے دوں۔ چائے پی لو تو یہ کپڑے فردوس خالہ کے گھر دے آؤ۔ وہ پیسے دیں گی وہ لے آتا۔“

ناشتا کرنے کے بعد اس نے سٹے ہوئے کپڑے اٹھائے اور گھر سے نکل گیا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک لمبا چکر کاٹا اور جامع مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت میز جیوں پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ یہاں کھڑے ہو کر دیر تک رات کے خواب پر غور کرتا رہا اور پھر فردوس خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھا۔ خالہ سے باتیں کیں اور پھر گھر کے لیے نکل پڑا۔

وہ عجیب سی آنکھن اور سرخوشی لیے گھر لوٹا تھا۔

شام ہوئی تو پھر حسب معمول جامع مسجد کی طرف چلا گیا۔ ابھی پوری طرح محفلیں جھی نہیں تھیں۔ شاید وہ گھبراہٹ میں جلدی گھر سے نکل آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے ساحر دہلوی کا نام یاد آیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔ شکل تو دیکھی نہیں انہیں پیچانوں کا کیسے۔ وہ بھی سوچتا ہوا ایڈورڈ پارک کی طرف چلا گیا جو جامع مسجد کے سامنے ہی تھا۔ یہاں بھی بے فکروں کی محفلیں جتی تھیں۔ یہاں اسے اس کے محلے کا ایک دوست مل گیا۔

”تم کیا یہاں روز آتے ہو۔“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”ہاں یہاں اچھے اچھے شاعر آتے ہیں۔ ان کے شعر سنتا ہوں۔“

”پھر تو تم شاعروں کو جانتے بھی ہو گے۔“

”جو یہاں آتے ہیں انہیں تو جانتا ہی ہوں۔“

”ساحر دہلوی نام کے شاعر کو جانتے ہو۔“

”انہیں کون نہیں جانتا۔“

”کیا وہ یہاں آتے ہیں۔“

”وہ استاد شاعر ہیں۔ وہ یہاں تھوڑی آتے ہیں۔“

”پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو۔“

”ان کے گھر مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں

تم بھی وہاں جایا کرو۔“

”اب مشاعرہ ہو تو مجھے بتانا۔“

”اس میں بتانا کیا ہے۔ ان کے گھر تو کل ہی مشاعرہ

ہے۔ میرے ساتھ چلتا۔ ساحر دہلوی جنہیں نظر آجائیں گے۔“

اس نے یہ رات اور دوسرا دن بے چینی کے بستر پر گزارا۔ دوسرے دن کی رات آئی تو وہ ماں کو بتائے بغیر گھر سے نکل گیا اور اپنے دوست کے گھر پہنچ گیا۔ دوست بھی تیار ہی بیٹھا تھا۔ دونوں مل کر پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی کے گھر

”مجھے بھی اچھا نہیں لگتا مگر کیا کروں مشاعرے تو رات ہی میں ہوتے ہیں۔“

”آخر ضرورت کیا ہے مشاعرہ سننے کی۔“

وہ سن کر خاموش ہو گیا۔ ماں نے زیادہ بحث کرنا اسے اچھا نہیں لگا بلکہ اس وقت تو اس نے یہ فیصلہ ہی کر لیا تھا کہ ماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے رات کو گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

جامع مسجد کے آس پاس ہر روز کہیں نہ کہیں مشاعرہ ہوتا تھا کوچہ پنڈت میں ساحر دہلوی کی رہائش گاہ سے ہی کیا مختصر اور بھی کئی ٹھکانے تھے جہاں مشاعرے برپا ہوتے تھے۔

جلال الدین نے کئی دن تو ماں کی نصیحت پر عمل کیا لیکن اس کا شوق نصیحتوں سے دبے والا نہیں تھا۔ ایک روز اپنے دوست کے ساتھ پھر ایک مشاعرے میں جا پہنچا۔ والدہ نے پھر اسے ٹوکا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نہ اس نے مشاعروں میں جانا چھوڑا نہ والدہ نے نصیحت کرنا چھوڑی۔

مشاعروں کی باقاعدہ شرکت نے اسے بھی شعر کہنے پر اکسایا۔ اس نے کوشش کر کے کچھ اشعار کہے۔ وہ یہ دیکھ کر خود حیران رہ گیا کہ اس میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی وادست میں یہ اشعار بالکل درست تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی تخلص ہوتا ہے۔ پنڈت امر ناتھ کا تخلص ساحر ہے اور دہلی کی مناسبت سے دہلوی لکھتے ہیں۔ اس نے بھی اپنا تخلص حیدر رکھا اور اپنی کاپی پر حلی حروف سے حیدر دہلوی لکھ دیا یعنی وہ سید جلال الدین سے حیدر دہلوی ہو گیا۔

وہ چھپ چھپ کر غزلیں کہتا رہا۔ ماں کے خوف سے مشاعروں میں جانا چھوڑ چکا تھا۔

ایک روز اس کے ماموں اس کے گھر آئے۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کے ماموں کے ہاتھ وہ کاپی لگ گئی جس پر اس نے اپنے اشعار لکھ رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کاپی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسے اندازہ تو ہو گیا کہ یہ اشعار جلال الدین کے ہیں لیکن کچھ شک بھی تھا۔ یہ شک اس وقت دور ہو گیا جب اسی وقت وہ بھی گھر آ گیا۔

”یہ شعر تم نے لکھے ہیں؟“

”جی ماموں جان۔“

”ان اشعار میں تو حیدر تخلص لکھا ہوا ہے اور تم جلال /

پہنچے۔ یہاں پہنچ کر تو اس کی آنکھیں ہی کھل گئیں۔ اس نے یہاں نہ صرف ساحر دہلوی کو دیکھا بلکہ یتھو دہلوی اور سائل دہلوی کو بھی دیکھا۔ دہلی میں شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں بھی شاعر پرے جمائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ ایک کونے میں دبک گیا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ کسی نے اس سے بھی پوچھا، صاحبزادے! کیا آپ بھی شعر فرماتے ہیں۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی لیکن عجیب شرمندگی کا احساس ہوا۔ کاش! میں بھی شعر کہتا ہوتا تو اس وقت یہ شرمندگی اٹھانی نہ پڑتی۔

مشاعرہ پوری آپ و تاب سے جاری تھا۔ وہ ایک ایک شعر سے اس طرح لطف اندوز ہوتا رہا جیسے ہر شعر اس کی سمجھ میں آ رہا ہو۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ شاعر کتنے خوش قسمت ہیں جو ایک ساتھ اتنے لوگ ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ شعراء اس کو کسی دوسری دنیا کی حلقوں نظر آ رہے تھے۔ کتنا ہی وقت گزر گیا۔ وہ تو اس وقت چمکا چکا جب اس نے دوست نے اس سے چلنے کے لیے کہا۔ ”جلال رات بہت ہو گئی ہے اب چلنا چاہیے۔“

”ساحر دہلوی کو تو پڑھنے دو۔ انہیں تو سن لوں۔“

”ان کا نمبر آنے تک تو صبر ہو جائے گی۔“

”تھوڑی دیر اور بیٹھتے ہیں۔“

”تم بیٹھو زیادہ دیر ہو گئی تو میری ماں میری کھال کھینچ لیں گی۔“

حیدر دہلوی چاہتا تو یہی تھا کہ اسے جانے دے لیکن اکیلے جاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا لیکن یہ افسوس رہا کہ وہ ساحر صاحب کو نہ سن سکا۔

اس کے گھر کا دروازہ کچھ اس طرح کا تھا کہ باہر سے ہاتھ ڈال کر کڑی کھل جاتی تھی۔ اس نے کڑی کھولی اور دبے پاؤں چلتا ہوا اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ خوش تھا کہ اس کا راز کھل نہ سکا لیکن صبح ہوتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

”تم رات گئے تک گھر سے باہر تھے۔ کہاں گئے تھے؟“

”وہ..... ماں..... قریب ہی ایک مشاعرہ تھا۔ ایک دوست کے ساتھ مشاعرہ سننے چلا گیا تھا۔“

”غضب خدا کا! یہ عمر اور مشاعرے سننے کا شوق۔ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ تم راتوں کو گھر سے غائب رہو۔“

ایسے داغ اشعار ایک بچے کی زبان سے نئے تو
 ساحر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔
 ”مہاں صاحبزادے کوئی مکمل غزل سنائیے جس میں
 آپ کا قصہ بھی موجود ہو۔“
 ”پیش کرتا ہوں۔“

بنیاد وفا پہلے پہل کس نے رکھی تھی
 یہ کون تھا کلم بخت یہ کس کی غلطی تھی
 خلقت کا سبب میری نظارہ طلبی تھی
 جینے سے بھی پہلے مجھے مرنے کی خوشی تھی
 جب آنکھ تری ست سریزم اٹھی تھی
 کچھ اور ہی عالم تھا، الم تھا نہ خوشی تھی
 پیار محبت جو نہ دنیا سے سدھارا
 شاید ترے انداز تغافل میں کسی تھی
 خود لے گئی اک موج یم حسن بہا کر
 اللہ رے کیا چیز مری تشنہ لبی تھی
 ڈھونڈا اسے ہرست مگر خود میں نہ ڈھونڈا
 حیدر یہ ہماری ہی نظر کی غلطی تھی
 ایک غزل اور ملاحظہ کیجیے۔

کیوں پریشان و خوار ہیں ہم لوگ
 کس کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ
 ہم سے دنیا کی زیب و زینت ہے
 اس چمن کی بہار ہیں ہم لوگ
 عفت دو جہاں نگاہ عشق
 حسن کا اقتدار ہیں ہم لوگ
 ہم کو ساتی سے خاص نسبت ہے
 فطرتا بادہ خوار ہیں ہم لوگ
 اب بھی موقع ہے استفادے کا
 کہ ابھی برقرار ہیں ہم لوگ
 ہم سے تعبیر جزد کل حیدر
 مظہر کر دگار ہیں ہم لوگ
 اس کے بعد ساحر صاحب نے اسے چند مصرعے
 دیئے کہ ان مصرعوں پر شعر کہو۔ حیدر نے اسی وقت ان
 مصرعوں پر شعر کہ دیئے۔

اپنی دشواری کو کر لیتا ہوں میں دشوار تر
 مشکلیں جس شخص کی سنتا ہوں آساں ہو گئیں
 ☆
 حیدر ہوں سے پاک ہیں اہل نظر کے دل

”میں نے حیدر قصہ اختیار کر لیا ہے۔ حیدر دہلوی۔“
 ”بہمی شاعری کے لیے کسی کا شکر دہونا ضروری
 ہوتا ہے۔“
 ”مجھے تو ساحر دہلوی اچھے لگتے ہیں مگر ان تک میری
 رسائی نہیں ہے۔“

”رسائی کا کیا ہے۔ ان سے ہماری اچھی دوستی ہے۔
 کسی دن لے چلیں گے کہیں۔ یہ کاپی ساتھ لے چلتا دیکھو
 وہ تمہارے شعروں کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں۔“
 ”بہمی کیوں آج ہی چلیے۔“

حیدر کے ماموں اسے لے کر ساحر کے گھر کی طرف
 چلے۔ خوشی کے اس احساس سے اس کا دل اچھل رہا تھا کہ
 کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے محبوب شاعر کے سامنے ہو گا۔ اس
 کے شعروں کی کاپی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور ماموں
 کے قدم بہ قدم چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ
 سال تھی۔

ساحر اس وقت گھر پر تھے اور تنہا بھی تھے ورنہ دو چار
 شاگرد انہیں ہر وقت گھیرے ہی رہتے تھے۔
 حیدر کے ماموں نے اس کا تعارف کرایا اور آنے کا
 مقصد بیان کیا۔ ساحر نے سر سے پاؤں تک اس چہرے پر
 بدن اور سانولے رنگ کے لڑکے کو غور سے دیکھا اور کچھ
 سنانے کی فرمائش کی۔
 حیدر نے چند غزلوں کے حصہ حصہ اشعار پیش کیے۔

جس کو دنیا بہار کہتی ہے
 ترجمہ ہے میری جوانی کا
 یا ستارے فلک پہ روشن ہیں
 یا دوپٹا ہے کاندانی کا
 ☆

یاد میں تیری عمر اگر گزرے
 خوب کیا بلکہ خوب تر گزرے
 چلتے بادل تھے دن جوانی کے
 بس ادھر آئے اور ادھر گزرے
 ☆

عشق کا ترجمان ہے پیارے
 دل بھی گویا زبان ہے پیارے
 اس پس پردہ جلوہ ریزی پر
 مجھ کو حیرا گمان ہے پیارے
 ☆

یہ قعرے خود ہیں قصبہ دریاء لیے ہوئے

☆

بالآخر پھوٹ نکلیں سب گل آتش کیف ہو کر
چمپادی نہیں کسی نے بھلیاں خاک گستاں میں
اب اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ وہ خود شعر کہتا ہے۔
اس نے ساحر صاحب کے سامنے فی البدیہہ یہ اشعار کہہ
دیتے تھے۔ ساحر صاحب کا قائل ہونا لازمی تھا۔
”میاں تم تو بے بنائے شاعر ہو۔ آتے جاتے رہا
کرو۔“ ساحر صاحب نے حیدر سے کہا۔

ساحر دہلوی نے اس سے ایک دو نہیں تیرہ غزلیں
سنیں اور کہا تو صرف یہ کہا کہ آتے جاتے رہا کرو۔ یہ مشورہ
دوستوں کو دیا جاتا ہے شاگردوں کو نہیں۔

”حیدر نے اس مشورے پر پوری طرح عمل کیا اور وہ
باقاعدگی سے ان کے پاس حاضر ہونے لگا۔ یہ معاً آخر تک
معینا رہا کہ ساحر نے اس کے کلام پر اصلاح دی یا نہیں۔
حیدر ہمیشہ یہ کہتا رہا۔ میں استاد کے پاس یہ آرزو لے کر گیا
تھا کہ ان کی شاگردی پر فخر کروں اور اصلاح لوں۔ انہوں
نے مجھ سے تیرہ غزلیں سنیں اور کہا کہ ان میں اصلاح کی
کوئی ضرورت نہیں۔“ ساحر صاحب بھی ہمیشہ یہی کہتے
رہے۔ ”حیدر سے قسم لے کر پوچھو کہ میں نے کبھی اس کے
ایک شعر کی بھی اصلاح کی ہے۔“

یہ دور استاد کی شاگردی کا تھا۔ شاگرد کی عزت استاد
کی عظمت سے ہوتی تھی۔ اس دور کے مشاعروں میں حصہ
لینے والے نوجوان شعرا پہلے اپنے استاد کے اشعار سناتے
تھے۔ حیدر دہلوی بھی ابتدائی مشاعروں میں ایک رباعی
پڑھا کرتے تھے جس کے دو مصرعے یوں ہیں۔

حیدر مری اعجاز بیانی معلوم

ان ہونٹوں نے ساحر کی جبین چومی ہے

وہ ساحر دہلوی کی محفلوں میں آتا رہا۔ اس نے
پنڈت جی کے ہاں ہونے والے ماہانہ مشاعروں کے علاوہ
دیگر ادبی تھیلیوں کے مشاعروں میں بھی حصہ لینا شروع
کردیا۔

ایک بار حیدر کے ماموں نے ساحر دہلوی سے
پوچھا۔ ”استاد وہ نوجوان (حیدر دہلوی) جو آپ کے سپرد کیا
تھا کیسا جا رہا ہے۔“

پنڈت جی نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ تم اسے میرا شاگرد
بنانے لائے تھے یا استاد۔ وہ تو کچھ زیادہ ہی استاد ہے۔“

خدا جانے یہ طرہ تھا، خشکی تھی یا تریف لیکن یہ حقیقت
ہے کہ اس نے اپنی شاعری اور پڑھنے کے اعزاز سے فوری
توجہ حاصل کر لی۔ اس کی حد سے بڑی ہوئی خود اعتمادی
ایکچھ اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مشاعروں میں اس کا
خوب رنگ جم رہا تھا لیکن اساتذہ وقت اس سے ناخوش
تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس کی شاعری میں ایک
نئی زبان اور جدید فکر نمایاں تھی۔ تمام اساتذہ دلی کورواچی
زبان تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زبان میں کسی قسم کی
جدید بی کے حق میں نہیں تھے جب کہ وہ دلی کی رواجی
نکسالت کا باغی بن کر سامنے آ رہا تھا۔

حیدر دہلوی نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیا وہ
داغ اور امیریتا کی تربیت یافتہ نسل کا دور تھا اور اس وقت
دلی میں استاد شعراء کی گونج تھی۔ ان اساتذہ کے درمیان
اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کرنا کسی مصرعے سے کم نہیں تھا۔
وہ اسی مصرعہ آرا کی میں مصروف اور مشاعروں کی فضا تبدیل
کرنے میں مشغول تھا۔

یہ کیا دست اجل نے کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور دیرانے میں رکھ دینا

☆

اب سے نہیں آؤں سے ہوں مشتاقی نظارہ
آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اڑی ہے

☆

وہ دن گئے کہ صرف گریبان پہ زور تھا
اب ہاتھ میں ہوں دامن صحرا آئیے ہوئے

☆

وہ یہ تازہ اور نئے مگر مختلف اشعار لے کر مشاعروں
میں پہنچا تو تیور یوں پر تل پڑ گئے۔ مخالفوں کی آنکھیاں اٹھ
کھڑی ہوئیں۔ اسے نیچا دکھانے کے لیے نئی نئی منصوبہ
سازیاں کی جانے لگیں۔ وہ بھی دبنے والا کب تھا۔ اس نے
بہ زبان شعر اعلان کیا۔

یہ ہم صغیر کیا مری وسعت کو پا سکیں

سب سے زیادہ طاہر رفعت پسند ہوں

ایک تو اس کی کم عمری دوسرے اس کی مختلف شاعری
تیسرے اس کی حد سے بڑی ہوئی خود اعتمادی۔ ان سب
نے مل کر مشاعرہ بازوں کو اس کا سخت مخالف بنا دیا۔ اسے
مشاعروں میں نظر انداز کیا جانے لگا۔ اس کے کلام کی کجی
کے باوجود اسے غلط مقام پر پڑھوایا جاتا۔ اساتذہ کے نوعمر

ہوتا تو یہیں سب جمع ہوتے اور مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہوتے۔

شاگردوں کی تعداد بڑھی تو اس نے اپنا حلیہ بھی استادوں کی طرح بنا لیا۔ چہرے پر داڑھی رکھ لی تاکہ عمر زیادہ معلوم ہو۔ شیردانی پہننے لگا۔ ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ ہاتھ میں چھتری لے لی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مشاعرے میں اکڑ کر بیٹھتا۔ یہ بھی ایک اندازِ استاد تھا۔ یہ عالم ہوتا اساتذہ وقت سے ٹوک جمو کہ لازمی تھی البتہ رسائلِ دہلوی سے اس کی دوستی یا ایسے تعلقات ہمیشہ رہے۔ اسی بے تکلف تعلق کا فائدہ اٹھا کر ایک روز رسائل نے اس سے پوچھا۔

”میاں تم مشاعرے میں ہماری شاعری پر زیادہ توجہ نہیں کرتے نہ ہی داد دیتے ہو۔ ہماری شاعری تمہیں پسند نہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔“

حیدر دہلوی نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں آپ استاد شاعر ہیں مگر دونوں کی شاعری ایک جیسی ہے جب کہ میں ذرا الگ اور مختلف شاعری کرتا ہوں۔“

”میاں یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی توجہ نہ پیش کرو۔“

حیدر دہلوی نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا۔

پڑا ہوں میکدے کے در پہ اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بیخود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے
اس شعر میں رعایتِ لفظی کا جو بہتر دکھایا گیا تھا اس کی سائل نے داد تو دی لیکن دل سے قائل نہ ہوئے کیونکہ اس کے بعد بھی محاصرہ مکملیں جاری رہیں۔

حیدر دہلوی اب کل وقتی شاعر تھا۔ گھر میں بہت کم نکلتا تھا۔ حافظ ہوئے اس کا ڈر پڑا ہوا تھا۔ وہ دن کے کسی حصے میں گھر سے نکلتا اور حافظ ہوئے پر آکر بیٹھ جاتا۔ جسے بھی اس کی تلاش ہوتی حافظ ہوئے پہنچ جاتا۔ مشاعروں کی سیاست پر بخشش ہوتی، اساتذہ کے اشعار پر تنقیدیں کی جاتیں، شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ۔

اس عرصے میں بہت سی سماجی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ دلی کی سڑکیں موٹروں سے مانوس ہو گئی تھیں۔ رتھ غائب ہو گئے تھے۔ بالکی بس مظر میں چلی گئی تھی۔ ٹرامیں چل رہی تھیں۔ تانکے بھی چل رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے راستے منور تھے۔ لباؤں میں فرق آ گیا تھا۔

ان تبدیلیوں کے باوجود دلی کے ادبی ماحول میں کچھ

شاگردوں کے بعد پڑھوایا جاتا تو اسے سخت دکھ ہوتا۔ اٹھارہ بیس سال کا نو جوان جب پختہ غزلیں لے کر مشاعروں میں پہنچتا اور مشاعرہ لوٹ لیتا تو اساتذہ کے سینے پر سائب لوٹنے لگتے۔ ان کے شاگرد اکیلے حیدر دہلوی کو طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ وہ نہ کسی دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا نہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اس کا نہ کوئی بااثر استاد تھا جو اس کی حمایت میں بولے۔ ان حالات میں اس نے خود استاد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے ارد گرد نو جوان شعراء کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ان میں وہ بھی تھے جو اس کی شاعری سے متاثر ہو کر اس کے پاس چلے آئے اور وہ بھی تھے جو خود شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن شاعری کے شوقین تھے۔ حیدر دہلوی انہیں خود شعر لکھ کر دیتا اور انہیں مشاعرے میں اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ ویسے بھی وہ دور طرزی مشاعروں کا دور تھا۔ وہ مصرعہ طرح پر سو شعر کہہ لیتا۔ کچھ خود کہہ لیتا اور باقی شاگردوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اگر اسے مشاعرے میں دوسرے نمبر پر پڑھوایا جاتا تو ان شاگردوں کی بدولت اس کا نمبر خود بخود بارہواں یا چودھواں ہو جاتا۔

مشاعروں میں اس کی گرم بازاری دیکھ کر دوسرے استادوں کے شاگردوٹ کر اس کے پاس آنے لگے۔ ان میں ایک نام نازش حیدری کا بہت نمایاں تھا۔ نازش حیدری بیخود دہلوی اور پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی کے شاگرد تھے اور ان سے ٹوٹ کر حیدر دہلوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ نازش حیدری صحافت سے متعلق تھے۔ انجام اور جنگ وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حیدر دہلوی کا کلام ان اخبارات کی زینت بننے لگا ان کے ساتھ نازش کے چھوٹے بھائی انور دہلوی بھی اس کے شاگرد ہو گئے۔ پھر تو جیسے نو جوان شعراء کا ہجوم اس کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ سب اس کے تلامذہ میں شامل تھے۔

اس کی اصلاح کا اندازہ بھی انوکھا تھا۔ وہ بلا مکان اپنے کئی شاگردوں کی اصلاح بہ یک وقت کیا کرتا تھا۔ ادھر شاگردوں نے شعر پڑھا ادھر اس نے مناسب حال اصلاح دی۔ اصلاح کے دوران دو ایک شعر تحریک کے طور پر بھی عطا کر دیتا جس سے غزل پختہ تر ہو جاتی۔

جامع مسجد کے سامنے حافظ ہوئے تھا۔ وہ یہاں باقاعدگی سے بیٹھنے لگا۔ یہیں احباب و شاگرد جمع ہوتے شاعری کے دور چلے، اصلاح کے دفتر کھلتے، کہیں مشاعرہ

”خدا نہ کرے آپ بد نصیب ہوں۔ آپ کا بیٹا ابھی زندہ ہے آپ کا مقدر بدل دوں گا۔“

”یہ شاعری واعری مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا کم از کم رات کو تو گھر میں رہے۔ بیٹیوں بیٹیوں کی شادیاں ہونگیں۔ میرے بچے اب میں تمہارے ہوں۔“

”اماں جان، میں غلط لوگوں میں نہیں بیٹھتا۔ شاعری کے میدان سر کر رہا ہوں۔ بڑے بڑے اساتذہ سے معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ بس ذرا یہ میدان فتح کر لوں۔“

”یہ سلسلہ تھکنے والا نہیں اور نہ تو میری بات مانے گا۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ میں تیری شادی کروں۔ میں تو تجھے سدا حار نہیں سکی۔ اب وہ ہی تجھے سدا حارے گی۔“

”اماں کچھ تو مہلت دیں۔“

”کوئی مہلت نہیں میں نے لڑکی دکھی ہے بس اب میں بات آگے بڑھاؤں گی۔“ حیدر نے سر جھکا لیا۔

والدہ کی وفات کے بعد گھر کا چولہا جلانے کے لیے حیدر نے شانہ بٹانہ کام کیا تھا۔ وہ حد درجہ ذہین اور محنتی تھا۔ جو کام ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے گزر جاتا بھولتا نہیں تھا۔ اس نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ گھڑی سازی، بانسڑنگ، کمپوزنگ، تھپو پریس کی چھپائی، سنگ سازی اور پریس لائن سے جس قدر بھی متعلقات رائج تھے بس اس کی دسترس میں تھے۔ شادی کرنا اس کے لیے بوجھ نہیں تھا۔ اسے اگر خوف تھا تو یہ کہ یہ شادی کہیں اس کی شاعری میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ شادی کے لیے تیار نہ تھا لیکن ماں کے حکم پر سر جھکا پاؤں۔

اجازت ملتے ہی حیدر کی والدہ نے تیاری شروع کر دی۔ حیدر نے بھی سوچا کہ بہنوں کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا شادی کر لینا ہی بہتر ہے گھر کے کام کاج کے لیے کسی عورت کا ہونا ضروری ہے۔

حیدر دہلوی نے والدہ کے کہنے پر شادی کر لی۔ اس نے والدہ کے کہنے پر شادی کی بھی لیکن آنے والی خاتون ایسی سلیقہ مند ثابت ہوئی کہ اس نے پورا گھر سنبھال لیا۔ شاعر پیشو ہر کون سنبھالنا کسی بیوی کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اس بیوی آنے والی نے بھی اس سے شکایت نہیں کی۔

راتوں کی غیر حاضری اسی طرح جاری رہی۔

حیدر کی قسمت میں سکون لکھا ہی نہیں تھا۔ ایک بیٹی کی ولادت کے بعد اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور بعد ازاں وہ

فرق نہ آیا تھا۔ بنفود دہلوی، سائل اور ساحر کے رنگ شاعری کا دور دورہ تھا۔ رواجی شاعری کے اس تالاب میں پہلا پتھر حیدر دہلوی نے پھینکا جس کی سزا بھی اسے ملی۔ اسے مانا کسی نے نہیں، اس نے خود کو منوایا۔ اس کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ اپنا وقت اس جدوجہد میں خرچ کر رہا تھا۔ اس کی قادر الکلامی کا سکھ اس وقت دلوں پر جم گیا جب اس کی ایک غزل نے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔

بنفود محقق کی گہوارہ جنایتی نہیں جاتی نہیں جاتی طبیعت کی پریشانی نہیں جاتی ہمیشہ دامن انگ خوں سے لالہ زار رہتا ہے یہ فطرت کے تبسم کی گل افشانی نہیں جاتی نظام دہر اگر میرے لیے بدلا تو کیا بدلا کسی گھر سے بھی شام غم بہ آسانی نہیں جاتی جنوں میں ہوش کیا جاں بھی بسا اوقات جاتی ہے نہیں جاتی تو طرز چاک دامانی نہیں جاتی سنا ہے شوخ جلوے بھی تحیر خیز ہوتے ہیں گزر جاتی ہے ساری عمر حیرانی نہیں جاتی میں خود اپنی محبت میں کمی محسوس کرتا ہوں مری صورت سے دل کی بات پہچانی نہیں جاتی چمن والوں سے مجھے معرالش کی بود و باش اچھی بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی ابھی ماحول عرفان و ہنر میں پست ہے حیدر کا ایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

وہ شہرت کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ بلند آواز پہچانی جائے لیکن گھر میں بیٹھنے والی اس کی ماں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا راتوں کو دیر سے گھر آتا ہے۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے بھی یہی چاہا کہ اس کے پیروں میں شادی کی زنجیر ڈال دی جائے۔

اس روز وہ رات گئے گھر پہنچا تو اس کی ماں خلاف معمول جاگ رہی تھی۔ حیدر کا ہاتھ ٹھکا۔ اللہ خیر کرے، اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

”اماں جان! خیر تو ہے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“

”جاگوں نہیں تو اور کیا کروں جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ بھی راتوں کو گھر سے غائب رہے تو اس کی بد نصیب ماں جاگے نہیں تو اور کیا کرے۔“

ماہنامہ مسرگوشٹ

بچی بھی چل بسی۔
حیدر شاعر تھا۔ اس صدمے کو عرصے تک فراموش نہ کر سکا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان بڑے سے بڑا صدمہ فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی اداسی دور ہوتے ہی والدہ نے دوبارہ گھر بسانے پر مجبور کیا۔ والدہ کا کہا بھلا کیسے ٹالنا۔ وہ پھر تیار ہو گیا۔ پہلا تجربہ جتنا خوشگوار تھا دوسرا تجربہ بے اتنا ہی تلخ نکلا۔ بیوی جھگڑا لگتی۔ دن رات جھگڑے سر اٹھانے لگے۔ اس کی نرم خوئی ان جھگڑوں کو بھی برداشت کر رہی تھی لیکن اس بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ اسے پراشوں میں زہر دینے کی کوشش کی۔ اتفاق سے یہ راز کھل گیا۔ حیدر نے اسے اسی وقت طلاق دے دی۔

”کسی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“
”آپ شاعر ہیں۔ دوسروں کے دلوں کا درد خوب سمجھتے ہیں۔ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں اس لیے آپ کے ساتھ بھی جھانڈ کر سکوں گی۔ آپ کے لیے میں ایک مردہ جسم سے زیادہ نہیں۔“
”جب آپ کسی کی محبت میں گرفتار تھیں تو شادی پر تیار ہی کیوں ہوئیں۔“

”میں نے اپنی ماں کے کانوں میں بات ڈال دی تھی لیکن انہوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے خاموش کر دیا۔ میں اس امید پر یہاں چلی آئی کہ آپ شاعر ہیں۔ میرے دکھ کو سمجھیں گے اور مجھے آزاد کر دیں گے۔“
”اس آزادی کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔“

”ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنے پر کوئی تیار نہیں ہوگا۔ میرے والدین مجبور ہو جائیں گے کہ اسی شخص سے میری شادی کرادیں جسے میں چاہتی ہوں۔“
اب کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دلوں طرف خاموشی تھی۔ حیدر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس وقت کمرے سے باہر نکلتا مناسب نہ سمجھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کس کس کو کیا کیا بتاتا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور تکیہ زمین پر رکھ کر لیٹ گیا۔ گھونگھٹ سے آواز پھر ابھری۔

”آپ زمین پر کیوں لیٹ گئے۔ آپ مسہری پر لیٹ جائیں۔ میں رات بھر جاگ کر گزار لوں گی۔“
”نہیں، یہ مسہری تمہارے بھتیجے کی ہے۔ اس پر تمہارا حق ہے۔ میں بھی جاگتا ہی رہوں گا۔ نیند میری آنکھوں میں بھی کہاں۔“
”آپ سوچ رہے ہوں گے، میں نے آپ کو کس الجھن میں ڈال دیا۔“

”یہ الجھن میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے۔“
”پھر آپ نے کیا سوچا؟“
”صبح بتاؤں گا۔“
”مجھے امید ہے آپ بات کو اس خوب صورتی سے بتائیں گے کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو۔“

وہ تو اس واقعے کو بھلا کر شاعری اور کاروباری دنیا میں واپس چلا گیا لیکن والدہ اس کی قسمت سے افسردہ ہو کر بستر سے لگ گئیں۔ وہ دن رات ان کے بستر سے لگا بیٹھا رہا۔ پریس مشین لگائی ہوئی تھی۔ مالی آسودگی، والدہ کے علاج پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا لیکن اس روپے سے وہ ان کی زندگی نہ خرید سکا۔

والدہ کی وفات اس کے لیے ایسا صدمہ تھا جس سے وہ مہینوں باہر نہ آسکا۔ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ وہ گھر ہی چھوڑ دیا اور اپنی بہن کے گھر رہنے لگا۔ اس کے بہنوئی عظیم اللہ خان اس سے بہت محبت کرتے تھے اسی لیے وہ ان کے گھر آ گیا تھا بلکہ وہ خود اسے لے آئے تھے کہ والدہ کے انتقال کے بعد اکیلے گھر میں کیسے رہ سکے۔

یہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ بہن نے تیسری شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ابھی پہلی بیوی کی وفات اور دوسری بیوی کی بے وفائی کو بھولا نہیں تھا۔ اب تو جیسے شادی کے نام سے چڑی ہو گئی تھی وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس بہن نے دوسری بہنوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ بہنوئی عظیم اللہ خان نے بھی زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ دوست احباب بھی زور دے رہے تھے۔ وہ مجبور ہو گیا۔ بہنوں سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی دیکھ لیں۔ بہنوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور ایک جگہ بات پکی کر دی۔ حیدر دہلوی نے ایک مرتبہ پھر سہ ماہی لیا۔ شاگردوں کے جھوم میں برات لے کر پہنچ گیا اور دن لے کر بہن کے گھر آ گیا۔

رات گئے تک گھر میں خوب ہنگامہ مچا رہا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ابھی بستر پر بیٹھے بھی نہیں پایا تھا کہ

اولاد میرے اشعار ہیں جو زندہ رہیں گے اور مجھے زندہ رکھیں گے۔ اس نے اپنے آپ کو کاروبار اور شاعری میں پوری طرح غرق کر لیا۔

اس کے بہنوئی نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کاروبار وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔ انہی کے مشورے سے اس نے پریس مشین کا کاروبار ختم کر کے بیٹ بنانے کا کارخانہ قائم کر لیا۔ یہ کارخانہ جامع مسجد کے سامنے تھا۔ اس کے پہلو میں حافظ ہوٹل تھا جہاں ہمیشہ سے اس کی بیشکبھی۔ کارخانے سے فارغ ہوتے ہی وہ ہوٹل پر آ کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اس کے ملنے والوں کا تانا باندھا رہتا۔ یہ مجلس آرائی رات گئے تک جاری رہتی۔

اس ہوٹل پر بیٹھنے والے شاکر دہلوی کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ایک ادارہ بنایا جائے جس کے تحت ماہانہ طرہی مشاعرے منعقد کیے جائیں کہنے کی دہریجی۔ ممبر سازی ہوگئی۔ مشاعروں کے انعقاد کے لیے رقم جمع ہوگئی۔ اس ادارے کے ممبران میں صرف اس کے شاگرد نہیں دیگر احباب بھی شامل تھے۔

دلی کے مشاعرے بڑے خاصے کی چیز تھے اور اس دور کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے تھے۔ وجود دہلوی، سائل دہلوی اور ساحر دہلوی کے شاگردوں کی ٹولیوں کے دم سے ادبی ماحول میں ایک گہما گہما تھی۔ ان مشاعروں میں اساتذہ دلی کے تلامذہ کے کردہ اپنے اپنے کردہ کی پاسداری میں پیش پیش رہتے تھے۔

اب ان مشاعروں میں ادارہ حیدری کی جانب سے ہونے والے ماہانہ طرہی مشاعروں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ مشاعرے حافظ ہوٹل کی بالائی منزل پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کے روح رواں حیدر دہلوی تھے۔ یہ مشاعرے اسی کی زیر صدارت منعقد ہوتے تھے۔ شاعروں کی اکثریت اس کے تلامذہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان شاعروں میں دوسرے شعراء کم ہی شرکت کرتے تھے لیکن ان مشاعروں نے ایک پہلی سی ضرورت پیدا کر دی تھی۔ اس کی کو ادارہ حیدری نے اس طرح پورا کیا کہ باہر سے شعراء کو مدعو کرنا شروع کر دیا۔ کبھی جگر آجاتے کبھی سیما کبھی کوئی اور اس اقدام سے ان مشاعروں کی وقعت بڑھنے لگی۔ باہر کے شعراء کو سننے اور دیکھنے کے لیے دوسرے شعراء بھی آنے لگے۔

دلی کی تہذیب اس قدر ضرورت تھی لیکن آن بان، شان و

”تم آرام سے سو جاؤ۔ میں سنبھال لوں گا۔“
دونوں طرف خاموشی پھر طاری ہوگئی۔ یہ خاموشی صبح اس وقت ٹوٹی جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔
”کسی کو کچھ نہ بتانا۔ میں خود بتاؤں گا۔“ حیدر نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ بیٹنس اندر آگئیں اور حیدر لڑے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے بیٹوں کو ایک کمرے میں جمع کیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔
”خیریت تو ہے حیدر، ہوا کیا۔“

”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنا۔ لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ مجھے قبول نہیں کر سکتی۔ میں زبردستی اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ میں نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ایسے کیسے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمارا اتنا پیسا خرچ ہوا ہے۔ بدنامی الگ ہوگی۔ ہم تو ابھی جاتے ہیں اس حرافہ کے گھر۔ اس کی ماں سے تو جا کر پوچھیں اس آوارہ کو ہمارے سر کیوں منڈھ دیا۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ طلاق تو اس کے بعد بھی دینی ہوگی۔ کسی لڑکی کو زبردستی گھر میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ان شریف لوگوں کو بے عزت کرنے کا کیا فائدہ۔“

”شریف کہاں سے ہو گئے۔“
”کسی کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلا جاؤں گا اور اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں گا اور یہ درخواست بھی کروں گا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کر دی جائے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔“

”حیدر، یہ تمہارا ہی طرف ہے۔ کوئی اور ہوتا تو ہنگامہ کر دیتا۔“
”ہر کوئی حیدر دہلوی نہیں ہوتا۔ بس اب اس لڑکی سے کچھ محبت کہنا۔“

اس نے اسی وقت اس لڑکی کو ساتھ لیا اور اپنی سسرال پہنچ گیا۔ اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر تمام باتیں گوش گزار کر دیں۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہ قسم بھی دے دی کہ بس اب بات کو ہمیں دفن کر دیں اور اگر بیٹی کی زندگی چاہتی ہیں تو اس کی شادی وہیں کر دیں جہاں یہ چاہتی ہے۔ خاموشی سے طلاق دے دی اور گھر آ کر اس کا فریجہ واپس بھجوا دیا۔

ایک مرتبہ پھر تکلیف دہ آزادی اسے مل گئی تھی۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ شاید شادی میرے مقدور ہی میں نہیں میری

مشاعروں کی کارروائیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔ تقریباً دو تہید کے عنوان سے تنقیدی مضامین بھی الہام میں شائع ہوتے تھے۔

حیدر دہلوی کا دور دراصل طرحی مشاعروں کا دور تھا۔ ادارہ حیدری میں ہر ماہ طرحی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جہاں حیدر دہلوی کے تلامذہ اور دیگر شعراء طرحی غزلیں پیش کرتے تھے۔ اب ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا تھا ان مشاعروں کی مکمل روئیداد الہام میں شائع ہوتی تھیں۔

الہام چونکہ دہلی سے باہر بھی جاتا تھا اس لیے ان مشاعروں کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ خود حیدر دہلوی کو بھی اس کا فائدہ ہوا۔ اسے ریڈیو کے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ دہلی سے باہر کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا۔ اسے ریاست ٹونک کے مشاعرے میں بلایا گیا تھا۔ دہلی کے اکثر شعراء اسے جل بھن گئے۔ اس مرتبہ بھی طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالی گئیں کہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے لیکن وہ دبے والا لب تھا۔ شاگردوں کا ہجوم اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے گیا اور وہ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہ مشاعرہ نظر بان ریاست ٹونک میں منعقد ہوا۔ سرکار ٹونک نواب محمد سعادت علی جان نے بھی نہ صرف خود شرکت کی بلکہ ریاست کے عمال صاحبزادگان بھی موجود تھے۔ ریاست ٹونک کے تمام قابل ذکر شعراء اس مشاعرے میں موجود تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرعہ طرح یہ دیا گیا تھا۔

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا
حیدر دہلوی نے اس مصرعہ طرح پر یہ غزل نکالی۔
اثر آنکھوں سے کیا ہو گا تیری جلوہ نمائی کا
کہ میں نے منہ نکا ہے مدتوں شام چدائی کا
متاع دل لٹا کر قدر دل معلوم ہوتی ہے
میں رستہ رہزنوں سے سیکھتا ہوں رہنمائی کا
ذرا گھر سے نکل گھر میں ذریعہ ڈھونڈنے والے
ذریعہ خود نکل آتا ہے منزل تک رسائی کا
قصص کی تیلیاں حیدر رگ تن ہوتی جاتی ہیں
لرز جاتا ہوں جس دن ذکر آتا ہے رہائی کا
اس کا دہنگ لہو، تحت اللفظ مگر کراہی آواز اس پر یہ
پختہ کلام مشاعرہ لوٹن کبوتر بن گیا۔ دوسرے دن ہر زبان پر
اس کے اشعار تھے۔

شوکت اب بھی وہی تھی۔ ہر کام میں ساجی مرتبے کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ فرد کی نہیں خاندانوں کی عزت تھی۔ شاعری کی دنیا بھی اس سے خالی نہیں تھی۔ یہاں بھی ان شعراء کی کرم بازاری تھی جو اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا کوئی نواب تھا کوئی نواب زادہ۔ حیدر دہلوی میں ایسی کوئی ظاہری خوبی نہیں تھی۔ اس کا تعلق تو ایک کر خندار گھرانے سے تھا۔ وہ اب بھی وظیفے پر نہیں اپنی محنت پر پل رہا تھا۔ پھر بھلا جاگیر دارانہ ذہنیت کے حامل استاد شعراء اس کی صلاحیتوں کا لوہا کیوں مانتے۔ شعراء اس کے معترف ہونے کی بجائے اس سے حسد کرنے لگے۔ خود اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے اس نے ضروری سمجھا تھا کہ اپنے گرد شاگردوں کو جمع کرے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو۔ ادارہ حیدری کا قیام بھی اسی ضرورت کا حصہ تھا کہ اگر کوئی مجھے مشاعروں میں نہیں بلواتا۔ تو میں اپنے مشاعرے خود منعقد کروں گا۔ میں صدارت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن مجھے ابتداء میں پڑھوایا جاتا ہے۔ میرے مقام تک کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اب میں اپنے مشاعروں کی خود صدارت کروں گا۔

مشاعرے خوب چل پڑے تھے لیکن اس وقت کے جرائم مخالفین کے ہاتھ میں تھے۔ ان مشاعروں کی روئیداد چھاپنے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ حیدر دہلوی... کا کلام بھی نہیں چھاپا جا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ مشورہ کیا گیا کہ ایک رسالہ ادارہ حیدری کے زیر اہتمام شائع کیا جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ مخالفین پر تنقیدی مضامین بھی شائع کیے جائیں گے اور اپنے لوگوں کے کلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ نازش حیدری صحافت کا تجربہ رکھتے تھے لہذا اس جریڈے کی دیکھ بھال کے لیے ان کا نام تجویز ہوا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اسے کر کے دکھاتا تھا۔ چند دن غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ ہم ماہنامہ الہام جاری کریں گے۔ یہ اعلان اس لیے ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ دہلی ادبی ماہناموں کا گڑھ تھا۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور ادیب ان جرائم سے وابستہ تھے۔ اس ماحول میں کسی نئے ماہنامے کا اعلان دل گردے کا کام تھا۔ اس نے ادارہ حیدری کے تحت ماہنامہ الہام جاری کرنا شروع کر دیا۔

ماہنامہ الہام ابتداء میں خالصتاً ادبی مجلہ تھا اور اس میں نظمیں، غزلیں، افسانے اور علمی و ادبی مضامین کے علاوہ

بھارت میں پیسوں کیلیے بوڑھوں

کو شیر کا نوالہ بنایا جانے لگا

بھارت میں ایک خطرناک اور پریشان کن رجحان دیکھنے میں آیا ہے جہاں غریب افراد پیسوں کے لیے اپنے خاندان کے بزرگوں کو شیروں کا نوالہ بنا رہے ہیں۔ بھارتی ضلع جیل بھیت میں ٹائیگر ریزرو کے اطراف دیہات میں غریب خاندان اپنے بزرگوں کو جان بوجھ کر شیروں کی کھار کی جانب بھیجتے ہیں جو ان درد مندوں کا نوالہ بن جاتے ہیں جس کے بدلے میں متاثرہ خاندان کو چند لاکھ کا معاوضہ مل جاتا ہے جب کہ موت کے اس تکلیف دہ مکمل میں خاندان کے بزرگوں کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ حالیہ چند ماہ میں ایسے کئی واقعات دیکھنے میں آئے جب انتہائی غربت کے شکار خاندانوں نے معاوضے کی رقم کے عوض اپنے بزرگوں کو خود بخود شیروں کی جانب بھیجا اور ان کی بریدہ لاش ملی اور خاندان والوں نے متعلقہ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ سے ہرجانے کی رقم لاکھوں میں وصول کی۔ ٹائیگر ریزرو کے قانون کے مطابق اگر کوئی دیہاتی حادثاتی طور پر شیروں کا شکار بن جاتا ہے تو بھارتی حکومت انہیں معاوضہ دینے کی پابند ہے۔

مافیا، اس کے خلاف ہو گیا۔ اس کی رباعیوں کا مجموعہ بھی اسی غفلت کا نتیجہ رہا۔ اس کے عقیدت مندوں نے اسے ”خیام الہند“ قرار دیا لیکن ادبی جرائد خاموش رہے۔

رباعیات حیدر میں مختلف موضوعات کے تحت رباعیاں شامل تھیں جن میں شراب و شباب، جبری، حقائق، تنقید، انسان، حقائق و معارف، شاعر، برکات وطن اور آثار وطن وغیرہ تھیں۔

مجموعے کا آغاز شراب و شباب کے موضوع پر رباعیوں سے کیا گیا تھا۔

ساتی رہی پر نور دکھائے تو سہی
پردے سے ذرا سامنے آئے تو سہی
کھا حرمت بادہ سے میں آگاہ نہیں
آنکھوں سے پیوں کوئی پلائے تو سہی

☆

مخامرے کی روایت سے بہت کر غیر طرہی غزل بھی اس سے کہی گئی۔

نہ دیکھو نہ فطرت سے مجھے حال پریشاں میں
میت کا مجسم کھلتا ہے میرے داماں میں
لہو کا قطرہ ہو گیا جب جذب پیکاں میں
مٹی لڑکھیں لینے مٹی آخر رگ جاں میں
ہا اٹھ پھوٹ نکلیں سب گل آتش بکف بن کر
پہا دی تھیں کسی نے بجلیاں خاک گھستاں میں
مجھے آوارہ کو میری منزل مقصد نہ پہچانے
کوئی ایسی بھی گردش ہے ابھی چرخ گرداں میں

☆

یہ ہنگامے سحر کس نے وفا کا نغمہ چھیڑا تھا
کہ جتنے گل ہیں سب جاے سے باہر ہیں گھستاں میں

ازل میں اس سراپا حسن کو بے پردہ دیکھا تھا
ابھی تک بجلیاں ہی کووندی ہیں قلب سوزاں میں
شعری امتاف میں رباعی ہمیشہ سے مشکل صنف رہی

یہ کہ اور کسی شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت رہی ہے۔ یہ صنف نئی بھی نہیں لیکن کتنی کے شاعر ہیں جنہوں نے اس صنف کو ہاتھ لگایا۔ حیدر دہلوی نے بھی جب خود کو استاد ثابت کرنا چاہا اور مرعوب کرنے کی خاطر اس نے غزل کے ساتھ ساتھ اس صنف کو بھی اپنایا۔ ”بادۂ عرفان“ کے عنوان

سے اس کی رباعیاں الہام میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور جلد ہی اپنی فنی اور فکری صلاحیتوں کو تسلیم کرانے کے لیے رباعی جیسی مشکل صنف سخن میں پہلا مجموعہ ”رباعیات حیدر“ پیش کیا تا کہ اس کے حریف استاد شعر اس کی قادر الکلامی کا اندازہ کر سکیں۔ وہ ایک اہم غزل گو تھا۔ سینکڑوں غزلیں کہہ چکا تھا لیکن پہلا مجموعہ رباعی کا پیش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھینبا یہ جذبہ موجود تھا کہ وہ اپنی قادر الکلامی سے مخالفین کو واقف کرانا چاہتا ہے۔

رباعیات حیدر شائع ہونے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادبی حلقے پذیرائی کرتے اور بچھلے گناہوں کا ازالہ کرتے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس کی قادر الکلامی سے خائف ہو کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور اسے مشاعروں میں نظر انداز کرنے کی روش تیز کر دی۔ اس دور میں سب سے بڑا میڈیم مشاعرہ ہی تھا اور یہی مشاعروں کی پرنٹیشن کا ذریعہ تھے مگر اس کی توانا شاعری سے ”ادبی

مارا اس کم بخت چلن نے مجھ کو
میں نے تو روایات سخن زدہ کیں
پال کیا اہل وطن نے مجھ کو

☆

مقصد یہ ہے برباد سخن ہو میرا
دل مخزن صدمات وطن ہو میرا
دجال کے بارے میں بھی اب شک ہے مجھے
ممکن ہے کوئی اہل وطن ہو میرا

☆.....☆

اہل ہنر سے مخالفت اپنی جگہ لیکن اس کا نیا کاروبار
ہیٹ بنانے کا کارخانہ خوب چل پڑا اور اسے مالی آسودگی
حاصل ہو گئی۔ انگریزوں کا دور تھا اور وہ انگریزوں کے لیے
ہیٹ بنا رہا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے ہیٹ لکنت اور آس
پاس کے شہروں میں بیچے جاتے تھے۔ آمدنی خوب ہو رہی
تھی۔ کام اتنا چمیل گیا کہ کئی کارنیکر رکھ لیے اور کاروبار کی
دیکھ بھال کے لیے کارخانے ہی میں رہائش اختیار کر لی۔
ان کارنیکروں میں دو کارنیکر بھائی سچ اور طاہر بھی تھے جو
اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دل سے چاہتے تھے کہ
حیدر شادی کر لے۔ بار بار امرار کر چکے تھے لیکن حیدر کو تو
جیسے شادی کے نام سے چڑھ گئی تھی۔ کئی مرتبہ سختی سے منع کر
چکے تھے۔ آخر دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے اسے اپنے
گھر مدعو کیا۔ مقصد یہی تھا کہ شادی کی بات آگے بڑھائی
جائے۔ حیدر نے ان کی دعوت قبول کر لی اور ان کے گھر
چلے گئے۔ وہاں اس کی ملاقات ان دونوں بھائیوں کی
والدہ سے ہوئی۔ ان کی والدہ میں حیدر کو اپنی والدہ کی
جھلک دکھائی دی۔ وہی لب و لہجہ وہی انداز گفتگو۔ حیدران
سے بے حد متاثر ہوا اور اکثر ان کے گھر جانے لگا۔ اس نیک
دل خاتون نے انہیں شادی پر آمادہ کر لیا۔

”میرے بھائی کی بیٹی ہے امت النبی، بہت پیاری
بچی ہے۔ ابھی کم عمر ہے تمہارے رنگ میں آسانی سے ڈھل
جائے گی۔“

انہوں نے حیدر کو لڑکی کے باپ سے بھی ملوایا۔ ان
کا نام شجاع الدین خان تھا۔ دلی میں جوتوں کا کاروبار
کرتے تھے۔ حیدران سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ یہ سن کر تو
ان سے ہمدردی ہو گئی کہ ان کی بارہ بیٹیاں ہیں وہ سوچنے لگا
کہ اگر میں شادی کر لوں تو ان کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ اس
زمانے میں لڑکی دیکھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس نے طاہر کی

بے لطف ہی دنیا میں جیسے جاتا ہے
بے کیف یہاں سانس لیے جاتا ہے
زاہد سے گل رنگ سے انکار تجھے
کیوں خون جوانی کا کیے جاتا ہے

☆

دنیا کی اداؤں پہ نئے جاتے ہیں
سامان تباہی کے کیے جاتے ہیں
پیری سے خمیدہ کہیں ہوتی ہے کمر
ہم بوجھ سے عصیاں کے جھکے جاتے ہیں
(پیری)

☆

آئے ہیں ترے کتب دنیا میں قدم
انساں ہے یہاں اپنے عمل سے موسوم
اک لفظ نو ایجاد ہے تیری ہستی
تو آپ ہی تجویز کر اپنا مفہوم
(انسان)

☆

ہر مکر حق صدق نوا ہو نہ سکا
مکر ہی رہا محو ثنا ہو نہ سکا
اللہ وہ تلفظ ہے زبان دل پر
جو بعض زبانوں سے ادا ہو نہ سکا
(حقائق و معارف)

☆

اس دہر کو جس رخ سے جدھر سے دیکھا
مردم حقائق کی نظر سے دیکھا
جب سامنے آیا کوئی دولت کا غلام
شاعر نے حقارت کی نظر سے دیکھا
(شاعر)

وہ ایک باصلاحیت فنکار تھا لیکن اس کی وہ پندیرائی نہ
ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ زندگی بھر سازشوں اور دشمنیوں کا
شکار رہا۔ وہ خود کو شاعری کے بلند منصب پر فائز دیکھتا تھا
لیکن اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا
جا رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں تو اس ناروا سلوک پر شکایت تو کر سکتا
تھا۔ یہ شکایتیں اس نے رباعی کی زبان میں کیں اور جب
مجموعہ رباعیات شائع ہوا تو ”برکات وطن“ کے عنوان سے
اس مجموعے میں شامل کر دیں۔

محمود کیا طرز سخن نے مجھ کو

والدہ برابری رضامندی ظاہر کر دی۔ امت النبی اس کے گھر
پیادہ کر آئی لیکن حیدر اسے دیکھ کر بے حد آزرده ہوا۔ اس کے
سامنے دہن کے روپ میں نو سالہ بچی تھی۔ اسے ظاہر کی
والدہ پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ یہی کر سکتا تھا کہ اس نے اپنی
نئی نو لڑکی دہن کو اس کے گھر بھیج دیا اور یہ گلہ بھی کیا کہ اتنی کم
سن لڑکی کی شادی آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی۔
اس نے اس لڑکی کو طلاق نہیں دی لیکن گھر میں بھی
نہیں رکھ سکتا تھا۔
وہ پھر اکیلا رہ گیا۔

پھر وہی شب و روز وہی شاعری وہی کاروبار۔ اُمید
پہ دنیا قائم ہے۔

کافر محقق ہی اس وقت بھلے ہیں حیدر
کبھی اللہ نے چاہا تو مسلمان ہوں گے
اسی دوران وہ اپنی بھانجی سرور جہاں کے گھر بیٹھا تھا
کہ ایک لڑکی لپک جھپک گھر میں داخل ہوئی کمرالے قدموں
بھاگ بھی گئی۔
”کون تھی یہ لڑکی؟“ حیدر نے پوچھا۔
”اچھی تھی نا۔“ سرور جہاں نے شوخی سے کہا۔
”میں نے تو اس غریب کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو
صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کون تھی۔“

”تھی آپ کی ایک عاشق زار، آپ کا نام سن کر آپ
بھرتی ہے۔ اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے اور آپ کی
باتیں کرتی ہے۔ آپ کے سینکڑوں شعر اسے یاد ہو گئے
ہیں۔“

”کمال ہے بھئی، ہماری اتنی قدردان اور ہمیں معلوم
تک نہیں۔“ حیدر نے ازراہ مذاق کہا۔
”اب تو معلوم ہو گیا۔ اپنے مریض کا کچھ تو علاج
کیجیے۔“

”افسوس کہ ہم شاعر ہیں ڈاکٹر نہیں۔“
”اس کا علاج شاعر ہی کے پاس ہے۔“
بات مذاق سے شروع ہوئی تھی مذاق پر ختم ہو گئی۔
حیدر اسے مذاق سمجھ رہا تھا لیکن یہ مذاق تجلید کی اختیار
کر گیا۔ تمام باتیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ ایک مرتبہ پھر
اس پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اس لڑکی یعنی ظفر جہاں سے
شادی کر لے۔

”میری شادی امت النبی سے ہو چکی ہے۔“
”آپ خود ہی کہتے ہیں وہ نو سال کی بچی تھی۔ آپ

نے اسے اس کے گھر بھیج دیا۔“

”تو کیا غلط کیا۔“

”جب وہ چلی ہی گئی تو کیا رکاوٹ رہ گئی۔“

”میں نے اسے طلاق نہیں دی ہے اور نہ دینا چاہتا
ہوں۔“

”اس کے ہوتے ہوئے بھی شادی ہو سکتی ہے۔ ظفر
جہاں آپ کو پسند کرتی ہے وہ آپ کا ہر طرح خیال رکھے
گی۔“

بہت بحث مباحثہ ہوا اور آخر یہ طے ہوا کہ کسی کے علم
میں لائے بغیر یہ شادی کر لی جائے۔ جب بات کھلے گی اس
وقت دیکھا جائے گا۔

سرور جہاں نے حیدر دہلوی کی والدہ اصرہری بیگم سے
بات کی تو انہوں نے فوراً قبول کر لیا کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی پسند
کو جانتی تھیں۔

اس شادی کو خفیہ رکھا گیا۔ حیدر نے نئی بیوی ظفر
جہاں کو کارخانے کے ایک حصے میں رکھا جہاں وہ رہائش
پذیر تھے۔ یہ شادی اس وقت تک خفیہ رہی جب تک اس کا
پہلا بیٹا پیدا نہیں ہو گیا۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر کسی نہ کسی طرح
امت النبی کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں تو رون پڑنا شروع ہو گیا۔
امت النبی کی والدہ تو سخت چراغ باہوئیں اور قاتوونی
چارہ جوتی کرنے کی دھمکیاں دینے لگیں لیکن اس کے سر
نہایت سمجھدار فحش تھے۔ انہوں نے کوئی قدم اٹھانے سے
پیشتر حیدر کو بلوایا بیچا اور ساری بات سن کر اسے تسلی دی۔
”آپ کی دوسری بیوی ہماری بیٹی کی طرح ہے۔
آپ اسے بھی یہاں لے آئیں۔ دونوں ہمیں ساتھ مل کر
رہیں گی۔“

حیدر اپنی بیگم ظفر جہاں کو بھی وہیں لے آیا۔
اس طرح ہنسی خوشی رہتے ہوئے دو سال ہوئے تھے
کہ تحریک پاکستان نے زور پکڑا اور ہندو مسلم فسادات
شروع ہو گئے۔ سائل دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بنجود دہلوی
مشاعروں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ایسے میں حیدر دہلوی
ہی دہلی سے مانے ہوئے استاد شاعر کے طور پر مشہور تھے۔
اس کی غزلیں ہر طرف دھوم مچا رہی تھیں۔ ریڈیو کے ادبی
پرگراموں میں اسے مدعو کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف اس کے نام
کاؤٹ کائج رہا تھا۔ ہندو شعر آکاس کی یہ شہرت قطعی پسند نہیں
تھی۔ وہ مذہبی تعصب کی سمیٹ چڑھ گیا۔ ان تمام تعصبات
اور افتخروں کو اس نے اپنی غزلوں کا حصہ بنالیا۔

1949ء میں وہ اپنے عزیز واقارب کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں غازی آباد کے راستے ٹکٹہ روانہ ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز سے کراچی جانے کے لیے اسے دوبارہ دلی جانا پڑے گا لیکن اب دوبارہ دلی میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیا کرتا ہندوستان میں کہیں بھی رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے ڈھا کا جانے کا فیصلہ کر لیا۔
ڈھا کا پہنچ کر اس نے حسب حال یہ رباعی کہی جو خاصی مشہور ہوئی۔

جو کچھ تھا میر وہ گنوا کے آئے
ارباب سیاست پہ لٹا کے آئے
اک قلعہ اعزاز و طرب تھی دلی
اس قلعے کو ہم توڑ کے ڈھا کے آئے
یہ بالکل وہی ماجرا تھا جس نے میر تقی میر کی زبان سے کہلوا دیا تھا۔

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
ڈھا کا پہنچنے ہی سب سے پہلا مرحلہ رہائش کا درپیش تھا۔ ڈھا کا میں اس کے بہت سے چاہنے والے موجود تھے۔ ان میں منظور اشعر بھی تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ انہیں ڈھونڈنے لگا۔ مختلف چائے خانوں میں تلاش کرتا رہا۔ جو شاعر صورت نظر آتی اس سے پوچھتا آیا آخر اس نے منظور اشعر کو تلاش کر لیا۔ استاد کی پیمائش کر وہ دیکھی تو ضرور ہوا لیکن حالات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ کہنے پر بھی مجبور ہو گیا۔

”حیدر صاحب، اگر آپ دلی ہی میں رہے تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ ڈھا کا ہے۔ یہاں آپ کو وہ ادبی ماحول نہیں مل سکے گا۔“
یہ سنتے ہی حیدر جلال میں آگیا۔

”میں خبر ہے وہاں میری جان کو کتنا بڑا خطرہ ہو گیا تھا۔ اپنے بگائے سب میرے دشمن بنے ہوئے تھے۔ میں کبھی نہ آتا لیکن جب مجھ پر حملہ ہوا تو مجھے اپنی عزت و آبرو خطرے میں نظر آئی۔“
”حملہ کیا حملہ؟“

”میں حسب معمول صبح کی سیر کے لیے ایڈورڈ پارک گیا ہوا تھا کہ چند غنڈوں نے مجھ پر ہاکیوں سے حملہ کر دیا۔“

بہت ہی تنگ ہے حیدر نغائے دلی سے
خدا پناہ میں رکھے بس اب یہاں سے مجھے

☆
اس برے وقت میں مجھے حیدر
حق نے کس جرم میں کمال کیا

☆
غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشین ہے آج

☆
کیا سوچ کر ہیں درے آزار ہم وطن
حیدر سے ان کو ضد ہے کہ علم و ادب سے ضد

☆
حیدر برا ہے کھلمہ علم و فن کا حشر
زندہ مثال سامنے مجھ ناتواں کی ہے

وہ ایک نامور استاد شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا مگر وہ ہندو شعراء کی آنکھ میں ٹھکتا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے مشاعروں میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔

پاکستان کا قیام دلی کے مسلمانوں کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ بے دریغ قتل عام ہونے لگا۔ محلے کے محلے اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بڑے بیٹا نے ہجرت ہونے لگی۔ جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جو رہ گئے تھے تیغ کر دیئے گئے۔ حیدر دہلوی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں تھا لہذا اسے ٹھکانے لگانے کے لیے خفیہ سازشیں ہونے لگیں۔ ان سازشوں کا علم جب اس کے دوستوں کو ہوا تو سخت فکر مند ہوئے اور اسے مشورہ دینے لگے کہ وہ پاکستان چلا جائے۔ اس کے کئی عزیز شاگرد اور رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے لیکن وہ کسی قیمت پر دلی چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے کئی دوستوں کو اپنی نگرانی میں بہ حفاظت لال قلعہ پہنچایا جہاں سے وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر گئے لیکن وہ خود جما بیٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حالات سدھر جائیں گے لیکن دلی کی دین اس پر تنگ کر دی گئی۔ خبریں عام تھیں کہ یا تو اسے قتل کر دیا جائے گا یا پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب عزت و آبرو اہلے میں تھی۔ اس نے بادل خواستہ دلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے پر عملدرآمد اتنا آسان نہیں تھا۔ حریفوں کا ٹکرائنا آسان نہیں تھا۔ دشمن اس کی تلاش میں تھے۔

میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کئی مہینے بستر پر پڑا رہا۔ کیا اس کے بعد بھی دلی نہ چھوڑتا۔“

”یہ غنڈے کون تھے۔“

”جتنے منہ اتنی باتیں مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ میری ٹانگ ٹوٹی تھی۔ ابھی زندگی کی ڈور نہیں ٹوٹی تھی اس لیے یہاں چلا آیا۔“

”اتنی بڑی خبر تھی لیکن کسی ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچی۔“

”میرا کلام تک دنیا سے چھپایا جاتا ہے یہ خبر کیسے پہنچی۔“

منظور اشعر کی کوشش سے اسے مہاجن پور لائن میں کرائے پر مکان مل گیا اور وہ ہوٹل سے اس مکان میں دونوں بیویوں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔

دوسرے دن شہر میں گھومنے کے لیے نکلا تو منظور اشعر کا کہا ٹھیک معلوم ہوا۔ کہاں دلی کہاں ڈھاکا۔ عجیب عجیب صورتیں نظر آئیں۔ ایسی اردو سننے کو ملی کہ کوفت کے سوا کچھ نہ ملا۔ اسے پھر میر تقی میر یاد آ گئے جو دلی سے لکھنؤ گئے تھے اس پر بھی بات کرنے سے گریز کرتے تھے کہ صاحبو تمہارا کچھ نہیں جانے گا میری زبان بگڑے گی۔ وہ تو لکھنؤ گئے تھے حیدر تو ڈھاکا آ گیا تھا۔

اس نے اپنی عادت کے مطابق یہ بھی سوچا ہو گا کہ کچھ دن رہ لوں سب کی اردو ٹھیک کر دوں گا۔

شاعری کی سلطنت فتح کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ روزگار کا کوئی ذریعہ پیدا کیا جائے۔ نوکری زندگی بھر نہیں کی تھی اب کیا کرتا۔ اس کی بیگم ظفر جہاں نے کلکتہ اسٹیشن پر جامہ تلاشی لینے والوں کی نظر بچا کر کچھ رقم اسے برقعے کی ٹوپی میں رکھ لی تھی یہ رقم انہوں نے حیدر کے آٹھے رکھ دی۔ اسی رقم سے اس نے کپڑے اور جوتوں کی بہت بڑی دکان بنائی دکان پر ایک ملازم بھی رکھ لیا۔ دکان کے اوپر ہی رہائش کا بندوبست کر لیا۔

کاروبار جم جانے کے بعد اس نے مشاعروں کا رخ کیا۔ چند مشاعروں میں شرکت کے بعد اسے اعزازہ ہو گیا کہ یہاں کی فضا کچھ اور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں بھی وہ کوئی حافظ کا ہوٹل تلاش کر لے گا۔ ایک مرتبہ پھر دلی والا ماحول بن جانے کا لیکن دریا میں اترنے کے بعد معلوم ہوا دریا کتنا گہرا ہے۔ ڈھاکا کے ادبی حلقوں کی حکمرانی عندلیب شادانی کے ہاتھ میں تھی۔ عموماً انہی کے ہاں

مشاعرے منعقد ہوتے یا پھر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیتے۔ یہ فریضہ اس لیے بھی وہ انجام دیتے تھے کہ ہر شاعر کو بلانے سے پہلے پچھلے شاعر کی زمین میں فی البدیہہ شعر پڑھ کر بلاتے تھے گویا منظوم نظامت ہوتی تھی جس سے مشاعرے کا رنگ دوپالا ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہیں مہارت حاصل تھی اور داد کے حق دار بننے تھے۔ تمام شاعر ان سے ڈرتے رہتے تھے کہ نظامت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اگر ناراض ہو گئے تو غلط مقام پر پڑھوا دیں گے۔ ان سے بنا کر رکھی جائے۔ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے لہذا طلبہ کی طاقت بھی ان کے ساتھ تھی۔ رام پور کے رہنے والے تھے پٹانوں کی اکثریتی ان میں تھی۔ غصہ ایسا کہ ٹانگ پر کبھی نہ بیٹھنے دیں۔ استاد کی کاظم بھی تھا۔ حیدر دہلوی کی آمد سے ایک نیام میں دو گواروں والا معاملہ ہو گیا۔ نہ یہ دہنے والے نہ وہ جھکنے والے۔ چھوٹی موٹی جہزیں شروع ہو گئیں۔

یوم اقبال کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ حیدر دہلوی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ حسب معمول عندلیب شادانی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عندلیب شادانی نے اسے غلط مقام پر بلایا لیکن حیدر نے دل پر جبر کیا اور غزل پڑھی۔

دل مست، فضا مست، جہاں مست، نظر مست
سب لطف سے ساتی کے یکے بعد دگر مست
اللہ رے جوانی کا دل آویز زمانہ
ہر چند کہ تاریک ہے یہ رات مگر مست
رفار تری مے کا برستا ہوا ہا دل
جس راہ سے تو گزرے وہی راہ گزر مست
مشاعرے میں حیدر دہلوی کو خوب داد ملی۔ جب غزل پڑھ کر وہ آج سے اتر گیا تو عندلیب شادانی نے اس کی زمین میں یہ شعر پڑھا

کیا مست غزل حضرت حیدر نے سنائی
دس بیس ادھر مست ہیں دس میں ادھر مست
اس شعر میں اگرچہ حیدر دہلوی کے خلاف کوئی بات نہیں تھی لیکن اس جیسے نازک طبع کے لیے بھی بہت تھا کہ اس کے سنجیدہ کلام کو بچہ وڈی میں ڈھال کر مزاحیہ رنگ دیا جائے۔ اس نے اس تضحیک کو محسوس کیا اور عندلیب شادانی کی طرف سے اس کے دل میں ایک گرہ کا اضافہ ہو گیا۔

انہی دنوں ڈھاکا ریڈیو کے ایک مشاعرے میں

”اے شادانی! لے پہ ایسی ہی چوٹ کی توحید دہلوی ضبط
کا اور اس کا جواب ایک رہائی میں دیا۔“

ہر چند کہ ہجرت زدہ انسان ہوں میں
مقبول سیاست ہوں پریشاں ہوں میں
اے اپن ادب ننگ نگاہی سے نہ دیکھ
اس مہم کی تاریخ کا عنوان ہوں میں

اساتذہ دہلی کی صف میں نمایاں شخصیت نواب سائل
دہلی نہایت وسیع دار بزرگ تھے۔ چلنے سے معذور ہونے
لے ہاوجود دہلی میں حافظ ہوئے پر رکشا میں بیٹھ کر تشریف
لاتے تھے اور حیدر دہلوی سے گھنٹوں مصروف گفتگو رہتے
تھے۔ ایک روز حسب معمول تشریف لائے۔ حیدر دہلوی
اتفاق سے تشریف نہ رکھتے تھے۔ نازش حیدری اور ایک
دوسرے شاگرد نے انہیں سہارا دے کر رکشا سے اتارا اور
ٹھایا۔ سائل دہلوی دونوں سے مخاطب ہو کر بولے۔
”مہماں! تم جانتے ہو تمہارے استاد کیا ہیں؟“

دونوں نے نواب صاحب کے اس سوال کی
وضاحت چاہی۔ سائل دہلوی نے اپنا ہاتھ ناک پر لے جا کر
فرمایا تمہارے استاد یہ ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ میرے اور بخود
کے بعد دلی مر جائے گی مگر حیدر دلی کی ناک ہیں ہمیں
اطمینان ہے کہ دلی نہیں مر سکتی۔
یہ تھا وہ حیدر دہلوی جسے سائل دہلوی دلی کی ناک کہہ
رہے تھے۔ وہی حیدر دہلوی تھا جو ڈھاکا میں بے نوا بنا ہوا تھا
اور زبان حال سے کہہ رہا تھا

غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشین ہے آج

اسے اپنی قدر و منزلت کا شدت سے احساس تھا مگر
دلی کی طرح یہاں بھی اس کی شعری صلاحیتیں اس کی دشمن
بن گئیں۔ دلی میں بھی حریفوں کا سامنا تھا یہاں بھی عندلیب
شادانی سے ٹھن گئی۔ شادانی سے مخالفت کا مطلب پورے
ڈھاکا کی مخالفت تھا۔ ڈھاکا کی ادبی فضا عندلیب شادانی
کے اثر میں تھی اور عندلیب شادانی سے اس کی بن نہیں رہی
تھی۔ اس کی فطرت میں ایک فنکارانہ انامی جس کا مظاہرہ
الغز ہو جایا کرتا تھا۔ لوگ اس اناکا کو اس کا غرور سمجھتے تھے
حالانکہ اس کی طبیعت میں غرور نہیں تھا ہاں جب اسے اپنی
نقد دہلی کا احساس ہوتا تھا تو پھر اس کا بھڑک جانا لازمی تھا
اور چونکہ مشکل سے مشکل وقت میں وہ جھکتا نہیں جانتا تھا
اس لیے مغرور سمجھا جاتا تھا۔ عندلیب شادانی اس کے اس

آپ نے پیرس اگر دیکھا نہیں تو اس
شہر کی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی۔ آپ
کو واضح طور پر دکھائی دے گا کہ پیرس میں
یوں تو بہت اونچی اونچی عمارتیں ہیں لیکن
وسطی پیرس میں ایسی اونچی اونچی عمارتیں
نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے
کہ پیرس کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے
ایسی پلاننگ کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ
ایک خطرناک غلطی ہے۔ تیرہویں صدی
میں (جہاں اب پیرس آباد ہے) جہنم اور
چونے کے بہت بڑے بڑے ذخائر تھے
اور کان کنی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے
لیے لاقعداؤ سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ جو
بہت دور تک پہنچتی چلی گئی تھیں۔ وہاں ایک
طرف تو سرنگوں سے کام لیا جا رہا تھا۔ اور
دوسری طرف پیرس شہر کی بنیادیں رکھی
جا رہی تھی۔ عمارتیں بنائی جا رہی تھی۔ لیکن
کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی
کہ ان سرنگوں کے جال کہاں تک پہنچے
ہوئے ہیں۔ لہذا ان سرنگوں کے اوپر ہی
عمارتیں بنی شروع ہو گئیں۔ پھر وہی ہوا جو
ہوتا تھا۔ جب شاخ نازک پر آشیانہ بنایا
جائے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ
گرنے لگیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر
کنگ لوکس کو تشویش ہوئی۔ اس نے
ماہرین کی ایک ٹیم مقرر کی کہ دیکھو یہ کیا
معاملہ ہے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ
بادشاہ سلامت پورا پیرس ہی خطرے میں
ہے۔ اب اس عظیم الشان غلطی کی اصلاح
نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ طے پایا کہ
سینٹرل پیرس یعنی وسطی پیرس میں اونچی
عمارتیں نہ بنائیں جائیں۔

نرسلا: ندیم مرزا، حیدر آباد

فطرت کو نہ سمجھ سکے یا انہیں یہ احساس ہوا کہ حیدر ان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے لہذا وہ انہیں نچا دکھانے پر تل گئے۔ عندیہ شادانی بہت پہلے سے ڈھا کا میں تھے۔ ان کا ایک خلقہ اثر تھا جب کہ حیدر کے قدم ابھی یہاں نہیں جھے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات سازگار ہو جائیں گے لیکن فضا ان کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ یہاں کے مشاعرے معرکہ آرائیاں بننے لگے۔

اگر اہل فن کی نہیں قدر حیدر تو پھر کیا رہے گا کوئی فن سلامت وہ ان معرکہ آرائیوں سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ ان حالات سے لڑتا رہا۔ مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ اپنے اس عزم پر قائم رہا۔

یہ ہم صغیر کیا مری وسعت کو پاسکیں سب سے زیادہ طائرِ رفعت پسند ہوں اس ڈھا کا میں اس نے لیاقت علی خان کی شہادت کی خبر سنی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اب پاکستان گیا۔“ اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے بچوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ دونوں بیویوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر چھوٹی بیگم نے ہمت کی۔ ”سرتاج خیریت تو ہے۔ باہر کسی سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ آپ اس سے پہلے اس طرح تو بھی گھر میں داخل نہیں ہوئے۔ وقار آپ کو دیکھ کر آپ کی طرف لپکا اور آپ نے اسے جھڑک دیا۔ گھٹ کو بھی آپ نے منہ نہیں لگایا۔ کیا بات کیا ہے۔“

”جانتی ہو آج کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“

”آج وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیاقت علی خان کو بھرے جلسے میں گولی مار دی گئی اور یہ کام ہندوستان کی سرزمین پر نہیں پاکستان میں ہوا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ محسن کشی انہوں کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہے۔ کتنی قربانیاں دے کر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ سازشیں یہاں بھی سرگرم ہو گئی ہیں۔ اب اس ملک کا کیا ہوگا۔“

دونوں بیویاں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے جذبے کو دیکھ رہی تھیں۔ آخر بڑی بیگم نے اسے تسلی دی۔ ”واقعی یہ تو بہت برا ہو گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ملک کو کچھ نہیں ہوگا جس اللہ نے یہ ملک دیا ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا۔“

اس حادثہ جاں کاہ نے اسے کئی دن بے حال رکھا۔ وہ اب تک ڈھا کا میں جیسے تیسے دن گزار رہا تھا لیکن اب اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے یہاں سے رخصت ہونے کی ٹھان لی۔ بڑی وجہ عندیہ شادانی سے کھٹ پٹ تھی۔ لاہور میں اس کی بھانجی اور بعض سرسالی رشتہ دار ہائش پذیر تھے۔ بعض شاکر دہمی تھے۔ لاہور کے ادبی ماحول سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ لاہور ادبی جراند اور اخبارات کا گڑھ تھا۔ نامور ادیب و شاعر یہاں موجود تھے چائے خانے آباد رہا کرتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی شہرت ڈھا کا تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب باتیں تھیں جس نے اس کی توجہ لاہور کی طرف مبذول کر دی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کی اور ڈھا کا چھوڑ کر لاہور آ گیا۔

لاہور آیا تو اپنی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کے گھر ٹھہرا۔ یہ دولتانہ کی وزارت کا دور تھا۔ احمد بخاری ان دنوں مسلم لیگ کے صدر تھے۔

جب وہ چند روز کی مہمان داری کا لطف اٹھا چکا تو احمد بخاری نے دولتانہ کی خوشنودی کے لیے اپنی بیگم سے کہا وہ اپنے ماموں سے درخواست کریں کہ وہ دولتانہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ دیں۔ حیدر نے یہ فرمائش قبول کر لی۔

جب آٹھ دن گزر گئے تو احمد بخاری نے اس سے قصیدے کے بارے میں پوچھا۔ حیدر نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

”مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ آپ میرے داماد ہیں آپ جو حکم کریں میں ماننے کو تیار ہوں لیکن قصیدہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف ہے۔“

احمد بخاری یہ صاف جواب سن کر مایوس تو ضرور ہوئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے اپنی بیگم سے ایک مرتبہ پھر کہا۔

”تم حیدر صاحب پر پھر زور دے کر دیکھو۔ انہوں نے اگر قصیدہ لکھ دیا تو میری بڑی بات بن جائے گی۔ ممکن ہے حیدر صاحب کو بھی کوئی گرانقدر انعام مل جائے۔ مجھے ہمارے سر اگر شاعر ہیں تو ہمیں کوئی فائدہ بھی پہنچنا چاہیے۔“

اس کی بھانجی نے من و عن میں یہی باتیں حیدر کے کان میں ڈالیں اور اسے قصیدہ لکھنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ حیدر پیش میں آگیا اور وہ باتیں کہہ کر ارجوہ احمد بخاری سے نہیں کہہ سکا تھا۔

مجھے اگر دولت کماتا ہوتی تو حیدر آباد اور ٹوئیک کی رہائش کم نہیں تھیں۔ ان ریاستوں کی طرف سے کئی بار تلاش ہوئی کہ وہ ان کے پاس آجائیں مگر میرے نزدیک شاعری ایک شریف فن ہے۔ میرے اشعار میری اولاد کی طرح ہیں میں انہیں فروخت کر کے پردہ فروشی کا مرتکب نہیں ہوں۔ آئندہ مجھ سے تقاضا مت کرنا۔

اس کے بعد سرور جہاں کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے تقاضا کرتی۔ حیدر دہلوی ایسا غیور تھا کہ سخت تنگدستی کے عالم میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ اس وقت بھی وہ ضرورت مند تھا۔ ڈھاکا میں کاروبار ختم کر کے آیا تھا۔ لاہور میں سرچھانے کی جگہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ قصیدہ لکھ کر دولت سے کسی کاروبار کی خواہش کر سکتا تھا لیکن اس کی خودداری نے یہ موقع گنوا دیا۔

اس کا چہیتا شاگرد شہاب دہلوی بہادر پور میں تھا۔ کئی سرکاری عہدوں پر رہ چکا تھا۔ نہایت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف حیدر کا شاگرد تھا بلکہ احسن پر اس کے احسانات بھی تھے۔ جب وہ دہلی میں تھا حیدر دہلوی نے کئی شاگردوں کی ناراضگی مول لے کر اسے اپنے رسالے الہام کا ایڈیٹر بنا دیا تھا جب کہ وہ اس وقت محض اٹھارہ سالہ طالب علم تھا۔ شہاب دہلوی ان احسانات کو بھولا نہیں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کے استاد لاہور میں ہیں اور کسپہری میں ہیں تو وہ خود لاہور آیا اور حیدر دہلوی کو اپنے ساتھ بہادر پور لے گیا۔

شہاب دہلوی کا خاندان علمی و ادبی روایات کا امین تھا۔ ان کے والد بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے دادا بھی ادیب و صحافی تھے۔ شہاب دہلوی کے نصابی بزرگ بہادر پور میں تقریباً ایک سو سال سے مقیم تھے۔ یہی کشش تھی جو شہاب کو 1947ء میں بہادر پور لے آئی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ماہنامہ الہام کا دوبارہ اجراء کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ بہادر پور میں بلدیاتی انتخاب ہوئے تو ایک نشست پر مسلم لیگ گروپ کی طرف سے شہاب دہلوی کو الیکشن میں کھڑا کیا گیا اور شہاب دہلوی بلدیہ بہادر پور کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس رخ کے بعد شہاب دہلوی کو احساس ہوا کہ وہ سیاست کے مرد میدان نہیں۔ اس کے بعد وہ پوری طرح صحافت کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ ادب و صحافت میں سرگرم ہو گئے مختلف جرائد و اخبارات کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ پریس کلب لے ہائی اراکین میں شامل تھے۔ انہیں حکومت کی طرف

اسپنر کو رنگ برنگے کاغذ پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر رنگ کے کاغذ تھے۔ جن کے اس نے رائٹنگ پیڈز بنا رکھے تھے۔ اور وہ اپنی یادداشتیں رنگین کاغذوں پر تحریر کیا کرتا۔ ایک بار وہ ایک ایسا گوند بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے چیزوں کو بہت مضبوطی کے ساتھ جوڑا جاسکے۔ اس کی میز پر نہ جانے کیسی کیسی اشیاء پھیلی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ گوند بنانے کے مرحلے میں تھا۔ اس کی انگلیاں گوند سے لٹھڑی ہوئی تھیں۔ اس کیفیت میں اس کی انگلیاں قریب رکھے ہوئے رنگین کاغذوں سے مس ہو گئیں۔ اور ان خوبصورت رنگین کاغذات پر گوند لگ گئے۔ اسے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا۔ اور غصہ بھی آیا۔ کیونکہ وہ ان کاغذات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جب ان کاغذات کی طرف دھیان دیا تو گوند لگے ہوئے کاغذات آسانی سے الگ بھی ہو گئے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ان رنگین کاغذات کی پرچیاں بنائیں اور ان کے کناروں پر وہی گوند لگا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپکا تا چلا گیا۔ اور اس طرح جو ایجاد سامنے آئی وہ آپ کے سامنے ہے۔ جی ہاں اسے پوسٹ اٹ نوٹ کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشنری کی دکان پر مل جائے گی۔ رنگین کاغذات کی بے شمار پرچیاں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی۔

کسی کو اپنا فون نمبر یا کچھ اور لکھ کر دینا ہو تو ایک ایک پرچی الگ کرتے جائیں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ بظاہر معمولی سی ایجاد لیکن کتنی اہم ہے۔

مرسلہ: زاہد خان، دہنہ

سے تمغہ خدمت بھی ملا تھا۔ انہوں نے الہام کے علاوہ ایک ادبی مجلہ اتریج بھی شروع کیا۔

شہاب دہلوی نے اپنے استاد کی نہایت شاندار مہمان داری کی۔ ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے میں بہاولپور اور اردگرد کے شعراء اس عظیم شاعر کو سننے کے لیے آئے۔

حیدر نے ایک ساتھ کئی غزلیں پیش کیں۔

اگر ذرا بھی شب بھر لطف خواب اٹھا
ترپ کے بستر مشرق سے آفتاب اٹھا
ذرا سی فرصت ہستی پہ سرکشی اتنی
خودی کے نشے میں ڈوبا ہوا حباب اٹھا
بہ جام و بادہ یہ صحن چمن یہ اہم بہار
تختہ جل کے بیٹھ مغنی ذرا رباب اٹھا
امید دید خیال حیات، خوف مہمات
یہ سب حجاب ہیں حیدر یہ سب حجاب اٹھا

☆

نمو کے جوش میں ذوقِ فنا حجاب بنا
شریک بحر جو قطرہ ہوا حباب بنا
تو آپ اپنے ہی جلوؤں میں رہ گیا مگر کر
ترا ہی عکس ترے حسن کا جواب بنا
پھنڑ کے تجھ سے ترا سایہ جہاں افروز
سحر کو مہر بنا شب کو ماہتاب بنا
نہ مٹ سکے گا ترا نقشِ لوحِ فطرت سے
نہ بن سکے گا نہ اب تک ترا جواب بنا

☆

اپنے گھر درش پہ احباب کے مشکل سے چلا
میں جنازے کی طرح کوچہ قاتل سے چلا
کبھی رویا کبھی ہر نقشِ قدم پر تڑپا
میں تری راہ میں آنکھوں سے کبھی دل سے چلا

☆

تیرے جلوؤں کو اس انداز سے مستور کیا
ہر فرشتے نے طوافِ دل رنجور کیا
اپہن سے کا تو آغاز نہ انجام کوئی
ختم اک لفظ پہ افسانہ منصور کیا

شاعروں کی طرف سے اصرار کے بعد حیدر نے چند رباعیاں بھی سنائیں۔ یہ وہ رباعیاں تھیں جو اس کے مجموعہ رباعیات میں شامل نہیں تھیں۔

چمکارا غم داغ سے ہو گا کیونکر
منہ دیکھیں گے اب مرگ و لحد کا کیونکر
جبری میں سکت بھی نہیں دنداں بھی نہیں
کائیں گے ہم اب عصر کا رشتہ کیونکر

☆

اب دن ہیں قیث کے نہ عہد طفلی
ہر وقت ہے درپیش عذاب جبری
کافور ہوں سبزہ خط کی صورت
اللہ رے جوانی تری طوطا چشمی

☆

کیوں اتنے پس ترک وطن شاق ہیں ہم
اس مملکت پاک کے خلاف ہیں ہم
ماضی کی روایات ہیں زندہ ہم سے
تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں ہم
اس مشاعرے کی صبح ہوئی تو بہاولپور کے شعرا شہاب دہلوی کے مکان پر جمع ہوئے۔ یہاں بھی شاعری کے دور چلے۔ اثنائے گفتگو یہ بھی اصرار ہونے لگا کہ حیدر کو اب مستقل بہاولپور میں رہنا چاہیے۔ بہاولپور میں رہیں تو کریں کیا۔ شہاب دہلوی انہیں لائے تھے۔ تو کچھ سوچ کر ہی لائے تھے۔

بہاولپور میں ان کے نام کچھ زمینیں الاٹ کر دی گئیں جن کی فصلوں سے ہونے والی آمدنی سے ان کا بہت اچھی طرح گزارہ ہو سکتا تھا۔

ڈھاکا، لاہور اور کراچی کے مقابلے میں بہاولپور ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ان کا دل گلتا۔ چند ماہ بعد ہی وہ اکتانے لگا کراچی میں ایسے بہت سے شاعر جمع ہو گئے تھے جنہیں وہ حافظ ہوٹل دہلی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ انہی دنوں جب ایک مشاعرے میں اس کا کراچی آنا ہوا اور چند روز قیام کا موقع ملا تو اسے یہاں کی ادبی فضا نے اپنا اسیر بنالیا۔

اس وقت کراچی میں ادبی محافل عروج پر تھیں۔ بہت سے بزرگ اساتذہ سخن کراچی میں موجود تھے جن میں جوش ملیح آبادی سیاب اکبر آبادی، حیدر دہلوی، اسد شاہ جہاں پوری، سید آل رضا، سید ہاشم رضا، ارم نکستوی، جمیل الدین عالی، ادیب سہارن پوری اور کئی دوسرے نامور استاد شاعر شامل تھے۔

اس کے شاگردوں میں نازش حیدری، انور دہلوی، فتہ دہلوی، فیض دہلوی، بیدل حیدری، عالم حیدری، شیدا

کمرانی، کرارنوری وغیرہ موجود تھے۔

وہ کراچی کے قیام کے دوران اس وقت کے سجان اللہ ہوٹل میں جا کر شاگردوں کے ساتھ بیٹھا تو اسے دہلی کا حافظ ہوٹل یاد آگیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ سامنے دہلی لی جامع مسجد ہے اور کچھ فاصلے پر ایڈورڈ پارک، حیدر کا اہ آہاد ہے۔ ادارہ حیدری اپنا کام کر رہا ہے۔ ”الہام“ کے پرچے دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں۔

وہ کراچی سے بہاولپور کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔

لجأت کو پیری و جوانی کے گزار
برعکس اس آشفہ بیانی کے گزار
کیا سوچتا ہے رنج کے اسباب و علل
ہنس بول کے دن ہستی فانی کے گزار

ہنس بول کے گزارنے سے اس کا مطلب یہی تھا کہ جو دن زندگی کے رہ گئے ہیں وہ بہاولپور میں نہیں کراچی میں گزارے جائیں۔ کراچی میں ایک کشش اس کے لیے یہ بھی تھی کہ اس کی بھانجی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں رہ رہی تھی اور بھی دوسرے رشتہ دار کراچی آگئے تھے۔ کراچی کا عام ماحول بھی اردو سے قریب تھا۔

بہاول پور پہنچنے ہی اس نے مستقل طور پر کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بیویوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی رضا مندی ظاہر کر دی۔ شہاب دہلوی نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ آنکھوں میں قدر و منزلت کے خواب سجائے کراچی آگیا۔

کسی شہر میں گھومنے کے لیے آنا الگ بات ہے اور مستقل رہنا الگ بات ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو رہائش کا تھا۔ اس نے کچھ دن تو بھانجی کے گھر گزارے اور پھر مستقل رہائش کی فکر ہوئی۔ سرچھپانے کی جگہ چاہیے تھی۔ اس سے بھی زیادہ کسی معقول کاروبار کی حاجت تھی۔

حیدر دہلوی کی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کا اچھا خاصا اثر رسوخ تھا۔ وہ کشتراے ٹی نقوی سے ملے تاکہ وہ اس سلسلے میں ان سے مدد لیں۔ ان دنوں کراچی میں اے ٹی نقوی کا روپاری پر مٹوں کے انچارج تھے۔ وہ کئی اہل قلم حضرات کو پرمٹ دے رہے تھے۔ احمد بخاری ان سے ملے اور کہا حضرت آپ نے حیدر دہلوی کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے

ملتان پر عربوں نے پہلی صدی ہجری میں قبضہ کیا اور غزنوی عہد تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ برابر رہا۔ 132ھ (749ء) تک ملتان کا تعلق خاندان بنی امیہ سے رہا مگر اسوی حکمت کی بساط اٹھنے کے بعد اس کا تعلق بنو عباس سے ہوا۔ تیسری صدی ہجری یعنی معصم کے زمانے تک ملتان عباسی حکومت کے تحت رہا۔ بعد میں ملتان کی صورت یہ رہی کہ اگر مرکز میں خلیفہ طاقت ور ہوتا تو دور دراز کے صوبے اس کے ماتحت رہتے۔ اگر خلیفہ کمزور ہوتا تو دور دراز علاقوں کے عامل خود مختار ہو جاتے۔ ایسے زمانوں میں بھی ملتان، سندھ اور منصورہ کے تحت رہا مگر تیسری صدی ہجری کے وسط میں ملتان، سندھ سے علیحدہ ہو کر ایک خود مختار سلطنت بن گیا جس کی وسعت و پچھم میں کران تک اور دکن میں منصورہ تک تھی اس زمانے کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ایک لاکھ بیس گاؤں اس سلطنت کے حدود میں تھے۔

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڈکانہ

کہا خیام الہند حیدر دہلوی کی بات کر رہے ہو۔ یعنی وہ میرے پاس آئے ہی نہیں۔ آپ انہیں لے کر آئیں۔ احمد بخاری نے وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں لے کر آئیں گے۔ حیدر دہلوی کو منانے اور راضی کرنے میں کئی دن لگے۔ وہ بہ مشکل تیار ہوا اور داماد کے ساتھ اے ٹی نقوی سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔

”آپ یہیں ٹھہریں، میں نقوی صاحب کو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔“

احمد بخاری نے انہیں ویننگ روم میں بٹھایا اور خود نقوی صاحب کے کمرے میں اطلاع دینے بلکہ اجازت لینے اندر چلے گئے۔ اجازت لے کر وہ واپس آئے تو حیدر دہلوی غائب تھے۔ ادھر ادھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے۔ وہ ان کے حراج سے واقف تھے یہ سمجھتے میں دیر نہیں لگی کہ حضرت کو انتظار گوارا نہیں ہوا اور گھر چلے گئے۔

احمد بخاری گھر پہنچے تو حسب توقع حیدر صاحب گھر پر ہی تھے۔

”آپ چلے کیوں آئے، نقوی صاحب آپ سے واقف بھی ہیں قدر دان بھی آپ کے لیے بہت کچھ کر سکتے

تھے۔ آپ نے اچھا موقع ضائع کر دیا۔“

حیدر دہلوی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں لحاظ کی وجہ سے مروتا آپ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے آگے دست طلب دراز کروں۔ معاف کرنا میں یہ نہیں کر سکتا۔“

”آپ کو وسوسہ طلب دراز کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سب بات کر لی تھی۔“

”پھر بھی میں سائل تو ہوتا۔ اپنی یہ حیثیت مجھے پسند نہیں۔ آئندہ مجھ سے نہ کہیے گا۔“

بات ختم ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلائے کا عادی نہیں تھا لیکن رزق حلال کمانے میں سب سے آگے تھا۔ اس نے دلی میں بھی کئی کاروبار کیے تھے اور مالی آسودگی حاصل کی۔ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا اور اب شہر بہ شہر گھوم رہا تھا۔ ڈھاکا کے مختصر قیام میں بھی اس نے روزگار کی داغ بیل ڈالی اور اب وہ کراچی میں تھا اور کراچی سے آگے سمندر تھا۔ اب کراچی چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اسے سر چھپانے کی جگہ کا بھی بندوبست کرنا تھا اور پیٹ بھرنے کے لیے کسی ذریعے کی تلاش بھی کرنا تھا۔ اس نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک کارخانہ قائم کیا جس میں فلٹر اور لوہے کی بالٹیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔

برنس روڈ کے قریب سبحان اللہ ہوٹل تھا جسے اس نے اپنا ڈیرہ بنایا اور شاگردوں کو لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جب حافظ ہوٹل دہلی میں بیٹھا کرتا تھا۔ دن رات چائے کے دور چلتے تھے۔ اس نے بھی کسی کوچیب میں ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ مل ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت مالی آسودگی تھی۔ اب وہ عالم نہیں رہا تھا لیکن اب بھی اس نے دہلی کی روایت کو قائم رکھا۔ رات گئے جب اٹھتا تو بل اپنی جیب سے ادا کرتا کسی کو زحمت نہ دینے دیتا۔ کوئی خوش حال شاگرد کو شش بھی کرتا تو اسے روک دیتا بلکہ جھڑک دیتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ چائے کا بل ادا کرنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا بس کارایہ بھی باقی نہ بچتا اور وہ پیدل ہی گھر کی جانب روانہ ہو جاتا۔

کارخانے کے قیام کے بعد اس نے ڈرگ روڈ کالونی (شاہ فیصل کالونی) میں دو کارٹھالائے کرائے۔ اس وقت یہ کالونی کسی جنگل سے کم نہیں تھی اور شہر سے اتنی دور کہ آنا جانا کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ چند بیس چلتی تھیں۔ اسی بس میں سے کسی بس میں بیٹھ کر وہ بلا ناغہ سبحان اللہ ہوٹل پہنچتا جو

اب حیدر کا ڈیرہ بن گیا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ڈرگ روڈ منتقل ہونے کے بعد وہ سبحان اللہ ہوٹل آنا چھوڑ دے گا لیکن غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب دوسرے ہی دن وہ چھڑی تھاے ہاتھ میں چری بیک لیے ہوٹل میں داخل ہوا اور پھر اس کی صبح داری نے تقاضا کیا کہ وہ کوئی ناغہ کیے بغیر یہاں آتا رہے۔

وہ خوش تھا کہ ڈرگ کالونی جنگل ہے مگر رہنے کا ٹھکانا تو مل گیا۔ اس کی دقتوں کا احساس تو اس وقت ہوا جب شدید بارش ہوئی اور برساتی نالے بھر جانے کی وجہ سے اس کا مکان سیلابی پانی کی زد میں آ گیا۔ یہ پانی اتنا اچانک آیا کہ سمجھنے سے پہلے ہی گھر کا سامان پانی میں بہنے لگا۔ مگر والے قیمتی سامان کو بچانے کے لیے بھاگے۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے بیٹے خالد اور بیٹی نگہت پر پڑی جنہیں پانی اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔ مدد کے لیے لوگ بھی آ گئے تھے۔ وہ چچا۔ ”سامان چھوڑ دو صرف میرے بچوں کو بچا لو۔“ لوگوں نے مدد کی اور بچوں کو بچالیا۔

سیلاب گزرنا تو ایک دن اور ایک رات کا فائدہ ہو چکا تھا۔ سارا سامان بہہ گیا تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست بیوی کے ہاتھ کی انگوٹھیاں بچ کر کیا گیا۔ امدادی ٹیموں کی طرف سے کھانا بٹایا جاتا تھا لیکن اس نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ کھانا لینے کسی بچے کو نہ بھیجنا یہ ہمارا حق نہیں۔ کبیل اور کپڑے تک بانٹے گئے لیکن اس نے کوئی امداد قبول نہ کی۔

وہ گھریلو ذمہ داریوں سے مکاحقہ عہدہ برآ ہوتا تھا۔ بچوں کے آرام و آسائش کا مکمل خیال رکھتا تھا۔ بچوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے خود خرید کر لاتا۔ اگر کوئی مشاعرہ نہ ہوتا تو آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاتا۔ روایتی شعراء کی طرح رات رات بھر گھر سے باہر نہ رہتا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس رہتا کہ اس کے بچے گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کی اسی انصاف پسندی کا تقاضا تھا کہ اپنی دونوں بیگمات کو عمر بھر ایک ہی گھر میں رکھا۔

وہ صبح جلدی بیدار ہونے کا عادی تھا۔ صبح اٹھنے ہی اسے چائے کی طلب ہوتی پھر ہلکا ناشتا کرتا۔ چائے کے ساتھ عموماً سادہ روٹی کھانا پسند کرتا، مین کی روٹی پھسن کی چٹنی کے ساتھ نہایت شوق سے کھاتا تھا۔ سکرٹ کی بجائے بیڑی استعمال کرتا تھا۔ لباس میں پاجامہ قمیص اور شیر وانی اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سیاست سے دلچسپی نہیں رکھتا لیکن

جس کا شکار وہ دہلی میں ہو چکا تھا۔ یہ افراتفری کا دور تھا۔ ہجرت کے مصائب ابھی کم نہیں ہوئے تھے۔ لوگوں کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کی بے رخی کو اپنی ناقدری سے تعبیر کیا اور ان نینوں کا تذکرہ اشعار میں ڈھال دیا۔

اک گوشہ نشین راہ گزر کیا جانے
کس سمت ہیں ارباب نظر کیا جانے
شہرت طلبی بے ہنری کی ہے دلیل
تبلیغ ہنر اہل ہنر کیا جانے

☆

یہ بغض بھی یہ ظلم بھی ہنگامی ہے
انجام اس آغاز کا ناکامی ہے
اس بغض سے اس ظلم سے کیا ہوتا ہے
حیدر کا رسول اور خدا حای ہے

☆

نیکی کا کہنے یہ بدل دیتے ہیں
کسی دیتی ہے تو چل دیتے ہیں
استاد کو استاد بنانا تو کچا
یہ باپ بھی ہر سال بدل دیتے ہیں

☆

حیدر ہر اہل ہوش نے غربت کی راہ لی
تو کس لیے کشاکش رنج و دھن میں ہے
قدر ہنر نہ حفظ مراتب نہ سحر خلق
کس کا وطن کہاں کا وطن کیا وطن میں ہے

☆

لاکھ ہر صنف سخن پر ہے تسلط مجھ کو
اور جدت بھی ہے ہر معرہ تر سے مجھ کو
لیکن افسوس ہے حیدر کو تحول کے بغیر
عیب ہوتا ہے یہاں عرض ہنر سے پیدا

اس بے پناہ غربت اور محنت کی باوجود اس نے
غیرت و حمیت کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ چاہتا تو اب بھی اپنے
لیے بہت سی راہیں تلاش کر سکتا تھا۔ کسی بڑے دروازے پر
جا کر اپنے کمال فائن کاؤنٹنر وار اپٹ سکھاتا لیکن وہ ہمیشہ یہی
کہتا رہا۔

حیدر یہ قدم اور انھیں جانب دنیا
دنیا انہی قدموں کی ہے ٹھکرانی ہوئی سی
کراچی میں اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بہاولپور کی
زمینوں کی فصلوں سے حاصل ہونے والی رقم تھی۔ اس زمین

انہا پابندی سے پڑھتا تھا۔ محلے داروں سے تعلقات بہت
اچھے تھے۔ جموٹ سے سخت نفرت تھی۔ بعض اوقات سچ
بولنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتا تھا۔

اسی حق گوئی نے دلی میں بھی اس کے دشمن پیدا
کر دیے تھے۔ کراچی میں بھی بہت سے لوگ اس کے خلاف
”گئے۔ اس کے خلاف لوگوں میں ریڈیو پاکستان کے
ایئر کیئر جنرل زید اے بخاری بھی تھے۔ ریڈیو کے ایک
مشاعرے میں زید اے بخاری نے نہ صرف اسے غلط مقام
پر پڑھوایا بلکہ کسی مصرعے پر اشارے سے طنز بھی کیا۔ حیدر
دہلوی اس طنز پر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے غزل اور حوری
چھوڑی اور زید اے بخاری کی طرف خشکی نظروں سے
دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، جمیل الدین عالی نے
زید اے بخاری کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

”حیدر صاحب استاد شاعر ہیں۔ ان کے ساتھ یہ
سلوک مناسب نہیں۔“

یہ مشاعرہ ریڈیو سے براہ راست نشر ہو رہا تھا لہذا
اسے بند کرنا پڑا۔ اس واقعے کی گونج کئی دن تک سبحان اللہ
ہوٹل میں سنائی دیتی رہی۔

اس کے بعد وہ ریڈیو کے کسی مشاعرے میں مدعو نہیں
ہوا۔

ریڈیو کے پروگرام اس سے چھن گئے تھے۔ بخاری
صاحب کو خوش کرنے کے لیے بہت سے مشاعروں میں بھی
اسے نظر انداز کیا جانے لگا تھا لیکن سبحان اللہ ہوٹل کا ڈیرا
آباد رہا۔ جہاں دن کے دو بجے سے رات گئے تک محفل جی
رہتی۔ شاگرد اور گرد جمع رہتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں، اصلاح
کے دور چلتے، چائے چلتی، رات گئے سب ہوٹل سے اٹھتے۔
انہی جیب سے وہ بل ادا کرتا۔ دوست رخصت ہوتے، وہ
بھی بس میں بیٹھتا اور ڈرگ روڈ اپنے بچوں کے پاس پہنچ
جاتا۔

مثل مشہور ہے مفلسی میں آٹا گیلا۔ ایک روز بس کے
حادثے میں اس کا پیڈ بیک گم ہو گیا جس میں بہاولپور کی
زمینوں کے علاوہ کارخانے کی شراکت کے کاغذات بھی
تھے۔

کارخانہ اور زمینیں بھی چلی گئیں۔
وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ مالی آسودگی
لے منہ موڑا تو دوست اور شاگرد بھی نظریں چرانے لگے۔
اب اسے اپنے وطن میں بھی اسی صورت حال کا سامنا تھا

کے کاغذات بھی گم ہو گئے تھے۔

ایک بار وہ بہاولپور گیا تاکہ فصلوں کی رقم لائے۔ وہاں ٹھہرنا بھی پڑا۔ خوب مشاعرے ہوئے دھوتوں کے سلسلے چلتے رہے۔ دوست دشمن سب شریک ہوئے۔

خوش خوشی واپس ہوئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کراچی نہیں پہنچا تھا کہ گلے میں تکلیف شروع ہوئی۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے گلہ پکڑ لیا۔ اس نے یہی سمجھا ہوا کہ کھانے میں کوئی ایسی چیز آگئی ہوگی جس نے گلے میں تکلیف پیدا کر دی۔ مگر تک پہنچتے پہنچتے تکلیف میں کمی آجائے گی لیکن کراچی پہنچنے کے بعد بھی تکلیف میں کمی نہیں آئی۔ اس نے اسے معمولی تکلیف سمجھا کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ مگر پلوٹو لگے کرتا رہا۔ کبھی تکلیف میں کمی آجانی کبھی پھر بڑھ جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا پھر اس تکلیف نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کی آواز ہی تو اس کا ہتھیار تھی۔ اس کی آواز طراوے دار تھی۔ اس آواز سے وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتا تھا۔ اب وہی آواز خاموش تھی۔ بڑی مشکل سے بول پاتا تھا۔ ایسے تو یہ ہوا کہ جہاں اس کے چاہنے والوں کے لیے یہ صورت حال باعث تشویش تھی وہیں اس کے مشاعرہ باز حریف خوش تھے کہ اس کی آواز دب گئی ہے۔ اب مشاعروں میں ان کی جیت ہوا کرے گی حیدر دہلوی کی نہیں۔ اس نے اس صورت حال کو بھی اپنے شعروں میں ڈھال دیا۔

بیٹھی ہوئی آواز کو میری ناگاہ
سننے ہیں تو کہتے ہیں ماشاء اللہ
اس حادثے پر خوش ہیں بزم خود لوگ
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

☆

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

☆

جب مجمع احباب میں مل بیٹھا ہے
حیدر نہ فردہ نہ نجل بیٹھا ہے
مایوس نہیں ہے وہ گرفتہ آواز
آواز ہی بیٹھی ہے کہ دل بیٹھا ہے

اس نے اپنی تکلیف کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت

چھوڑ دی تھی لیکن شاعری تو نہیں چھوڑی تھی۔

جذبات ہنر پر جو جوانی تھی وہ ہے
مرقوم جو اعجاز بیانی تھی وہ ہے
اتھار کمالات زبانی نہ سہی
پہلے جو طبیعت میں روانی تھی وہ ہے
اس کی دونوں بیگمات کا کہنا یہ تھا کہ وہ جب بہاولپور گئے تھے تو اسے کسی نے کھانے میں سیندر کھلا دیا تھا جس سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ کسی ڈاکٹر نے اسے انڈیشے کا اتھار نہیں کیا۔ ممکن ہے سیندر والی بات سچ ہو بہر حال حیدر نے اس تکلیف کو معمولی سمجھا اور یوں تقریباً سال بھر گزر گیا۔ گلے میں شدید تکلیف کے بعد اس کی بھانجی اسے اپنے گھر لے گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔ وہ اپنے داماد احمد بخاری اور دوسرے گھروالوں کے ساتھ مقررہ وقت پر سول اسپتال پہنچ گیا جہاں اس کا آپریشن تھا اور صبح دس بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جب تک اس کی باری نہیں آگئی بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد کپاڑے وغیرہ آگئے اور اسے آپریشن ٹیبل پر بٹھا دیا گیا۔ آپریشن شروع ہوا۔ آپریشن کے دوران چند منٹ کے لیے ڈاکٹر آپریشن کے دوران کسی اور مریض کی طرف متوجہ ہو۔ حیدر کو چھینک آگئی اور اس کا دم نکل گیا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپریشن کے دوران اسے ہارٹ ایک ہوا تھا۔

10 نومبر 1958ء کو دس بج کر دس منٹ پر سول اسپتال میں وہ خالق حقیقی سے جا ملا۔ وفات کے وقت اس کی عمر صرف 52 سال تھی۔

اس کی ناگہانی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسی روز قلم کے بعد اسے سوسائٹی کے قبرستان میں دفن دیا گیا اگلے روز تمام اخبارات میں اس کی وفات کی خبریں شہر سرخوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔

”خیام الہند حضرت حیدر دہلوی وفات پا گئے۔“
افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

ماخذات

حیدر دہلوی، ڈاکٹر اختر شمار
عنایلیب شادانی، نظیر صدیقی



روایت شکن

زویا اعجاز

ماضی نے گر سنوارا نہیں تو کیا ہوا، اگر عزم و حوصلہ ہو تو خود بھی وقت کو سنوارا جاسکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال سلیمہ بیگم ہے۔ یہ سلیمہ بیگم ہے کون اس بارے میں جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے کہ اس نے ایسا کیا کیا جس کی وجہ سے بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی کو پوری دنیا نے قابل تقلید مان لیا۔ اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ ایسی ہمت اور ایسا حوصلہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی ہر بیٹی کو بخشے۔

برف پوش پہاڑوں کے دامن میں رہ کر بھی اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا

فطرت آپ رواں ہے۔ اس کی روانی زندگی میں تحریک، تسلسل اور بقاء کی علامت ہے لیکن اگر یہی فطرت روایات، جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہو جائے تو کسی جوہر سے کم ثابت نہیں ہوتی۔

انسانی فطرت کو پروان چڑھانے اور اوج تک پہنچانے میں والدین کے علاوہ اساتذہ اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانیت کے لیے میٹھا اور نسل نو کے لیے شخصیت ساز، عمارت گر کی حیثیت رکھنے والے یہ افراد ازل ہی

سے معاشرتی ناقد رہی اور ۱۹۶۱ سال کا شکار رہتے ہیں۔ جبر مسلسل کی بدولت اثر ہے۔ اس کا اصل مقام فراموش کر کے روایت پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر معاشرہ تنزلی کے عبرتناک سفر کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ اقدار کی چمک ماند پڑنے لگتی ہے اور مستفہم کے معمار ملک و قوم کے لیے بوجھ بننے لگتے ہیں۔

لیکن قدرت کے خود کار منصّفانہ نظام کے تحت کچھ روایت شکن ایسے بھی ہوتے ہیں جو تنگ آمد بچک آمد کے مصداق تنہا اس روایت پرستی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جدوجہد ذاتی سطح سے شروع ہو کر عالمی پیمانے پر ایک مثال بن جاتی ہے۔ ان چندہ افراد کی کاوشوں کو سراہنے اور مزید وسائل کی فراہمی کے لیے کچھ دودمند اور با اختیار افراد نے گلوبل نیچرز برائز کا اجراء کر رکھا ہے جس میں فاتح معلم کو 'ایک ملین ڈالرز کی رقم متوازی اقساط کی صورت میں دس سال تک فراہم کی جاتی ہے۔ شعبہ تدریس میں 'نوبل برائز' کی حیثیت رکھنے والے اس انعامی سلسلہ میں ہر معلم کا خواب ہے۔

رواں سال بھی دنیا کے ہر کونے سے چالیس معلمین کے انتخاب کے بعد دس بہترین افراد کو فائز مقابلہ کے لیے نامزد کیا گیا اور یہ دسویں اساتذہ ہمت، لیکن جدوجہد اور روایت شکنی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت کا نام سلیمہ بیگم ہے۔ سلیمہ بیگم کا تعلق گلگت بلتستان کے ایک دور دراز مشرقی گاؤں اوشی حنڈ اس سے ہے۔

اوشی حنڈ اس میں بمشکل گیارہ سو گھرانے آباد ہیں جو بے حد روایت پسند ہیں۔ پہاڑوں کی اس جہتی کے لیے زندگی کبھی بھی سہل نہیں رہی۔ اسے تعلیمی زبیر سے آراستہ ہونے کا بے حد شوق تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی ویسے کہ اس کی برادری میں تعلیم نسوان کی کوئی روایت ہی نہ تھی۔ لڑکیوں کی زندگی بنیادی دینی تعلیم، گھرواری شادی اور پھر بچوں کی پرورش کے دائرے میں مقید تھی۔

گاؤں میں لڑکیوں کا واحد پرائمری اسکول محض دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس نجی اسکول میں صرف ایک معلمہ تھی۔ پرائمری کے بعد ثانوی تعلیم اس نے ہنزہ میں آغا خان اکیڈمی سے حاصل کی۔ اس کے جنون کا سفر مشکل سے مشکل تر ہونے لگا۔ اس کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے گلگت یا کسی اور شہر کے کالج میں داخلہ لے

یا اپنے خواب فراموش کر کے روایات کی پیروی میں سر تسلیم خم کر دے۔ علاقہ میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم..... کا کوئی رواج نہ تھا، کالج میں داخلہ تو چہ معنی دار۔ والد پر بھی معاشی اور سماجی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

سلیمہ کے خلوص نیت اور لگن کی بدولت قدرت بھی اس پر بے حد مہربان تھی۔ اس کے والد پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر اپنی برادری کی روایات کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور اسے گلگت میں انٹر کالج وکین میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے سلیمہ نے بے انتہا کٹھنائیوں کا سامنا کیا۔ اسے کالج پہنچنے کے لیے روزانہ دو بسوں میں دو گھنٹے سفر کرنا پڑتا لیکن تعلیمی جنون نے اس کے نازک وجود میں اتنی سختی پیدا کر دی تھی۔ ہر مشکل در کاوٹ اس کے ارادے مزید ہمیز کرتے۔

ساتھی مضامین میں انٹر کے بعد سلیمہ نے اپنی ایک اور دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے کمر کس لی۔

اسے بخوبی علم تھا کہ برادری کی روایات اور معاشی دباؤ سے نبرد آزما ہونا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ اپنے والد کی محبت اور اساتذہ کی محنت کا قرض چکانے کا وقت آچکا تھا۔ اس نے اپنے ہی اسکول میں لڑکیوں کو نوویں و دسویں جماعت کے ساتھی مضامین پڑھانے کا آغاز کر دیا۔

آٹھ ماہ بعد ان طالبات کا استثنائی نتیجہ اس کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اس کی لگن بارگاہ ایزدی میں قبولیت کا شرف حاصل کر چکی تھی۔ راہیں خود بخود آسان ہونے لگی تھیں۔ اسی دوران محکمہ تعلیم کی جانب سے 'خواتین اساتذہ کے لیے کچھ آسامیوں کا اعلان کیا گیا۔ سلیمہ کے لیے یہ موقع کسی من و سلوئی سے کم نہ تھا۔ اس نے محکمہ جاتی ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد انٹرویو میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

وقت کے دھارے میں تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اوشی حنڈ اس کے لیے 1992 ایک تاریخی سال ثابت ہوا اور سلیمہ اس گاؤں میں سرکاری معلمہ تعینات ہو گئی۔ اس اسکول کے حالات بھی انتہائی دگرگوں تھے۔ تین کمروں پر مشتمل عمارت میں صرف ششم جماعت تک طالبات موجود تھیں۔ ہر کمرے میں دو جماعتیں بٹھائی جاتیں۔ اساتذہ کا یہ عالم تھا کہ سلیمہ سے قبل وہاں دو خواتین تھیں جن کی تعلیمی قابلیت 'مڈل تھی۔ اسکول میں فرنیچر کا تصور ہی ناپید تھا۔ طالبات کو سنگی فرش یا گھاس پر بٹھا کر پڑھایا جاتا۔

سلیمہ ان حالات پر بے حد افسردہ رہتی تھی لیکن اکیلا چلتا

ہما ہمز تا بھی تو کیسے؟

قرآن الحکیم کی 2 آیت

کاتر جمہ اشعار میں

قرآن الحکیم کی سورۃ الف 61 کی آیت
9+8 کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے اس خوب
صورت شعر میں کیا ہے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
قرآن کریم کی سورۃ الانفال 8 کی آیت 53
پارہ 9+10 کا ترجمہ علامہ اقبال نے اس خوب
صورت شعر میں کیا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
محی رحمن۔ یو ایس اے

جاتی۔ سلیہ اس روایت میں تبدیلی کی خواہاں تھی۔ وہ اسکول
میں بطور ہیڈ ٹیچر سائنسی مضامین کی تدریس کے ساتھ اس
تبدیلی کے لیے شب درو زحمت میں جت گئی۔

سلیہ نے اپنی طالبات کی والدہ کے ساتھ ہفت وار اور
ماہانہ خصوصی ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔ ان خواتین کو قائل کرنا
کسی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ علاقہ کے رہائشی سماجی
اور معاشی دباؤ میں یہ طرح کی رہے تھے۔ معاشی پسماندگی
کا یہ عالم تھا کہ اسکول فیس کی مد میں سات آٹھ روپے کا
انتظام بھی یہ حد تک مشکل تھا۔ اس نے وسائل مد نظر رکھتے ہوئے
مسائل کا منطقی حل تلاش کر لیا۔

اس کی تجاویز کے مطابق مقامی خواتین نے سبزیوں کی
کاشت مرغیوں کی خریداری اور سلاخی کڑھائی کا آغاز کیا۔
دستکاری کی اشیاء بڑے شہروں میں بی بی کس ڈیزنہ ہزار روپے
کے نرخ پر فروخت ہونے لگیں۔ معاشی حالات میں بہتری
آتے ہی طرز فکر میں بھی واضح مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

معاشی استحکام کے بعد سلیہ اسکول مینجمنٹ کمیٹی میں
تبدیلی کی جانب متوجہ ہوئی۔ اسے کمیٹی میں خواتین ارکان کی
شمولیت درکار سمجھی لیکن وہ اس خلق حقیقت سے بھی لاعلم نہیں تھی
کہ اوشی خنڈ اس کے روایتی نظریات اس معاملہ میں بہت کمزور
ہیں۔ ان نظریات کے مطابق عورت ذات میں قوت ارادی کا
عصر مفقود ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ لینے کی اہل نہیں ہوتیں۔
اس صورت حال میں علاقہ کے لوگوں کو قائل کرنا ایک

تاجر بہ کاری و مسائل کی شدید کی اور مشکلات سے زور
آزما کر کرتے ڈیزنہ سال کا عرصہ بیت گیا اور پھر بالآخر تبدیلی
کی ایک خوشگوار لہر ڈولڈ چنک کی صورت میں درآئی۔ اس نے
تمام تر صورت حال اس وفد کے سامنے بیان کیں۔ نہایت
سنجیدگی اور عرق ریزی سے ان معاملات کا جائزہ لینے کے بعد
وفد کے اراکین نے اسے اسکول مینجمنٹ کمیٹی (SMC) کے
قیام کی تجویز دی تاکہ انتظامی معاملات سے نمٹنے کے لیے
اعانت میسر آسکے۔

سلیہ نے اپنے گاؤں کے فہر دار سے رابطہ کیا اور ایک
ممبر آزما بدل گفتگو کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کمیٹی
کا قیام عمل میں آگیا۔ ابتدائی طور پر اس کمیٹی میں چھ افراد
شامل تھے۔

انتظامی مشکلات کے حل کی راہیں متعین ہوئیں تو اسے
اپنی تا تجربہ کاری اور تعلیمی قابلیت میں کمی کا احساس ستانے
لگا۔ اعلیٰ تعلیم اور وسعت انظری کے بغیر وہ اپنے جنون کا یہ
سفر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے
محکمہ تعلیم سے رابطہ کیا اور تعلیمی سلسلہ کے اسز نو آغاز کی
درخواست پیش کر دی۔ محکمہ بھی اس کی لگن کاوشوں اور خلوص کا
قائل ہو چکا تھا اس لیے سلیہ کو اسلام آباد منتقل ہونے کی
اجازت دے دی گئی۔

اسلام آباد میں بہترین تعلیمی اداروں سے بی ایس بی
اور بی ایڈ کی ڈگری لیے ساڑھے تین سال بعد وہ ایک نیا عزم
اور بہت سیٹھے اپنے اصل کی جانب لوٹ آئی۔ سلیہ اوشی
خنڈ اس کی وہ پہلی لڑکی تھی جو شہری تعلیمی اداروں سے مستفید
ہوئی۔ اس کے لیے اپنی علاقائی اقدار اب بھی مسلمہ
تھیں۔ مقامی لوگوں کی عزت و احترام میں بھی وہ کوئی کسر اٹھا
نہ رکھتی۔ نتیجتاً اس کے شخصی وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ مقامی
افراد کی نظر میں وہ بہت بلند مقام حاصل کر چکی تھی اور اسی
تناسب سے ذمہ داریوں کا بار بھی بڑھنے لگا۔

گاؤں میں واپسی کے بعد اس نے میٹرک جماعت کا
ہا قاعدہ اجراء کیا اور رضا کار اساتذہ کی بھرتی کا آغاز بھی کر
دیا۔ اوشی خنڈ اس میں وہ اب کسی سلیہ کو دوسرے شہروں میں
تعلیم حاصل کرنے کی اضافی مشقت سے جنگ آزما ہوتے
نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا مطمح نظر اپنے علاقہ میں تعلیم
اسواں کا فروغ تھا۔ مقامی روایات کے مطابق لڑکیوں کو
جماعت پنجم تک تعلیم دلوانے کے بعد ان کی شادی کر دی

ناممکن امر تھا۔ سلیبہ نے کمیٹی ارکان کے ساتھ ان گنت باضابطہ ملاقاتیں کیں اور بالآخر انھیں کم از کم چار خواتین کی شمولیت کے لیے راضی کر لیا۔

بظاہر ناممکن نظر آنے والے مسائل کے احسن ترین حل نے اسے خاطر خواہ اعتماد بخشا اور وہ نئی لگن سے دیگر امور میں تبدیلی کے لیے کوشاں ہو گئی۔ اسکول کے اندرونی معاملات میں بھی بہت پیچیدگیاں تھیں۔ والدین بچوں کو پڑھائی کے لیے زائد وقت دینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہی نہ ہوتے۔ طالبات اپنے گھروں میں اسکول کی جانب سے تفویض کردہ کام مکمل کرنے سے قاصر تھیں۔ تعلیم سے بے بہرہ والدین ماہانہ اور ہفتہ وار میٹنگ میں ایک ہی بات دہرایا کرتے۔ ”ہم اپنی بچیوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں سب کچھ سکھا پڑھا کر بھیجا کریں۔ اس لیے کہ بچیوں کو گھر داری کے علاوہ کیمتوں میں بھی والدین کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔“

سلیبہ نے بے پناہ مزاحمت اور ابتدائی ناکامی کے بعد والدین کو قائل کیا کہ طالبات کو گھروں میں اسباق کی دہرائی کے لیے دو تین گھنٹوں کی فراہمی ان کی ذمہ داری ہے جس سے وہ ہرگز کنارہ کش نہیں ہو سکتے۔ تعلیمی عمل محض چھ گھنٹوں پر محیط نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ والدین کے ساتھ بے شمار نشستوں اور بحث و مباحثہ نے اس مسئلہ میں جزوی تبدیلی پیدا کر دی تاہم یہ سوچ اور نظریہ آج بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

پیشہ وارانہ قابلیت اور لگن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ طالبات کو بلکہ پچھلے اعزاز میں تدریس نے اسے بے حد مقبول بنا دیا۔ اس کی محنت اور مجیدیگی کے باعث اسکول میں میٹرک جماعت کے حالیہ آغاز کے باوجود تین سال تک سالانہ امتیہ کی شرح ’نوے فیصد‘ سے بھی زائد رہی۔ ہرگز تباہ سال ادارہ میں بچیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے لگا۔ اس کی مثبت تعمیری محنت سے برادری کا اعتماد بھی راسخ تر ہوا۔

سلیبہ نے پہلی بار اپنے علاقہ میں والدین اور اساتذہ کے باہمی تعامل کا باقاعدہ اجراء کیا۔ ان اقدام سے والدین کی دلچسپی بڑھ گئی اور برادری کے وہ اساتذہ بھی اس کے ہم قدم بننے کے لیے راضی ہو گئے جو قبل ازیں محض سطح پر تنہا چراغ در چراغ جلانے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے۔

اس کی انتھک کادوشوں کی بدولت محل جماعت کے بعد تعلیمی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ میٹرک پاس

لڑکیوں میں چند ایک نے نرسنگ کا شعبہ اختیار کیا تو نصف درجن نے اسی اسکول میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ کچھ طالبات قانونی شعبہ سے وابستہ ہو گئیں۔ ان کے والدین کے سماجی و معاشی رتبہ میں بھی لامحالہ برتری پیدا ہوئی۔

غربت اور ہمسایہ کی اب بھی کسی عفریت کی طرح مقامی افراد کے لیے لاغلیل مسئلہ تھی۔ سلیبہ نے باہمی مشاورت سے ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جو اپنی آمدن کا چھوٹا سا حصہ غریب لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مختص کر دیتا۔ انہیں یونیفارم، کتابوں اور سالانہ فیس کے اخراجات میں اعانت میسر آ گئی۔ اس گروہ کی پُر خلوص کوششوں سے 1500 لڑکیوں کے خوابوں کی تکیوں کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ مستحق طالبات کی عزت نفس کا احترام ان کی اولین ترجیح تھی۔ انھیں مطلوبہ سامان بھی کسی ہم جماعت کے سامنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ علیحدگی میں ان کے والدین کے سپرد کیا جاتا۔

اوشی خٹا اس کے اس اسکول میں سائنس لیب کی عدم موجودگی بھی بے حد دشواری کا سبب تھی۔ سائنسی مضامین کے عملی امتحانات کی تیاری ان طالبات کے لیے ہمیشہ دوسرے ثابت ہوتی جس میں رتی بھر کی بیشی بھی براہ راست ان کے سالانہ بورڈ امتحانات پر اثر انداز ہوا کرتی تھی۔ سلیبہ نے اسکول میں جنمٹ کمیٹی کے علاوہ علاقہ میں موجود طلبہ کے اسکول پر نپل سے درخواست کی کہ انھیں براہ صرف ایک ہفتہ طالبات کے عملی امتحانات کے لیے لیب متعارف دے دی جائے۔

سلیبہ کی پیشہ وارانہ زندگی میں اگر ایک جانب مسائل کے انبار تھے تو دوسری جانب دست غیبی سے اسے ایسی آسانیاں بھی میسر آرہی تھیں جن کا تصور ہی کچھ عرصہ پہلے ایک ناممکن امر لگتا۔ علاقہ کی وہ طالبات جن کے لیے کمتر معاشی حیثیت اور برادری کے دباؤ کی وجہ سے اسکول میں پڑھنا ایک دشمنانہ عظیم تھا اب اپنے خاندان کی مکمل رضامندی سے اس کی عملی معاون ثابت ہونے لگیں۔ اسی دوران دو سابقہ طالبات اسکول میں سائنسی مضامین کی تدریس کرنے لگیں۔ ان کے سابقہ تعلیمی ریکارڈ زہانت اور سنجیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے سلیبہ نے حتی الامکان انہیں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتیں منتقل کر دیں تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اسکول کی تدریسی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ یا کمی نہ آئے۔

سلیبہ پیگم کی انتظامی صلاحیتیں اور لگن اب کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھیں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اس کی ذاتی علمی قابلیت میں مزید اضافہ کے خواہاں تھے۔ 2002ء میں اسے آغا خان

پاکینہ

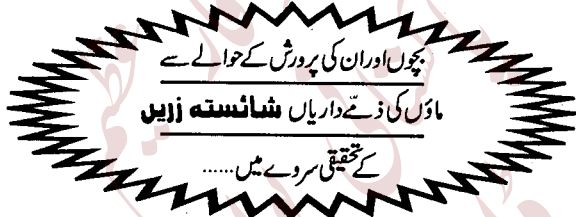
کراچی

ماہنامہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قلم کے جوہر..... قسط وار ناول کی صورت

سیما رضا ردا کا خوب صورت مٹی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا کا منطقی انجام.....

رفاقت جاوید نے کھلائے محبت کے رنگ..... فصل محبت میں.....



اختر شجاعت اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے ایمان افروز مضامین.....

رائٹرز کی کہکشاں..... رخ چوہدری کے شوخ قلم سے احوالِ تقریب

سمیرا یونس ہارون کا پُر لطف مکمل ناول..... کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا

دردانہ نوشین خان کی حیرت انگیز تحریر..... خواب گزیدہ.....

شہناز وسیم، حیا بخاری اور نصرت یوسف کی موشر کاوشیں.....

(نکاحِ علاوہ)

امِ ایمان، شگفتہ شاہ، ہاجرہ ریحان، سیما بنت عاصم، شمیم فضل خالق، ناہید چوہدری، ریحانہ آفتاب دیگر مشاق تحریر نگاروں کی دکش کاوشیں.....

اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی تراشے، متاثر کن مستقل سلسلے اور دل پریر شاعری اور بہت کچھ آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر.....

یونیورسٹی فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ (AKUED) نے MS ڈگری کی تکمیل کے لیے وظیفہ فراہم کیا۔ اس تعلیمی سفر میں اسے تکنیکی امور میں طاق کیا گیا۔ روایتی طریقوں سے قطع نظر تعلیمی عمل کے دوران طلبہ و طالبات کی دلچسپی برقرار رکھنے کے 'گزر' کمیونیٹی کی شمولیت کے جدید سائنسی اور منطقی طریقہ کار کے استعمال نے اس کی صلاحیتوں میں کئی گنا نکھار پیدا کر دیا۔ اپنے دیگر ہم جماعت اساتذہ پر سلیسہ کی ذہنی برتری واضح تر نظر آتی رہی تھی اس لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے محکمہ تعلیم سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد اسے گلگت بلتستان کے شمالی علاقوں میں 'آغا خان یونیورسٹی پروفیشنل ڈویلپمنٹ سینٹر' کے لیے متعین کر دیا۔ اس تربیتی منصوبہ کے تحت سلیسہ نے گلگت بلتستان کے چھ اضلاع میں سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز کیا۔ انہیں معیاری تعلیم فراہم کرنے کے تکنیکی انداز برادری کی شمولیت کے عملی طریقہ کار سے آگاہی، طلبہ کی سماجی و اخلاقی تعلیم کے علاوہ معلمین کی ذاتی بہبود پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی۔

یہ تربیتی و فلاحی منصوبہ پانچ سال جاری رہا اور اس دوران سلیسہ نے گلگت، ہنزہ، استور سمیت کئی اضلاع میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہوئے تقریباً سات ہزار سے زائد اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کی۔ اس کا ذہن منفرد تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ وہ مسائل ہی کی مدد سے منطقی وسائل تخلیق کرنے میں طاق تھی۔ گلگت بلتستان کا قدرتی حسن عوامی بے پروائی، کم علمی اور جہالت کی بدولت کوڑا کرکٹ، ماحولیاتی آلودگی اور مختلف بیماریوں سے گھنا رہا تھا۔ سلیسہ نے بے حد خود غرض کے بعد اس کوڑا کرکٹ کو بطور کھانا استعمال کرنے کا تاریخی قدم اٹھایا۔ علاقہ کے کسانوں کو یوریا اور اس قسم کی دیگر کھادوں کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل سے آگاہی فراہم کی۔ ان روایتی طریقوں کا استعمال نسل در نسل محیط تھا لہذا انہیں نامیاتی کھاد کے استعمال پر قائل کرنا بلاشبہ ایک ٹھن امر ہی تھی، لیکن کامیابی ایک بار پھر سلیسہ کا مقدر ٹھہری۔

آغا خان یونیورسٹی کے معاہدہ کی مدت مکمل ہوتے ہی اسے 'قرآرم یونیورسٹی' نے دو سال کے لیے اپنے ساتھ تھمتی کر لیا۔ اس کی قابلیت و صلاحیتیں اس بار بھی دیگر سماجی اساتذہ سے بہت ارفع ثابت ہوئیں۔

سلیسہ کی پیشہ وارانہ قابلیت کی گونج اب بین الاقوامی سطح پر بھی پہنچ چکی تھی۔ 2010 میں آغا خان پروفیشنل ڈویلپمنٹ نے

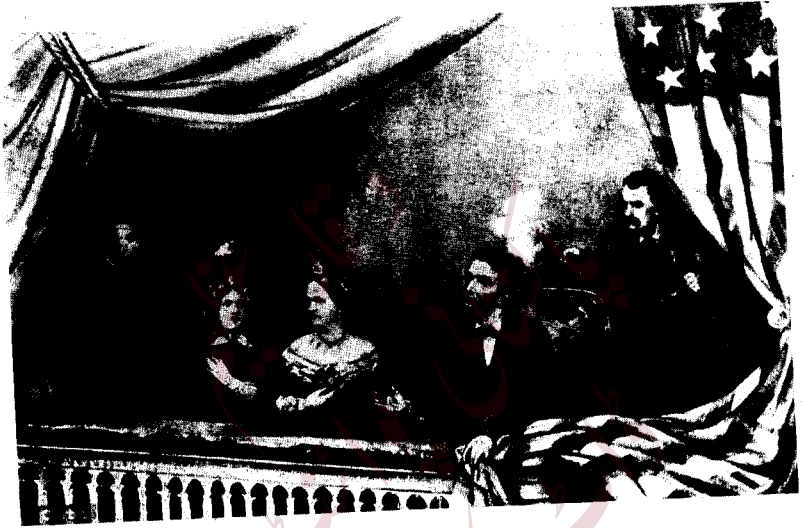
آسٹریلیوی تعلیمی فنڈ کے اشتراک سے علاقائی اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی معیار میں بہتری کے لیے ایک نئے معاہدہ کا آغاز کیا۔ اس معاہدہ میں سلیسہ کی شرکت بھی ناگزیر تھی۔ بعد ازاں اسے 'پولیس ایڈ' کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔

سلیسہ نے اس صورت حال سے بھرپور استفادہ کیا۔ ایڈوائس تعلیمی ڈیپلوما میں تدریس کے بعد اس نے مذکورہ ڈیپلوما کے لیے ایک کتابچہ بھی تصنیف کیا جس کا مطبع نظر اساتذہ میں غیر روایتی طریقہ تعلیم کی تحریک پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ذاتی صلاحیتوں میں نکھار کی افزائش تھا۔ گلگت بلتستان انتظامیہ اور آسٹریلیین وفد کے بعد پولیس ایڈ بھی سلیسہ کے بلند ذہنی معیار کی قائل ہوئی۔

2014 میں جرمن تعلیمی انتظامیہ نے گلگت بلتستان میں GIZ-GFA پروگرام کے تحت اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کا آغاز کیا تو ان کا پہلا انتخاب بھی سلیسہ ہی تھی۔ جرمن انتظامیہ اس کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئی کہ انہوں نے سیکریٹری محکمہ تعلیم سے سلیسہ کو سرکاری نوکری سے عہدہ برآ کرنے کی درخواست کر دی۔ جرمن حکومت اسے پاکستان میں اپنے قومی پروگرام کے لیے کوآرڈینیٹر متعین کرنا چاہتی تھی۔ سیکریٹری کی حوصلہ افزائی، شوہر سے مشاورت اور بے حد سوچ و بچار کے بعد وہ اسلام آباد منتقل ہو گئی۔ اگلے ڈیڑھ سال میں اس نے پاکستان کے طول و عرض میں 18,500 اساتذہ کو اپنے تجربات سے مستفید کیا۔

کہادات مشہور سے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن سلیسہ کی کامیابی کے اس سفر میں دو مردوں والد اور شوہر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اوشی خٹا اس کے روایتی کٹر ماحول میں روایت شکنی سے خوشگوار تبدیلی لانے والی یہ خاتون اس وقت اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے قومی سطح پر اسے مختلف ایوارڈ دیئے گئے ہیں۔ سلیسہ بیگم پہلی پاکستانی نژاد خاتون ہیں جسے گلوبل پیچرز پرائز کے تحت دس بہترین عالمی اساتذہ میں شامل فہرست کیا گیا۔ گزشتہ سال پاکستان کی جانب سے عقیدہ آصفی بھی نامزد ہوئی تاہم عقیدہ افغان نژاد ہے۔

گلوبل پیچرز پرائز کے حصول میں سلیسہ بیگم کو کامیابی میسر نہیں ہوئی لیکن اس کی جدوجہد اظہر من الشمس ہے۔ گلگت بلتستان میں اس نے جو تعلیمی انقلاب برپا کیا اسے تاقیامت بھلا یا نہیں جاسکے گا۔



بھیاںک سازش

سید احتشام

امریکا کی تاریخ میں اس سے بڑی کسی اور سازش کا ذکر نہیں ملتا۔ بلاشبہ وہ سازش ایسی تھی جس نے امریکا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سازش کے کئی کردار سامنے آئے جن کو سزا بھی سنائی گئی لیکن ان کا سرغنہ کون تھا یہ بات آج بھی پردہ راز میں ہے۔

ملک کے صدر اور کئی اہم افراد کے قتل میں کون کون شامل تھا؟

ہیری فورڈ نے اس چھبیس سالہ نہایت حسین و جمیل خوش پوش نوجوان کو یہ کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ”یہ رہا واشنگٹن کا حسین ترین شخص۔“

پھر اس نے اپنے دفتر میں بوتھ کے پرستاروں کی

وہ 14 اپریل 1865 گڈ فرائی ڈے کا نئی یون تھا۔ واشنگٹن ڈی سی میں دوپہر سے ذرا ہی پہلے آج کا مایہ ناز ایکٹر جان ویلس بوتھ اپنی ڈاک لینے فورڈس حیر میں ٹھہلا ہوا داخل ہوا۔ جب وہ مزید قریب پہنچا تو تھیر کے نیچر

طرف سے موصول ہونے والے خطوط اس کے حوالے کر دیئے۔ ہوتھ جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اسٹیج کے ایک بڑھی نے مینیجر فورڈ سے پوچھا۔ ”کیا آپ اسٹیٹ باکس تیار چاہتے ہیں؟“

اسٹیٹ باکس سے مراد وہ باکس تھا جو صرف محترم صدر اور ان کی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔

”ہاں۔“ مینیجر فورڈ نے جواب دیا۔

انہیں وائٹ ہاؤس سے یہ پیغام موصول ہوا تھا کہ اس رات صدارتی پارٹی وہاں ڈراما دیکھنے کے لیے آنے والی ہے۔ ہوتھ نے جب یہ سنا تو فورڈ کی طرف دیکھا۔

”صدر لنگن اور یہاں؟“

”ہمارا کھیل دیکھئے؟“

ان دنوں ایک پرانا مزاحیہ کھیل ”امریکن کزن“ اسٹیج کیا جا رہا تھا جو تماشا بینوں میں اپنی دلچسپی کھو چکا تھا۔

”ہاں۔“ فورڈ نے چمک کر کہا۔ ”شاید اس طرح ہمارے اس باسی کھیل میں کشش پیدا ہو جائے اور یہ مزید بڑھ سکے۔“

”ہاں شاید۔“ ہوتھ نے اس سے اتفاق کیا اور ہار چلا گیا تاکہ ٹھیکر کی داخلی میز میوں پر بیٹھ کر آرام سے اپنے پرستاروں کے تعریفی خطوط پڑھ سکے۔

کسی بھی معنی میں شاید کو یہ یاد نہیں کہ اس نے ہوتھ کے رویے میں کسی قسم کی غیر معمولی بات محسوس کی ہو۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شاندار ایکٹر تھا کیونکہ اس کے ذہن میں فوراً ہی ریاست ہائے متحدہ کے صدر کو قتل کرنے کا منصوبہ تشکیل پا گیا تھا اور اس منصوبے کو اسے اگلے دس گھنٹے میں عملی جامہ پہنانا تھا۔

وہ اپنے خطوط پڑھنے کے بعد قصداً دوبارہ ٹھیکر میں داخل ہوا، اور پڑھ کر ٹھیکر میں گیا اور ایک نقلی راہداری سے ہو کر صدر لنگن کے لیے مخصوص باکس میں جا گھسا۔ وہاں بیٹھ کر وہ رات میں پیش ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل دیکھنے لگا۔ اس کھیل کے ایک منظر میں ایک مزاحیہ اداکارہ کو ایک جملہ ادا کرنا تھا۔ اس اداکارہ نے جو نبی وہ جملہ اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا، ہوتھ چونکا ہو گیا۔ وہ جملہ کچھ ایسے بے لطف انداز میں ادا کیا گیا تھا کہ ہوتھ کو یقین ہو گیا کہ جب کھیل پیش ہو گا تو اس مزاحیہ جملے پر پورا ہال تماشا بینوں کے قہقہوں سے گونج اٹھے گا۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد ٹھیکر سے نکلا اور تیزی سے چل

پڑا۔ اس مرحلے پر اس کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ ٹاؤن، ڈاؤن ٹاؤن اور کراس ٹاؤن میں درجنوں افراد نے اسے دیکھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سب کو دکھایا۔ اس نے دوستوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا، خواتین کی طرف دیکھ کر احتراماً اپنا ہیٹ اتارا، راہ گیروں سے ہیلو ہائے کیا۔ اس وقت اس کے جسم پر بے داغ لباس تھا اور میزوں میں شہ سواری کے پوش تھے جن میں مہینز کی پھر کی لگی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیکر سے نکل کر سیدھے کھوڑوں کے ایک اصطبل پہنچا اور اس نے ایک صحت مند کھوڑی کرائے پر حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ فورڈس ٹھیکر کے نزدیک ہی واقع ایک بورڈنگ ہاؤس گیا جہاں بھانت بھانت کے بد قماش لوگوں سے وہ گزشتہ کئی ماہ سے میل جول بڑھائے ہوئے تھا۔ کچھ دیر ان کی صحبت میں وقت گزارنے کے بعد وہ ایک بار میں گیا۔ وہاں ایک بوتل براغی حلق میں اتاری اور کچھ بچے کے قریب کھین گائب ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر گھوم کر ٹھیکر میں داخل ہوا، جواب بالکل دیر ان تھا، وہ سیدھے اسٹیٹ باکس کے دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے بڑی پھرتی سے چاقو کی مدد سے دروازے کے بالائی پینل میں ایک سوراخ کیا، پھر جبکہ کفرش پر سے ٹھیکر سمیٹا اور وہاں سے کھسک گیا۔ گویا اس نے صدر کے قتل کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ واپس ٹھیکر میں پہنچا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے کھانا کھایا، اس کے بعد اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں اس نے ایک وگ، ایک نقلی داڑھی، ایک خنجر، دو رپوالور اور سنگل شاٹ والا ایک مخصوص پستول اٹھا لیا جس سے فائر کرنے پر ایک کچھ کے برابر چھوٹا سا سوراخ ہو جاتا تھا۔ وہ رات کے لگ بھگ آٹھ بجے ٹھیکر میں ہلکا ہلکا۔ ہوتھ کے استقبال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ٹھیکر سے پوچھا کہ کیا وہ اس رات فورڈس ٹھیکر جائے گا؟

”نہیں۔“ ٹھیکر نے جواب دیا۔

”تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“ ہوتھ نے اصرار کیا۔

”آج رات وہاں اداکاری کے بعض عمدہ نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔“

ایسا وہ اس لیے کر رہا تھا کہ لوگ گواہ رہیں اس کے بعد وہ ایک بار پھر تقریباً ایک گھنٹے کے لیے غائب ہو گیا۔ شہادتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس دوران اس

لے اس بھیا تک، گہری اور چھیدہ تاریخی سازش میں ملوث اپنے دوستوں کے ساتھ تھی اور فیصلہ کن صلاح و مشورے کیے جو اس رات کی سیاسی دھڑلے سے پہلے ہی منکشف ہونے والی تھی۔

رات کے ساڑھے نو بجے وہ فورڈس تعمیر کے پھوڑے بلیسٹ اہلی میں اسٹیج کے دروازے پر نمودار ہوا۔ پھر وہاں سے چلتا ہوا صدر کی منظر بھی کے پاس سے گزرتا ہوا ٹیٹھ اسٹریٹ پہنچا جہاں ایک بار واقع تھا۔ وہاں بھی اس نے بے لوثی سے شغل کیا اور پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس موقع پر بار میں موجود کسی شخص نے اس پر تفرہ چست کیا۔ ”تم بھی اپنے باپ جیسے ایکڑ نہیں بن سکتے۔“

بوتھ ایڈیوں کے ٹل مڑا۔ کچھ دیر تک لا جواب سا ہو کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اچانک مسکرایا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند کیا۔ ”جب میں اسٹیج سے اتروں گا تو امریکا کا سب سے مشہور شخص ہوں گا۔“ سننے والے اس بات کی گہرائی نہ سمجھ سکے اس نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔

جان بوتھ کا باپ جونس بروڈس بوتھ نیم پاگل شرابی تھا، جو اپنے وقت کا عظیم ترین ایکٹر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے دس بچے تھے جن میں جان بوتھ کا نواں نمبر تھا۔ جان بوتھ نے صرف سترہ سال کی عمر میں اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ دو سال کے بعد 1858ء میں اس نے درجینا کے شہر ریجنڈ میں شیکسپیر کے ڈرامے ”ہیلٹ“ میں ہیلٹ کا کردار ادا کیا اور وہ راتوں رات اسٹیج کے افق پر چاند کی طرح چمکنے لگا۔ لڑکیاں اس کی دیوانی ہو گئیں۔ وہ سڑکوں پر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ گئیں۔ جب وہ اسٹیج پر نمودار ہوتا تو وہ دھوم و جذبات سے چمکنے لگتیں اور اس کا آؤ گراف لینے کی غرض سے اس طرح ٹوٹ پڑتیں جیسے کھیاں مٹھائی پر ٹوٹی ہیں۔

جان بوتھ فروری 1861ء تک جنوب ہی میں سکونت پذیر رہا لیکن چونکہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، اس لیے اس نے شمال میں تھیمزوں میں بنگلہ منظور کر لی کیونکہ وہ پیدائشی جنوبی نہیں تھا۔ وہ میری لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے غلامی سے اس کی کوئی جذباتی یا مالی وابستگی نہیں تھی۔ جس وجہ سے بنات نے جنگ کی صورت اختیار کی تھی اور امریکا جنوب و شمال میں بٹ گیا تھا وہ وجہ غلاموں کی خرید و فروخت تھی۔ جان بوتھ نہ تو غلاموں کی تجارت سے وابستہ

تھا اور نہ اسے اس قسم کی تجارت سے نفرت تھی۔ وہ لاطعلق بندہ تھا مگر جب سسٹر میں توہیں داغی جانے لگیں تو بوتھ نے تھلم تھلکا کر شروع کر دیا کہ یہ جدید دور کی سب سے دلیرانہ کارروائی ہے اور یہی بات اس کے مخالفین نے پکڑ لی۔ ایک گروپ نے تھیمز کو تباہ کرنے اور اسے شہر چھوڑنے کی دھمکی دی لیکن وہ اپنی ہمدردی کے باوجود بھاگ کر جنوب کی باغی آرمی میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے شہر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

جب ہزاروں اتحادی محب وطن مر رہے تھے تو جان بوتھ اسٹیج پر ہی رہا اور پانچ سو ڈالر فی ہفتہ کے عوض ہیلٹ، میکیتھ اور اوٹھیلو کے کردار کرتا رہا لیکن جلد ہی وہ اسٹیج سے ہٹ کر ایک خطرناک کھیل میں ملوث ہو گیا۔ 1865ء میں وہ انڈر گراؤنڈ باغیوں سے جاملتا تھا۔

کٹھنر ریٹ سیکرٹ سرس انتہائی منظم تھی۔ یونین کے ہر بڑے شہر میں ان کے جاسوسوں کا جال بچھلا ہوا تھا لیکن بوتھ کا پیش ایک انتہائی عمدہ بہروپ تھا۔ وہ آزادی سے محاذوں پر اور ریاستوں کے درمیان آتا جاتا رہتا اور اسٹیج کے پیچھے پیغام رسالوں اور سیکرٹ ایجنٹوں سے ملتا رہا۔ دستاویزی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ باغیوں کی اعلیٰ جنس سے کینیڈا تک میں اس کا رابطہ تھا۔ اس لہجہ کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک غیر ذمے دار جنونی تھا جس کی گردن پر ابراہام لیکن کا خون ہے۔ مگر کیسے یہ بتاتا چلوں۔

☆.....☆

دسمبر 1864ء کے اواخر میں بوتھ ایک دن ایک بورڈنگ ہاؤس گیا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس، مسز میری یوجینیا سرات نامی ایک خاتون کا تھا اور واشنگٹن میں فورڈس تعمیر سے چار بلاک کے فاصلے پر 541 ایچ اسٹریٹ پر واقع تھا۔ وہاں دو باغی ایجنٹ کے علاوہ متعدد جعلی شخصیتیں اکٹھا ہوئی تھیں۔ بوتھ کے وہاں جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک میللا پچھلا کرایہ دار وہاں وارد ہوا اور ایک کمرے کے لیے اس نے درخواست کی۔ اس کا نام جاری تھا۔ اس کے بعد ہی ایک اور اجنبی وہاں آ گیا۔ وہ ایک عظیم نوجوان تھا۔ اس نے ایک مسیحی مبلغ کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام فادر لوکس بین تھا۔ اس کے ذرا ہی دیر کے بعد ایک اور مفلوک الحال شخص آ پہنچا۔ وہ ایک سابق ڈرگ اسٹور کلرک ڈیوڈ ہیر ولڈ تھا۔ یہ لوگ مرکزی سازشی تھے۔

کو جوان کو پکڑتی جب کہ چین اور خود ہوتھ صدر لنکن کو دبوچے۔

ذرا ہی دیر میں ایک چمپاتی ہوئی کبھی اپنے شیڈول کے مطابق نمودار ہوئی جسے گھوڑے پہنچ رہے تھے۔ کو جوان گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ کبھی آئی اور گزرتی لیکن کبھی میں بیٹھا ہوا شخص صدر لنکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ یونین کے فوجیوں کو تنہا بانٹ رہا تھا جو غیر متوقع طور پر باغیوں سے حاصل کیا ہوا ان کا جھنڈا صدر کو پیش کرنے اور شکنجے آئے تھے۔

اغواء کی تیسری کوشش اس وقت پھر ناکامی سے ہمکنار ہوئی جب صدر لنکن نے آخری لمحوں میں تھیمز جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ تیسری مرتبہ بھی ناکامی کا رخ مزہ چھٹنے پر سازشیوں کا چیف ہوتھ غصے، جھنجھلاہٹ، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس سے دیوانہ ہو گیا۔ صدر لنکن کو ٹریپ کرنے کی ساری کوشش، ساری محنت، ساری بھاگ دوڑ رائیگاں لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اب تک ہوا میں جال پھینکتا رہا ہو۔ اسے اپنے انڈر گراؤنڈ ساتھیوں کی خفیہ اور ناراضگی کا بھی احساس تھا جنہیں اس نے ارٹ کر دیا تھا۔ اب وہ اور تفصیلاً کا سامان کر رہے تھے۔ اپنی ذلت اور رسوائی وہ کیسے برداشت کرتا جو اس کی ناکامیوں کے باعث اس کی جموں میں آنکھیں تھیں جب کہ وہ تو شہرت اور ناموری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بار بار کی ان ناکامیوں پر کڑھتے ہوئے اس نے اغواء کا منصوبہ ترک کر کے اس سے کہیں زیادہ خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

☆.....☆

1865ء کے گڈ فرائی ڈے تک اس کا یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔ اس اطلاع نے کہ صدر لنکن اس رات فورڈس تھیمز میں اپنے باکس میں ہوگا، جگہ اور وقت کا تعین کر دیا تھا۔ اس رات ہوتھ نے جارج کو نائب صدر اینڈر پو جانسن پر قاتلانہ حملے کی ذمہ داری سوپنی۔ چین اور ہیرولڈ کو وزیر داخلہ ولیم ایچ سیوارڈ کو ہلاک کرنا تھا۔ گویا ایک ہی وار میں یونین کی سرکردہ ہستیوں کا صفایا کرنا مقصود تھا۔

اس رات ہوتھ، فورڈس تھیمز کی اس راہداری میں نمودار ہوا جو صدر کے باکس تک رہنمائی کرتی تھی۔ اس موقع پر اس نے خود کو لوگوں کی نگاہ سے چھپانے کی زحمت نہیں کی۔ کئی لوگوں نے اسے راہداری میں دیکھا۔ صدر کے باکس کی داخلی گزراہ پر کوئی چہرہ نہیں تھا۔ اس حقیقت کے

سازش کے ابتدائی مراحل میں ایک پلان بنایا گیا۔ اس پلان کے مطابق انہیں صدر کو اغواء کر کے جنوب میں لے جانا تھا۔ صدر کے پکڑے جانے پر شمالیوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور جنوبیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ دوسرے یہ کہ یرغمال بنا کر ہزاروں قیدیوں کو رہا کرایا جاسکتا تھا لیکن بدقسمتی سے اغواء کا منصوبہ جو یونین کی محنت اور سوچ و بچار کے بعد بنایا گیا تھا حادثوں کا شاہکار ثابت ہوا۔ ہوتھ کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ صدر ابراہام لنکن کو فورڈس تھیمز میں اس کے باکس میں دبوچ لیا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق ایک سٹیل طے پر گیس کے مرکزی وال کو آف کر دیا جائے گا جس سے پورا تھیمز اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ اغواء کنندگان تیزی سے باکس میں گھس جائیں گے اور صدر کو دبوچ کر نیچے اسٹیج تک لے آئیں گے۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر کھڑی بھی میں سوار کر دیں گے اور بھی تیزی سے رجسٹر روانہ ہو جائے گی۔ اس کا متبادل منصوبہ یہ تھا کہ گھسنے درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی اس ٹرل کھاتی سڑک کے ایک موڑ پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے جو واشنگٹن سے باہر تین میل آگے ایک ملٹری اسپتال تک جاتی تھی۔ صدر اکثر وہاں جاتا رہتا تھا اور دستور کے مطابق اخبارات میں پیشگی اس وزٹ کا اعلان ہوتا تھا۔

ہوتھ نے 18 جنوری کو اپنے پہلے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی۔ کوڈ سائن، پاس ورڈ اور خفیہ آرڈر اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئے۔ مختلف مقامات پر انڈر گراؤنڈ باغیوں کو چوس کر دیا گیا۔ فورڈس تھیمز کے اسٹیج کے دروازے پر ایک بھی بھی پہنچ گئی جس میں مناسب پردے لگے ہوئے تھے لیکن یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا کیونکہ وہ ایک طوفانی رات تھی اور صدر ابراہام لنکن نے ایسے خوفناک موسم میں تھیمز کا رخ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ گھر ہی میں رہا۔

اس کے دو ماہ کے بعد اغواء کی دوسری کوشش اسپتال جانے والی سڑک پر کی گئی۔ اس موقع پر ایچ اسٹریٹ کے پورڈنگ ہاؤس کے سازشیوں کا پورا اُگرہ شراب پی کر گھوڑوں پر سوار ہو کر شہری حدود سے بہت آگے سڑک کے کنارے لکڑی کے پتے ہوئے ایک اسٹینڈ پر اکٹھا ہو گیا۔ اب ہوتھ نے آخری حکم جاری کیا۔ اس کے مطابق سرات

بلکہ لاکھوں سفید قام بھی اس کے حامی تھے۔ ایسے حالات کے باوجود صدر کے باکس کے دروازے کے باہر سول یا ملٹری پولیس کا کوئی پہرہ نہیں تھا۔

وائٹ ہاؤس کے ایک گارڈ کے مطابق صدر لٹکن ذاتی طور پر وزیر دفاع ایڈون ایم اسٹینٹن سے اس رات باڈی گارڈ فراہم کرنے کو کہا تھا کیونکہ اس دن سہ پہر میں صدر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ صدر نے اسٹینٹن سے خاص طور سے اس کے ایک گارڈ کا کہا تھا جو ایک میجر تھا اور جس کا نام ایکٹر تھا۔ لیکن اسٹینٹن نے صدر کو جواب دیا کہ اس رات ایکٹر کو دوسرا اہم کام انجام دینا ہے لہذا وہ ایکٹر کو اس کے ساتھ نہیں بھیج سکتا لیکن ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ میجر ایکٹر اس رات فارغ تھا اور اسے کوئی اہم فرض تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ وہ شام سے گھر پر تھا اور رات دس بجے شیور کر رہا تھا۔

واشنگٹن کے ایک پولیس مین جان ایف پارکر کو صدر کے باکس کے دروازے پر پہرہ دینا تھا۔ اسے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

اخبارات کئی دنوں تک شور مچاتے رہے کہ پارکر کے

باہر نہ صدر کو اغواء کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور واشنگٹن ہائی ایجنٹوں اور جویشے حامیوں سے بھرا ہوا تھا، دروازے پر پہرہ بھی ہوئی، محافظ کی کرسی خالی تھی۔ وائٹ ہاؤس میں لٹکن کی میز پر ایک ایسا لفاظہ تھا جو اس خطوط پر مشتمل تھا۔ ان خطوط میں اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں اور ایک باغی نے اس پر گولی بھی چلائی تھی۔ اس کے علاوہ، درجنیہا کا ایک گروپ، جس میں معزز افراد شامل تھے، فٹرز اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ تاکہ صدر لٹکن کو قتل کرنے والے کو بطور انعام خطیر رقم دی جاسکے۔ جنوب کی ریاستیں صدر لٹکن سمیت شمالی ریاستوں سے محض اس بناء پر بغاوت پر اتر آئی تھیں کہ سیاہ فاموں کو حاصل ہونے والے حقوق کے نتیجے میں شمالی ریاستوں کا غلبہ کسی بھی صورت میں ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

1861ء سے 1865ء تک جاری رہنے والی یہ خانہ جنگی اسی نسلی منافرت کا شاخسانہ تھی جس کے بھیاکٹ شعلوں نے ہزاروں سیاہ فاموں کو چاٹ لیا اور ان کے گھروں کو پھونک ڈالا۔ صدر لٹکن ان کا سب سے بڑا ہدف تھا کیونکہ وہ سیاہ فاموں کو ملنے والے حقوق کا سب سے بڑا یاسان تھا۔ شمالی ریاستوں کے نہ صرف سارے سیاہ فام

شکست کی فتح

تھن زدہ حالات سے ایک حینہ کی بغاوت..... آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کے قلم سے ایک ایسی دلگذاڑ داستان جو سچنے پر مجبور کر دے

دربان

پرتھوی راج کے عہد کے تیز و شیریں واقعات..... ایک بیٹی کا باپ کے خلاف اٹھایا جانے والا قدم اسے عشق کی انتہا پر لے گیا..... ابتدائی صفحات پر علی اختر کی سوغات

رنگ آسمان

ماضی کی دلفریب یادیں اور ایک فرنگی حینہ کی دلداریاں..... اے، آر، راجپوت کے قلم سے خوب صورت سلسلہ وقت

وقت کی چالوں اور انسان کی مکاریوں کے درمیان معرکہ آرائی..... حسام بٹ کے خیالات کی روانی

منظر امامہ تنویر دھاض، شمر عباس سلیم انور اور محمد ہاسر اعوان کی خوب صورت تحریریں

نمبر 2017 کے شمارے کی ایک جھلک

خواصورت کہانیوں کا مجموعہ

سیریس ٹیٹس



مزید

خطوط کی محفل، محفل شہر و سخن اور

مرزا امجد بیگ کی کھوج کا نتیجہ

اس کے علاوہ

خلاف تفتیش کی جائے۔ میٹرڈ پولیشن پولیس ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پوری پولیس فورس میں یارکر کا ریکارڈ سب سے گندہ تھا۔ اس میں وہ ساری برائیاں تھیں جو پولیس میں نہیں ہوتیں۔ وہ ڈیوٹی کے دوران شراب پیتا تھا، حکم عدولی کرتا تھا، انتہائی بدبین اور بد اخلاق تھا۔ اس کا پورا ریکارڈ سیاہ تھا۔ سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ ایسے ناکارہ ترین پولیس میں کو خود مسزنگن کی خصوصی درخواست پر وائٹ ہاؤس میں ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ جب مسزنگن کی یہ اسانسر شپ سامنے آئی تو اس پورے معاملے پر فوری سنسرشپ کی نقاب ڈال دی گئی۔

☆.....☆

بوتھ نے اس خالی کرسی کو آہستہ سے پھلانگ کر اس سوراخ سے باکس کے اندر جھانکا جو اس نے اسی دن بنایا تھا۔ صدرنگن اپنا اور کوٹ پہنے، اپنی مخصوص ہلنے والی کرسی پر متمکن تھا۔ بوتھ نے اپنی پوزیشن بدل کر جھانکا۔ صدر کے پہلو میں مسزنگن فروکش تھی۔ اس سے آگے ایک آرام کرسی پر نگن کی ایک مہمان کار ایئر بیٹھی ہوئی تھی اور باکس کے اندر دنی دیوار کے ساتھ ہی ایک دیوان پر اس خاتون کا محافظ بیٹھا تھا۔ وہ ایک نوجوان فوجی میجر تھا اور اس کا نام رچھ بون تھا۔

بوتھ نے اپنا سنگل شاٹ والا مخصوص ریوالور نکال لیا اور ڈرامے کے اس مزاحیہ فقرے کا انتظار کرنے لگا۔ بالآخر ڈرامے کی اداکارہ نے وہ فقرہ ادا کیا اور پورا ہال ہتھکڑوں سے گونج اٹھا۔ بوتھ نے دروازے کا تاب ایک جھٹکے سے کھول لیا اور اندر کی طرف جھپٹا۔ اس کا پستول لہرایا، دھماکا ہوا۔ صدرنگن کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ بون ساکت ہو گیا گویا پیٹھے پیٹھے اچانک سو گیا ہو۔

میجر رچھ بون نے چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اسے صدر کی کرسی کے پیچھے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ صدر کے سر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ رچھ بون اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے بوتھ کا تجربہ لہرایا اور رچھ بون کے بازو کو چیر گیا۔ میجر رچھ بون تیزی سے پیچھے ہٹا اور بوتھ پر جھپٹا۔ دونوں قسم قسم گھما ہو گئے۔ بوتھ اس سے چٹنا ہوا، باکس کے مگر پر آ گیا۔ اس نے زور سے دھکا دے کر میجر کو ایک طرف گرا دیا اور ایک ٹانگ گھما کر رینگ پر چڑھ گیا۔ میجر رچھ بون اسے پکڑنے کے لیے ایک بار پھر جھپٹتا تھا کہ اس نے خود کو

رینگ سے نیچے اسٹیج پر گر ادیا۔ اس کوشش میں اس کا پایاں ٹخنہ مڑ گیا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ تکلیف کی شدید لہر کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑا ہوا اور اپنا تجربہ لہراتا ہوا اسٹیج کے بازو میں جا گھسا۔ وہاں ایک ایکٹریس اپنا فقرہ بولنے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بوتھ نے اسے زور کا ایک طرف دھکا دیا اور بجلی کی سی تیزی سے اسٹیج کے نیم تاریک دروازے کی طرف لپکا۔ راہداری میں آرکسٹرا کا لیڈر موجود تھا۔ بوتھ نے اس پر بھرے دو دروازے اور اسے زور کا دھکا دیا۔ آرکسٹرا کی پہلی سیٹ پر متمکن دانشن انارنی مسٹر اسٹیوارٹ کو صدر کے باکس میں ہونی گزیر کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لیے جیسے یہی بوتھ نے اسٹیج پر جھلاٹ لگائی اسٹیوارٹ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بوتھ کے پیچھے لپکا لیکن وہ جوبنی اسٹیج کو عبور کر کے دروازے پر پہنچا، دروازہ باہر سے ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ اسٹیوارٹ دروازے کی تاب پکڑنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔

باہر گلی میں جو شخص بوتھ کا گھوڑا تھا اس کے انتظار میں کھڑا تھا، بوتھ کو دیکھ کر چپکا۔ ”مسٹر بوتھ دروازے سے باہر آ گئے۔“ اسی وقت اسٹیوارٹ بھی چیخا ہوا باہر آ گیا۔ ”رک جاؤ..... رک جاؤ۔“ لیکن بوتھ تب تک گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا چکا تھا۔

☆.....☆

بوتھ کا سب سے ذہین اور قابل اعتماد ساتھی ڈیوڈ ہیرولڈ، گڈ فرائی ڈیوڈ کا پورا دن ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ وہ اسلحہ چھپانے کے لیے جارج کے پاس بورڈنگ ہاؤس گیا، پھر بوتھ کی تلاش میں ہینشل ہوئی گیا۔ اس کے بعد مسٹر پچر کے اصطبل پہنچا جہاں سے اس نے ایک گھوڑی کرائے پر لی اور جب اس پر سوار ہونے لگا تو پچر نے اسے یاد دہانی کرائی کہ گھوڑی ہر صورت میں رات کے نو بجے تک واپس کرنی ہو گی لیکن ہیرولڈ رات کے نو بجے تک اصطبل نہیں لوٹا۔ دس بج کر دس منٹ پر وہ بین کے ساتھ تھا اور اس کی رہنمائی کرتا ہوا، دیران اسکو اتر کو عبور کر کے وزیر داخلہ سیوارڈ کے گھر کے سامنے پہنچا تھا۔ عظیم ایڈی پادری لوئس بین، لیوورڈ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی ہیرولڈ تیزی سے اپنی گھوڑی سے اترا، اس نے بین کا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا۔ پھر اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ جاہد جا۔

ہوئے فرنیچر کے درمیان سے ہو کر اپنے زخمی شوہر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فرش پر پچھی ہوئی قالین خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ سیوارڈ، فرش پر سکت پڑا تھا۔ اس کا شکستہ بازو خطرناک زاویے سے مڑا ہوا تھا۔

اپنے کوٹ پر خون کے دھبوں اور خون سے تھمے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لوٹ چپن چپتا ہوا، زینے پر بھاگ رہا تھا۔ ”میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں۔“

گچلی منزل کے ایک کمرے سے ایک بے خبر شخص برآمد ہوا اور اوپر جانے کے لیے زینہ طے کرنے لگا۔ بین نے اکیلے سے اس پر چلا گیا لگائی اور خبر دے تک اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ شخص وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بین باہر کی طرف بھاگا۔

باہر آتے ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ہیرولڈ اسے چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ حویلی کی ایک بالائی کھڑکی سے کوئی عورت حلق پھاڑ کو ہسٹریائی اعزاز میں چیخ رہی تھی۔

”قاتل..... قاتل..... قاتل..... قاتل!“ بین نے اپنے گھوڑے کو اڑانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ آرام سے گھوڑے کو چلاتا ہوا، سڑک پر آگیا۔ اس سے اچھی عیارانہ ترکیب بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

لوگس بین اپنے گھوڑے پر سوار آرام سے چلا جا رہا تھا مگر وہ غلط سمت میں بڑھ رہا تھا حالانکہ ہیرولڈ نے اسے فرار کا راستہ چھ مرتبہ سمجھایا تھا لیکن اس وقت اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ راستہ کون سا تھا۔

☆.....☆

شہر بھر میں افواہ گردش کر رہی تھی کہ نائب اور جانسن کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جنرل گرانٹ کو گولی ماری گئی ہے۔ واشنگٹن پر باغیوں نے حملہ کر دیا ہے۔“

صدر لیکن کے سر میں گولی لگی تھی۔ اسے اس مہلک زخم کے ساتھ فورڈس ٹھہر سے اٹھا کر سڑک کے دوسری طرف واقع ایک گھر میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں صدر لیکن اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وزیر دفاع اسٹینٹن جو اب امریکی قوم کا سپریم کمانڈر بن گیا تھا۔ اپنے گھٹنے پر رکھے ہیٹ کو بطور میز استعمال کرتے ہوئے آرمی، نیوی اور انسٹیٹوٹ پارٹنٹ کو فرمان، احکامات اور ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس نے واشنگٹن میں اٹھ ہزار فوجیوں کو اسی وقت متحرک کر دیا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے قلم تھپتھپ رہا تھا اتنی ہی تیزی سے زبانی احکامات بھی جاری کر رہا تھا اور ہاتھ

وزیر داخلہ سیوارڈ ایک حویلی میں اپنی بیوی، دو بیٹوں فریڈرک، آگسٹس اور بیٹی مینی کے ساتھ رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کی بکمی کو ایک زبردست حادثہ پیش آیا تھا جس میں اس کے جڑے ٹوٹ گئے تھے۔ دایاں بازو فریکچر ہو گیا تھا۔ 14 اپریل کی رات وہ تیسری منزل پر واقع بیڈروم میں بیڈ پر غم وراں تھا۔ اس کا دایاں بازو ٹکے کی پٹی میں تھا اور ٹھوڑی چمڑے اور لوہے کے پتر میں جکڑی ہوئی تھی۔ درد کی شدت سے اس کی رگت سفید ہو رہی تھی۔ چہرے کا ایک حصہ بری طرح سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ سارا جنٹ ہنسن میل نرس کی حیثیت سے اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ فنی بیڈ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کے باپ کو نیند آ جائے اور وہ سکون سے سو جائے۔

ابھی اس پر غودگی طاری ہوئی تھی کہ اچانک حویلی کا سکوت زوردار آواز سے مجروح ہو گیا۔ فریڈرک سیوارڈ بڑھ چکا تھا۔ وہ بیٹی سے پوچھنے والا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ فریڈرک نے اس شخص کو روکنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے اچانک اچھل کر کوٹ ریو اور کال لیا اور ٹیکر دبا دیا لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ اجنبی لوگس بین تھا۔ نشانہ خطا ہونے پر اس نے فریڈرک کے سر پر خالی ریو اور سے حملہ کر دیا۔ اضطراب کے عالم میں ضرب پر ضرب لگاتا چلا گیا۔ فریڈرک کا چہرہ خون سے تر ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر گڑبڑ کی طرح گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بھئی کسی نے پیچھے سے بین کے بازو کو پکڑ لیا۔ عقب میں کھڑی لڑکی ہسٹریائی اعزاز میں چیخ رہی تھی۔ وہ دو مرد تھے جو اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں اس سے متعمم گھماتے۔ بین نے ایک شخص کو دکھاوے کے کیمیز پر گرا دیا اور اس پر خنجر سے وار کر کے تیزی سے گھوما اور دوسرے شخص پر وار کیا۔ پھر فرنیچر کو لات مار کر اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا بھاگ کر ہال میں پہنچا۔

وہ اپنے پیچھے ایک انتہائی دلخراش اور روح فرسا منظر چھوڑ آیا تھا۔ فریڈرک خون کے جوہر میں بے ہوش پڑا تھا۔ آگسٹس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پورا چہرہ خون سے تر تھا۔ سارا جنٹ رابنسن زخموں سے بچ رہا تھا۔ اس کے سینے اور شانوں میں خنجر گھونپا گیا تھا۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ فنی ہسٹریائی اعزاز میں جیتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور مسز سیوارڈ خوف سے تھر تھر کا پتی ہوئی، بیڈروم کے ٹوٹے

لہذا لہرا کر چیخ بھی رہا تھا۔ اس نے ملٹری پولیس، سٹی کانسٹیبلری، وفاقی سراخ رسائوں اور تمام گاؤں کو چیلک بلاؤنگز کو متعلقہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر کی تمام سڑکوں پر گشت کرنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی فورڈس ٹھیکڑ کو سر پہ مہر کرنے اور اس ڈرامے آرزو ”امریکن کزن“ کے ایک ایک فنکار کو گرفتار کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔

اس نے واشنگٹن سے قاتلوں کے راہ فرار کو مسدود کرنے کے لیے ریلوے ٹرمینل پر پولیس فورس کی بھاری جمعیت کو متعین کر دیا تھا۔ نینول فورسز کو بھی دریائے پونومیک کی ناکہ بندی کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ آرمی فورس کو دارالخلافہ سے مشرق، شمال مشرق، شمال مغرب اور جنوب کی سمت نکلنے والی چھ سڑکوں کی ناکہ بندی کرنے کی ہدایات دے چکا تھا لیکن فرار کے دور استوں کو بالکل کھلا چھوڑ دیا تھا جس سے سازش کرنے والے نیوی یارڈ برج کے طویل جنگلات سے گزر کر دریائے ان کو بیٹا عبور کر کے بہ آسانی فرار ہو سکتے تھے۔ یہ دونوں سڑکیں زیریں میری لینڈ تک رہنمائی کرتی تھیں۔ یہ علاقہ انڈر گراؤنڈ باغیوں کا علاقہ رچمنڈ کی گزرگاہ تھا۔ یہ امر انتہائی ناقابل فہم ہے کہ واشنگٹن نے جب واشنگٹن سے باہر جانے والی ہر سڑک کی ناکہ بندی کر دی تھی تو قتل کی پوری رات یہ دونوں سڑکیں پوری کھلی چھوڑ دی تھیں؟

☆.....☆

چونکہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔ حفاظتی اقدامات کے تحت نیوی یارڈ برج کا پچاسک رات کے 9 بجے بند کر دیا جاتا تھا۔ 14 اپریل کی اس رات برج کا گاؤں کے کمانڈر سارجنٹ سلاسل گورنر دس بج کر پچیسٹائیس منٹ برتاریکی میں ڈوبی ہوئی گیارہویں اسٹریٹ پر کسی تیز رفتار گھوڑے کی ٹاپ سٹائی دی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اگلے چند ہی سیکنڈ میں ایک گھڑسوار ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ایک سنتری نے بڑھ کر گھوڑے کی راس تمام لیں۔

”جناب آپ کون ہیں؟“ سارجنٹ سلاسل نے پوچھا۔

”میرا نام بوتھ ہے۔“ گھڑسوار نے جواب دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔“

سارجنٹ نے سوچا کہ وہ کسی رئیس کا بیٹا ہو گا جو

دارالخلافہ میں عیاشی کرنے کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر سوار کا جائزہ لیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ سہلہ کر بولا۔ ”آپ جاسکتے ہیں۔“

بوتھ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے ہل عبور کرتا چلا گیا۔

محکمہ جنگ نے کبھی سارجنٹ سلاسل کے اس رویے کی نہ تو کوئی تحقیق یا تفتیش کی اور نہ ہی مذمت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اس کے افسران اعلیٰ نے اس کے فیصلے کو بد قسمتی سے تعبیر کیا اور قابل درگزر سمجھ کر قبول کر لیا۔ سارجنٹ کے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ رات گئے وہاں سے گزرنے والے گھڑسوار نے کچھ ہی دیر پہلے ریاست ہائے متحدہ کے صدر کا قتل کر دیا ہے۔

تاریخ کے ریکارڈ میں بہت سی بڑی بڑی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور اس رات صدر کا قاتل جان بوتھ ان میں سے ایک کوتاہی کا سہارا لے کر شہر سے نکل گیا تھا۔ کیا یہ اندازے کی غلطی تھی؟ یا کہ ایسی غلطیاں ڈیزائن کی گئی تھیں۔ اس رات بوتھ کو ہل پر سے گزرنے کی اجازت دینا، تاریخ میں اکیلے سارجنٹ ہی کا حصہ نہیں ہے۔ بوتھ کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر کے بعد دوسرا گھڑسوار اپنے گھوڑے کو سر پٹ بھاگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ وہ ڈیوڈ ہیر ولڈ تھا۔

”تم کون ہو؟“ سارجنٹ سلاسل نے اس سے شناخت کا مطالبہ کیا۔

”میرا نام تھامس ہے۔“ ہیر ولڈ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”تم اتنی رات گئے گھر سے باہر کیا کر رہے ہو؟“ سارجنٹ نے پوچھا۔

”میں ایک عورت سے ملنے گیا تھا۔“ ہیر ولڈ نے جواب دیا۔ ”اب میں واپس گھر جا رہا ہوں۔“

سارجنٹ کو وہ گھڑسوار بے ضرر لگا۔ لہذا اس نے سنتری کو پچاسک کھولنے کا اشارہ کر دیا ہیر ولڈ بڑی آسانی سے فرار ہو گیا۔ اسے گئے ہوئے صرف چند ہی منٹ گزرے تھے کہ تیسرا گھڑسوار بھی اپنے گھوڑے کو بگٹ بھاگاتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ وہ اسٹبل کا مالک پچر تھا جس سے ہیر ولڈ نے گھوڑا کرائے پر لیا تھا اور پچر نے گھوڑا رات 9 بجے واپس اسٹبل پہنچانے کی تاکید کی تھی۔ ہیر ولڈ، وزیر داخلہ سیدوارڈ کے گھر سے بھاگتے ہوئے اس اسٹبل کے پاس

سے گزرا تھا اور چارج لپچر کی نظر اس بھاگتے ہوئے گھڑسوار اور گھوڑے پر پڑ گئی تھی۔ وہ اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور ہیرولڈ کا پیچھا کرتا ہوا اس بل تک آ گیا تھا۔

”مجھے بل کے اس پار جانا ہے۔“ اس نے سارجنٹ سلاس سے اصرار کیا۔ ”وہ شخص میرا گھوڑا چرا کر بھاگ رہا ہے۔“

لیکن سارجنٹ سلاس نے اس رات تیسری فاش غلطی کی۔ ”بلی بند ہو چکا ہے۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”تم نہیں گزر سکتے واپس جاؤ۔“

چارج لپچر کا رے غصے کے خون کھول اٹھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو موڑ کر سر پٹ بھگاتا ہوا سیدھے دانشمنین پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچا۔ ”میرا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”پوری نیوی یارڈ برج سے فرار ہو گیا ہے۔“

سپرٹنڈنٹ نے فوراً ان ہلاکتوں کا تعلق مفردوں سے جوڑ دیا اور آری ہیڈ کوارٹرز سے درخواست کی کہ انہیں فوری گھوڑے فراہم کیے جائیں تاکہ پولیس کی حجت کو ان مفرد قاتلوں کے تعاقب میں روانہ کیا جاسکے۔ آری ہیڈ کوارٹرز نے جواب دیا کہ ان کے پاس کوئی گھوڑا دستیاب نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے پولیس کو ہدایت کی کہ ہیڈ کوارٹرز میں جم کر بیٹھے رہو اور ملٹری کو یہ تعاقب ہینڈل کرنے دو لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ انہیں اگلے دن اس کا ہوش آیا۔ جب تک قاتل کہیں سے کہیں فرار ہو چکے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں ہوا؟ آری ہیڈ کوارٹرز نے سپرٹنڈنٹ کی درخواست پر کیوں نہیں کان دھرا اور خود کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا سرخ فیتہ راہ میں حائل ہو گیا تھا یا ایڈون اسٹینن کے ناقابل فہم رویے کے پیچھے کوئی گھناؤنی سازش کا فرما تھی؟ اس کا جواب آج تک نہیں مل سکا۔

☆.....☆

دریائے اناکوسٹیا عبور کرنے کے بعد ہیرولڈ بوتھ سے مل گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ شال کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ آدھی رات ہوتے ہوتے بوتھ اپنے غٹھے میں آنے والی موج سے بے حال ہو گیا۔ لیکن کے ہاگس سے اس پر چلاٹک لگانے پر اس کے ہائیں غٹھے میں موج آگئی تھی اور اب گھوڑے پر سوار ہر جگہ پر تکلیف بڑھ رہی تھی۔ درد اس قدر شدید تھا کہ اسے التلیاں ہونے لگیں۔ اسے براعڑی کی

سخت طلب محسوس ہو رہی تھی، اس کا گلخٹک ہو رہا تھا۔ دانشمنین سے دس میل دور ایک مقام سرات ویل میں ایک سرائے تھی جہاں سازشیوں نے اپنے اسلحے کا ایک ہینڈل چھپا رکھا تھا۔ یہاں وہ دونوں رکے اور سرائے کے مالک جان لائڈ کے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر اسے نیند سے جگا یا۔ اس نے ان کے طلب کرنے پر اسلحے کا وہ ہینڈل لا کر ان کے حوالے کر دیا۔ اس دوران بوتھ دھکی سے اپنی پیاس بجھاتا رہا۔ پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر پورٹ ٹوبیو کی سمت روانہ ہو گئے جہاں ایک کچی انہیں دریائے پوٹومیک عبور کرانے کے انتظار میں تھی لیکن ابھی وہ منزل بہت دور تھی۔

اب تک بوتھ کا بھرا اس بری طرح سوچ چکا تھا کہ اسے اپنا بوٹ اس پیر میں لوہے کے ٹکٹے کی مانند کسا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے ہیرولڈ سے کہا کہ اسے کوئی ڈاکٹر ڈھونڈنا پڑے گا۔ قریب تر سن جگہ بری ان ڈاؤن تھی جہاں ڈاکٹر سیوینل ہوا کرتا تھا۔ پچھلی سردیوں میں بوتھ اکثر اس کے پاس آتا رہا تھا لیکن وہ ڈاکٹر سیوینل کی سیاسی وابستگی کے بابت وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس کے پاس جانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک ہلاکت خیز فیصلہ تھا۔ صبح کے تقریباً چار بجے ہیرولڈ، بوتھ کی رہنمائی کرتا ہوا، سیوینل کے فارم پر پہنچا اور سڑک کی طرف پھٹنے والے پھانک پر زور زور سے دستک دینے لگا۔

”کون ہے؟“ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے پکار کر پوچھا۔

”ایک شخص گھوڑے سے بری طرح گر گیا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔“ ہیرولڈ نے پکار کر کہا۔ ”کیا ڈاکٹر اس کی ٹانگ ٹھیک کر دے گا؟“

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر سیوینل ڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوتھ کو ہیرولڈ کی مدد سے گھوڑے سے اتارا اور دونوں اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ بوتھ نے ایک شال سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا تاکہ ڈاکٹر سیوینل اسے پہچان نہ سکے۔ ہیرولڈ نے ڈاکٹر سے بوتھ کا تعارف مسرتابی سن کی حیثیت سے کرایا۔ بعد ازاں ڈاکٹر نے حکام کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہی وجہ تھی کہ وہ اور اس کی بیوی اس مفرد زخمی کو پہچاننے سے قاصر رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر نے بوتھ کے جوتے کو کٹ کر کھول دیا اور پچھلیوں کی مدد سے

اس کے پیرکسیدھا رکھنے کے اقدامات کیے۔ پھر اس کے جسم پر کبل ڈال کر میج ٹرک کے اپنے کیمپ پر کام کرنے چلا گیا۔

دو پہر میں فارم سے واپس آ کر اس نے ہاتھ کے پیرکا پھر معائنہ کیا۔ ہاتھ نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا تھا۔ یہ بات کسی بھی فزیشن کو جس کر سکتی تھی اور وہ اپنے مریض سے اس کی وجہ پوچھ سکتا تھا لیکن ڈاکٹر مل کے بیان کے مطابق اس نے مریض سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بجائے وہ کھلیان میں گیا اور اس کے لیے ایک بیساکھی بنا کر لایا۔ اسی سہ پہر وہ دونوں گھڑسوار وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆.....☆

وہ سہ پہر سے مسلسل بھاگ رہے تھے اور اب رات ہو گئی تھی۔ جنگل میں ایک چرچ کے قریب وہ راستہ بھول گئے۔ وہ جس پلٹ پڑی پر بڑھ رہے تھے وہ پلٹ پڑی دلدلی علاقہ میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ وہ کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔ گھڑسوار کی وجہ سے اب ہاتھ کے دونوں پیر زخمی ہو گئے تھے اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ جب اس نے گھوڑے سے اتر کر پیدل چلنے کی کوشش کی تو اس کی بیساکھی کچھڑ میں جھنس گئی۔ وہ بار بار کرتے پڑتے ہوئے ہفتے کی آدمی رات کو کرٹل کاس کے ہاں پہنچ پائے لیکن اس وقت تک دریائے پوٹومیک کو عبور کرنا بے حد خطرناک ہو چکا تھا۔ وفاق کے سپاہی چپے چپے پر موجود تھے۔ چنانچہ کرٹل کاس نے انہیں چھ دن تک اپنے گھر سے دو میل دور ایک دلدلی علاقے میں چھپائے رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتا رہا۔ اس دوران فوجی اور پولیس شکاری کتوں کی طرح ان کی ہوسختی پھر رہی تھی۔

اس دوران ہاتھ نے اپنے خیالات ایک ڈائری میں محفوظ کیے جو خود ستانی کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اس نے خود کو ایک ایسے ہیرو سے تشبیہ دی جسے عوام الناس سمجھ نہیں سکے۔ اس کا مشن اتنا اعلیٰ و ارفع تھا کہ عام انسانوں کو اس کا ادراک نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتا ہے۔

”کاش دنیا میری عظمت کو سمجھ سکے کہ ایک ہی گولی نے مجھے کتنا عظیم بنا دیا ہے حالانکہ مجھے عظمت کی کوئی خواہش نہیں۔ میں یہاں جنگل اور دلدل میں سردی سے شہر رہا ہوں اور فاقے کرنے پر مجبور ہوں۔ فوج اور پولیس کی بھاری نفی شکاری کتوں کی طرح میری ہوسختی پھر رہی ہے۔ ہر شخص کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی ہے۔ میں یہاں

بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں پڑا ہوں، تو کیوں؟ میں نے آخر کیا کیا ہے؟ میں نے تو آج تک کسی سے نفرت نہیں کی، کسی کو اپنی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میرے اندر ایک عظیم روح ہے، میں ایک مجرم کی حیثیت سے مرنا نہیں چاہتا۔“

☆.....☆

قتل کی اس بھیانک اور تاریخی رات کو واشنگٹن پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میجر ایس ریچرڈز بھی خود ڈس تھیر میں تماشاخیوں کے درمیان موجود تھا اور اس نے ہاتھ کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھ کر صدر کے باکس کی طرف بھاگا۔ باکس کے باہر کرسی پر وہ گاڑا موجود نہیں تھا جسے پہرہ دینے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ ریچرڈز اس پہرے دار کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر بھاگتا ہوا، پولیس ہیڈ کوارٹر میں پہنچا اور اس نے دس منٹ کے اندر اندر مشینری کو حرکت دے دی۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود فورس کو مختصر الفاظ میں اس قومی سانحے سے آگاہ کرتے ہوئے، ریزرو پولیس کو فوری طلب کر لیا اور جاسوسوں کی ایک فوج کو فورڈس تھیر روانہ کر دیا۔

رات بارہ بجے کے بعد 15 اپریل کی تاریخ شروع ہو گئی۔ رات کے دو بجے تک فورڈس تھیر میں موجود سارے تماشا بینوں سے سخت پوچھ گچھ کی جاتی رہی جس کے نتیجے میں تین نام ابھر کر سامنے آئے۔ جان ولکس ہاتھ، ڈیوڈ ای ہیرولڈ اور جان، ایچ سرات سپرنٹنڈنٹ ریچرڈز کو ایک اہم سچے کا بھی علم ہو گیا۔ 1541 ایچ اسٹریٹ، ریچرڈز نے فوراً سراغ رساں جان کلارڈ کو حکم دیا کہ اس بورڈنگ پر چھاپہ مار کر ہاتھ اور سرات کو گرفتار کرے۔ جان کلارڈ نے اپنے دس سراغ رسالوں کی معیت میں رات کے سوادو بجے بورڈنگ ہاؤس پر چھاپہ مارا۔ وہاں کے ایک رہائشی لوگ دو بجے میں نے اطلاع دی۔ دروازہ کھولا۔ سارے سراغ رساں ایک ساتھ اندر کھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ پھر جب وہ واپس ہال میں آئے تو لوگ نے ناگواری سے ان سے پوچھا۔ ”معموز حضرات! رات کے اس پہر اس خانہ تلاشی کا کیا مطلب ہے؟“

کلارڈ نے اسے سخت نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں پتا ہی نہیں۔ پچھلی رات کو کیا سانحہ پیش آیا ہے؟“

رہائشی لوگ نے اسے خالی نظروں سے اس کی طرف

”میتے ہوئے لٹی میں سر ہلایا۔“ ”نہیں۔“

کلاردو نے ایک سیاہ گلوبند اسے دکھایا جس پر خون کے دھبے تھے۔ ”کیا تمہیں اس پر خون نظر آرہا ہے؟“
لوئس اس خون آلود منظر کو گھورنے لگا۔

اسی وقت مسز سرات اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی۔
لوئس نے وہ خبر اسے سنائی۔ بیوہ مسز سرات یہ سن کر بوکھلا گئی۔ ”اودہ خدایا! مسٹر وچ مین۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر متوحش لہجے میں بولی۔ ”ایسا مت کہو۔“
کلاردو کو اس کے تاثرات بالکل اصلی لگے۔ مسز سرات نے پوچھ گچھ کے دوران اعتراف کیا کہ اس نے بوتھ کو گزشتہ روز سہ پہر کے دو بجے دیکھا تھا لیکن اس نے زور دے کر کہا کہ اس نے اپنے بیٹے جان سرات کو دودھ پینے سے نہیں دیکھا کلاردو کو بوتھ اور جان سرات دونوں کو گرفتار کرنا تھا لیکن دونوں ہی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔
وچ مین نے رضا کارانہ پیشکش کی کہ وہ افسروں سے تعاون کرنے کے لیے صبح آٹھ بجے پولیس ہیڈ کوارٹر آئے گا اور اس یقین دہانی کے ساتھ سراغ رساں رخصت ہو گئے۔

☆.....☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مسز سرات کے سر پر تقصا ناچ رہی تھی۔ سوموار 17 اپریل کی رات کو دانشمن آری فورس کے کمانڈر انچارج جنرل کرستوفر نے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہر فرد کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ کرستوفر کے آدی پارلر کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران بورڈنگ ہاؤس کی خواتین اپنے لباس پہن رہی تھیں۔ بعض سپاہی بورڈنگ ہاؤس کے باہر تاریکی میں کھڑے تھے۔ رات کے تقریباً گیارہ بج کر تیس منٹ پر فٹ پاتھ پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک راہ گیر اپنے شانے پر ایک کدال اٹھائے ہوئے نمودار ہوا اور بورڈنگ ہاؤس کے سامنے رک کر اس نے کال بیل بجائی۔ اندر موجود پولیس والوں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گیا۔ سراغ رسالوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جواب دیا کہ مسز میری سرات نے صبح ہی اسے ایک گڑھا کھودنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی کہ مسز میری سرات کمرے میں داخل ہوئی۔

”کیا تم اس مزدور کو جانتی ہو؟“ ایک سراغ رساں نے نووارد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”خدا گواہ ہے۔ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

اگلے ہی لمحے سراغ رسالوں نے نووارد پر ریوالور تان لیے۔ ”اپنی شناخت کراؤ۔“

”لغنت ہو۔“ نووارد جلتے بجئے انداز میں بڑبڑایا اور پھر اس نے ایک سندان کی طرف بڑھادی۔

اس سند پر اس کا نام لوئس پین تھا۔ پولیس نے اسے اسی وقت گرفتار کر لیا لیکن وہ اپنے اسی موقف پر ڈٹا رہا کہ وہ گڑھا کھودنے والا مزدور ہے۔ وہ لوگ اسے لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر آ گئے اور پھر انہوں نے وزیر داخلہ مسٹر سیوارڈ کے ٹیکر ملازم ولیم بیل کو طلب کر لیا۔ ولیم بیل پہلی ہی نظر میں پین کو پہچان گیا۔ پولیس نے پین کو فوراً دہری تھکڑیاں پہنا دیں اور دریاے پٹومیک میں قیدیوں کے نئی جہاز ساؤکس میں سوار کر دیا جہاں اسے دیگر قیدیوں سے الگ تھلگ قید خانگی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی محکمہ جنگ نے اعلان کر دیا کہ انہوں نے وزیر داخلہ کے حملہ آور کو گرفتار کر لیا ہے۔

☆.....☆

اس سال 17 اپریل 1865ء کا ایئر سوسمار سرکاری ایجنسیوں کے لیے خوش قسمتی کا دن ثابت ہوا۔ یہ صبح ہے کہ لیکن کا قاتل اور اس کے ساتھی اب تک مفرد تھے۔ تاہم اس سلسلے میں ہونے والی گرفتاریاں خاصی موثر تھیں۔ مسز میری سرات، لوئس پین، بوتھ کے دو گرگے مائیکل اولافلین اور سیوئیل بی آرڈل کے علاوہ بوتھ کا ارول ایڈورڈ بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ اگلے دو دن میں ایک اور اہم سازشی جارج ایزیوٹ بھی 19 اپریل کو اپنے کزن کے فارم ہاؤس سے گرفتار ہو گیا۔ وہ نشے میں دھت اور شراب سے تر تھا۔ اسے بھی قیدیوں کے جہاز ساؤکس کی ایک کونٹری میں دیگر قیدیوں کے ساتھ پیچک دیا گیا۔

ان میں سے کسی بھی قیدی پر فرد جرم عائد نہیں کی گئی تھی۔ محض قتل کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ مقدمہ بعد میں چلایا جانا تھا۔ انہیں بے پناہ اذیت دی گئی۔ تاہم اسٹینٹن اس پر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے 23 اپریل کو ایک حکم جاری کیا کہ جہاز پر موجود سارے قیدیوں کے سروں پر کیٹوس کے بیک پہنائے جائیں اور گردن پر کس دیئے جائیں۔ یہ کیس ماسک جیسے تھے۔ ان میں صرف ناک اور منہ کے پاس سوراخ تھے جن سے وہ سانس لے سکتے تھے اور کھانا پیتے

تھے لیکن دیکھنے اور سننے سے محروم تھے۔ کیوں کے بیک اوڑھائے جانے کے بعد قیدیوں کی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ گردن پر ڈوری کی سخت بندش کی وجہ سے انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے سر جن نے اس ظالمانہ اور غیر انسانی سلوک پر اسٹینشن سے احتجاج کیا کہ قیدیوں کے گلے کی بندش ذرا ڈھیلی کی جائیں تاکہ ان کا دم نہ گھٹ جائے لیکن اسٹینشن کی طرف سے اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قیدیوں میں سب سے عظیم الجذہ لوگس پنن کے لیے یہ ناقابل برداشت ہو گیا اور وہ بالکل ہو گیا۔ اس نے اپنا سر گونڈھری کی دیوار سے ٹکرا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

ایئر سمارٹک فائلوں کی تلاش پھیل کر ملک گیر ہو گئی تھی۔ جو کے ساتھ گھن بھی بسنے لگے۔ ایسے بے گناہوں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی جو صدر لنگن کے قاتل کی بات کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہیں صرف شریک جرم یا معاون ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ریجنل ملٹری پولیس نے ان مشتبہ افراد کو واسٹنگٹن روانہ کر دیا۔ جلد ہی سی پولیس اور دور دراز کے علاقوں کے شہر کی کارروائیوں کے نتیجے میں جیلیس مشتبہ افراد سے بھر گئیں اور پھر بوتھ کے رشتے داروں پر سرکاری ایجنسیاں قہر بن کر نازل ہوئیں۔ بوتھ کی بہن آسیا بوتھ کلارک کا جو پانچ ماہ کی حاملہ تھی، اس وقت نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوئے رہ گیا جب پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنا کر کھینچتے ہوئے، واسٹنگٹن کے پرانے جیل میں لے جا کر ڈال گئی جب کہ وہ بالکل بے گناہ تھی۔

اس کے بعد بوتھ کے بھائی جوئیس جوئیر پھر تھوٹا۔ وہ قتل کی رات سنٹانی میں ایک ڈراما کر رہا تھا۔ اس دوران لنگن کے قتل کی خبر وہاں پہنچی اور مشتعل ہجوم نے اس کے ہوٹل کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ بڑی مشکل سے ایک بگلی راستے سے جان بچا کر بھاگا اور ہمیں بدل کر فرضی نام سے مشرق کی سمت روانہ ہو گیا لیکن 26 اپریل کو فوڈا ٹیپیا میں گرفتار ہو گیا۔ جب پولیس نے اسے جیل میں ڈالا تو غصے کی شدت سے اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے خانہ جنگی کے دوران شمال کی حمایت کی تھی۔

بوتھ کے دوسرے بھائی جوزف بوتھ کے سر پر اس وقت حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب اسے سان فرانسسکو سے نیویارک پہنچتے ہی اسٹیر میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی پولیس نے اسے ٹھیک ٹھاک طریقے سے مرگڑا اور چند گھنٹوں کے بعد ہار کر دیا۔ وہ اس

تجربے کو کبھی نہیں بھول سکا اور کئی سال تک وہ بوتھ کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔ اسٹینشن کو جب کوئی قابل ذکر سراغ ہوتا تھا نہ آیا تو اس نے بوتھ کی فیملی کو جیلوں میں ٹھونٹنا شروع کر دیا۔

مزے کی ایک اور بات سامنے آئی۔ جب پورا ملک صدر لنگن کے قتل پر بستے کے عالم میں تھا، بوتھ کی موجودگی کی ایک درجن رپورٹیں ملیں۔ واسٹنگٹن کے کئی شہریوں نے دعویٰ کیا کہ بوتھ کو انہوں نے ہنسلوانیا ایونیو پر دیکھا تھا۔ نیویارک کے شہریوں کو وہ براڈوے پر نظر آیا۔ نیا گرافانو، بوٹن اور شکاگو سے بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ ہنسلوانیا میں پولیس نے ایک شخص بوتھ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ اس کا پورا نام بھی جان و لیس بوتھ تھا۔ لیکن وہ کوئی اور تھا۔ اس طرح پولیس اس نام کے ایک اور بے گناہ شخص کا ڈیٹا بیس سے پچھا کرتی ہوئی مونٹریال پہنچ گئی اور اسے پکڑ کر دم لیا لیکن وہ بے چارہ بھی کوئی اور بوتھ تھا۔

☆.....☆

17 اپریل 1865ء سے بوتھ کی ملک گیر تلاش نہایت زور و شور سے شروع ہو گئی۔ زیریں میری لینڈ میں پرنس جارج اور چارلس کاؤنٹی کے علاقے دس ہزار کھوڑوں کی ٹاپون سے قمر اٹھے۔ سواروں کو بوتھ کا سراغ لگانے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی۔ ایٹلس فریش اور پورٹ ٹوبیکو جیسے مقامات پر لگ بھگ آدھے گاؤں والے جان سرات، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایزروٹ سے واقف لگتے تھے۔ سرات ویل میں سرائے کے مالک لائڈ پر اس وقت بجلی کی گری جب ایک شہ سوار دستہ اس کے ہاں آیا۔ فوج کی اتنی بڑی نفری دیکھ کر اس پر کچلی طاری ہو گئی۔ جب فوجیوں نے اس سے پوچھا کچھ شروع کی تو وہ بلا پس و پیش سب کچھ اٹھا چلا گیا اور یوں پھانسی کے پھندے سے بچ کر وفاقی حکام کی گود میں بیٹھ گیا اور حکومت کا سب سے اہم گواہ بن گیا۔

اس نے حلفہ بیان دیا کہ قتل کی شام مسز میری سرات اس کے پاس آئی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اس کے سرائے میں جو اسٹے چھپائے گئے ہیں، ان اسٹوں کی آج رات ضرورت پڑ سکتی ہے اور وہ اسٹے رات میں طلب کیے جاسکتے ہیں۔

لائڈ کی یہی گواہی بعد میں مسز میری سرات کو پھانسی پر لٹکانے کے کام آئی۔ لائڈ نے یہ بھی اقرار کیا کہ قتل کی رات جان بوتھ، واسٹنگٹن سے فرار ہوتے ہوئے اس کے ہاں رکا

ماہنامہ سمرکز شت

ماہنامہ سمرکز شت کے فرار کی راہ کا تعین ہو گیا۔
اس جال میں پھنسنے والا دوسرا اہم مشتبہ ڈاکٹر سیوسٹیل
ایفٹینٹ کو ڈاکٹر ڈی جی جی کی گدی اور اس نے
انڈیا کے سرائے پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کر لیا۔ شروع
شروع میں ڈاکٹر ڈی جی جی میں کچھ نہیں آیا لیکن پھر اس نے
صرف یہ اقرار کیا کہ دو گھڑ سوار 15 اپریل کی رات کے
اولین پہر میں اس کے ہاں آئے تھے اور ان میں سے ایک
گھڑ سوار کے ٹوٹے ہوئے ٹخنے کا علاج کرایا تھا جو اپنے
گھوڑے سے گر گیا تھا۔

”کیا تم انہیں جانتے تھے؟“ ایفٹینٹ نے چبھتا ہوا
سوال کیا۔

”نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ دونوں میرے لیے بالکل
اجنبی تھے۔“ ڈاکٹر نے ہرگز دیر لمبے میں جواب دیا۔
لیکن جب اس سے سختی سے باز پرس کی گئی تو اس نے
اتر اتر کر لیا۔ ”ہاں وہ بوتھ ہی تھا جس کی ٹانگ کا میں نے
طالع کیا تھا اور میں نے دلدل عبور کرنے میں اس کی مدد کی
تھی۔“

☆.....☆

اب جال کسا جانے لگا۔ 20 اپریل کو وزیر دفاع
ایٹنٹن نے ایک سخت اعلان جاری کیا۔ ”ان تمام لوگوں کو
جنہوں نے بوتھ اور ہیر ولڈ کو پناہ دی، ان کی پشت پناہی کی،
ان کے سراغ پر پردہ ڈالا، کسی بھی طرح سے ان کی مدد کی یا
ان سے تعاون کیا یا ان کے فرار میں مدد دی یا انہیں پوشیدہ
رکھا، انہیں صدر کے قتل میں شریک جرم سمجھا جائے گا اور اس
کا مقدمہ ملٹری کمیشن میں چلایا جائے گا۔ اسے سزائے موت
ہی دی جاسکتی ہے۔“

اس اعلان نے زیریں میری لینڈ میں زبردست سنسنی
پھیلا دی۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے
انے لگے۔ پھر بھی اطلاعات کا سلسلہ جاری رہا۔
ہوسٹ مارشل جیمز آراو، ہیر نے 21 اپریل کو یہ اطلاع
وصول ہوئی کہ کرنل سیوسٹیل کا کس کے ایک ملازم کا کہنا
ہے کہ اوپر کچھ دنوں سے کرنل کا کس خود اپنے ہاتھوں سے
لٹا ہوا کر دلدلی علاقے کی طرف لے جاتا رہا ہے۔

یہ ایک اہم اطلاع تھی لیکن مارشل جیمز کے سراغ
مالوں کو اس تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ جب وفاق کا رسالہ
ارل کا کس کے مکان کے پچھواڑے دلدلی علاقے میں
پہنچا تو بوتھ اور ہیر ولڈ دریائے پوٹو میک کو عبور کر کے درجینیا

میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ قتل کی رات کے ایک ہفتے کے بعد
جمعہ اور ہفتے کی شب کے درمیان کا واقعہ ہے۔ درجینیا پہنچ
کر ہیر ولڈ نے ایک خاتون سز کوئینز ہیری کو تلاش کیا جو
ایک انڈر گراؤنڈ سازشی اور اس کی رہنمائی کارمچی۔ سز کوئینز
ہیری نے ان دونوں کو چوری چھپے اپنے آدمیوں کے ہمراہ
دوسری جگہ بھیج دیا۔ وہاں ان آدمیوں نے انہیں رازداری
سے ایک دوسرے گروپ کے حوالے کر دیا۔ اس طرح کئی
ہاتھوں سے گزر کر وہ جنگل میں واقع لوکاس نامی ایک سیاہ
قام کے کیمپ تک پہنچے۔

”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ لوکاس نے
انہیں اپنے سامنے پا کر پوچھا۔

”ہم یہاں رات گزارنا چاہتے ہیں۔“ ہیر ولڈ نے
کہا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ لوکاس نے جواب دیا۔
”میں سیاہ قلم ہوں اور مجھے سفید قلموں کی مہمان نوازی
کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس
صرف ایک ہی کمر ہے اور میری بیوی بیمار ہے۔“

بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے بوتھ نے اپنا منہ
ٹکا لیا۔ ”بڑھے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس
کا لہجہ سفاک تھا۔

بوڑھا لوکاس اور اس کی بیوی بے چوں و چرا کیمپ
سے باہر جا کر سڑکیوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ساری
رات اسی طرح گزار دی۔ صبح میں وہ دونوں لوکاس کے
گھوڑے لے کر وہاں سے چلے گئے۔

☆.....☆

سوموار کو ان دونوں بھگورڈوں کی ملاقات تین
سپاہیوں سے ہوئی جو بغاوت کا ساتھ دینے والوں میں
تھے۔ بوتھ اور ہیر ولڈ نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور مدد
طلب کی۔ ان میں سے ایک اٹھارہ سالہ کیپٹن دلی ایس
جیٹ رضا کارانہ طور پر ان کی رہنمائی کرتا ہوا انہیں درجینیا
کے پورٹ رائٹل سے تین میل دور جنوب میں واقع ایک قصبہ
رچرڈ گھیرٹ کے فارم پر لے گیا۔ وہ جگہ واشنگٹن سے اٹھتر
میل دور تھی۔ وہاں کیپٹن جیٹ نے رچرڈ سے ان الفاظ میں
بوتھ کا تعارف کرایا۔ ”یہ میرا دوست جان ولیم ہوائڈ ہے،
ایک سپاہی۔ یہ رچرڈ کی جنگ میں زخمی ہو گیا ہے۔ میں بدھ
کی صبح خود آکر انہیں لے جاؤں گا۔ تب تک ہر طرح سے
ان کا خیال رکھنا۔“

لیکن کیپٹن جیٹ بدھ کی صبح کے بجائے منگل کی شام کو اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا رچڑ کے مکان کے بیرون پھاٹک پر آکا اور اس نے وہیں سے سچ کر بوتھ کو خبردار کیا۔ ”دفاق کے نیلے کوٹ والے فیری سے دریا سے رپائونک عبور کر کے پورٹ رائل پہنچ رہے ہیں۔“

یہ سن کر بوتھ اور ہیر ولڈ کے ہوش اڑ گئے۔ کیپٹن جیٹ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چلا گیا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ شام کے جھپٹے میں پوری فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ فوج کا ایک دستہ بولے کی مانند رچڑ کے پھاٹک کے سامنے سے گزرا۔ وہ دستہ کیپٹن جیٹ کے تعاقب میں تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے رچڑ کے نوجوان بیٹے ولیم کیرٹ نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ”یہ لوگ بھینا باؤ لنک گرین جا رہے ہیں۔“

بوتھ اور ہیر ولڈ بھی کہیں جا رہے تھے۔ کیرٹ اور اس کی فیملی کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ان دونوں مہمانوں کو ٹوبیکو فارم کے پچھواڑے واقع پائن کے جنگلات کی طرف جاتے دیکھا۔ بوتھ اپنی بیساکھی کے سہارے مسکھ خیز انداز میں پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ دونوں کٹنے جنگل میں غائب ہو گئے اور اپنے پیچھے شک و شبہ میں مبتلا ایک حیران اور ششدر فیملی کو چھوڑ گئے۔

ان دنوں کیرٹ ہاؤس میں کسان رچڑ کیرٹ کی سالی ہولووے ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ اس کے مطابق اس کا بھانجا ولیم، ان مہمانوں کے اس عجیب و غریب رویے سے بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے بارے میں تحقیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آس پاس کے لوگوں سے اسے معلوم ہوا کہ نیلے کوٹ والے شہسوار ایک لنگڑے اور اس کے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس وقت تک بوتھ اور ہیر ولڈ وہیں آچکے تھے۔

ولیم نے انہیں دیکھ کر غصے سے کہا۔ ”تم لوگوں کو صبح میں یہاں سے ہر صورت میں جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کی وجہ سے میرا باپ کسی مصیبت میں پڑے۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رات میں جب سب لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے تو ایک عجیب بات ہوئی۔ بوتھ نے بالائی منزل پر سونے سے انکار کر دیا۔ وہ بالائی منزل کے سوا کہیں بھی سونے کو تیار تھا۔ چنانچہ ولیم انہیں سلانے کے لیے تہہ تہا کی کھلیان میں لے گیا اور وہ

جیسے ہی کھلیان میں داخل ہوئے اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے قفل لگا دیا اور چابی اپنی خالہ مس ہولووے کو دے دی۔

”یہ چابی کسی کو بھی مت دینا۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”کیونکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ دونوں ہمارے گھوڑے چما کر فرار ہو جائیں گے۔“

یہ معاملہ عجیب اور ناقابل فہم ہے۔ کیونکہ بوتھ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر تھی۔ جو بھی اسے زندہ یا مردہ پیش کرتا، اسے حکومت ایک لاکھ ڈالر انعام دیتی۔ دوسرے یہ کہ بوتھ اور ہیر ولڈ دونوں ہی خطرناک حد تک مسلح تھے جس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر ہو، اس نے اتنی آسانی سے کھلیان میں بند ہونا کیسے قبول کر لیا۔ اگر انہیں اس بات کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ وہ ٹریپ ہو گئے ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ کیرٹ فیملی کو جان سے مار دیتے یا اپنے ربوالور سے دروازے کے قفل کو اڑا کر وہاں سے نکل جاتے لیکن انہوں نے بظاہر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

آدمی رات کے وقت ایک اور عجیب بات ہوئی۔ دفاق فوج کے رسالے نے جس کی کمانڈر یفٹیننٹ ڈوبرٹی کے ہاتھ میں تھی، باؤ لنک گرین میں اس ہولٹ کو گھیر لیا جس میں کیپٹن جیٹ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ فوجیوں نے اسے بستر سے اٹھایا اور اس کی گردن پر ربوالور دکھ کر گھسیٹے ہوئے بالائی منزل سے نیچے لے آئے۔ نوجوان کیپٹن کو کھری نیند سے جگایا گیا تھا اور اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ فوجی فوراً اپنے مطلب پر آگئے۔ ”بتاؤ تم نے انہیں کہاں چھپایا ہے؟ سچ بتاؤ ورنہ تمہارا بہت ہی برا اثر ہوگا۔“

نوجوان کیپٹن پہلے ہی بغاوت کے جرم میں کافی سزا بھگت چکا تھا اور اب اسے اپنے سربراہ تعنا ناجی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ فوراً ٹوٹ گیا۔ اس نے انہیں ان کا ٹھکانا بتا دیا جہاں وہ چھپے ہوئے تھے۔ گویا جان بوتھ کے گرد جال حرا بچک ہو گیا۔

☆.....☆

خوابیدہ مس ہولووے اپنے بیڈ پر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔ باہر گھوڑوں کی ٹاپوں، جھاڑیوں کی سرسراہٹ، دروازے کی زنجیر کی پرسشور اور دل ہلا دینے والی کھڑکڑاہٹ اور برآمدے میں فوجی بوٹوں کی دھمک

ہری لھا قہرا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زبردست ہتھیار آگیا ہو۔ اچانک کچن کے دروازے پر زور زور سے بٹنے لگے۔ لیفٹیننٹ ڈوہرٹی کے سپاہی وہاں اڑھلے تھے۔

”دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو.....!“ باہر سے گرجا

اڑا، آواز میں فوجی پیچھے۔
مس ہولووے نے ایک کھڑکی کے اوپر سر کئے کی اڑائی اور پھر گیرٹ کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“
مس ہولووے بھاگ کر کھڑکی پر پہنچی اور اس نے ہاتھ بٹکا کر دیکھا۔ ہر طرف فوجی ہی فوجی تھے۔ وہ کلیان میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور پھولوں کی کیاریوں کو روند رہے تھے۔

”دروازہ کھولو۔“ انہوں نے دروازے پر بدستور نئے برساتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔“

مس ہولووے ہال کی طرف بھاگی۔ اسے اپنا بہنوئی رچرڈ گیرٹ کا ہاتھ پکڑتا ہوا دیکھتا ہوا اپنے اترتا نظر آیا۔
”رکھو۔“ وہ پکار کر بولا اور کچن کے دروازے کی الجھن کھولنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور دروازہ ٹوٹ کر گرنے کو تھا۔

زنجیر کھلتے ہی دروازہ ایک دھماکے سے پورا کھل گیا اور فوجی دھناتے ہوئے گھس آئے۔ ان کے بوس کچڑ میں لپٹ پٹ تھے۔ چہروں سے بربریت اور سفاکی فیک رہی تھی۔

”ہمیں وہ دو آدمی چاہئیں۔“ لیفٹیننٹ ڈوہرٹی اڑا۔

”وہ تو چلے گئے۔“ رچرڈ گیرٹ کے منہ سے نکلا۔

لیفٹیننٹ نے اس کا گلا دبوچ لیا اور اس کا سر دروازے سے ٹکرا کر اس کی کپٹی پر پڑا اور رکھ دیا۔ ”بکواس بند کرو اور ان باغیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔“ وہ حلق پھاڑ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا۔ ”اس باغی کو پکڑ کر لٹکا دو۔ پھر شاید یہ اپنی زبان کھولے۔“

فوجیوں نے رچرڈ کو فوراً پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے پورچ پر لے گئے۔ پھر اسے اچاٹے کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور موٹے رسوں کا کوئل نکال کر اس کے ہاتھوں پر پھانسی کا پھندا بنانے لگے۔ رچرڈ کے منہ

سے ایک کڑواہٹ نکل گئی۔ فوجیوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور وہ ان کے زرخے میں دم بخود کھڑا تھا۔ فریڈ دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ برآمدے میں اس کی بیوی اور بیٹی خوف اور دہشت سے پچھلی پچھلی نظروں سے یہ تنا قابل یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کی رنگت کفن کی مانند سفید ہو رہی تھی۔ رچرڈ قہر قہر کانپ رہا۔ پھر جونہی ایک فوجی نے اسے کا دوسرا سر درخت کی ایک شاخ کی طرف پھینکا، مس ہولووے کے منہ سے بے اختیار ایک دہشت آمیز چیخ نکل گئی۔ اس موقع پر ولیم کی ذہانت کام آئی۔ اس نے بدوقت مداخلت کی۔

”معزز حضرات، میں آپ لوگوں کو وہاں لے چلتا ہوں۔“ وہ بولا۔

اگلے ایک منٹ میں فوجیوں نے تمباکو کے اس کلیان کو گھیرے میں لے لیا اور ولیم سے چابی لے کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

”باہر نکلو۔“ لیفٹیننٹ ڈوہرٹی جھکنا نہ لے کر جا۔ کلیان اندر میرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر جو لوگ تھے وہ اسلحے بھی رکھتے ہوں گے۔ اندر جاتے ہی وہ حملہ کر دیے اسی لیے فوجی اندر جانے سے ہچکچا رہے تھے۔
جواب نہ مارو۔

”سنو۔“ ایک فوجی آفسر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”ہم کلیان کو آگ لگا کر ان کی جلی ہوئی لاشیں نکال لیتے ہیں۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کچھ جھاڑیاں لے کر آؤ۔“

کئی فوجی حکم کی تعمیل میں ذرا ہی دیر میں جھاڑیوں کا بیڑا اٹھا لائے۔ انہوں نے اسے کلیان کی دیوار کے ساتھ ڈھیر کر دیا، پھر اس پر کچھ خشک لکڑیاں بھی ڈال دیں۔ ”تم دونوں کے لیے آخری موقع ہے۔“ لیفٹیننٹ نے چیخ کر کہا۔ ”ہم تمہیں پانچ منٹ دیں گے۔“

رات کو جیسے سناٹے نے ڈس لیا ہوا اور وقت کی نبض تھم گئی ہو۔ سب لوگ سانس روکے کھڑے تھے۔ کلیان کے اندر گہرا سکوت تھا۔ اچانک ہتھ کی آواز سنائی دی۔ ”تم کون ہو، ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

برآمدے میں مس ہولووے شال اوڑھتے غم کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں رخسار پر بہنے لگی تھیں۔

کسان رچرڈ گیرٹ اپنی جگہ کسی جھبے کی طرح ساکت و سامت کھڑا تھا اور بیسیوں رائفلوں کی نالیں اس

کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کھلیان کے اندر اور باہر ایک بار پھر سناٹا سانس لے رہا تھا۔

”وقت ہو گیا۔“ اچانک لیفٹیننٹ کی آواز سناٹے میں کسی کوڑے کی مانند لہرائی۔

جواب میں کھلیان کے اندر سے ایک گھٹکھاتی ہوئی آواز سنا کی دی۔ ”مجھے اپنی جان بچانے کا ایک سوچ دو۔“

وہ دونوں آپس میں تاریک کھلیان کے اندر ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے۔ پھر بوتھ جیسے پھٹ پڑا۔

”تم ایک بزدل ہو جاؤ جاؤ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ وہ حلق کے بل چیخا۔ آواز میں وحشیانہ پن تھا۔

چند ہی ثانیے کے بعد دروازے کے پیچھے کھڑکڑاہٹ سی ہوئی۔ پھر ایک آواز سنا کی دی۔ ”مجھے باہر آنے دو۔ میں سرسٹر کر رہا ہوں۔“

لیفٹیننٹ ڈوہرنی یہ سن کر دروازے کے بالکل قریب ہو گیا۔ ”جو شخص سرسٹر کرنا چاہتا ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ دروازے سے باہر لگا لے۔“ وہ حکمانہ لہجے میں بولا۔

دروازہ ہوا ہنسی کئی اچھوٹا ہو گیا اور ایک ہاتھ باہر آیا۔ اگلے ہی لمحے لیفٹیننٹ نے وہ ہاتھ پکڑ کر ایک شدید جھٹکا دیا۔

قیدی منہ کے بل کرتے کرتے بچا۔ فوجیوں نے پلک جھپکنے سے پہلے ہی اسے دبوچ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ ہیرولڈ تھا۔

لیفٹیننٹ اسے گھسیٹ کر احاطے کے دوسری طرف لے گیا اور اس نے نہایت چابکدستی سے اسے ایک رے کی مدد سے ایک درخت سے باندھ دیا۔ لیفٹیننٹ کے پاس جھنجریاں نہیں تھیں۔ سارے فوجی خوش سے نعرے لگانے لگے۔ ہیرولڈ کی گرفتاری پر پچیس ہزار ڈالر کا انعام تھا۔

اب بوتھ، کھلیان کے اندر تھارہ گیا تھا اور بڑھکیں مار رہا تھا۔

فوجیوں نے اس کی بڑھکوں کے دوران جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ آنا فانا کھلیان نے آگ پکڑ لی اور پورا کھلیان ایک جیسے جاتے جہنم میں بدل گیا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تاریکی روشنی میں کھلیان کے اندر بوتھ کا ہولا بھجڑے میں قید کسی زخمی درندے کی مانند اپنی بیساحمی کے سہارے ادھر سے ادھر پھد پھدکا پھر رہا تھا۔ وہ جدر بھی جاتا، آگ کے ہمایاںک شعلے اس کا استقبال کرتے۔ اچانک ایک گولی چلی اور بوتھ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اسے جلنے ہوئے کھلیان کے اندر سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ دم توڑ رہا تھا لیکن اس

کا انداز بڑا ہی ڈرامائی تھا گویا وہ اسٹیج پر مرنے کی اداکاری کر رہا ہو۔ ”ماں سے کہتا میں اپنے ملک پر قربان ہو رہا ہوں۔“

لیکن اس نے مرنے میں خاصا وقت لے لیا، بھوکے پیاسے تھکے ہارے، کئی راتوں کے جاگے ہوئے فوجی صبح میں پیٹ بھرنا شتے یا انعام ملنے کی آس میں بوتھ کے مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے رہے۔ بالآخر پوچھے بوتھ نے دم توڑ دیا۔

☆.....☆

اسے کس نے اور کس کے حکم سے شوٹ کیا کیونکہ اسے ہلاک کرنے کے نہیں بلکہ زندہ گرفتار کر کے واپس لانے کے واضح احکامات تھے۔ کیونکہ وہ نہایت اہم سوالات کا جواب دے سکتا تھا۔ لیکن اسے قتل کی سازش میں ملوث لوگوں کے چہروں سے شتاب اتر سکتی تھی۔ کئی سوال حل طلب تھے کہ جان سرات کہاں ہے؟ ریمنڈ میں کس نے مدد کی؟

واشنگٹن میں کتنے لوگوں نے مدد کی؟ وغیرہ لیکن اب وہ مر چکا تھا۔ کوئی بھی دھوکے سے نہیں کہہ سکتا کہ کس نے گولی چلائی تھی۔ ایک اطلاع کے مطابق جس پر سب متفق ہیں بوتھ نے خودکشی کر لی تھی۔

لیفٹیننٹ ڈوہرنی اور اس کے آدمی اپنے انعام کے ساتھ واپس واشنگٹن پہنچنے کے لیے بھینچا بہت بے تاب تھے۔ لیفٹیننٹ نے پھانک کے نزدیک کھڑے ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سے ایک کبل اتار اور برآمدے کی طرف لپکا۔

”لاش کو اس میں لپیٹ دیں۔“ اس نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

لیفٹیننٹ کے پاس مزید چار قیدی تھے۔ لہذا گھوڑوں کی کئی پڑی تھی ورنہ ان نیم جاں قیدیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے لے جایا جاتا۔ خانہ جنگی کے باعث دور دراز کے دیہاتوں میں جھنڈا گاڑیاں بھی ناپید ہو گئی تھیں لیکن ایک مقامی ٹیگرونیڈ فری مین کے پاس ایک کھٹارا ایمبولینس تھی جسے گھوڑے پہنچتے تھے۔ وہ انہیں اور لاش کو پہلی پلین میں دریائے پوٹومیک تک لے جانے پر راضی ہو گیا۔ وہاں سے لاش مشقی میں ستر کرتی۔

☆.....☆

27 اپریل کی سحر نمودار ہوتے ہوئے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی واشنگٹن پہنچ گئی کہ بوتھ کی لاش اسٹیر کے ذریعے لائی جا رہی ہے۔ اس خبر کے پہنچنے ہی

تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسٹینٹن کی سفارش پر اور یقیناً اس کی رضا مندی سے جج ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولٹ نے ٹریبونل کے ان پانچ ججوں سے ایک سمجھوتے کا اہتمام کیا۔ وہ یہ کہ اگر ٹریبونل اتفاق رائے سے سزائے موت کو سزائے موت سناتی ہے، تو صدر جانسن سے رحم کی اپیل کی جائے گی۔ چنانچہ اس سمجھوتے کے تحت پانچوں جرنلوں نے اس پیشین پر اپنے دستخط کیے اور سفارش کی کہ سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولٹ نے یقین دلایا کہ وہ پیشین صدر جانسن کو پیش کی جائے گی لیکن صدر جانسن کے بیان کے مطابق وہ پیشین کبھی اس کی نظر سے نہیں گزری۔ مورخہ 6 جولائی کی صبح صدر جانسن نے ان چاروں کے موت کے پروانے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ سزائے موت پر اگلے ہی دن عملدرآمد ہوتا قرار پایا۔

مقدمے کا اصرام شک و شبہ کی ایک اور عجیب و غریب دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ وفاقی فوجیوں نے دم توڑتے ہوئے ہتھ کی جیب سے اس کی ڈائری برآمد کی تھی اور وہ ڈائری واشنگٹن میں اسٹینٹن کے حوالے کر دی تھی۔ اسٹینٹن کا بیان ہے ”میں نے اس ڈائری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے سارے مندرجات پڑھے۔“

اس کے باوجود اس انتہائی اہم ڈائری کو شہادت کے طور پر پیش کیا جانا تو درکنار مقدمے کے دوران کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ کیا اس میں سازشی لیڈروں کی فہرست تھی؟ وہ ڈائری اسٹینٹن کے حوالے کیے جانے کے بعد غائب کر دی لیکن 1867ء میں وہ حلقہ جنگ کی ایک بھولی بھری فائل سے بازیاب ہوئی تاہم اس کے اٹھارہ صفحات غائب تھے جن میں سازش کے آغاز سے لے کر قتل تک کا ذکر تھا۔ وہ صفحات بلیڈ سے کٹے ہوئے تھے۔

☆.....☆

مورخہ 7 جولائی کی صبح احاطے میں پھانسی کا پھندا تیار تھا۔ قماشانیوں، فوجیوں اور نامہ نگاروں کے چہروں سے پسینہ بہہ رہے تھے۔ وہ دھوپ میں پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ہونے کے منتظر تھے۔ اسی دوران قید خانے کا دروازہ کھلا اور سزائے موت میری سزائے دو پادریوں کے بازوؤں میں جمبوتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس کے بعد جارج ایزیروٹ نکلا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ پھر ہیرولڈ برآمد ہوا۔ سب سے آخر میں لوکس پنن نظر آیا۔ اس کا چہرہ اٹھا ہوا اور

ہارے واشنگٹن میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ شہر کے سارے درگاہیں چھوڑ کر اپنے گھوڑوں کی طرف بھاگے۔ شرفاء نے اپنی اپنی بھی کو تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ واشنگٹن کی پوری آبادی اٹھ کر نیوی یارڈ پہنچ گئی۔ پوریا رڈ لوگوں سے کچھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے لیکن لاش کو اتارنے وقت عرشے پر ایک کیڑوں پھیلا دیا گیا تاکہ عوام ہتھ کو نہ دیکھ سکیں۔ اس کے فوراً بعد اس کیڑوں کے نیچے نقیشت کا آغاز ہو گیا۔ اسٹیمر پر موجود کوئی بھی آفیسر ذاتی طور پر ہتھ سے واقف نہیں تھا۔ لہذا ایک عجیب و غریب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ہر مسئلہ لاش کی شناخت کا تھا۔ اس شخص شدہ لاش کے ہال بھرے ہوئے تھے، آنکھوں میں وحشتناک پن تھا، دانت فرانے کے سے انداز میں باہر جھاک رہے تھے۔ کیا یہ وہی شخص تھا جسے لوگ حسن کا دیوتا کہتے تھے؟ جو بے شمار نازنیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا؟ جو سچ کا اپلا اور فیشن کا شہزادہ کہلاتا تھا؟

چونکہ لاش کی شناخت کا مسئلہ محکوم لگتا تھا، لہذا اے دارالافران سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ہتھ کے دوستوں اور رشتے داروں کو لاش کی شناخت کے لیے طلب کرتے۔ اس وقت ہتھ کا بھائی جوئیس ہتھ جوئیس واشنگٹن کی پرانی جیل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اسے لاش کی شناخت کے لیے طلب نہیں کیا گیا بلکہ ہتھ کی لاش اسی روز انتہائی رازداری سے جہاز سے اتار کر اسٹے کے ایک کبس میں رکھ کر دفن کر دی گئی۔

☆.....☆

9 مئی 1865ء کو ہتھ کے شرکائے جرم پر فٹری کمیشن میں مقدمے کا آغاز ہوا۔ اس مقدمے میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ چونکہ صدر کا قتل کا مڈر رائجیف اور آرمی کے سربراہ کی حیثیت سے ہوا تھا چنانچہ یہ ایک فوجی جرم تھا۔ مورخہ 30 جون کو وہ سارے مدعا علیہان قتل کی سازش میں شریک جرم پائے گئے۔ ڈاکٹر سیوئل ٹڈ، سیوئل ٹڈ آرٹلڈ اور مائیکل اولڈن کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ایڈورڈ آئیڈنگر کو ۱۱ سال کی سزا ہوئی۔ لوکس پنن، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایزیروٹ اور سزائے موت میری سزائے موت کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ لیکن کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ سزائے موت میری سزائے موت کو لٹکایا جائے گا۔ بہت بعد میں یہ راز کھلا کہ سزائے موت میری سزائے موت کے پیچھے ایک گہری سازش کا رفرما تھی۔ لہذا اس کے چار سے پانچ فٹری جج سزائے موت کے خلاف

شانے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بے خوف نظر آ رہا تھا۔ ان چاروں کو تختہ دار پر پہنچا دیا گیا۔ جلاد نے پھانسی کے پھندے درست کیے، ان چاروں کو موت کی سیاہ ٹوپی اوڑھائی، گردنوں میں پھانسی کے پھندے پہنائے اور لیور کھینچ دیا۔ اگلے ہی لمحے تختہ دار پر چار لاشیں لٹک رہی تھیں۔ یہ کہنا تو درست ہوگا کہ صدر ابراہام لنکن کے قتل میں ملوث ان تمام سازشیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے گئے کیونکہ ایک سازشی اپنے انجام سے صاف بچ نکلا۔ وہ تھا جان سرات۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وزیر دفاع اسٹیمن نے جان بوجھ کر سرات کو فرار ہونے دیا تھا۔ اسٹیمن کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جان سرات بھاگ کر کینیڈا چلا گیا ہے لیکن کسی بھی میٹری ایجنٹ کو اسے پکڑنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ چار ماہ کے بعد جان سرات انگلینڈ میں نظر آیا۔ امریکی قوتوں نے فوراً واشنگٹن کو یہ اطلاع بھیجی تو اسے یہ جواب موصول ہوا۔ ”وزیر دفاع سے صلاح و مشورے کے بعد یہ طے پایا ہے کہ جان سرات کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔“

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد جان سرات کو اٹلی میں اس کی ایک دوست نے پہچان لیا۔ جان سرات نے اسے راز کی ایک بات بتائی۔ ”سازشیوں نے کچھ ایسے لوگوں کے حکم پر یہ کام کیا جو ہوز پرودہ راز میں ہیں۔“ واشنگٹن کو ایک بار پھر مطلع کیا گیا، جس پر وزیر داخلہ سیدوارڈ نے وزیر دفاع اسٹیمن کو ایک نوٹ لکھ کر بھیجا کہ اس مفرور کی گرفتاری کے لیے اسٹیشن ایجنٹ بھیجے جائیں۔ اسٹیمن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسٹیمن کو اس سلسلے میں جتنے بھی خطوط بھیجے گئے۔ ان کا کبھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بالآخر دسمبر 1866ء میں نیوی سیکریٹری ویلس، وزیر داخلہ سیدوارڈ کے حکم پر جان سرات کو گرفتار کرنے کے لیے فعال ہو گیا۔ وہ گرفتار کر کے واشنگٹن لایا گیا۔ اس پر دو مرتبہ مقدمہ چلا۔ پہلی جیوری کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ دوسرا مقدمہ خارج کر دیا گیا کیونکہ وقت گزر چکا تھا۔ کوئی بھی شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی گرفتاری اور اس مقدمہ چلانے میں جان بوجھ کر تاخیر کیے گئے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

☆.....☆

ابراہام لنکن کے قاتل جان ویلس بوتھ کی فیملی کی

درخواست پر اس کی لاش فروری 1869ء میں اس کو عارضی قبر سے ہالٹی مور کے قبرستان میں منتقل کرنی تھی۔ صدر کے احکام کے بموجب اس کی قبر پر کسی بھی قسم کی یادگار نصب نہیں کرنی تھی لیکن جب اس کے تابوت کو ہالٹی مور کے چھبڑا تختہ کے پارلر میں کھولا گیا تو ایک بار پھر لاش کی شناخت متنازع بن گئی۔ جو لوگ بوتھ کی لاش کو غلط میں دفن کیے جانے پر غیر مطمئن تھے، انہوں نے فوراً یہ نقطہ اٹھایا کہ ہالٹی مور میں کیا جانے والا دانتوں کا معائنہ واشنگٹن کے اس دندان ساز کے ریکارڈ سے میل نہیں کھاتا جس نے بوتھ کے دانتوں کا علاج کیا تھا۔ اس پر خاصی بحث ہوئی اور کافی عرصے تک ہوئی رہی۔ اس سمیت چھوٹے بڑے کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جس کی گونج لگ بھگ ایک صدی تک سنا دی گئی رہی۔ فاضل مورخین کو یقین ہے کہ بوتھ فیملی کی طرف سے اس کے باقیات کو قبول کر لینے کے بعد کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن بڑے بڑے اور نہایت اہم ایٹھوز کی بابت کیا کہا جاسکتا ہے۔ ان بے شمار مجرمانہ سرکاری کارروائیوں اور شواہد کی کیا توجہ پیش کی جاسکتی ہے جنہوں نے بلاشبہ اس پورے کس کو دھندلا رکھا ہے۔

☆.....☆

1926ء میں ابراہام لنکن کے بیٹے رابرٹ ٹوڈ لنکن نے اپنی موت سے پہلے اپنے باپ کے ذاتی کاغذات کے ایک بنڈل کو جلا ڈالا۔ اتفاق سے اس وقت اس کا ایک دوست اس کے ہاں پہنچ گیا اور اس نے ان کاغذات کے بارے میں پوچھ لیا۔

صدر کے بیٹے نے جواب دیا۔ ”یہ کاغذات اور لنکن کے کابینہ کے ایک رکن کی غدار کی شہادتوں پر مشتمل تھے۔ میں نے سوچا کہ ایسی شہادتوں کو تلف کر دینے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔“

لہذا اس شخص کو پہچانا شاید کبھی ممکن نہ ہو جو اس بھیا تک سازش کا مرکزی کردار تھا لیکن وہ اور اس کے ہراڑ جو کوئی بھی رہے ہوں انہوں نے اس شخص کو بے نقاب کر دیا جس نے صدر کو غیر محفوظ کر کے جانے پہنچانے سازشیوں کو فرار ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ سب کے سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے تھے اور امریکا کی تاریخ کے سب سے بڑے جرم کے گواہ تھے۔

انوکھی شادیاں

وسیم بن اشرف

شادی ہر معاشرے کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ ہر مذہب و ملت نے اسے ضروری قرار دیا ہے لیکن اس امر کی بجائے اور کی بجائے ہر معاشرے میں الگ الگ رسم و رواج ہیں۔ بعض علاقوں کی رسمیں اتنی عجیب اتنی دلچسپ ہیں کہ انہیں پڑھ کر ہی لطف آجائے۔ اب ذرا سوچیں کہ انہیں دیکھنے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔

دنیا بھر سے دلچسپ رسوم شادی کا احوال

رکھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں دلچسپ، انوکھی، پہلی ترین اور عجیب ترین شادیوں کا کچھ حال احوال قارئین سرگزشت کی نذر ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی شادی پر کچھ انوکھا کرنے کے لیے اچھوتا انداز اپناتے ہیں۔ برطانوی شہر سنڈرلینڈ سے تعلق رکھنے والے 43 سالہ کلیرا فیلون اور 38 سالہ پال دورسکی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا جنہوں نے اپنی شادی پر روایتی پرچس گاڑیوں میں سفر کرنے کی بجائے کچرا جمع کرنے والے ٹرک کو ترجیح دی۔ سنڈرلینڈ ٹی کوئل کے لیے کچرا جمع کرنے کا ٹرک چلانے والا یہ جوڑا اپنی ملازمت کی جگہ پر پہلی بار ملا اور ایک دوسرے سے شادی کے عہد و بیان کر ڈالے۔ شادی کی تقریب کو یادگار بنانے کے لیے اس جوڑے نے روزی روٹی کے ذریعے کوئی شادی کے لیے اپنا سفری ذریعہ بنانے کی ٹھانی اور 11 سالہ 27 ہزار پاؤنڈ میں لوری وین کو سناٹا کر اس کے ذریعے شادی کے ویڈیو تک پہنچے۔

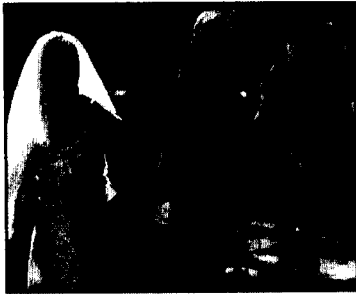
شانداز پرچس گاڑیوں یا پھر کھوڑا گاڑیوں اور بکریوں کی

ہر دور میں لوگ کچھ نیا کر کے دکھانے کے خواہشمند رہے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ آرزو جنم لیتی رہی ہے کہ ان کی تعریف اور تحسین کے گن گائے جائیں، شادی بھی زندگی کا ایک ایسا ہی ایونٹ ہے، کچھ لوگ سادی سے اور کچھ سچ و سچ کے شادی رچاتے ہیں۔ ماضی میں اگر شادی کی رسومات عجیب و غریب ہوتی تھیں تو حال میں بھی ایسی ایسی شادیاں ہو رہی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بالخصوص مغرب میں تو شادی کو یادگار بنانے کے لیے لوگوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے کہ انسان دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتا ہے، شادی ایک ایسا سماجی بندھن ہے جس سے زندگی میں رونق ملے ہے۔ اس کی بنیاد پر خاندان پھلتے پھولتے ہیں۔ شادی کا بندھن بے حد خوبصورت، نرگش اور نازک ہوتا ہے۔ ہر قوم و مذہب میں شادی کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ شادی کے موقع پر ہر ملک میں خاندان اپنے اپنے رواج کے مطابق مختلف رسومات ادا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان رسوں کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں مگر اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ شادیاں ایسی انوکھی ہوتی ہیں کہ انہیں تا دیر یاد

2.51 میٹر 8 (فٹ 13 انچ) طویل سلطان کی بیوی کا قدر 1.75 میٹر ہے، 31 سالہ سلطان قوسین کی شادی 20 سالہ مردی دیو سے مردانہ صوبے میں ہوئی۔ سلطان نے کہا کہ یہ میری زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ ہے، ان کی بیوی نے امید ظاہر کی کہ ان کے لیے شادی ہمیشہ کی خوشیاں لائے گی۔

دنیا میں معمر ترین جوڑے کی شادی نے بھی تہلکہ مچا دیا تھا۔ پیراگوائے کے ایک ضعیف جوڑے نے اسی سال تک اکٹھے زندگی گزارنے کے بعد مذہبی طور پر شادی کر لی ہے شادی کے لیے عمر کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ شاید یہ دنیا کا معمر ترین جوڑا ہے۔ جس میں دو لمبے جوڑے مینوں کی عمر 103 جبکہ وہن مارینٹا لوپیز کی عمر 99 برس ہے۔ دولہا ویل چیر پر بیٹھ کر شادی کی تقریب میں شریک ہوا۔ اس شادی کی تقریب جوڑے کی گھر کے لان میں ہوئی۔ شادی کی تقریب میں ان کے آٹھ بچوں، چچا، نواسوں، پوتے، پوتیوں، پینتیس پڑپوتے، پڑپوتیوں، پڑنواسے، پڑنواسیوں اور ان کی اگلی نسل کے بیس بچوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر پادری نے کہا کہ انہیں۔ نے اس سے پہلے اتنی عمر کے نئے شادی شدہ جوڑا نہیں دیکھا۔ اس جوڑے نے انچاس برس پہلے بھی ایک سول میرٹ کی تھی لیکن انہوں نے مذہبی طور پر شادی نہیں کی تھی۔ ننانوے سالہ وہن مارینٹا نے کہا کہ مذہبی شادی پر بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ خاندان نے اس شادی کے بعد ایک پارٹی کا انتظام کیا تھا۔

قلعہ میں تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ انہیں خود پر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں بھی دیکھا ہی کرنے



کی کوشش کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو امریکی ریاست انڈیانا میں ہونے والی اس انوکھی شادی کو بھی دیکھ لیں جس میں دولہا وہن سے لے کر وہاں آئے ہوئے مہمانوں نے بھی قلعوں میں نظر آنے والے خوفناک کردار زومبی بن کر شرکت کی۔ اس

بجائے اس انوکھے سچے سچے ٹرک پر شادی کے استقبالیے تک پہنچنے والے اس جوڑے نے دیکھتے ہی دیکھتے برطانیہ سمیت دنیا بھر میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔

شادیاں تو آپ نے بہت دیکھی ہوں گی مگر ایک دوسرے پر نہیں تان کر زندگی بھر ساتھ جھانے کا عہد کرتے جوڑے آپ کو کبھی نظر نہیں آئے ہوں گے۔ جی ہاں امریکی عوام میں آج کل ایک نیا ہی رجحان فروغ پانے لگا ہے وہ یہ



کہ دولہا اور وہن ہاتھوں میں تئیں اٹھائے شادی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کے بعد وہ نشانہ بازی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جی یہ پیچش لاس ویگاس کے ایک گن اسٹور کی ہے جس کے 300 پاؤنڈز کے پیکیج میں گولوں کی فراہمی اور پھر وہی آگ کی شوٹنگ رینج میں شہ نے بازی کی مشق کرنا ہے، شاٹ گن ویڈیو نامی یہ شادیاں فائرنگ میں بچوں کے قتل کے واقعات کے باوجود لوگوں میں تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں اور اب تک کسی بھی جوڑے نے اس انداز کی شادی منسوب نہیں کی ہے۔ دنیا کے سب سے طویل قد انسان کی شادی کا تذکرہ بھی خوب ہے۔ ترکی سے تعلق رکھنے والے دنیا کے سب سے طویل قد سلطان نے شام سے تعلق رکھنے والی اپنی خوابوں کی شہزادی سے شادی کر لی۔ گواسے ڈھونڈنے میں دیر لگی۔





لباس پہن کر آئیں۔

کھیلوں کے ایک شوقین مارٹن لیمرٹ کی شادی دو ہزار چھ میں برطانیہ کے آئیں ہاکی کے ریک میں ہوئی۔ ایسی ہی ایک شادی سمندر کی تہہ میں ہوئی۔ جیف پارکنز کی بیٹی لیلی اور ان کے شوہر بین اپنی شادی کے دن موسم کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ ان کی شادی امریکا میں سی ایٹل کے علاقے میں سمندر کی سطح کے نیچے ہوئی۔ ایک جوڑے نے برقیے پہناؤں پر شادی کا پروگرام بنایا۔ سارا داراؤن اور ان کے ہونے والے شوہر نے شادی کی تقریب کینیڈا کے برٹش کولمبیا کے علاقے میں برقیے پہناؤں پر انجام دی۔ ایک شادی پر جوڑے نے تیلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کے



عہد و بیان کیے۔ امریکا میں میسچو سیٹس میں 'سیلک شادی' میں ڈیٹیل کین میک کی اور برٹش تھامس تقریر نے تیلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کی۔ دسمبر 2010ء میں میرٹھیل اور لیسٹا وائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لنڈن آئی کے سائے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی۔ دارالحکومت ماسکو میں ایک جوڑے نے شادی سائیکلوں پر کی۔ جبکہ سائمن براؤن اور انکارن پلانگ پنڈا نے تھائی لینڈ کے جزیرے پوکھٹ میں سمندر کے کنارے شادی کی۔

ڈراؤنی شادی میں شریک مہمانوں نے بھوتوں اور چڑیلوں کا روپ اس مہارت سے دھارا کر انہیں دیکھ کر واقعی حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ عالمی ریکارڈ قائم کرنے والی شادی بھی کمال کی تھی، یہ شادی سری لنکا میں ہوئی۔ شادی کی اس انوکھی تقریب نے عالمی ریکارڈ توڑ ڈالا۔

دنیا میں بہت سے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی شادی کی تقریب ایسی شاہانہ ہو کہ لوگ دیکھ کر رشک کریں اور اس مقصد کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ سری لنکا میں شادی کی ایک ایسی انوکھی تقریب منعقد ہوئی جس میں تمام ملازمین نے ایک جیسے لباس زیب



تن کر کے عالمی ریکارڈ بنا ڈالا۔ سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہونے والی شادی کی اس تقریب میں 126 خواتین ملازمین، 25 مرد ملازمین، 20 کم عمر ملازمین اور 23 پھول پکڑنے والی لڑکیوں نے شرکت کر کے ایک نیا عالمی ریکارڈ بنایا، سب خواتین اور مرد ملازمین نے سری لنکا کا ایک جیسا روایتی لباس زیب تن کر رکھا تھا، شادی کی تقریب کی مہمان خصوصی سری لنکا کی خاتون اول شرافتی راجا پاکسہ تھیں۔ شادی کی تقریب کا اہتمام کرنے والی ڈریس ڈیزائنر چیمپری سری وردنے کا کہنا تھا کہ شادی کی ریکارڈ ساز تقریب منعقد کرنا ان کا خواب تھا، گمیز بک آف ورلڈ ریکارڈ توڑنا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ شادی کی تقریب میں موجود گمیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے افسران کا کہنا تھا کہ سہیلی جوڑے نے تھائی لینڈ کا 96 خواتین ملازمین کے ساتھ شادی کی تقریب میں شرکت کا سابقہ عالمی ریکارڈ توڑا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ چند منفرد شادیوں کا ذکر بھی ہو جائے۔ ایک شادی میں دولہا دہن نے شادی کی بھی تقسیم بنائی۔ کرینینا ایک نکال نے کہا کہ ہماری شادی کی تقسیم 'سمندری فزاق' تھی۔ جس میں ہم نے مہمانوں کو بھی دعوت دی کہ وہ ایسا

والوں کی طرف سے 11 ہزار افراد کو دعوت نامے بھیجے گئے جبکہ دلہن کی طرف سے 7 ہزار افراد کو دعوت دی گئی ہے۔ ویسے میں شرکت کے لیے تمام افراد کو ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی بھجوائے گئے۔ لڑکی کو سلائی میں ڈھائی کروڑ روپے دیئے گئے۔ ویسٹمنسٹر دہلی میں ہوا۔ جہیز کی مدد میں 21 کروڑ روپے نقد اور 25 کروڑ روپے کا ایک گھر دیا گیا۔ اس گھر میں 11 کروڑ روپے کا سامان پہلے سے موجود تھا۔ بھارت کی روایات کے تحت شادی میں بیٹنڈا باجے والوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن پر تقریباً ایک کروڑ روپے بچھا دیئے گئے۔

نئی شادیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں دیکھی جاتی ہیں۔ برطانوی شہزادے پرنس ولیم اور کیٹ میڈلن کی شادی بھی یادگار رہی۔ برطانوی شاہی خاندان کی یہ یادگار شادی دنیا کے کونے کونے میں براہ راست دیکھی گئی۔ یہ شادی بھی ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم کے پوتے پرنس ولیم اور کیٹ میڈلن کی۔ شادی میں 600 غیر ملکیوں سمیت 1900 مہمانوں نے شرکت کی۔ دنیا بھر میں شادی کی براہ راست تقریب ٹی وی دنیا پر دیکھی۔ سفید رنگ کے عروسی لباس میں ملیں کیٹ سادگی و پرکاری کا شاہکار تھیں تو شہزادہ ولیم شادی کے موقع پر فوجی وردی میں بہت فخر رہے تھے۔ دنیا بھر کی مشہور لیکن منتخب ہستیوں کی شرکت نے جہاں تقریب کو ایک انوکھا رنگ دیا وہیں دلہن کے سادہ مگر انتہائی اسٹائلش لباس نے فیشن کی دنیا میں ایک نیا ٹرینڈ متعارف کرایا، شہزادہ ولیم اور میڈلن کی شادی جس قدر دنیا کے لیے ایک حسین و جمیل لمحہ ثابت ہوئی، اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے پرنس سوزارا کی شادی اس قدر سادگی سے ہوئی کہ سادگی کے سبب ہی اسے سال کی ایک اور یادگار شادی کا درجہ مل گیا۔ یہ شادی ہوئی نہایت خاموشی، رازداری اور سادگی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اس شادی کا اعلان بھی صرف ایک دن پہلے کیا گیا۔ ملکہ برطانیہ



گھنٹوں کے بل بیٹھ کر پھول پیش کرنا اور شادی کی پیشکش کرنا یہ تو آپ نے بہت سی فلموں میں دیکھا ہوگا لیکن اس نوجوان نے تو ڈرامے کی حد کر دی۔ اس نوجوان نے اپنی دوست کو انوکھے انداز میں شادی کی پیشکش کی۔ چھت کے کنارے پر کھڑا یہ نوجوان بات کرتے ہوئے اچانک چھت سے نیچے گر پڑا اور جب اس کی دوست نے گھبراہٹ اور تشویش کے عالم میں نیچے جھانکا تو شادی کے ایک خوبصورت پردہ پوزل کی چھتری اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ظاہری بات ہے کہ اس انوکھے انداز میں پردہ پوز کیے جانے کے بعد کون لڑکی ہے جو انکار کر سکتی ہے لہذا یہ خاتون بھی نورانی شادی کے لیے راضی ہو گئیں اور منگنی کی انگوٹھی پہن لی۔

”بھارتی تاریخ کی مہنگی ترین شادی“ کا حال بھی جان لیجئے۔ گو آج کل ماڈرن شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔ آبادی میں چین و بھارت کے مابین مقابلہ جاری ہے اور بھارت اب چین سے آگے نکلنے ہی والا ہے۔ بھارت میں بھی شادیاں



دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ بھارتی تاریخ کی مہنگی ترین شادی اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔ سال 2011 میں بھارت میں ایک ایسی شادی بھی ہوئی جس کی تفصیلات کسی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ شادی بھارتی تاریخ کی اب تک مہنگی ترین شادی ثابت ہوئی جس میں 15 ہزار بارانی شریک ہوئے جبکہ اس پر کروڑوں روپے کے اخراجات آئے۔ یہ شادی بھارت کی حکمران جماعت کانگریس کے راہنما کنور سنگھ ننڈور کے بیٹے للیت سنگھ اور دلہن یوگیتا کی تھی۔ دلہن کی رخصتی ہیلی کاپٹر میں ہوئی جو اسے جہیز میں دیا گیا تھا۔ شادی میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو تحفے کے طور پر 30 گرام سونے اور چاندی کا ایک بیکٹ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کو ایک سفاری سوٹ، ایک شال اور 2100 روپے بطور تحفہ دیئے گئے۔ شادی تو شادی ویسے بھی قابل ذکر رہا۔ ویسے میں شرکت کے لیے لڑکے

۱۰۔ ہالی ہائی دارا فلپس رمگی کے کھلاڑی مائیک ٹنڈل کے
۱۱۔ ایلن از دواج میں بندھیں۔ شادی اسکاٹ لینڈ کے
۱۲۔ ایلن برگ کے ایک چرچ میں انجام پائی جبکہ شادی
۱۳۔ راز سبیلے استقبالیہ ایک مجری جہاز پر دیا گیا جس میں
۱۴۔ خاندان کے صرف اہم ترین افراد نے شرکت کی۔
۱۵۔ ایک حیران کن شادی بھوٹان کے شاہ جگمے کھیسر کی ہے۔
۱۶۔ مالہ بادشاہ جگمے کھیسر نے اپنی کالج کی دوست اور ایک
۱۷۔ لام لاکہ جینٹس پما سے شادی کی۔ اس شادی کا جشن



۱۸۔ 3 روز تک منایا گیا۔ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو 14
مال سے جانتے تھے۔ شادی کی تقریب دارالگو مت پناکھا
میں ہوئی جگمے کھیسر بھوٹان کے پانچویں بادشاہ ہیں۔ وہ
امریکا اور برطانیہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ انہیں ہمالیہ کا
"ولفس بادشاہ" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ 2008ء میں تخت نشین
ہوئے تھے۔ جینٹس پما شاہ بھوٹان سے 10 سال چھوٹی
ہیں۔

شادیوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری ساری رہے گا، آنے
والے اپنے دور میں شادیوں کے نئے نئے انداز اپنائیں گے
'ایلن شادی ہر شخص کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے، جسے لوگ
ہا ہے بھول جائیں لیکن دولہا دلہن کو یہ دن ہمیشہ یاد رہتا ہے۔
پاکستان میں بھی ایک انوھی شادی ہوئی ہے جس کی پہلے کبھی
مثال نہیں ملتی، بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں کے برعکس دلہن کا
علق ہندو مذہب اور دہلیہ کا تعلق مسلمان خاندان سے تھا
نام شادی میں پسندیدگی ضرور بھی مکر کوئی جبر یا زبردستی
نہیں بلکہ دونوں خاندانوں کی منشا سے یہ شادی ہوئی۔ میرپور
خاص کے معروف ہندو ڈاکٹر کی بیٹی ایک مسلمان لڑکے کو پسند
کر لی تھی۔ باپ نے بیٹی کی پسند کے سامنے تسلیم کریم کیا۔ بیٹی
لوہندو مذہب تبدیل کر کے مسلمان کیا اور پھر اس کی مسلمان

سے شادی کر کے رخصت کر دیا۔ شادی کی تقریب میرپور
خاص کے ایک شادی ہال میں ہوئی جہاں دونوں خاندانوں
کے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ شادی کی تقریب کے
بعد دلہن کو رسم کے مطابق رخصت کیا گیا۔ واضح رہے کہ ایسی
شادی پہلی مرتبہ ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان خاندانوں نے
اپنے بچوں کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھا اور باہمی رضامندی سے ان
کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

بھارت میں ایسی کئی شادیوں کے واقعات سامنے آئے
جس میں لڑکا مسلمان اور لڑکی ہندو ہوتی ہے، تاہم انتہا پسند
ہندو تملنا اٹھے اور اسے 'لو جہاد' قرار دیتے ہیں، چند ماہ قبل
بھارتی شہر میسور میں مسلمان لڑکے نے بھینچن کی ہندو دوست
کے ساتھ دھوم دھام سے شادی کر لی۔ دلہن نے اسلام قبول کیا
جس کے بعد دونوں کا نکاح ہوا۔ تقریب میں دلہن کے رشتہ
دار بھی شریک ہوئے جس پر ہندو انتہا پسند تملنا اٹھے اور ہنگامہ
کیا۔

بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں میں ہمیشہ لڑکا ہندو ہوتا ہے
اور لڑکی مسلمان جس کی ایک مثال فلم 'ویزارا' اور 'ہے' ہے
جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تینوں خانوں (شاہ رخ،
سلطان اور عامر) کی شادی یا محبت کا تعلق ہندو خواتین کے
ساتھ رہا ہے۔ کرینہ کپور سے شادی کرنے والے سیف علی
خان کی بھی مثال سامنے ہے۔

گو جرانوالا کے علاقے کا موگی میں شادی کے حوالے
سے دلچسپ معاملہ سامنے آیا۔ برأت لیٹ ہونے پر ایک بڑی
دلہن کو بیاہ کر لے گیا اور دولہا نے مہمان آئی لڑکیوں میں سے
ایک سے شادی رچائی۔

حملہ حبیب پور سے تنویر احمد کی برأت مقررہ ٹائم ایک
بچے کی بجائے تقریباً دو گھنٹے تاخیر سے 4 بجے حملہ صابری کا
لونی ادا کاڑھ میں لڑکے کی خالہ کے ہاں پہنچی تو لیٹ آنے کی وجہ
دریافت کرنے پر دولہا تنویر اور دلہن کے بھائی بھولا کی آپس
میں تلخ کلامی کے بعد نوبت ہاتھ پائی تک جا پہنچی، جس پر دلہن
کے بھائی بھولانے اپنی بہن کا نکاح تنویر سے کرنے سے انکار
کر دیا اور دولہا کے ساتھ برأت میں آئے ہوئے قریبی عزیز
براتی عثمان سے نکاح کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ دلہن کے گھر
میں مہمان آئی ہوئی دلہن کی خالہ نے متاثرہ دو لہجے تنویر سے
اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

جہاں ہم نے بھارت کی ایک مہنگی ترین شادی کا ذکر کیا
وہاں بھارت میں ہی "پانی کی بیویوں کی کتھا بھی پڑھ لیں"

پانی کی بیویوں کے حوالے سے ایک ہندوستانی گاؤں کی انوکھی روایت سے لطف اٹھائیے۔

ہندوستانی ریاست مہاراشٹر کے خشک سالی سے متاثرہ علاقے ودار بھا کے ایک گاؤں ڈینگا مکمل میں کہیں بھی پانی کے نکلے نہیں نظر آتے۔ اس گاؤں کے لوگ پینے کا پانی ان کنوؤں سے حاصل کرتے ہیں، جو ایک پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ گاؤں کے لوگ یہاں پہنچنے کے لیے گھنٹوں پیدل چلتے ہیں



اور کنویں پر اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے بھی گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل سے نجات کا حل گاؤں کی بچائیت نے یہ نکالا ہے کہ پانی لانے کے لیے گاؤں کے مردوں کو مزید دو شادیاں کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس گاؤں کے ایک کسان سکھارام بھگت کی تین بیویاں ہیں، بچی، سکھری اور بھاگی۔ ان میں سے ایک کو باضابطہ طور پر بیوی کا درجہ حاصل ہے، باقی دو پانی کی بیویاں کہلاتی ہیں۔ پانی کی بیویاں کہلانے سے مراد یہ ہے کہ گھر کے استعمال کے لیے طویل فاصلے سے پانی بھر کر لانا ان کی ذمہ داری ہے۔ سکھارام نے پہلی بیوی کے ہونے کے باوجود دو مزید شادیاں صرف اس لیے کیں تاکہ دونوں گھر کے استعمال کے لیے پانی ملا سکیں۔ اپنی تین شادیوں کے بارے میں اس کا کہنا ہے ”میری پہلی بیوی اپنے بچوں کے کام کاج میں مصروف رہتی ہے۔ پانی لانے کے لیے میں نے دوسری شادی کی تھی لیکن اس کی بیماری کی وجہ سے مجھے تیسری شادی کرنی پڑی۔“ سکھارام بھگت اسی گاؤں میں گھیتوں میں مزدوری کر کے اپنا گزر بسر کرتا ہے۔ اس کے گھر میں روزانہ تقریباً 100 لیٹر پانی خرچ ہوتا ہے۔ کئی پھر لگانے پر یہ ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس نے بتایا ”پہلی بیوی شادی کے فوراً بعد حاملہ ہو گئی تھی، اور کنویں سے پانی نہیں لاسکتی تھی چنانچہ دوسری شادی کی، اس کی عمر زیادہ تھی، گھر گھر سے بعد اس کے لیے بھی کنویں سے پانی بھر کر لانا مشکل ہو گیا۔ لہذا تیسری

شادی کرنی پڑی۔ سکھارام کی تیسری بیوی کی عمر صرف 16 سال ہے اور اس کے پہلے شوہر کی وفات ہو چکی ہے۔ اس کا تینوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ پہلی کے ذمے بچوں کے کام ہیں، جبکہ دوسری گھر کے پانی کا کام کرتی ہے۔ پہلی کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ باقی دونوں کی ضروریات کا خیال رکھے ان میں اکثر جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں پھر بھی بعد کی دونوں بیویاں خوش ہیں۔

اس گاؤں میں لڑکی کی پیدائش پر خوشی منائی جاتی ہے۔ کیونکہ گاؤں والوں کا خیال ہوتا ہے کہ پانی بھرنے کے لیے ایک رکن کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم گاؤں کی عورتوں کو اُمید ہے کہ جب ان کی بیٹیاں جوان ہوں گی تو ان کے گاؤں میں بھی پانی کے نلکے لگ جائیں گے۔

ہندوستان کی بڑی ریاست مہاراشٹر کے بارے میں گزشتہ سال کے سرکاری تخمینے کے مطابق 19 ہزار سے زیادہ گاؤں کے لوگوں کو پینے کا پانی میسر نہیں ہے۔ مہاراشٹر کے اس گاؤں میں پانی بھرنے کا شقت بھرا کام صرف خواتین ہی کی ذمہ داری ہے۔ ڈینگا مکمل گاؤں میں بنجر زمین کے ایک حصے پر تقریباً 100 کے گھر موجود ہیں۔ یہاں زیادہ تر کسان گھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں اور بہت معمولی آمدنی میں بمشکل گزارا کر پاتے ہیں۔ اس گاؤں کے ایک فرد کا کہنا ہے کہ پانی کے لیے شادی کرنا۔ یہاں کی روایت ہے۔ یاد رہے کہ ایک سے زائد شادیاں ہندوستان میں غیر قانونی ہیں لیکن اس گاؤں میں پانی کی بیویاں عام ہیں۔ ڈینگا مکمل گاؤں کے ایک اور فرد نام دیو کا کہنا ہے کہ بڑا خاندان رکھنا آسان نہیں ہے اور خاص طور پر اس صورت میں جب کہ پانی ہی دستیاب نہ ہو۔ نام دیو کی بھی دو بیویاں ہیں۔

آپ نے بھارت کے ایک گاؤں میں پانی کی بیویوں کا دلچسپ احوال پڑھا، اب آپ جانے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں انوکھی شادیوں اور عجیب و غریب رسومات کے بارے میں، ان شادیوں اور رسومات کا احوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور حیرت انگیز بھی ہے۔ ارجنیا میں نوجوان شادی کرنے سے کترانے لگے ہیں۔ ایک سرکاری ادارے کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار جن کی رو سے 1990ء میں دارالحکومت بنوں آئرس میں 22000 جوڑے شادی کے بندن میں بندھے تھے مگر 2013ء میں یہ تعداد نصف (11642) رہ گئی۔ بڑا عظیم جنوبی امریکا میں واقع ملک کے نوجوان شادی کرنے سے گریزاں ہیں مگر پچھلے دو سال سے

خاتون کا ہاتھ مانتے کے لیے لڑکے کو اپنے ممکنہ سر کو چیل مچل کے دانت بطور تحفہ دینے پڑتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کا تو ماننا ہے کہ محبت کا حقیقی اظہار ہی اس وقت ہوتا ہے جب آپ سمندر کے اندر سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا کر دنیا کے سب سے بڑے ممالے کے دانتوں کو ڈھونڈ نکالیں۔

کرغیزستان میں دلہنوں کے اغوا کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک پرانی کرغیز کہادت ہے کہ شادی کے روز آنسوؤں کا بہنا خوش باش شادی کی بنیاد ہوتی ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہاں کچھ لڑکے لڑکیاں اغوا کر کے انہیں شادیوں پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کے والدین بھی مجبور اس رشتے کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ روایت 1991ء میں غیر قانونی قرار دے جانے کے باوجود زندہ ہے۔ ویسے دولہا کو اغوا کر کے شادی کرانا..... بھارت میں عام ہے۔ اس کی وجہ جہیز کی لعنت ہے۔ بھاری جہیز دینے کے بجائے اغوا کرنے والے کو تھوڑے سے پیسے دے کر ان کی خدمت حاصل کر لی جاتی ہے۔ لڑکی والوں کو جو لڑکا پسند آتا ہے وہ اسے اغوا کر کے بیٹی سے شادی کرا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کو اغوا کار گروپ دھمکی دے دیتا ہے کہ اگر پانچ سال کے اندر تم نے لڑکی کو چھوڑا تو قتل کر دیے جائیں گے۔

دلہن کا منہ کالا کرنے کے حوالے سے آپ نے سنایا بڑھا ہوا۔ دنیا بھر میں شادی سے کچھ عرصے قبل ہونے والی دلہن اور دولہا کے چہروں کو مختلف طریقوں سے چمکانے کا کام کیا جاتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ میں معاملہ بالکل الٹا ہے جہاں



کے لوگوں کا ماننا ہے کہ کسی شادی شدہ جوڑے کا کامیاب آغاز ان کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے۔ جب ہی تو شادی سے قبل دلہن کا منہ سیاہ یا کالا کر کے اس کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے۔

”محبت کے تالے“ کی رسم بھی کافی دلچسپ ہے۔ روم

اٹالی کی تعریب کے انعقاد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں اب میں نو جوان بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے اور خوب ہلاکلا لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے محبت فاتح عالم ہے مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں محبت کے اظہار کے طریقے بالکل مختلف اور عجیب ان کر دینے والے ہیں؟ یقین نہیں آتا۔ کوئی بات نہیں دنیا بھر کے مختلف خطوں میں محبت سے جڑی یہ روایات آپ کی حیرت لے لیے کافی ثابت ہوں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہیرا نگھایا جلی جنوں جیسی کلاسیک کہانیوں کو بھی بھول جائیں۔ کوریا میں ہر ماہ منایا جانے والا ویلنٹائن ڈے عجیب روایت ہے دنیا بھر میں اکثر افراد محبت کا دن سال میں ایک دفعہ مناتے ہیں مگر بارہمہر ایسا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کوریا میں تو ایک صرف چودہ فروری کو ہی ویلنٹائن ڈے نہیں مناتے بلکہ وہ ہر ماہ کی اسی تاریخ کو خصوصی رومانوی اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم کبھی انہیں معافی کا دن کا نام دیا جاتا ہے تو کبھی گلے لگانے کا، مگر ہر ماہ کی چودہ تاریخ کو منفرد انداز میں محبت کا اظہار ضرور کیا جاتا ہے۔ ایک دلچسپ منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بیویوں کو اغوا خانے کی ورلڈ چیمپئن شپ ہر سال دنیا بھر کے لوگ فن لینڈ کے گاؤں سوئکا جروی میں جمع ہوتے ہیں جہاں ایک دلچسپ کھیلوں کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں مرد



معزات اپنی بیویوں کو کندھوں پر اٹھا کر دوڑتے نظر آتے ہیں جس کے فاتح کو بیوی کے وزن کے برابر مشروب اور نیک نامی کے شوقیٹ سے نوازا جاتا ہے۔

روس میں قبر کے ساتھ شادیوں کا ذکر بھی حیران کن ہے۔ ماسکو کے معروف نامعلوم فوجی کا مقبرہ شادیوں کا بھی مقبول ترین مقام ہے جہاں اس فوجی کی قبر کے ساتھ نیا نوپلا جوڈازندگی بھر تعلق بھانے کے عہد وہاں کرتا نظر آتا ہے۔ کیا شادی کا بہترین تحفہ ڈھونڈنے میں آپ کو مشکل کا سامنا ہے؟ تو اسرا سوچے کہ جی میں کیا ہوتا ہے جہاں شادی کے لیے کسی

بل گیٹس کی 5 پیشگوئیاں

بل گیٹس برسوں سے دنیا کے امیر ترین شخص کا اعزاز اپنے نام کئے ہوئے ہیں، جس کی وجہ ان کی کمپنی مائیکروسافٹ ہے۔ تاہم 1999 میں انہوں نے مستقبل کے حوالے سے کچھ پیشگوئیاں کی تھیں جو حیران کن حد تک درست ثابت ہوئیں۔ انہوں نے انسانیت کے مستقبل کے حوالے سے بلا سوچے سمجھے بات نہیں کی تھی بلکہ ٹیکنالوجی کے روزمرہ کی زندگی پر اثرات کو کاغذ پر لکھ کر دیا تھا۔ اور اس وقت اسمارٹ فون کا تصور بھی نہیں تھا جبکہ انٹرنیٹ بھی کچھ زیادہ اچھی طرح استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ فیس بک کی آمد سے پانچ سال پہلے بل گیٹس نے فیس بک جیسی تخلیق کی پیشگوئی تھی۔ یہاں ان کی ایسی ہی چند چوچسپ پیشگوئیوں کے بارے میں جانیں جو حقیقت کا روپ اختیار کر گئیں۔

موبائل ڈیوائسز

بل گیٹس نے پیشگوئی تھی کہ مستقبل لوگ ایسی چھوٹی ڈیوائسز اپنے ساتھ لے کر گھوم کریں گے جو انہیں مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں مدد دے گی، ان کی مدد سے خبروں کو دیکھا جاسکے گا، پرواز کا وقت اور اسی طرح بہت کچھ معلوم کیا جاسکے گا۔ اور یہ اسمارٹ فون کے موجودہ نمبر سے درست ثابت ہو چکا ہے۔

سوشل میڈیا

انہوں نے کہا تھا کہ ایسی ویب سائٹس سامنے آئیں گی جو لوگوں کو اپنے دوستوں اور گھر والوں سے بات چیت میں مدد دیں گی، آسان الفاظ میں بل گیٹس نے فیس بک یا ٹویٹر سے سوشل میڈیا کی آمد کی پیشگوئی کی تھی۔

پڑتا ہے، اگر وہ محنت مند ہو تو یہ اچھا شگون ہوتا ہے اور شادی کی تاریخ طے کر دی جاتی ہے، تاہم ایسا نہ ہو تو جوڑے کو کسی ایسے جگر کی تلاش تک مرغیاں ہی کاٹنا پڑتی ہیں۔

اسی طرح شادی کے موقع پر رونا دھونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر چین کے تیجہ نسل کے افراد شادی سے ایک ماہ قبل ہی روزانہ ایک گھنٹا رو دھو کر گزارنا پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر دلہن پر تو یہ فرض ہوتا ہے جبکہ اس کی ماں بھی دل کرے تو اس شغلے میں شامل ہو سکتی ہے۔

”خواتین کی بالادستی“ یہ بھی خوب حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اکثر جگہوں پر خواتین کو جتنا سنوڑنا پڑتا ہے تا کہ مرد انہیں زندگی بھر کے تعلق کے لیے چن سکیں تاہم نا بھجر کے دوڑا ہوا فلا قبیلہ کا دستور بالکل ہی نرالا ہے۔ جہاں مردوں کو باقاعدہ میک اپ کر کے تیار ہونا پڑتا ہے اور ناچ گاکر خواتین کو متوجہ کرنا ہوتا ہے جو ان میں سے اپنے لیے شوہر چنتی ہیں۔

جاپانی ”وائٹ ڈے“ کی رسم بھی خوب ہے۔ جاپان میں ویلنٹائن ڈے پر خواتین مردوں کے لیے چاکلیٹس خریدتی ہیں تاہم ایک ماہ بعد وائٹ ڈے منایا جاتا ہے جس میں مردوں کو اپنی گریل فرینڈ کے نقش کے مقابلے میں دو گنا زیادہ

کے پونے میلو پونامی علاقے میں دنیا بھر سے جوڑے آکر اپنی محبت کی یادگار کے طور پر وہاں ایک تالا لگا جاتے ہیں اور اس کی چابی دریا میں پھینک دیتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ان کا پیار کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

چینی دوہلوں کی مشکل کو کون آسان کرے گا۔ چین میں شادی کے بعد دولہا کا دلہن تک پہنچنے کا راستہ اس کی سہیلیاں روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور پیسوں سے بھرے سرخ لفافوں کی مانگ کرتی ہیں، جسے پورا کرنے کے بعد بھی دولہا کی مشکل آسان نہیں ہوتی بلکہ اسے مختلف گیمز اور جسمانی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اکثر اسے گانے پڑیے مجبور کیا جاتا ہے۔

دیروند میں جولیت کی بالکونی“ کا قصہ بھی مضمون کن ہے۔ کہا تو اسے دنیا کی عظیم ترین داستان محبت جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہزاروں جوڑے اٹالوی شہر دیروند میں جولیت کی اس مشہور زمانہ بالکونی کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں جہاں سے رومیو کو خط وغیرہ بھیجتی تھی۔

”چین کی ایک اور عجیب روایت کا ذکر بڑے“ محبت میں ایک کائے کا تو سنا ہوگا مگر مرنی کو کاٹنا نہیں؟ مگر چین میں رہنے والے ایک خاص نسل کے افراد میں روایت ہے کہ متفنی کے بعد جوڑے کو ایک مرض کاٹ کر اس کے جگر کا معائنہ کرنا

کمپونٹی ویب سائٹس

بل گیش کی ایک پیٹھوٹی یہ تھی کہ کیونٹی ویب سائٹس سامنے آئیں گی جن میں مختلف موضوعات کی آن لائن کیونٹیٹر تشکیل پائیں گی، اب ریڈیٹ اس کی ایک مثال ہے۔

آن لائن ملازمت کا حصول

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ لوگ آن لائن جا کر ملازمتوں کو تلاش کر سکیں گے اور اب پاکستان میں نہ ہی مگر متحدہ ممالک میں انٹرنیٹ ملازمت کی تلاش کرنے والوں اور کمپنیوں کے لیے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ لاتعداد ویب سائٹس میں ملازمت کی تلاش میں مدد دی جاتی ہے۔

ڈیجیٹل اسسٹنٹ

بل گیش نے یہ بھی پیٹھوٹی کی تھی کہ پرسنل اسسٹنٹ یا سماجی تیار کیے جائیں گے جو کہ آن لائن کنکٹ ہو کر تمام ڈیوائسز کو ایک ساتھ جڑیں گے، چاہے وہ دفتر میں ہوں یا گھر میں، جبکہ ڈیٹا کا تبادلہ بھی ہو سکے گا۔ اور اب ایسا ہو چکا ہے، گوگل ناڈ موپائل ڈیوائسز کے لیے ایسا اسمارٹ اسسٹنٹ ہے جو اسی سمت پیش قدمی کر رہا ہے، جبکہ آئیڈون انکو اور گوگل ہوم وغیرہ بھی اسمارٹ ہوم کو یقینی بن رہے ہیں۔

مرسلہ: دسّم بن اشرف، ملتان

کھلا کر موٹا کیا جاتا ہے جو مختلف طبی مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

”جھاڑو سے کودنا“ یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے۔ امریکا کے انتہائی جنوب میں ایک انوکھی روایت ہے جھاڑو سے کودنا جس کا مطلب ہے کہ اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرے جو ان کی نئی زندگی کے کامیاب سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں عجیب و غریب اور انوکھی شادیوں کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اب بھی یقیناً ناقابل یقین شادیاں ہوتی ہوں گی۔

انوکھی شادیوں کا تذکرہ بہت طویل بھی ہے اور حیران کن بھی، پاکستان میں بڑے حیران کر دینے والے واقعات رونما ہوتے ہیں جیسا کہ مئی 1986ء میں چاؤ خان نامی ایک شخص نے رائے وٹل میں رہائش اختیار کی۔ اس نے کرائے کا مکان حاصل کیا اور بہت جلد اہل محلہ پر اپنا اعتماد قائم کر لیا۔ چاؤ خان اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا آرزو مند تھا۔ اس شخص نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چار مختلف خاندانوں سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات طے کر دی۔ اس نے اس دوران ہر خاندان سے بھاری رقم وصول کر لی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے سب کو شادی کی ایک ہی تاریخ دے دی۔ شادی سے

خرچ کر کے تحائف خرید کر دینے پڑتے ہیں تاکہ وہ عادت کر سکیں کہ وہ بھی محبت میں کسی سے کم نہیں۔ ”مہندی کے ٹیوڈ“ کے بارے میں جاپے کہ افریقا کی عربی دافرتی خواتین کی جانب سے محبت کا منفرد اظہار مہندی کے ڈیزائنز کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

”شادی سے پہلے علیحدگی“ ہے تاجرت کی بات۔ طلاق موجودہ دنوں میں کافی عام ہو چکی ہے مگر پھر بھی یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ مبینہ شادی کے دن ہی یہ تعلق ختم بھی ہو جائے، تاہم پورا کائنات میں ایسا ہی کچھ لوکھا ہوتا ہے جہاں اپنے والدین کی پسند سے ناراض جوڑے شادی کے دن ہی ایک دوسرے سے الگ بھی ہو جاتے ہیں۔

”موٹاپے کا کرشمہ“ یہ ایک دلچسپ روایت ہے کہ شادی سے پہلے وزن کم کرنا کسے یاد نہیں رہتا، مگر جناب افریقی ملک موریطانیہ میں آپ جتنے موٹے ہوں گے اتنے ہی خوبصورت مانے جائیں گے۔ خاص طور پر خواتین پر تو اس فارمولے کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے کیونکہ موٹی بیویاں شوہر کے لیے دوستداری کی علامت بھی جاتی ہیں تاہم یہ سننے میں جتنا اچھا لگتا ہے اتنا آسان کام نہیں کیونکہ ان خواتین کو زبردستی کھلا

ایک رات پہلے جاؤ خان نے مکان چھوڑ دیا اور نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ اگلے دن صبح چار برائیں اس مکان کے باہر اکٹھی ہو گئیں۔ حقیقی صورت حال کا علم ہونے پر برائیاں نے اپنا سر پیٹ لیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا مکار شخص اپنا کام دکھا چکا تھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ مئی 1985ء میں پیش آیا شہداد پور سے اورنگی ٹاؤن جانے والی بارات سے دلہن کے والدین نے مطالبہ کیا کہ پانی کے دو ٹینکر بھی ساتھ لائے جائیں کیوں کہ یہاں پانی کی انتہائی قلت ہے۔ دلہن کے والدین نے دوہلا والوں کو بتایا کہ یہ پانی نہ صرف ذاتی استعمال کے لیے ہوگا بلکہ مقامی لوگوں کے کام بھی آئے گا۔

کچم جنوری 1985ء میں جنوبی افریقہ میں اپنی نوعیت کی ایک انوکھی شادی ہوئی۔ دولہا کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا لیکن وہ بیٹے کی برأت میں موجود تھا۔ وہ کیسے؟ 24 سالہ مارک سان گر کی یہ شدید آرزو تھی کہ اس کا باپ بھی اس کی شادی میں شریک ہو لیکن کرکس کے دن اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ دولہا کا کہنا تھا کہ اگر اس کا باپ اس شادی میں شریک نہ ہوا تو اس کی خوشیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی منگیتری کی رضا مندی حاصل کی اور پھر اپنے باپ کے کھلے تابوت کو بارات میں شامل کر لیا۔ جب برائیاں نے یہ منظر دیکھا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ایک اور انوکھی شادی کا حال بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ قصہ اپنے ہی ملک کا ہے۔ نومبر 1984ء میں پاکستان کے شہر وزیر آباد میں ایک نوجوان کا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد جب دولہا کے دوست اور عزیز واقارب اسے مبارکباد دینے کے لیے آئے تو دولہا میاں غائب تھے۔ مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دلہن نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ دولہا کے والدین انتہائی پریشان تھے کہ ان کے بیٹے نے انہیں کس صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اچانک کسی نے یاد دلایا کہ وہ شہر میں فٹ بال کا چیمپیئن کھلاڑی ہے۔ اس پر تمام لوگ بھاگ بھاگ فٹ بال کے میدان میں پہنچے۔ وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ دولہا میاں عروسی جوڑا پہنے ہوئے فٹ بال کو کھک لگا رہے تھے۔ دولہا میاں کو سمجھایا گیا کہ بھائی صاحب گھر چلیں اور شادی کی تقریب میں شامل ہوں۔ نکاح کے بعد بھی آپ کا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ دولہا نے شادی کے شرکاء کی خواہش کا احترام کیا اور ان کے ساتھ واپس گھر چلا گیا۔

ایک اور حیرت ناک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ 2001ء میں جنوبی افریقہ میں ایک خاتون زیمبی نے اپنے مردہ شوہر سے دوبارہ شادی کی۔ یہ شادی کا اتنا انوکھا واقعہ تھا کہ لوگوں نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبائیں۔ زیمبی کے شوہر کا اس کی غیر حاضری میں انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایک گرجا گھر میں زیمبی اور اس کے آنجنابی شوہر آئزک کو قانونی طور پر میاں بیوی بنانے کی قدم رسومات ادا کیں۔ رات بھر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

دنیا کی دس حیرت انگیز شادیوں کا جان کر بھی سردھننے کو جی چاہتا ہے، ان شادیوں کا تذکرہ بھی انگشت بدنداں کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے انسانوں کی شادیوں کے بارے میں سنا ہوگا اور شرکت بھی کی ہوگی کیا آپ نے سنا ہے کہ کسی نے شادی اپنی من پسند شے سے کی یا پھر خود سے ہی کر لی؟ واقعی یہ سب کچھ آپ کے لیے حیران کن ہوگا؟ یہاں ہم آپ کو چند ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بتا رہے ہیں جنہوں نے کسی دوسرے انسان کی بجائے اپنی من پسند شے سے شادی کی یا اگر انسان سے کی بھی تو وہ بھی حیران کن انداز میں اور ان سب شادیوں کی باقاعدہ طور پر تقریبات بھی منعقد کی گئیں۔ 37 سالہ ریٹائرڈ فوجی ٹاؤن سان فرانسسکو میں رہائش پذیر ہیں انہیں ہٹلر ٹاور سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اپنی اس محبت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ایک بہت بڑی تقریب منعقد کر کے ہٹلر ٹاور سے شادی کی اور باقاعدہ قانون کے مطابق اپنے نام کے ساتھ ہٹلر کا اضافہ بھی کیا۔ ایجا 54 Eija سالہ جرمن خاتون ہیں۔ انہوں نے 1979ء میں برلن وال سے شادی کی۔ ایجا کا کہنا ہے کہ انہیں اس وال سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس وال کو پہلی مرتبہ سات سال کی عمر میں دیکھا تھا اس کے بعد انہیں اس وال سے محبت ہو گئی تھی۔

ایک جاپانی شخص نے میٹرو ڈیم کے کردار سے شادی کی جو ایک لڑکی کا ہے۔ انہوں نے گوام میں باضابطہ طور پر اپنی شادی کی تقریب منعقد کی جس میں انہوں نے قانونی طور پر اس کردار سے شادی کا اعلان کیا جو صرف گیم کا ایک خیالی کردار ہے۔ ایم اے وولف 32 سالہ امریکن شہری ہے۔ انہوں نے فیئر گراؤنڈ رائٹ سے شادی کی۔ یہ رائٹ ہسٹولونیا کے لیمو زمنٹ پارک میں نصب ہے۔ ”مرحوم دوست سے شادی“ ناگالی اور جون تھن جارج نومبر 2008ء میں شادی کرنے والے تھے۔ ایک موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے

جس کے نتیجے میں جو تین جارج کی موت واقع ہو گئی اس واقعے کے باوجود ماگالی نے اپنی شادی کی تقریب منسوخ نہیں کی اور باقاعدہ طور پر اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر کے ساتھ شادی کی۔

”جیکے سے شادی“ تو آپ نے سنا ہوگا کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور وہ کسی سے بھی ہو سکتی ہے مگر کیا بھی آپ نے اتنی اندھی محبت کے بارے میں سنا ہے جو انسان کو اپنے جیکے سے ہو جائے۔ گویا کے رہنے والے لی جن نے اپنے جیکے سے شادی کی جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ طور پر ایک تقریب کا اہتمام بھی کیا۔

”سانپ سے شادی“ ایک ہندو خاتون جنہوں نے 2000 افراد کے سامنے 2006ء میں ایک سانپ سے شادی کی۔ اس شادی کا اہتمام ہندو رسم و رواج کے مطابق کیا گیا۔ خاتون شادی کی رسومات کے دوران سانپ کے ساتھ بیٹھی رہیں۔ ہندوستان میں چرند، پرند سے شادی عام ہے۔ لڑکی اگر مالک ہے تو اسے کتے، بلی یا بچہ پودے سے شادی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بیوہ ہو جائے گی۔ اسیاتھ بچن کی بہو ایسورہ رائے کی شادی پہلے نیم کے پیڑ سے کرائی گئی پھر اگلے دن اصل شادی ہوئی گوگل پر ایسی شادیوں کی بے شمار تصویریں مل جاتی ہیں۔

”وٹیکن سے شادی“ ایڈورڈ اسمتھ جنہوں نے اپنی ویلا واکس وٹیکن ہٹل کے ساتھ شادی کی۔ مشرا سمیت 57 سالہ شخص ہیں ان کا کہنا ہے کہ انہیں پہلی مرتبہ 15 سال کی عمر میں اس گاڑی سے محبت ہو گئی تھی۔

”اسٹیر یوسٹم سے شادی“ ایما 43 سالہ برطانوی خاتون ہیں انہوں نے ایک ہائی فائی اسٹیر یوسٹم سے شادی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سسٹم سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسے جیک کے نام سے پکارتی ہیں۔ ان کے خیال میں جیک ایک مضبوط قابل بھروسہ اور خوبصورت ساتھی ہے۔

شادی میں اعداد کا مکمل دخل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہم آپ کو چھن لیے چلتے ہیں جہاں شادی میں 9 کا ہندسہ اہمیت کا حامل ہے۔ چھن روایت میں 9 کے عدد کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علم الاعداد کے مطابق 9 کے عدد سے تشکیل پانے والے چھنی لفظ کا مطلب ہے ”ہمیشہ قائم رہنے والی“ چنانچہ شادی کو پائیدار بنانے کے لیے 9 کے عدد کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ نے کوئی تحفہ دینا ہے تو 9

کی تعداد پوری کرنا ہوگی مثلاً کوئی جواب دینا ہے تو 9 سے جوڑ دے گا۔ کسی نے رومال دینا ہے تو 9 عدد ہوں گے۔ کوئی پھل دینا چاہتا ہے تو 9 دانے ہوں گے۔ یہ 9 تو کم از کم ہے آپ نے زیادہ کرنا ہے تو کوئی حد نہیں، آپ 99، 999، 9999، علیٰ ہذا القیاس کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر 9 کے چکر سے باہر نہیں نکلنا۔ چنانچہ سلاوی وغیرہ بھی اس حساب سے دی جاتی ہے۔ دولہا کی جانب سے دیئے گئے شادی کے کھانے یعنی دعوت دہانہ میں ویڈنگ ہال کی آرائش قابل دیدہ ہوتی ہے، ہر طرف بکھری سرخی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ گویا پورے ماحول کو بجزہ احمر میں ڈبکی دے کر چین کے اس قصبے میں رکھ دیا گیا ہو۔

روایتی چینی کھانے میں غیر ملکی مہمانوں کے ذوق و ضرورت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح سلاوی کا رواج چین میں بھی ہے۔ مگر وصولی کا طریق کار انوکھا۔ وصولی ہال کے مرکز کی دروازہ پر ہی کی جاتی ہے۔ مہمان ویڈنگ بک پر اپنا نام اور سلاوی میں دی جانے والی رقم کا اندراج کرتے اور سرخ لفافہ انڈینڈنٹ کو تحفہ دیتے۔ یہاں بھی 9 کے عدد کا رواج ہے۔ سلاوی کی رقم بے اہتمام 9، 99، 999 یا 9999 پوآن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاکہ بد شگونی کا احتمال نہ رہے۔ رخصتی کا منظر بھی مشرقی رنگ لیے ہوتا ہے۔ دلہن کو گاڑی میں بٹھانے کا فریضہ کسی بھانجی کے ذمہ ہوتا ہے جو شوہر اور بچوں والی ہو اور ماں باپ اور ساس سرسری جیات ہوں اس دوران دلہن کی بہن یا سہیلی اس پر سرخ رنگ کی تیشی کی چھتری تانے لگتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی نشست پر مٹی بھر چاول پھینک دیتی ہے۔ گاڑی کے پیچھے سرخ رنگ کی چھتری اور آئینہ باندھنے کا رواج بھی ہے جسے بد رجحان سے دلہن کے تحفظ کا موجب سمجھا جاتا ہے ہمارے ہاں تو رواج نہیں رہا مگر چین میں آج بھی دلہن رخصتی کے وقت آٹو ضرور بھاتی ہیں اور ماں آخری پیار کے بعد اسے پند و نصائح کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ چینی دلہن مایوں بھی بیٹھتی ہیں۔ شادی سے چند ہفتے پہلے باہر نکلتا چھوڑ دیتی ہیں اور گھر میں زیادہ سے زیادہ وقت والدین، بہن بھائیوں اور سہیلیوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔

چین میں جہیز کا رواج بھی ہے۔ جو نئے گھر کی بنیادی ضروریات پر مشتمل ہے جو شادی کے دن سے پہلے دولہا کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔

چینی شادیوں میں لی شی منی بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں شادی کی تقریب میں مختلف مواقع پر ہونے

قدرتی آفات مثلاً زلزلہ باری، طوفان سے فصلوں کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس شادی سے ہمارے گاؤں میں ”شادی بنی رہے گی“۔ علاقے کے بیشتر کاشت کار لوہا اور روٹی اگاتے ہیں اور ان کی زندگی کا دارومدار یہی اچھی فصل پر ہے۔ گنگا اور پرکاش کی شاہانہ شادی میں گاؤں اور قریبی علاقوں کے 5000 افراد نے شرکت کی۔ گنگا کو خصوصی طور پر تیار کردہ دلہنوں والی ساڑی، ہار اور پھول پہنائے گئے اور میک اپ بھی کیا گیا۔ دوسری جانب دولہا یعنی ”پرکاش“ کی شان بھی نرالی تھی۔ آراستہ پیراستہ کبھی میں ملتی کلرڈ شیروانی اور اورنج پگڑی میں پرکاش بھی کچھ کم خوبصورت نہیں لگ رہا تھا۔ شادی کی تمام رسومات سادہ سادہ جتنی روایتی انداز میں ادا کیں۔ ان رسومات میں ہلدی، گنش پوجا، منڈپ اور انگی کے گرد پھیرے بھی شامل تھے۔ شادی کے بعد پٹواری جی خوشی سے پھولے نہیں سار رہے تھے۔ پھیروں کے بعد ناچ گانے اور کھانے پینے کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک چلا جس میں سب نے دل کھول کر حصہ لیا۔

مہنگی اور عجیب و غریب شادیوں کے احوال کے دوران ملتان میں 2017ء میں ہونے والی اس سستی ترین شادی نے بھی سب کو متوجہ کر لیا۔ ملتان میں دو مہنگی شادیوں کے بعد ایک سستی اور انوکھی شادی ہوئی جس میں شادی کے لیے دولہا میاں تیار ہو کر باراتیوں کے ساتھ میٹروپس میں سوار ہو کر دلہنیا لینے پہنچے اور وہاں بالوشاہی اور پانی سے تواضع کے بعد دلہنیا لے کر گھر واپس آ گئے۔ دولہا نے شادی کے لیے چھوٹے گئے انوکھے کارڈ میں تمام مہمانوں کو وقت پر پہنچنے کی تلقین بھی کر ڈالی اور کارڈ پر یہ بھی درج کیا کہ اس کے ماموں قدر میٹرو کے سیکے بانٹیں گے۔

ملتان کے علاقے منٹھور آباد میں دو لمبے میاں نے پہلے تو یہ انوکھا کارڈ چھپوایا اور پھر برأت کے ساتھ میٹرو اسٹیشن پہنچ گیا۔ سفید شلوار قمیص پر کالی واسکٹ زیب تن کیے دولہا رمضان میٹرو اسٹیشن پہنچا تو ماموں قدر نے وعدے کے مطابق باراتیوں میں سے تقسیم کیے اور یوں برأت شاہ رکن عالم اسٹیشن پہنچ گئی۔ دولہا میاں ماموں قدر کے ساتھ 62 باراتیوں پر 1240 روپے کا خرچ کرنے کے بعد دلہن کے گھر پہنچے تو نکاح ہوا جس کے بعد میٹروپس پر آئی بارات کی صرف بالوشاہی اور پانی سے ہی تواضع کی گئی۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں بھی ایک انوکھی شادی نے مظاہرہ کی یاد تازہ کر دی۔ ایک بڑے مذہبی گھرانے کے بیٹے کی شادی میں پولیس اور انتظامیہ

والے خرچوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے سلامی، منہ دکھائی، رحمتی خرچا وغیرہ۔ چھٹی ان سب مواقع کے اخراجات کے لیے صرف ایک جادو کی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ”لی شی منی“ لی شی کا مطلب ہے ”Good luck for ever“ یعنی دائمی خوش بختی۔ لی شی منی سے دولہا بھی مبرائیں۔ برأت روانہ ہوتی ہے تو دولہا لی شی منی الگ سے سرخ رنگ کے لفافے میں رکھ لیتا ہے۔

بھارت میں مہنگی ترین شادی کا تذکرہ ہو چکا، اب ایک عجیب و غریب شادی کا حال بھی جان لیجئے۔ شادی پر 10 لاکھ روپے، یعنی یوں کہہ لیجئے 10 ہزار پاؤنڈ کا خرچا آیا۔ یہ وہ رقم ہے جس میں برطانوی جوڑا بہت شاعرانہ طریقے سے شادی رچا سکتا ہے۔

کہتے ہیں جوڑے آسانوں پر بنتے ہیں۔ لیکن بھارت میں ایک ایسے انوکھے جوڑے نے شادی رچائی جو آپ نے شاید پہلے کبھی نہ دیکھی ہو اور نہ سنی ہو۔ شادی کا نام آتے ہی ڈھول، تانبے، زرق برق کپڑے پہنے برات کے آگے ناپچے گاتے براتی، آتش بازی اور حرے حرے کے کھانوں کا خیال آتا ہے۔

بھارت میں بھی ایک ایسی ہی شادی کی تقریب ہوئی جس میں یہ سب روایتی میلہ اور ہلا گلا تو ہوا، لیکن یہ سب کچھ دوسری شادیوں سے کچھ الگ اس طرح تھا کہ اس شادی میں



برات کا دولہا ”نیل“ جبکہ دلہن ”گائے“ تھی۔ اس انوکھی اور دلچسپ شادی کا احوال کچھ یوں ہے کہ شادی پر 10 لاکھ روپے یعنی یوں کہیے 10 ہزار پاؤنڈ کا خرچہ آیا۔

یہ شادی کروائی کس نے اور کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گائے ”گنگا“ اور نیل ”پرکاش“ کا بیہ رچانے والے ریاست مدھیہ پردیش کے شہر اندور کے قریبی رہنے والے گنگا کے مالک گوپال پٹواری۔ گوپال کا کہنا تھا کہ شادی کا مقصد

گئی، چار بیگمات کے شوہر نے چار بیگمات لانے کے لیے پہلے سے موجود چاروں خواتین کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا تاہم جب وہ نئی خواتین سے شادی کرنے میں ناکام ہوا تو پہلی بیگمات سے دوبارہ شادی کا فیصلہ کیا لیکن اب سابقہ بیگمات نے بھی جہنم کا مطالبہ کر دیا جو تقریباً ایک لاکھ 60 ہزار سعودی ریال (تقریباً 44 لاکھ 63 ہزار پاکستانی روپے) بنتے ہیں۔

آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں نوٹناروزانہ کا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع داراؤنی (بنارس) کے چولا پور گاؤں میں شادی کی تقریب کے لیے دولہا اور دلہن والوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت تقریب کے لیے دولہا والوں کی جانب سے ڈی جے کا بندوبست کیا جانا تھا لیکن دلہن کے والد ڈی جے پر قارئین کا مطلب آرکیسٹرا اچھے بیٹھے لڑکی والے جب تقریب میں پہنچے تو لڑکے والوں نے ان کا بھرپور استقبال کیا اور ساتھ آئے لوگوں نے دیگر مہمانوں کے ساتھ مل کر ڈی جے کے گانوں پر خوب رقص کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دلہن کے والد نے آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شور مچانا شروع کر دیا اور شادی ختم کرنے کی دھمکی بھی دی۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ دولہا والے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جس پر مہمانوں نے مداخلت کی اور دونوں کو معاملہ سمجھانے کی ہدایت کی تاہم دلہن کا والد اپنی ضد پر اڑا ہوا رشید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کر ڈالی۔

یہ محبت کی انوکھی داستان ہے کہ 16 سالہ لڑکے کی 73 سالہ خاتون سے شادی ہو گئی۔ انڈونیشیا میں روایات اور قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نوجوان نے 70 سال کی معمر خاتون سے شادی کی۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب شادی کی ویڈیو آن لائن وائرل ہو گئی۔ نوجوان دو لہجے کی عمر 16 سال ہے اور قانونی طور پر اسے شادی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہر حال جب گاؤں کے لوگوں اور حکام نے اس شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو جوڑے نے خود کشی کی دھمکی دی۔ اس کے بعد حکام نے بغیر رجسٹریشن کے شادی کی اجازت دے دی۔ انڈونیشیا قانون کے مطابق شادی کے لیے خواتین کی عمر 16 سال اور مردوں کی عمر 19 سال ہونی چاہیے۔ دونوں میں اس وقت قربت بڑھی جب

لے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، یوں تو شادی کی تقریبات میں دلہا و داماد ہمارے معاشرے کا دستور بنتا جا رہا ہے مگر کچھ ایسی تقریبات بھی ہیں جن پر نہ چاہتے ہوئے بھی قلم اٹھ جاتا ہے۔ وفاقی دارالحکومت کی شاہراہوں پر گھوڑوں کی سکی میں سوار یہ نوجوان راولپنڈی کے معزز مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلام آباد کی تاریخ کی شاید پہلی شادی ہو گئی جس کے لیے ہائی سکیورٹی زون میں واقع فائینا اسٹار ہوٹل تک پہنچنے کے لیے راولپنڈی اور اسلام آباد کی سول انتظامیہ اور پولیس نے وی آئی پی ٹیکرل کو فروغ دینے میں اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی اور برسات کے لیے تمام راستے بند کر کے پروٹوکول دیا گیا بلکہ اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ نے تو اپنے آفیسر بھی تعینات کیے تاکہ پروٹوکول میں کوئی کمی نہ رہ جائے، انوکھی شادی کے تمام راستے صاف کرنے والے اسلام آباد پولیس اور سول انتظامیہ کے افسران حیرت انگیز طور پر گھوڑوں اور اونٹوں کی آمد سے لاطمی کا اہتمام کرتے رہے۔ سعودی عرب میں شادی کی ”انوکھی ترین“ تقریب کا حال بھی قابل ذکر ہے۔

سعودی عرب کے علاقے الجوف میں ایک انوکھی اور غیر روایتی انداز کی شادی دیکھنے میں آئی جہاں دولہا ایک ”ٹرائلر“ میں سوار ہو کر اپنے دوستوں کے ہمراہ شادی کی تقریب میں پہنچا اور تمام لوگوں کو حیران کر ڈالا۔ سوشل میڈیا پر مذکورہ شادی کا ویڈیو کلپ پورے زوروں کے ساتھ گردش میں رہا۔ سعودی حلقوں کی جانب سے اس کو مملکت میں ”انوکھی ترین“ شادی قرار دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ سعودی عرب کی شادیوں میں دولہا کی بہت بڑی سواری میں آمد کو انوکھا اور غیر مانوس امر شمار کیا جاتا ہے۔ ویڈیو کلپ میں دولہا کو شادی ہال کے اندر ایک بڑے ٹرائلر ٹرک میں سوار ہو کر داخل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے جب کہ دولہا کے عزیز و اقارب اور دوست اس کو مبارک باد دینے کے لیے ایک جانب ہو گئے۔

نئی شادیوں کے لیے ایک ہی دن میں چار بیویوں کو طلاق کا معاملہ وچسپی سے خالی نہیں، یہ واقعہ بھی سعودی عرب کے شہر جدہ میں پیش آیا۔ ایک سعودی شہری نے نئی شادیاں کرنے کے لیے اپنی موجودہ چاروں بیویوں کو ایک ہی دن میں طلاق دے دی لیکن نئی شادیاں کرنے میں بھی ناکام رہا جبکہ سابقہ بیگمات سے دوبارہ شادی کرنے کے لیے اسے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سعودی ریال بطور جہیز دینا ہوں گے۔ بعد وہیپ سائنٹ ایمریش 24/7 نے سعودی میڈیا کے حوالے سے لکھا کہ طلاقیں کی یہ انوکھی کہانی سوشل میڈیا پر پھیل

لیبریا میں جتلاڑے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بزرگ عورت نے سنبھالی۔ جنوبی سائرا کے اس گاؤں کے سربراہ سب انہی نے بتایا کہ ”چونکہ لڑکے کی عمر کم تھی، اس لیے ہم نے شادی کی اجازت بغیر رجسٹریشن کے دے دی“۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ”ایک غیر اخلاقی عمل کو روکنے کے لیے دو جولائی کو یہ شادی ہوئی۔ لڑکے کا نام سلامت جبکہ ان کی اہلیہ روہایا کی عمر 73 سال تھی“۔ اطلاعات کے مطابق لڑکے کے والد کی کئی سال پہلے موت ہو چکی تھی جس کے بعد اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ روہایا کی یہ تیسری شادی ہے اور ان کی پہلی دو شادیوں سے کئی بچے بھی ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی آپ کی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ دولہا کو ڈانس کرنا مہنگا پڑ گیا، لہٰذا نے شادی سے انکار کر دیا۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں ٹوٹنا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار دولہا کے ڈانس کرنے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ بھارتی ریاست اتر پردیش کے طلبہ شاہ جہان پور میں ایک دولہے نے اپنی شادی کے دوران اچانک ناگن ڈانس شروع کر دیا۔ اسے یہ حرکت اتنی مہنگی پڑی کہ لہٰذا نے شادی سے ہی انکار کر دیا۔ منے میں دھت دولہا جیسے ہی برأت لے کر لہٰذا کے گھر پہنچا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور سڑک کے پتھوں بچ لوٹنے ہوئے ناگن ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا پر ناگن ترپائی کو جب یہ سب واقعہ معلوم ہوا تو اسے بہت شرمندگی ہوئی اور اس نے فوری طور پر اپنے والدین سے کہہ دیا کہ وہ ایسے شخص سے کسی صورت شادی نہیں کرے گی۔ دونوں خاندانوں نے لہٰذا کی بہت منت سماجت کی کہ وہ شادی سے انکار نہ کرے تاہم لہٰذا اپنے فیصلے پر قائم رہی، یوں دولہے میاں کی ایک چھوٹی سی غلطی ان کی عمر بھر کا بچھڑا بن گئی۔

سنگاپور میں بھی عجیب واقعہ رونما ہوا۔ سنگاپور سے تعلق رکھنے والا ایک جوڑا گزشتہ دو سال سے اچھی بھلی ازدواجی زندگی گزار رہا تھا مگر حال ہی میں شوہر نے ایک ایسا کام کر ڈالا کہ حکومت نے مداخلت کرتے ہوئے ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ شوہر نے اپنی جنس تبدیل کروائی تھی اور تہذیبی جنس کے بعد اپنے شادی کارڈ کو بھی تبدیل کروایا اور اس پر اپنی جنس عورت لکھوائی تھی۔ جب متعلقہ محکمے کو معلوم ہوا کہ میاں بیوی دونوں کی جنس عورت ہے تو ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی شدہ جوڑوں کو

پہلی بار رہائش گاہ خریدنے کی صورت میں حکومت کی جانب سے رعایت ملتی ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے اس جوڑے نے بھی اپنی معلومات متعلقہ محکمے کو دی تھیں لیکن اس خوش میں ان کی اصل حقیقت سامنے آ گئی۔ حکام کا کہنا ہے کہ سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے لہٰذا یہ جوڑا میاں بیوی قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی انہیں گھر خریدنے کے لیے حکومتی رعایت حاصل ہو سکتی ہے۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے برعکس سنگاپور نے ہم جنس شادیوں کو تا حال قانونی قرار نہیں دیا۔ سنگاپور کے وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ یہ ملک ابھی ہم جنس شادیوں کو قانونی قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ذکر پھر بھارت کا آ گیا ہے، کبھی ڈانس پر شادی سے انکار اور کبھی لڑکھاٹے سے دلہن روکھ گئی۔ دولہے کے سسکے کھانے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ جی ہاں ریاست اتر پردیش کے مرارتی گاؤں میں شادی کی تقریب میں دولہے کو لڑکھاٹے چھوڑ دیا گیا اور دلہن نے اسی وقت شادی سے انکار کر دیا۔ دولہا شادی کی رسومات کے دوران لڑکھاٹے ہاتھ جو اس کی دلہن کو ڈرانہ بھایا اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر لڑکی کے گھر والوں نے بہت سمجھایا لیکن دلہن اپنی ضد پراڑی رہی، شدید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کر ڈالی۔

پاکستان میں بھی ایک واقعہ سننے اور سرد چھینے۔ رواں برس 21 جنوری کو حیدر آباد پاکستان میں گدھے گدھی کی شادی کر دی گئی۔ ”حیدر آباد میں انوکھی شادی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حیدر آباد کے رہائشیوں نے ایک انوکھی شادی کا اہتمام کیا۔ رہائشیوں کی طرف سے گدھے کو دولہا اور گدھی کو دلہن بنایا گیا۔ گدھا گاڑی بان نے اپنے لاڈلے گدھے کو دولہا بنا کر اپنے دوست کی گدھی سے شادی کروادی۔ گدھا اور گدھی کی شادی کے لیے کئی گدھا گاڑی بانوں نے مل کر خصوصی اہتمام کیا اور خوب مزہ ملا کھایا۔

شادیوں کے ان حیران کن واقعات میں ایک دلچسپ واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ایک شخص نے ”جل پری“ کو شادی کی پیشکش کر دی۔ اس جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت کو ایک نئی ”گہرائی“ پر پہنچا دیا ہے۔ جی ہاں امریکی ریاست کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے ایک مارٹینز نے اپنی گرل فرینڈ کی رینی سے میکسیکو کے علاقے ریور ہایاما میں تعطیلات کے دوران زندگی بھر کے ساتھ کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس جوڑے

شادی ہمارے لیے درست انتخاب نہیں، اگرچہ ہم اپنے اس خاص دن کو گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ شہر کرنا پسند کرتے، مگر ہم دونوں نے اس خیال کو اپنایا کہ ان حیران کن تعطیلات کے دوران شادی کے بندھن میں بندھا جائے۔ اگرچہ یہ شادی کے لیے دنیا کا بلند ترین اور غیر متوقع مقام سمجھا جاسکتا ہے مگر جوڑے نے امریکی روایتی عروسی لمبوسات پہننے کو ترجیح دی۔ جیمو نے سوٹ جبکہ ایٹلے نے سفید رنگ کا روایتی عروسی لباس زیب تن کیا، ان کی اس تقریب کو ایک ایڈووچر ویڈیو فوٹو گرافر چارلسٹن چرچل نے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیا۔ فوٹو گرافر نے اپنی ویب سائٹ پر ایک بلاگ پوسٹ میں اس تقریب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا، ”سفر کے آغاز میں بہت زیادہ برقباری ہو رہی تھی، ہمارے گائیڈ کے مطابق



ہمارے اوپر پورے موسم سرما سے زیادہ برف گر سکتی ہے، 14 ہزار فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت منفی 8 سے 10 فارن ہائیٹ تک گر گیا تھا اور ہمارے ہاتھ دستوں سے نکلنے ہی سمجھ نہ ہو جاتے، جیسا کہ تصاویر لینے کی کوشش کے دوران میرے ساتھ ہوا۔“ انہوں نے لکھا، ”جیمو اور ایٹلے کی شادی منفی پانچ سے پانچ ڈگری فارن ہائیٹ کے دوران ہوئی، لیکن کے عروسی لباس کے لیے ہم نے خصوصی طور پر انتظام کیا کہ وہ گرم رہے۔“ تاہم تمام تر مشکلات کے باوجود شادی کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ فوٹو گرافر کے مطابق جب ہم بیس کمپ پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پاس ویڈیو گھٹنا ہے جس کے دوران کھانا، شادی، سامان باندھنا اور ٹیلی کاپٹر برسرِ ہوا ہے، تو ہم نے ایک گھنٹے کے اندر کھانا، پینا اور شادی کی تقریب منائی، جس کی ہم نے چند تصاویر بھی لیں۔“

چارمربہ شادی کرنے والے میاں بیوی کا تذکرہ بھی حیران کن اور اپنی طرز کا انوکھا واقعہ ہے۔ آپ نے کئی رومانوی ناؤز اور افسانوں میں تو پڑھا ہی ہوگا کہ محبت کا کوئی



نے فوٹو گرافر پولی ڈاؤسن سے اس یادگار لمحے کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کا کہا۔ مگر ایک نے اپنی ہونے والی دلہن کے لیے صرف یہ سر پرانہ ہی نہیں رکھا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مگھیر کی بچپن کی خرابی کو بھی حقیقت کا روپ دینے کا اہتمام کیا تھا۔ ایک نے مکی کو کہا کہ وہ ایک بار پھر شادی کی پیشکش کرے گا مگر اس بار پانی میں۔ اور خاتون جل پری کے روپ میں ہوں گی۔ مکی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا، ”میری بچپن سے پسندیدہ شہزادی دی لائل مریمڈ کی اریل تھی، جل پریاں جادوئی ہوتی ہیں اور سمندر کی گہرائیوں کو کھال سکتی ہیں، اور میں اتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے پرنس ایک جیسا شخص ملا، جس نے میرا خواب پورا کر دیا۔“ اس مقصد کے لیے ایک نے خاص قسم کی سرخ آگٹو مکی بھی تیار کرائی تھی تاکہ زیر آب فوٹو شوٹ میں اسے نمایاں کیا جاسکے، جبکہ خاتون کے لیے جل پری جیسی گولڈ اور یلرنگ کی دم بھی تیار کروائی۔ اگرچہ اب یہ تصاویر بہت خوبصورت اور آسانی سے لی جانے والی لگ رہی ہیں مگر مکی کے مطابق یہ انتہائی مشکل کام تھا خصوصاً اس لیے کیونکہ میرا سر چکر رہا تھا، مگر پھر بھی پانی کے اندر میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔“

ماؤنٹ ایورسٹ پر شادی کرنے والے جوڑے کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس نوبیا ہتا جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت کو ایک نئی ”بلندی“ پر پہنچا دیا ہے۔ امریکا کے تعلق رکھنے والے 35 سالہ جیمو سیسوم اور 32 سالہ ایٹلے شہید نے زندگی بھر کے تعلق میں بندھنے کے لیے انتہائی غیر متوقع مقام کا انتخاب کیا اور وہ ہے دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ۔ رواں برس مارچ کے آخر میں ہونے والی یہ شادی ماؤنٹ ایورسٹ کمپ پر ہوئی جہاں وہ اس سے قبل تین دفعے تک ہائیکلنگ کرتے رہے تھے۔ ایٹلے نے بتایا، ”کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ روایتی انداز سے

میرج ایکٹ کے تحت شادی کی، یہ ایکٹ مسلمان مرد کو 4 شادیوں سے بھی روکتا ہے۔ اکلچا اور فیض نے اپنی تیسری شادی اور محبت کو یادگار بنانے کے لیے ہندوستانی فلموں اور رومانوی ٹاؤل کی کہانیوں میں بتائے گئے آئیڈیاز کو خوب استعمال کیا۔ وہ تیسری شادی کے لیے بھارتی ریاست گواڈاچے، جہاں انہوں نے ایک بار پھر اسلامی رسم و رواج کے مطابق دوستوں اور سیاحوں کے سامنے نکاح کیا، اس دوران گیت سنگیت اور رقص کا پروگرام بھی سجایا گیا۔ اکلچا اور فیض نے چوتھی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، انہوں نے ساحل سمندر پر سات پھیرے لیے۔ شادی کی چوتھی تقریب میں بھی انہوں نے گیت سنگیت اور رقص کے پروگرام کا اہتمام کیا۔ دسمبر 2010ء میں سیرٹیل اور لیسا وائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لنڈن آئی کے سامنے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی، امریکا میں میسچو پیٹس میں اپنی میلنک شادی میں ویٹیکل لٹن میک کی اور برے ٹن تھامس تقریبے تھیلیوں کو آزار دہانے ہوئے شادی کی۔

چوتھیں گھنٹوں میں دوشادیاں کر کے ملتان میں ایک نئی روایت ڈالی گئی۔ ملتان میں ایک نوجوان نے ایک دن میں دو شادیاں رجا کر ایک سے زیادہ شادیوں کے متنی مردوں کے لیے ایک نئی روایت قائم کر دی ہے۔ تیس سالہ اظہر حیدری چوتھیں گھنٹوں میں دو شادیوں کا اعلان کر کے پاکستانی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنے، اظہر حیدری نے بتایا کہ اس کی دلہنوں میں سے ایک اس کے خاندان کی پسند ہے جبکہ ایک ان کی اپنی پسند ہے۔ انہوں نے کہا کہ دراصل وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے خاندان نے ان پر زور ڈالا کہ وہ اسی خاتون سے شادی کر جسے ان کے والدین نے بچپن سے طے کر رکھا تھا۔ اس مشکل صورت حال سے نکلنے کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا کہ دونوں لڑکیوں سے انہیں شادی کر لی جائے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں خاندانوں نے ان کی تجویز کو مان لیا اور اب وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کرتے ہیں کیونکہ دونوں نے شاید ہی کسی ایک مرد کو پسند کیا ہے۔ تیس سالہ اظہر حیدری کی پہلی شادی اتوار کے روز اٹھائیس سالہ کرن حمیرا قاسم سے ہوئی جبکہ ان کی دوسری شادی ان کی اپنی پسند رومانہ اسلم سے سوموار کے روز ہوئی۔ پاکستان میں رائج اسلامی قانون مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ اس میں پہلی بیوی کی رضامندی شامل ہو۔

مذہب یا ذات نہیں ہوتی اور یقیناً آپ نے ایسی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی جن میں ہیرو اور ہیروئن الگ الگ مذہب اور ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں ایسا حقیقت میں بھی ہوتا ہے کہ دولہا اور دلہن الگ الگ مذہب رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں اور مذہب بھی تبدیل نہیں کرتے، مگر ایک ہی میاں بیوی چار بار مختلف طریقوں سے شادی کریں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بھارت جیسے کثیر المذاہب اور کثیر الثقافتی ملک میں دو مختلف مذاہب کے ماننے والے افراد کی شادی ہمیشہ ہی سماجی مسئلہ رہی ہے، تاہم بہت سارے جوڑے ایسے بھی ہیں جنہوں نے غیر مذہب افراد سے شادی کر رکھی ہے، ایسی شادیاں کرنے والوں میں بولی ووڈ اداکار، سیاستدان، کھلاڑی اور کاروباری افراد شامل ہیں۔

ہندوستان کی ریاست ہریانہ سے تعلق رکھنے والی اکلچا بھی ایک ایسی ہی لڑکی ہے، جس نے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی اور یہ شادی ایک بار نہیں بلکہ چار بار کی۔ اکلچا ہندو مت کی ماننے والی ہیں، جبکہ ان کے شوہر فیض کا تعلق ترقی پسند مسلمان گھرانے سے ہے۔ فیض اور اکلچا کی محبت ڈرامائی طور پر 2 سال قبل شروع ہوئی، جو بتدریج بڑھتی چلی گئی اور پھر دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ آسان اور ممکن نہ تھا۔ اکلچا نے اپنی شادی کی کہانی لکھتے ہوئے اعتراف کیا کہ ان کے گھر والے شادی کے لیے تیار نہیں تھے، تاہم انہوں نے مکمل کھجالت بھی نہیں کی۔ گھر والوں کو راضی کرتے کرتے انہیں 2 سال گزر گئے مگر دونوں کے اہل خانہ راضی نہ ہوئے پھر بالآخر انہوں نے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکلچا اور فیض کی شادی کے بعد بالآخر ان کے اہل خانہ بھی راضی ہو گئے، فیض کے مطابق ایک مسلمان مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس لیے انہوں نے ایک ہی دلہن کے ساتھ چار بار شادی کی رسومات ادا کیں۔ شادی کے بعد دونوں نے ایک دوسرے پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا، بلکہ دونوں اب بھی اپنے اپنے مذاہب پر یقین رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی زندگی کا اٹھ حصہ بن چکے ہیں۔

اکلچا اور فیض نے پہلی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، فیض نے اکلچا کی ماگ میں سندور بھرا اور انھیں مالا پہنائی۔ اکلچا اور فیض نے دوسری شادی اسلامی رسم و رواج کے تحت کی، وہ عدالت گئے اور بھارت کے عدالت

باراتیوں کو برغمال بنالیا تاہم رات گئے ان کو چھوڑ دیا گیا جس کے بعد برأت دہن کو لیے بغیر واپس چلی گئی۔

دنیا بھر میں شادی کی رسوم و رواج میں وہاں کی روایات اور تہذیب و ثقافت جھلکتی ہے۔ مسلمانوں میں نکاح، عیسائیوں میں مقدس انگشتیں اور ہندوؤں میں اگنی کے سات پھیرے زندقہ بھرتا بھرتا کا عہد نامہ ہوتے ہیں۔

پاکستان میں شادیاں بہت رنگین اور رونق والی ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں شادی کی رسموں میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ذیل میں چند دلچسپ شادیوں کی رسومات کے بارے میں اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

پاکستان میں شادی کی تقریبات کا آغاز دھوئیں سے ہوتا ہے۔ شادی سے کئی روز پہلے سے دھوئیں بچنا شروع ہو جاتی ہے جس میں خاندان کی لڑکیاں اور عورتیں شرکت کرتی ہیں۔ شادی کی پہلی باقاعدہ رسم مایوں ہوتی ہے۔ اس میں دہن کو پیلا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ مہمان بھی پہلے پکڑے پہنتے ہیں۔ دہن اور دولہا کو اٹھن لگائی جاتی ہے۔ اٹھن کے بعد مہندی کی رسم ہوتی ہے۔ قدامت پرست گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کی مہندی علیحدہ علیحدہ جبکہ ماڈرن گھرانوں میں ایک ساتھ ہوتی ہے۔ برأت والے روز دولہا کی سہرا بندی کی جاتی ہے۔ دہن والے برأت کا استقبال ہار پھول پہنا کر کرتے ہیں۔ نکاح کی رسم ادا ہونے کے بعد چھوہارے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دودھ پلائی کی رسم ہوتی ہے۔ رخصتی کے وقت دہن کو قرآن مجید کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے۔

عیسائیوں میں دوفرے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں۔ کیتھولک فرقے میں شادی کی رسوم کی ابتدا رشتہ لے جانے سے ہوتی ہے۔ باہمی رضامندی کے بعد بات طے ہو جاتی ہے۔ قریبی عزیزوں کو مدعو کر کے منگنی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دولہا دہن ایک دوسرے کو انگوشی پہناتے ہیں۔ شادی کی تاریخ طے ہوتی ہے اور تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ شادی کی رسم چرچ میں ہوتی ہے۔ دہن سفید میکسی اور دولہا سیاہ سوٹ پہنتا ہے۔ پادری دعا میں پڑھتا اور شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ ایجاب و قبول کے بعد پادری شادی کی مقدس انگشتیاں بائبل پر رکھتا ہے جسے دولہا اور دہن ایک دوسرے کو پہناتے ہیں۔ اس کے بعد پادری ان کے میاں بیوی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ بعد ازاں میاں بیوی شادی کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہیں پھر موم بتیاں جلاتے ہیں۔ دو موم بتیاں ان دونوں کی اور تیسری ان کے بندھن کی ہوتی ہے۔ شادی کی

پاکستان میں ایک سے زیادہ بیویاں ہونا انہونی بات تھی لیکن دوسری شادی اکثر کئی سالوں کے وقفے کے بعد کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ایک ہی شخص کی چوبیس گھنٹوں میں دو شادیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان کے کئی دی محلوں پر اظہر حیدری کی شادی کی تقریبات کو براہ راست دیکھا گیا تھا۔

ملتان میں بھی ترین شادیوں کے بعد بھی ترین مہندی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ دولہا 2 ہزار مہمانوں اور قیمتی کھڑے، آؤنوں اور شیروں کے ہمراہ دہن کے گھر مہندی لے کر پہنچ گیا تھا۔ دوسری بڑس مین نے بیٹی کی شادی پر 11 ارب لادے تھے۔

یوں تو ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بچوں کی شادی کو یادگار بنانے کے لیے کوئی کرسنہ چھوڑے لیکن کچھ لوگ تو اس موقع پر خزانے کا منہ ہی کھول دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملا۔ امریکی شہر لاس اینجلس میں جہاں رومی بڑس مین نے اپنی 22 سالہ بیٹی کی شادی میں۔ صرف چند گھنٹوں میں ہی ایک ارب روپے سے زائد لٹا دیے۔ ایڈلارڈ سٹار وانا می رومی بڑس ٹائیگن کی بیٹی کی شادی کی تقریب لاس اینجلس کے ڈوبلی تمیز میں منعقد کی گئی اور اس موقع پر ٹیگز کرکٹ بریکے میسٹر ترین پھولوں سے سجایا گیا۔ جن کی مجموعی مالیت 5 لاکھ امریکی ڈالر تھی۔ تقریب میں معروف امریکی سنگریڈی گا گانے بھی پر فارم کیا جبکہ تقریب میں دیگر امریکی دوسری اشارز بھی شریک تھے۔ اس شادی پر مجموعی طور پر ایک ارب سے زائد خرچ ہوئے، جس میں مہنگا عروسی لباس، کئی فٹ لمبا ایک، آؤ کیسٹر اپر فارمنس بھی شامل تھی۔ چلتے چلتے بھارت کا ذکر آ گیا۔

بھارت میں ازوداجی بندھن کی بے حرمتیوں کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع ہارپور میں دولہا کی طرف سے گاڑی کا مطالبہ کرنے پر دہن نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ دہن کے گھر والوں نے باراتیوں کو برغمال بھی بنالیا۔ پولیس کے مطابق الاہ کی رسم جب ادا کی جا رہی تھی تو اچانک دولہا نے کہا کہ الاہ کی رسم بھی ادا ہو گئی جب لڑکی والے اسے گاڑی دیں گے۔ لوگوں نے دولہا کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات سنا نہیں سنے نہیں ہوا۔ دونوں اطراف کے لوگ اس مسئلے کو حل کرنے میں لگے رہے لیکن اسی دوران دہن نے نکاح لے لے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کے بعد لوگوں نے

تھیکل کے بعد کیک کاٹا جاتا ہے جو جتنا امیر ہوتا ہے اسی حساب سے کیک کی منزلوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیک اور شروبات سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے اور اس کے فوراً بعد کافی ہون پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں میں شادی کی بہت سی رسمیں ہیں۔ ان میں رشتہ لڑکی والے لائے ہیں۔ پنڈت "کنڈلی" ملاتا ہے۔ رضامندی کے بعد منگنی (سگائی) کی تقریب ہوتی ہے اور دو روز بعد شادی کی تاریخ دے دی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی کی ابتدا "دوا" کی رسم سے ہوتی ہے جسے ہم ماپوں کہتے ہیں۔ دلہن کو پیلا جوڑا پہنانا اور مہندی لگائی جاتی ہے۔ شادی والے دن دولہا تیار ہونے کے بعد کھیر کی خالی کنوری پاؤں سے توڑتا ہے جبکہ لڑکی والوں کے ہاں پنڈت ایک منگلے میں پانی ڈالتا ہے اور منگلے پر ناریل رکھتا ہے۔ لڑکی کی ماں وہ منگلا سر پر رکھ کر لائی ہے پھر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک رسم میں دودھ بھری ہوئی کنوری میں دولہا اور دلہن کی انگوٹھیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ دونوں پیالے میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھیاں تلاش کرتے ہیں جس کو انگوٹھی مل جاتی ہے وہ دوسرے کو دے دیتا ہے یہ عمل تین بار دہرایا جاتا ہے۔ شادی کی اہم ترین رسم اگنی کے سات پھیرے ہیں۔ آگ کو گواہ بنا کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس میں دولہا کا پٹکا دلہن کے پلوے سے باندھ کر اگنی کے سات پھیرے لیے جاتے ہیں اس دوران پنڈت منتر پڑھتا رہتا ہے۔ لڑکی کا ماسوں آگ میں جوڑا لٹا ہے اور دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اگلے پھیروں میں چچا، جھائی اور باپ سبھی رسم دہراتے ہیں۔ پھیرے مکمل ہونے کے بعد دولہا دلہن کی مانگ میں سیندور بھر کر اسے منگل سوتر پہناتا ہے اور آخر میں دونوں ایک دوسرے کو پھولوں کے ہار اور مالا پہناتے ہیں۔ اس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ رخصتی کے بعد دلہن سسرال آتی ہے تو سر پر دودھ بھرا کنورا رکھتی ہے اور چوکھٹ سے گھر کے اندر دودھ کے چھینٹے مارتی ہے۔ چوکھٹ پر ہی ساس دلہن کی آرتی اتارتی ہے۔ وہیں سندور سے بھرا کنورا رکھا ہوتا ہے جسے دلہن شوکر سے گرا کر سرخ پاؤں سے گھر کے اندر داخل ہوتی ہے۔ دلہن کے ہاتھ میں تل اور جوڑا کھاتا ہے اور منہ دکھائی دی جاتی ہے۔ جاپان کے جزائر اوکی ناوا میں دلہن کو آتماش سے گزرتا پڑتا ہے۔ جملہ عروسی میں داغے کی منگنی لڑکی کے سر کے بال جلانے جاتے ہیں۔ اس موقع پر قبیلہ کا جادوگر کسی جانور کے تیز دانت سے لڑکی کی پیٹھ پر گہری لکیریں ڈالتا ہے اور زخموں میں

بسی ہوئی مرچیں بھرنے سے قبل لڑکی کے ہاتھ کو خوب مضبوطی سے باندھ دیتا ہے۔ لڑکی زخموں میں بسی ہوئی مرچوں کی تکلیف سے درد کے مارے تڑپتی رہتی ہے لیکن کامیاب شادی کے پیلے یہ تکلیف برداشت کرنا ہوتی ہے۔

سواڈان کے بعض علاقوں میں رواج ہے کہ دلہن اپنے ہونے والے شوہر کے رخسار کو داغ دیتی ہے۔ اس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اسے اپنے ہونے والے شوہر سے محبت ہے اور یہ داغ اس کی محبت کی مہر ہے جو اس کے رخسار پر ثبت ہے۔ یہ داغ دیتے وقت شوہر کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ عشق کی یہ مہر زندگی بھر شوہر کے چہرے پر ثبت رہتی ہے۔

دلیز انگلستان کا مشہور علاقہ ہے۔ وہاں قدیم ایام سے آج تک یہ رسم جاری ہے کہ دولہا دلہن کو جملہ عروسی میں داخل ہونے کے لیے آگ کے ڈھیر پر سے گزرتا پڑتا ہے۔

کینیا کے مسائی قبیلے میں رخصتی کے وقت دلہن کا باپ اپنی بیٹی کے سر اور جسم پر دودھ کے قطرے چھڑکتے وقت دعائیں نکالتا ادا کرتا ہے کہ اللہ اسے بہت سے بچوں کی مار بنائے۔ سسرال پہنچنے ہی دلہن کا طمانچوں پتھروں اور گھونروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ کوئی خاتون آگے بڑھ کر دلہن کے سر پر مٹی بھر کر بڑا ڈال کر اسے عروسی سلام پیش کرتی ہے۔ پھر دلہن کی ساس اسے جملہ عروسی (جو ایک خوبصورت چھوٹی سی صورت میں ہوتا ہے) میں لے جانے کے لیے آتی ہے۔ پھر عزیز واقارب پیش قیمت تحفے دے کر اور لاڈ پیار سے اسے جملہ عروسی میں پہنچا دیتے ہیں۔

مراکش کے ایک قبیلے میں شادی کے موقع پر مذہب رہنما ایک تیز دھار چاقو دلہن کے گلے پر رکھ دیتا ہے جب دلہن کے گلے سے خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اس رسم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دلہن پر داغ ہو جائے کہ وہ اس شوہر کے رحم و کرم پر ہوگی۔

تبت کے سوگ قبائل میں شادی کی رسم کی ادائیگی کے لیے دولہا اور دلہن کو ایک ایک پورا کیک کھانا پڑتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی کیک کھانے میں ناکام رہے تو وہ شادی اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔

بھارت کے ایک قبیلے بھو میں شادی کی رسومات میں دلہن کی ماں شریک نہیں ہوتی۔

سائنس و شینا لوہی کی ترقی کے باوجود دنیا میں آج بھی ایسی رسوم پائی جاتی ہیں کہ جن کے متعلق سن کر ہی انسان

اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے اور دلچسپی کا نشان اس کی محبت کا ثبوت ہے۔

1991ء میں کرغزستان میں ایک رسم پر پابندی لگائی گئی جس میں ہونے والی دہن کو شادی کے دن اٹھا کر لیا جاتا تھا اور اسے خوب رلایا جاتا تھا۔ دہن کے آنسو جتنے زیادہ بہتے اسے اتنا زیادہ اچھی زندگی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ دہن کا زارو قطار روٹا شادی شدہ زندگی کے لیے انتہائی نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم اب بھی چوری چھپے ادا کی جاتی ہے۔ اصل میں اس رسم میں دہن کو رلانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا رونا آج ہی ختم ہو جائے گا۔ تاہم دوہلا کو ساری زندگی رو رو کر ہی گزارنی ہے۔ ہمارے ہاں اس رسم کی اتنی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رحمتی کے وقت دہنیں خود ہی دل کھول کر رو لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا اغواء ضروری نہیں ہوتا۔

میانمار میں لوگ اپنے بچوں کے پیدا ہونے کا دن یاد رکھتے ہیں جب ان کی شادی کا وقت آتا ہے تو اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ ایک ہی دن پیدا ہونے والے لوگوں کی آپس میں شادی نہ ہونے پائے۔ اگر یہ شادی ہو جائے تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ مثلاً بدھ کو پیدا ہونے والے لڑکے کی شادی اسی دن پیدا ہونے والی لڑکی سے نہیں کی جاتی۔

سری لنکا میں جو کئی سال میں ایک دن کو شادی کے لیے بہت موزوں قرار دیتے ہیں لوگ اس خصوصی دن کا کئی کئی مہینے انتظار کرتے ہیں اور کئی شادیاں ایک ہی دن سرانجام پا جاتی ہیں۔

چین میں قبروں سے خواتین اور لڑکیوں کی لاشیں نکال کر ان کی مردہ آدمی سے شادی کرنے کے بعد دوبارہ دفن کرنے کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ چین میں تو ہم پرستی کے مارے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی کنوارا شخص اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اگلی دنیا میں اسے مسائل کا سامنا ہوتا ہے، اسی لیے مرنے والے لہجہ افراد کی کسی خاتون یا لڑکی کی لاش سے شادی کرادی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے کسی مرد کے ساتھ یا مرد کے برابر قبر میں دفن دیا جاتا ہے۔ قدیم چینی تہذیب میں یہ بات بھی عام ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر شادی کے مر جائے تو اس کی روح بھٹک کر اس کے عزیزوں کو اذیت پہنچاتی رہتی ہے، اسی لیے کئی خاندان اپنے مرنے والوں کے لیے ”بھوت دہن“ تلاش کرتے ہیں اور اسے اپنے عزیز کے ساتھ دفن کرتے ہیں، اس طرح ان کے عقائد کے

پیشان ہو جاتا ہے۔ چین کے دور دراز علاقوں میں پائی جانے والی ایک رسم بھی ایسی ہی مثال ہے کہ جس کا جدید دنیا میں تصور کرنا خاصا مشکل ہے۔ یہ رسم دو لمبے کوادا کرنا پڑتی ہے جو اپنی دہن کو اٹھا کر دھکتے ہوئے کوٹوں پر چلتا ہوا گزرتا ہے۔ قدیم چینی روایات کے مطابق نئے جوڑے کے لیے اپنے لمبے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسم ادا کرنا ضروری ہے۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ اس کے دور رس فوائد ہیں جن میں سے سرفہرست یہ ہے کہ دہن جب حاملہ ہوگی اور بچے کو جنم دے گی تو اس سارے عمل کے دوران اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اگر اس کا خاوند پہلے ہی کوٹوں پر چلنے کی تکلیف اٹھا چکا ہوگا۔ قدرتی آفات سے دوچار ہونے کی صورت میں بھی چینی لوگ اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور جنوب مشرقی ایشیاء کے کئی اور ممالک میں بھی یہ رسم پائی جاتی ہے۔

ہر علاقے کی رسومات الگ ہوتی ہیں۔ یہ رسومات اس علاقے کی شناخت بن جاتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں یہ رسومات توہمات کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے زمانہ قدیم میں دریائے نیل کے کنارے آباد لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ ہر سال نیل کے کنارے ایک نوجوان دوشیزہ کا خون بہانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دریا بہنا بند ہو جائے گا۔ مسلسل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مصر پر قبضہ کرنے سے پہلے تک چلتا رہا۔

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سمندر کے پانی کو چھڑنے سے ملحد کا دیوتا ناراض ہو جائے گا اور طوفان کی صورت انہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ یہ عقیدہ اب بڑی حد تک دم توڑ گیا ہے لیکن ہندی اور مائیکرونیشیائی کی صورت میں ہندو سمندر سے لڑکی کرچکے ہیں۔

چینی اپنے نئے سال کے آغاز پر پٹائے بجاتے ہیں تاہم دوسروں بھاگ جائیں اور پچھلے سال کی بدقسمتی کو ختم لانے کے لیے نئے سال سے ایک دن پہلے ہی گھر کو صاف کر لیتے ہیں۔ نئے سال کے پہلے دن گھر کو صاف نہیں کرتے تاہم غشی غلطی سے جھاڑو کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکل سکتا۔ دنیا بھر کے ممالک میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ شادی بیاہ کے موقع پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کانگو کے کئی علاقوں میں یہ رواج ہے کہ دہن اپنے دلہا کے ماتھے پر نوکیلے اٹھانے نام کندہ کرواتی ہے تاکہ کوئی اور عورت اس کے دلہن نہ جاسکے۔ اسی طرح کی ایک رسم سوڈان میں بھی ہے جس میں دہن اپنے شوہر کے منہ کو داغ دیتی ہے۔

مطابق تمام بلائیں مل جاتی ہیں اور خاندان محفوظ رہتا ہے۔
 چین کے مختلف علاقوں میں کنوارے شخص کی موت کے
 بعد کسی خاتون کا چاندی کا جسم، پلاسٹک کا پتلا اور دیگر اشیاء
 دفن کی جاتی رہی ہیں تاہم ان میں سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے
 کہ کسی تازہ قبر کو کھود کر خاتون کی لاش نکالی جاتی ہے پھر اسے
 میک اپ کر کے نئے کپڑے پہنا کر مرنے والے کی قبر کے
 ساتھ دفن دیا جاتا ہے جبکہ یہ لاشیں قبر سے نکالنے کے لیے
 خطرات مول لینے کے ساتھ ساتھ خطیر رقم بھی خرچ کی جاتی
 ہے۔ چین میں اس کام کے لیے مردہ خواتین کو چرانے والے
 کئی خفیہ گروہ کام کر رہے ہیں جو لاشوں کی بڑھتی ہوئی طلب کو
 پورا نہیں کر سکتے۔ ایک لاش کی قیمت اس وقت پاکستانی 10
 سے 15 لاکھ ہے جبکہ 2011ء میں 4 ایسے افراد پکڑا گیا تھا
 جنہوں نے قبر سے 10 خواتین کی لاشیں نکال کر فروخت کی
 تھیں اور اس کے بدلے میں تقریباً 40 لاکھ روپے حاصل کیے
 تھے۔ چین میں خواتین کی لاشوں کو بے حرمتی سے بجانے کے
 لیے کئی خاندان انہیں قبرستان کی بجائے دور دراز کے پہاڑی
 علاقوں پر دفن کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے قبروں کو پختہ کر کے
 خاردار تار لگا دیئے اور کچھ نے سی سی ٹی وی کیمرے بھی نصب
 کرائے ہیں۔ واضح رہے کہ چین میں مردہ خواتین اور مردوں
 کی شادی پر 1949ء میں پابندی لگا دی گئی تھی تاہم گزشتہ کئی
 سال سے کچھ علاقوں میں یہ واقعات بڑھ گئے ہیں۔ ہریان اور
 شاہکی صوبوں میں گزشتہ 3 برسوں میں قبر کھود کر خواتین کی
 لاشیں نکالنے کے 30 قریب واقعات ہو چکے ہیں۔
 شادیوں کا ذکر ہوتا ہی رہے گا۔ کچھ بات دنیا بھر میں
 پہنے جانے والے روایتی عروسی ملبوسات کے بارے میں ہو
 جائے۔ دنیا کے ہر علاقے کی دہن جاتی ہے کہ شادی کے دن
 سب سے زیادہ اہم عروسی لباس ہی ہوتا ہے۔ بیشتر ممالک
 میں دہن کا لباس وہاں کی ثقافت کا اظہار ہوتا ہے، اس کا
 رنگ، ساخت اور دیگر تفصیلات اس جگہ، مذہب وغیرہ کی
 روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے ترکی میں دہن ایک سرخ،
 دو ڈھیری کی بلیٹ خوش قسمتی کی علامت کے طور پر پہنتی ہے۔
 اریتریا میں دہن گہرے رنگ کے ریشمی تاج اور جاسمی وکولڈ
 عبادہ زیب تن کرتی ہے۔ دنیا بھر میں جوڑے کس طرح کے
 عروسی ملبوسات پہنتے ہیں، یہ جاننا آپ کے لیے دلچسپی سے
 خالی نہیں ہوگا، جس سے ان ممالک کی ثقافتی روایات کا بھی
 اندازہ ہوتا ہے۔ جاپانی شادیوں میں دہن اکثر دو یا اس سے
 زائد ملبوسات پوری تقریب میں استعمال کرتی ہے جو کہ سفید

اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ گھانا کی روایتی شادی بہت رنگ
 رنگ ہوتی ہے، وہاں اکثر ملبوسات کے ڈیزائن مختلف رنگوں
 اور پٹرن کے حامل ہو سکتے ہیں، ہر خاندان کے لباس کا اپنا
 پٹرن ہوتا ہے۔ رومانیہ میں اکثر نوجوان شادی کے موقع پر
 جدت کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم روایتی تقریبات اب بھی اس
 کے دیہی علاقوں میں ہوتی ہیں، اگرچہ یہ ملک زیادہ بڑا نہیں مگر
 اس کے ہر خطے کی شادی کے حوالے سے اپنی روایات
 ہیں۔ اگر آپ کو کسی سری لنکن روایتی شادی میں شرکت کا موقع
 ملے تو آپ کی نگاہیں دوپہا سے نہیں ہٹ سکیں گی۔ بھارت
 میں سرخ یا گلابی عروسی ملبوسات بھارتی ثقافت میں دہن کا
 روایتی انتخاب ہوتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں دوپہا عام طور پر
 اسکرٹ پہنتا ہے، جبکہ شادی کی تقریب کے بعد دوپہا ایک
 شال دہن کے کندھے پر ڈالتا ہے جو اس کے خاندان کے
 رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس طرح یہ دہن کی نئے خاندان
 میں رکنیت کی علامت بن جاتا ہے۔

پاکستان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں
 کیونکہ ہمیں اپنے ملک کی روایات کے بارے میں کافی کچھ علم
 ہے۔

ایتھوپیا واحد افریقی ملک ہے جہاں عیسائیت سرکاری
 مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شادیاں یونانی یا رومی انداز
 کی ہوتی ہیں۔ انڈونیشیا میں ایک سے دوسرے جڑے میں
 شادی کی روایات مختلف ہوتی ہیں، ویسے بھی تین سو لاکھ گروہوں
 اور چھ بڑے مذاہب کو ماننے والے افراد پر مشتمل اس ملک کی
 ثقافت متعدد رنگوں کی حامل ہے۔ یورپ اور ایشیا کی سرحد پر
 موجود علاقے قفقاز میں روایتی شادی کے موقع پر دوپہا وہاں کا
 روایتی کوٹ پہنتا ہے جبکہ بلیٹ سے نکوار بندھی ہوتی ہے۔ دہن
 اکثر سفید عروسی لباس میں ہوتی ہے جس پر خوبصورت سیاہ
 پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔

چین کا روایتی عروسی لباس سرخ ہے، چین میں ویسے
 سفید رنگ کو ماتم کا رنگ مانا جاتا ہے۔ شادی کے بعد دوپہا دہن
 کے سر سے سرخ دوپٹے کو مٹاتا ہے۔ ملائیشیا میں اکثر دہن
 جاسمی یا کریم رنگ کے عروسی لباس کا انتخاب کرتی ہے۔ جنوبی
 کوریا میں روایتی انداز سے شادی کرنے کا رواج حالیہ عرصے
 میں زور پکڑ چکا ہے، یہاں کی تاریخی روایات کے مطابق دوپہا
 اپنی بیوی کو کمر پر اٹھا کر میز کے گرد گھومتا ہے، جو اس بات کی
 علامت ہوتا ہے کہ دہن اپنے شوہر پر انحصار کر سکتی ہے
 ناروے میں دہن ایک روایتی نارویجن لباس پہنتی ہے

نا بچہ یا میں دلہنیں روایتی عروسی لمبوسات کا انتخاب کرتی ہیں جبکہ سر پر ایک مخصوص پٹری ٹاپ کپڑا باندھا ہوتا ہے۔ طلاق کی دلچسپ رسومات اور عجیب و غریب قوانین کے بارے میں بھی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ آپ نے شادی کے موقع پر ادا کی جانے والی رسومات کے بارے میں تو سنا ہوگا لیکن دنیا میں چند ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شادی کی ناکامی پر بھی مذہبی رسومات ادا کرنے کی روایت موجود ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شادی کی ناکامی کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں، شادی ٹوٹنے کا بچہ لوگوں کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا ہے جس میں دونوں فریق کو طلاق کا معاہدہ کرنا ہوتا ہے اور اس حوالے سے اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ دنیا میں کئی ممالک میں پائی جانے والی طلاق کے عجیب و غریب رسومات اور طلاق کے حیرت انگیز قوانین موجود ہیں۔

جاپان میں ایک ایسا مندر واقع ہے جو اپنے زائرین کو ناکام شادی ٹوائٹ میں بہانے کی پیشکش کرتا ہے۔ وسطی جاپان کے صوبے گواما میں منٹوکوجی ٹیمپل ازدواجی تعلقات سے چھٹکارا حاصل کرنے والے جوڑوں کو ایک کاغذ پر تمام کلمے لکھوے لکھنے اور طلاق کی وجوہات بیان کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جسے بعد میں فلش میں بھادیا جاتا ہے۔

2000ء کی بات ہے جب جرمنی میں ایک پادری مارکوس کا سمین نے ملک کے تمام گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر ماتم کی رسم ادا کرنے کی تجویز پیش کی جس کے بعد ان کی تجویز پر گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر بڑے پیمانے پر ماتم کی رسم ادا کی گئی۔ ان تقریبات میں دونوں فریقین دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنی شادی کی ناکامی کی وجوہات سے آگاہ کرتے ہیں۔

چین سے تعلق رکھنے والی ایک اقلیتی نسل جینگ کے ہاں طلاق کا ایک مخصوص طریقہ ہے، جس کے مطابق طلاق کے شوقین پر دستخط گھر کے اندر نہیں کیے جاسکتے اور دستخط کرنے کے فوراً بعد قلم اور دوات کو براہمن سمجھ کر درود پھینک دیا جاتا ہے۔

2011ء میں چین میں ایک سرکاری ڈاک خانے کی طرف سے ایک ایسی مہم چلائی گئی جس میں شادی شدہ جوڑوں کو ایک محبت نامہ لکھنے کی ترغیب دی گئی، جسے شادی کے سات برس بعد شریک حیات کو ارسال کیا جائے گا، اس اقدام کا مقصد دراصل ملک میں طلاق کی شرح کو کم کرنا تھا تاکہ سات

برس بعد محبت نامہ پانے والے میاں بیوی ایک بار پھر اس محبت کو یاد کر سکیں جس نے انہیں ملایا تھا۔ دنیا کے کئی ممالک میں طلاق کے ایسے عجیب و غریب قوانین موجود ہیں جہاں طلاق حاصل کرنا ایک ناقابل یقین تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ دنیا میں فلپائن واحد ملک ہے جس کا قانون آج بھی اپنے شہریوں کو طلاق کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ تاہم پتا چلتا ہے کہ 1985ء سے 2000ء کے درمیان جاپان میں طلاق کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ اس کی وجوہات سے پتا چلتا ہے کہ 2006ء میں جاپانی جوڑوں میں شادی کے بیس برس بعد طلاق لینے کا رواج زیادہ عام ہو گیا تھا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ یہ ریٹائرڈ سینیٹر روم کی وجہ سے تھا یعنی ایسے شوہروں کی وجہ سے جو روزگار کے لیے ملک سے باہر جتے ہیں اور اپنی بیوی کو زیادہ نہیں جانتے ہیں لیکن، ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اپنی

پاکیزہ

ماہنامہ

کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

بیوی میں ہر طرح کے عیب نظر آتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سات ریاستوں جن میں ریاست نیو میکسیکو اور مسیسیپی شامل ہیں، شادی کی ناکامی کی وجہ ایک تیسرے فریق کو ٹھہرایا جاسکتا ہے اور شادی خراب کرنے والے تیسرے شخص پر شادی کے نقصان کے لیے بھاری رقم کا ہرجانہ دائر کیا جاتا ہے، تاہم اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ امریکی ریاست کنساس میں شادی کو طویل مدت تک قائم رکھنے کے لیے طلاق کا ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت دونوں فریق کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ساس کے ساتھ بدسلوکی یا برے تعلقات رکھنے پر ایک دوسرے کو طلاق دے سکیں۔

امریکی ریاست ویلاڈیز میں طلاق کے لیے ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت اگر ایک شخص ہنسی مذاق یا شرط بھانے کے لیے شادی کر لیتا ہے تو اسے بعد میں طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کی اجازت ہے جبکہ اس قانون سے ہنسی مذاق میں شادی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آسٹریلیا میں قبائلی خواتین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یا تو اپنے شوہر کو طلاق دینے کے لیے آدھ کریں یا پھر شادی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک دوسری شادی کر سکیں اس طرح ان کی پہلی شادی خود بخود منسوخ ہو جاتی ہے۔ امریکی ریاست کیلیفورنیا میں اس بات کی اجازت ہے کہ آپ ایک ہی شخص سے طلاق کے بعد تین بار شادی کر سکتے ہیں لیکن چوتھی بار اسی شخص سے شادی کرنے کی اجازت ریاست کا قانون نہیں دیتا ہے۔ امریکی ریاست فلوریڈا میں اگر شریک حیات جان سے مارنے کے لیے کوئی حربہ مثلاً زہر پلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس بنیاد پر آپ کی طلاق منظور ہو سکتی ہے۔

نویارک میں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کے شریک حیات کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے تو آپ کو طلاق مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ شادی کے دوران شریک حیات کی دماغی حالت کم از کم پانچ سالوں سے خراب رہی ہو۔ برطانیہ میں طلاق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شریک حیات کی حدود پر برائیاں کا ذکر کیا جائے۔ صرف ذاتی ناپسندیدگی کی بنیاد پر طلاق منظور نہیں کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں جوڑے طلاق کے لیے شریک حیات میں عجیب و غریب عیب تلاش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شوہر نے طلاق کے مقدمے میں کہا کہ وہ اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر روز پھل پکاتی ہے۔

شادی، لمبوسات، طلاق کے بارے میں کافی دلچسپ باتیں جاننے کے بعد شادی کی ایک رسم کا تذکرہ بر محل ہے جو اب معدوم ہوئی جا رہی ہے۔ یہ رسم گھڑولی کہلاتی ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع کی طرح جھنگ میں بھی شادی کی کچھ انوکھی رسومات و تقریبات اپنی سادگی اور خوبصورتی کی بنا پر ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان رسومات میں گھڑولی کی قدیم رسم کو ایک عرصہ تک وہ مقام حاصل رہا ہے جو شاید دوسری کوئی بھی رسم حاصل نہیں کر سکی۔ تاہم وقت کی بے رحم لہروں میں بہتی یہ قدیم رسم اب ماضی کا حصہ بنی جا رہی ہے۔ گھڑولی کی رسم اس وقت ادا کی جاتی تھی جب نکاح کے بعد برأت بنڈال سے ذہن کے گہرے جاگتی جاتی تھی۔ گھڑولی دراصل دو گھڑوں پر مشتمل ہوتی ہے جن پر خوبصورت طریقے سے نقش نگاری کی جاتی ہے، ایک گھڑا سائز میں دوسرے گھڑے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ چھوٹے گھڑے کو بڑے گھڑے کے اوپر رکھا جاتا ہے اور بعد ازاں ان کو ایک دنگین پٹھرے جس پر کڑھائی کا خوبصورت کام ہوتا ہے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس کو دو لہے کی بٹنیں یا دیگر غوریں اٹھاتی ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر علائے کے کسی محزون کے گھر جا کر اس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک اس پانی سے وضو کروا کر ہی ذہن کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا تھا لیکن اب صرف انگلی ڈوبنے پر ہی انکشاف کر لیا جاتا ہے۔ گھڑولی کی معدوم ہوتی رسم میں گھر والوں کی حیثیت کے مطابق ان سے پیسے مانگتے ہیں جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ پیسوں کے ساتھ کوئی پالتو جانور مثلاً بچھڑا یا بکرا وغیرہ بھی دے دیتے ہیں جبکہ متوسط لوگ پانچ سو سے تین ہزار روپے تک دیتے ہیں۔ جدید دور میں لوگ اس رسم کو فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کرنا شروع ہو گئے ہیں جس سے گھڑولی بنانے کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اب پہلے جیسا دور اور وہ لوگ نہیں رہے۔ اب لوگ شادی ہالز میں جا کر رسومات کرتے جہاں اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ نکاح اور کھانے کے سوا کوئی اور کام کیا جاسکے۔ ایک وقت تھا جب نہ صرف جھنگ بلکہ پورے پنجاب میں شادی کو اس رسم کے بغیر ادھورا تصور کیا جاتا تھا۔ آج کی شادیاں ان رسوں کے بغیر نامکمل لگتی ہیں۔ زمانے کی تیزی اور جدت کے باعث گھڑولی سمیت پنجاب کے کئی قیمتی رسم و رواج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ معاشی بدحالی، مغربی روایات اور جدید فیشن کی بھرمار نے لوگوں کو اپنی ثقافت سے دور کر دیا ہے۔



بھڑپے

کاشف زبیر

رواں صدی کا مورخ جب تاریخ لکھے گا تو وہ مسلمانوں کو مظلوم ترین قوم کا خطاب دے گا۔ جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہٹلر نے تھوڑے سے یہودیوں کا قتل عام کرایا تو لوگ اس ہولو کاسٹ پر آج بھی رو رہے ہیں۔ جب کہ اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کا قتل عام قیام پاکستان کے وقت ہوا، اب بھی فلسطین و لبنان میں جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے یہ تاریخ کا حصہ بن رہا ہے لیکن ان سب سے زیادہ بری افتاد یورپ کے اکلوتے مسلمان ملک کے مسلمانوں پر پڑی ہے۔ جہاں ایک دن میں کئی کئی سو مسلمانوں کو ایذائیں دے دے کر ہلاک کیا گیا۔ کس بری طرح وہاں مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی اس کا ہلکا سا عکس۔

اس ملک میں مسلمانوں کو چن چن کر شہید کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی

ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں موجود تھی۔ سردی کی وجہ سے ان کا بیشتر وقت باورچی خانے میں گزرتا تھا جہاں آگ جلتی اور کسی قدر حرارت رہتی تھی۔

سینہ کا شوہر حاجو بیگ ملک کی فوج میں شامل ہو کر سربوں سے لڑنے گیا ہوا تھا اور سینہ نے آخری بار ڈیڑھ سال پہلے اسے دیکھا تھا جب وہ کسی محاذ پر جانے سے پہلے

اس بار موسم سرما شہید تھا۔ یونیا کے اس دور دراز چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں لوگ ابھی تک اپنے گھروں میں محصور تھے۔ اپریل کا وسط آنے کے باوجود برف پھلنے لے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہار کا موسم دور تھا۔ باغوں میں انگوڑیوں کی پتیوں نے گتے گتے سینہ کو لگ رہا تھا کہ وہ زندہ بھی نہیں آئے گا۔ سینہ اپنے تین چھوٹے بچوں کے

ذرا دیر کے لیے گھر آیا تھا۔ اس نے سفینہ سے کہا۔ ”ممکن ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں مر گیا تو تم بچوں کا خیال رکھو گی۔“

سفینہ یہ سن کر رو دی مگر لیکن جنگ نے اس قوم کے اعصاب مضبوط کر دیے تھے اور انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ جب اجتماعی طور پر کسی قوم کو خطرہ لاحق ہو تو فرد واحد کی زندگی کی اہمیت نہیں رہتی۔ اس احساس کے تحت سفینہ نے جلد خود پر قابو پا لیا۔ اور اس نے شوہر سے وعدہ کر لیا کہ وہ بچوں کا پورا خیال رکھے گی لیکن وہ اس کا انتظار بھی کرے گی۔ بے شک اسے ساری عمر انتظار کرنا پڑے جب بھی وہ کرے گی۔

”جب ہم یہ جنگ جیت جائیں اور میں بھی زندہ نہ رہوں تو تم کسی ایسے آدمی کو اپنا شریک سفر بنا لیتا۔“ حاجو بیگ نے اس سے کہا لیکن سفینہ دل میں سوچ چکی تھی۔ اس کے لیے دنیا کا واحد مرد حاجو بیگ تھا۔ پھر وہ چلا گیا اور اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ سریوں نے پورے یونیا کو یوں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ ایک حصہ دوسرے حصے سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ آمد و رفت اور اطلاعات کے راستے بند تھے۔ ملک کا دار الحکومت سر اجود دوسرے سریوں کے محاصرے میں تھا۔ سفینہ خود کو تسلی دیتی تھی کہ حاجو خیریت سے ہے کسی وجہ سے اپنی خیریت کی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔

اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں حاجو بیگ کی کچھ زمین تھی، جس پر گرمیوں میں وہ گندم کاشت کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ کام سفینہ نے سنبھال لیا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا باڑہ تھا جس میں ایک گائے اور دو دھ دینے والی چند بکریاں تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ مرغیاں اور ٹرکی بھی پال رکھی تھیں جن سے انڈے اور گوشت مل جاتے تھے۔ زمین سے اتنی گندم مل جاتی تھی کہ اپنے لیے نکال کر باقی وہ فروخت کر دیتی تھی تو اس سے کچھ رقم ہاتھ آ جاتی تھی۔ خوراک کے لحاظ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ اگر بھی مجاہدین گاؤں میں آ جاتے تو سب کے ساتھ سفینہ بھی ان کی خوراک کی ضرورت پوری کرنے میں حصہ لیتی تھی۔

سفینہ کے تین چھوٹے بچے تھے سب سے بڑی علینہ سات سال کی تھی پھر اس سے ایک سال چھوٹا غازی اور اس سے دو سال چھوٹا علی تھا۔ تینوں بچے ذہین اور ہوشیار تھے۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کا ملک اور ان کا گھر مشکل حالات سے دوچار ہے اور ان کی ماں کی مدد کرنے والا کوئی

نہیں ہے۔ اس لیے وہ عام بچوں کی طرح سفینہ کو جنگ کرنے کے بجائے گھر اور زمین کے کاموں میں اس کی مدد کرتے تھے۔ خاص طور سے علینہ تو باورچی خانے کا آدھا کام سنبھال چکی تھی۔ گھر کی صفائی بھی وہی کرتی تھی۔ جب کہ غازی اور علی باہر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

اس علاقے میں عام طور سے اپریل کے آغاز تک برف پگھل جاتی تھی لیکن اس سال اپریل کے پہلے ہفتے میں غیر متوقع طور پر شدید برف باری ہوئی تھی۔ لوگ جو باہر نکل کر اپنے کھیتوں اور باغات کی دیکھ بھال اور سرما میں برف باری اور طوفانوں سے ہونے والی مکانون کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی تیاری کر رہے تھے، پھر سے گھروں میں بند ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ جب سرما کا آغاز ہوتا تو لوگ خوش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ گرمیوں میں شدید محنت کے بعد اب انہیں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

گھر والے لڑکوں کی ٹھیل کھیلنے یا قہے کہانیاں سناتے لیکن رفتہ رفتہ یہ آرام انہیں بور کرنے لگتا تھا۔ وسط سرما تک وہ باہر جانے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور جب بہار کا وقت قریب آتا تو ان کی بے تابی بھی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ جیسے ہی زمین برف کی قید سے آزاد ہوتی اور درختوں پر سنے سچے آنے لگتے وہ باہر نکل آتے اور اس وقت ان کی خوشی کا عالم دیکھنے والا ہوتا تھا اور اگر سرما طویل ہو جاتا اور وہ کچھ دنوں یا کچھ ہفتوں کے لیے مزید گھروں میں قید ہو جاتے تب ان کی مایوسی دیکھنے والی ہوتی تھی۔

سفینہ اور اس کے بچوں کا بھی یہی عالم تھا۔ گرما کے آخر میں کھینے والی گندم اور دوسری اشیاء کو ذخیرہ کر کے اور فالٹو اجناس فروخت کر کے وہ سرما کے لیے لکڑی جمع کر لیتے تھے۔ جانوروں اور پرندوں کے لیے چارہ اور دانہ جمع کیا جاتا تھا۔ گھر اور باڑے کی مرمت کی جاتی تھی اور سارے کام نمٹا لیے جاتے تھے۔ نومبر کے پہلے ہفتے سے برف باری کا آغاز ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ مارچ کے آخر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد برف کھلتی لگتی تھی۔

برف باری کے آغاز کے بعد سفینہ خود بھی باہر جانے سے گریز کرتی تھی اور بچوں کو بھی نہیں جاننے دیتی تھی اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو طبی امداد کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ان کے گاؤں میں نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی دواؤں کا انتظام تھا۔ اس لیے سفینہ خاص طور سے بچوں کے معاملے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ اس کے بچوں کو سرما پسند نہیں تھا کیونکہ وہ

اور آزاد رہتا پسند کرتے تھے۔ جب کہ سردی میں انہیں کھانے کے لیے اس چھوٹے سے گھر میں محدود ہو جانا پڑتا تھا۔

یہاں کا دل بہلانے کے لیے سفینہ انہیں طرح طرح لکھانے بنا کر کھلاتی تھی۔ ان کے ساتھ کھیتی اور انہیں لکھا ہاں ساتی تھی۔ سردیوں میں ناشتے کے بعد دن چھوٹا لے کی وجہ سے یہ لوگ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے رات کا کھانا سورج غروب ہوتے ہی کھا لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ اور ہی خانے سے مکان کے نیچے بنے خانے میں چلے جاتے۔ ساری سردیاں وہ یہ خانے میں سوتے تھے کیونکہ وہ اس وقت گرم ہوتا تھا۔

یہ خانے میں ایک بڑا سائبر تھا جس پر روٹی اور اون بھرا دینا گدا بچھا ہوا تھا اور وہ اس نرم بستر پر اپنے اپنے لمبوں میں لیٹ کر سو جاتے تھے لیکن سونے سے پہلے وہ لہجہ سے کھانسی ضرور سنتے تھے۔ سفینہ بڑی لمبی تھی۔ اس نے کالج تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے کہنا نہیں پڑھنے کا شوق تھا وہ جب تک کالج کی تعلیم کے دوران اپنی خالہ کے اس شہر میں رہی اس نے کالج کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابوں کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ پھر اس کی شادی حاجو سے ہوئی۔ یہاں گاؤں میں کتابیں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں اور اسے مطالعے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا۔ پھر اس کی شادی کے پانچ سال بعد یونینا پر سریوں کی جانب سے ہنگ مسلط کر دی گئی اور نہتے یونینائی مسلمان جدید ترین اسلحے سے ایس سریوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ ملک کی فوج نہ ہونے کے برابر تھی لہذا رضا کار فوجیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کے پاس اسلحہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا لیکن وہ اپنے ملک اور قوم کے دفاع کے جذبے سے سرشار ہو کر سفاک سریوں کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ گاؤں کے سارے ہی جوان مرد بلکہ ہر وہ مرد جس کی عمر پندرہ سے پچاس برس کے درمیان تھی جنگ لڑنے چلا گیا اور اب گاؤں میں سوائے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے کوئی نہیں تھا۔ وہی گاؤں کے سارے کام کرتے تھے۔ مویشی چراتے اور کھیتوں و باغات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بہت سے گھریسے تھے جن میں کوئی ایک بھی مرد نہیں تھا اور سفینہ کا گھر بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ اسے سارا کام ٹھوکرنا پڑتا تھا۔ بچے اس کی مدد کرتے تھے لیکن وہ بھی اس حد تک مدد کر سکتے تھے۔ صبح سے شام تک کام کر کے

سفینہ چھکن سے چور ہو جاتی تھی۔ خاص طور سے موسم گرما میں اسے بہت محنت کرنا پڑتی۔

شالی یونینا میں ان کا گاؤں شروع میں جنگ سے دور تھا اور پہلے دو سال وہاں گولی کی آواز بھی نہیں گونجتی تھی لیکن پھر سرب رفتہ رفتہ اس طرف بھی آنے لگے۔ دور پہاڑوں پر ان کی طرف سے کی جانے والی گولہ باری کی دھمک ساتھ دیتی راتوں میں روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ جنگ کو اپنے قریب پا کر گاؤں والوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جنگ سے دور ہونے کے باوجود انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سرب مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ وہ جس علاقے پر قابو پاتے وہاں کے ہر مسلمان کو یا تو قتل کر دیتے یا اسے اپنے بنائے ہوئے محبوت خانوں میں قید کر دیتے تھے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو جن جن کر لے جاتے اور ہندی کیمپوں میں انہیں مسلسل زیادتی کا نشانہ بناتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ حاملہ ہو جائے اور پھر سریوں کی اولاد کو جنم دے۔ سرب مجرمانہ حملوں کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ جوان مردوں اور لڑکوں کو وہ گرفتار کر کے جنگوں اور پہاڑوں میں لے جا کر ان کا قتل عام کرتے اور انہیں اجتماعی قبروں میں دفن کر دیتے تھے۔

جب یہ خبریں گاؤں والوں تک پہنچیں اور انہیں پتا چلتا کہ سرب ان کے علاقے سے اب زیادہ دور نہیں ہیں تو ان میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ اپنی اور اپنے پیاروں کی جانوں کے لیے فکر مند ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے جن کے گھروں میں جوان عورتیں تھیں ان کی فکریں بھی کہیں زیادہ ہو جاتیں۔ لیکن یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے تھے کیونکہ ان کے چاروں طرف مسلمانوں کے دشمن تھے۔ یورپ کا کوئی ملک ان کو نہاد دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان کو ہتار کھٹے کے لیے یونینا کے چاروں طرف ٹھہرائی کا کڑا حصار بنا دیا گیا تھا۔

سربا کے دوران ہی چاروں طرف سے لڑائی اور بربادی کی خبریں آنے لگی تھیں۔ سریوں نے علاقے میں مسلمانوں کی بستیوں اجاڑنا شروع کر دی تھیں۔ وہ کسی گاؤں کا محاصرہ کر لیتے اور پہلے اسے اپنی توپوں اور مارٹر گنوں سے نشانہ بناتے تھے۔ جب پورا گاؤں بلے کا ڈھیر بن جاتا اور انہیں محرمات کا موبوم سا خدشہ بھی باقی نہیں رہتا تو وہ بھوکے بھڑکیوں کی طرح آبادی میں گھس جاتے اور وہاں جو زندہ فرد نظر آتا اسے بے دریغ موت کے گھاٹ

اتار دیتے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر گاؤں میں کچھ مکانات بچ جاتے تو سرب آگے جانے سے پہلے انہیں آگ لگا دیتے تاکہ کبھی اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے مسلمانوں کو واپس آنے کا موقع بھی ملے تو یہاں سوائے رائے کے ڈھیر کے انہیں کچھ نہ ملے۔ اسی طرح وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان بے گناہ لوگوں کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔

یہ بات گاؤں والے بھی جانتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ انہیں اپنا دفاع خود کرنا ہے لیکن وہ جدید اسلحے سے لیس ان درندہ صفت سربوں کے خلاف کیا کر سکتے تھے۔ پورے گاؤں میں گنتی کے چند ہتھیار تھے۔ یوگو سلوایہ میں مسلمانوں پر ہتھیار رکھنے کی سختی سے پابندی تھی اور کسی مسلمان کے پاس سے ہتھیار نکل آتا تو اسے فوراً جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ ایسے میں مسلمان نہتے رہ گئے اور سرب جو فوج اور پولیس میں تھے ہر طرح سے مسلح اور طاقت ور تھے۔ جیسے ہی یونین نے آزادی کا اعلان کیا سرب نے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مہذب کہلانے والے یورپ میں قتل و غارت کا وہ طوفان اٹھا کہ اس نے شاید بظہر اور پچنگیر خان کی روجوں کو بھی دنگ کر دیا ہوگا۔ اس قتل و غارت گری سے زیادہ تکلیف دہ..... رویہ یورپی اقوام کا تھا جنہوں نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام نظر انداز کر کے یونین پر اسلحہ حاصل کرنے کی پابندی لگائی تھی۔ یہی ایک نام نہاد پابندی سربوں پر بھی لگائی گئی تھی لیکن سرب اول تو پہلے ہی پوری طرح مسلح تھے اور پھر سابق سوویت یونین یعنی روس ان کی ہر طرح سے مدد کر رہا تھا۔

گاؤں کے رہ جانے والے مرد ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے سربوں سے دفاع کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ دفاع کا واحد طریقہ جو سمجھ میں آیا وہ فرار کا تھا کیونکہ اب وہ یہاں سے نکل کر ہی... اپنی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن یہاں سے نکل کر کہاں جاتے کیونکہ چاروں طرف سرب تھے۔ ان کے ہتھیار بہت معمولی تھے صرف کچھ دیر ہی مزاحمت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا، سربوں نے حملہ کیا تو وہ ان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ مرتے دم تک مقابلہ کریں گے۔ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں بھی ان کا بھی انجام ہوتا تھا۔

اپریل کا آغاز تھا لیکن پورے گاؤں میں ایک سہمی

ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی نے بہار کی آمد کا انتظار کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اور پھر موسم سرما میں پورے دو سال تک شدید برفانی طوفان آیا تھا۔ ہر طرف برف کے انبار لگ گئے اور گاؤں والے دوبارہ اپنے گھروں میں دیک جالے مجبور ہو گئے۔ ان کے پاس خوراک ختم ہو رہی تھی۔ جنگ و جد سے ویسے ہی کھانے پینے کے سامان کی قلت ہو گئی۔ اوپر سے سرما بھی طویل ہو گیا تھا۔

سفینہ کھانا بنا کر نیچے آئی تو بیچے بستروں میں دھوئے تھے۔ علیہ کی طبیعت خراب تھی۔ بھائی اسے کھانے کے لیے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے ان سے کھانے کے لیے اوپر آنے کو کہا۔ ”علیہ تم یہیں رکو گا تمہارے لیے کھانا لائی ہوں۔“

غازی اور علی اوپر آ گئے۔ اس نے ان کے لیے مہر کھانا لگا دیا اور خود علیہ کے لیے پیالے میں سوپ نکال نیچے لے آئی۔ علیہ کی طبیعت خرابی کی وجہ سے اس گوشت اور خشک سبزیوں کا سوپ پینا تھا تو بیمار علیہ بھی کسکتی تھی۔ علیہ بیمار ہونے کے ساتھ خوف زدہ بھی گئی۔ اس نے سن لیا تھا کہ سرب اس کے گاؤں کے پاس آ گئے تھے وہ حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ سفینہ نے اس کے پریشانی بچایا اور اسے سچ سے سوپ پلانے لگی۔

”ماما کیا سرب یہاں آ گئے ہیں؟“

سفینہ کا ہاتھ رک گیا۔ ”ہاں.... لیکن تم قلمت کرو انہیں اندر آنے نہیں دے دو گے اور جلد ہماری بہادر فوج آں سربوں کو مار بھگائے گی۔“

علیہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”ماما ایک بار آپ نے بہر بھڑیوں کی کہانی سنا لی تھی جنہوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔“

”ہاں سنا ہی تھی۔“ سفینہ نے سر ہلایا۔ درحقیقت اس نے یہ کہانی ایک بار نہیں ان بچوں کو لاکھ بار سنا لی تھی۔ سرما میں وہ کہانیاں سنتے تھے ان میں سب سے زیادہ اس سے سنی جانے والی کہانی یہی تھی۔ علیہ نے سوچ ختم کر اس سے انتخابی انداز میں کہا۔

”ماما آج رات یہ کہانی پھر سنا دیجئے۔“

سفینہ اس دن بہت تھک گئی تھی کیونکہ اس نے مہر برف بھی صاف کی تھی مگر وہ بیمار علیہ کی انتخابی نظر انہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ضرور سناؤں گی میری کیوں نہیں سناؤں گی۔“

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عمبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

ہب غازی اور علی کو پتا چلا کہ آج رات ان کو ہلکی سی کھانسی کا موقع ملے گا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ اس لمبی میں انہوں نے جلدی جلدی سفینہ کا ہاتھ بنا لیا۔ کچھ کافی رکھی تھی سفینہ نے اپنے لیے کافی لیا اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے بیچے تھے۔ بچے بستر میں اپنی اپنی جگہ لیٹ چکے تھے۔ اماں کا ہاتھ اٹھا کر وہ سب آرام سے کل کر لیٹے تھے۔ سفینہ نے ہلکی سی گئی اور اس نے کافی کاک پاس رکھ لیا تھا۔ "اماں کھانی سائیں نا۔" غازی نے بے چینی سے کہا۔ لیونہ نے ہلکی سی گئی اور کھانی کا آغاز کیا۔ یہ نسل در نسل چلنے والی کھانی تھی۔ اس نے کہا شروع کیا۔ "بہت عرصے پہلے بات ہے۔۔۔۔۔"

اس وقت کی بات تھی جب مشرقی یورپ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ کئی سال تک جاری رہنے والی اس جنگ نے اس پورے علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ آبادیاں اجڑ گئی تھیں اور شہر واپس آئے تھے۔ لوگ خانہ بدوش بن گئے تھے۔ ایک ایک گھروں میں رہنے لگے۔ جنگ جاری تھی تو دوسری طرف عیسائیوں میں آپس میں خانہ بدوشی جاری تھی۔ کیتھولک اور آرتھوڈوکس آپس میں لڑ رہے تھے۔ پھر ان کے بے شمار ذیلی فرقے تھے جو موقع پا کر دوسرے کے خلاف خون ریز کارروائیاں کر جاتے۔ آرتھوڈوکس فرقے سے الگ ہونے والے ایک فرقے نے اٹلی الگ شناخت بنا لی تھی وہ امن پسند لوگ تھے۔ اب ان امن پسند دوسرے فرقوں کو ظلم کا شکار بنا رہے تھے۔ اٹلی ایک طرف جو آرتھوڈوکس کو ظلم کا شکار تھے تو دوسری طرف کیتھولک ان کی زندگی الگ اجڑانے کے رکھتے تھے۔ ان دونوں فرقے اس نئے فرقے کو عیسائیت سے خارج کر رہے تھے۔ نئے فرقے کے لوگ اپنی جائیں بچانے کے لیے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور وہیں اپنی بیتیاں بسا لیں۔ ان بچے میدانوں میں ان کے دشمن بہت طاقتور تھے۔ ان کو بڑی ملکوتوں کی حمایت حاصل تھی۔ جیسے پاپاؤس کے پشت پناہ یونانی اور روسی تھے جب کہ اٹلی کی حمایت میں اٹلی اور فرانس کھڑے تھے۔ اس نئے فرقے کو کہیں جانے پناہ نہیں تھی۔

اسی تعداد میں اتنی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن سو سال میں ان کے اس علاقے میں بے شمار بیتیاں آباد کر لی گئیں۔ ان میں سے ایک بستی سفینہ کا یہ چھوٹا سا گاؤں بھی

تھا۔ اس وقت اس گاؤں میں صرف نئے فرقتے کے لوگ تھے۔ انہیں بھلتے پھولتے دیکھ کر آتھوڈوکس عیسائی زبردست فوجی تیاری کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے اور ایک ایک کر کے ان کی بستیاں تاراج کرنے لگے۔ جو ان کے ہاتھ آتا اسے قتل کر دیتے اور باقی بچ جانے والوں کو غلام بنا لیتے۔

لیکن اس موقع پر عثمانی ترک ان کے نجات دہندہ بن کر آئے انہوں نے حملہ آور فوج کی پشت سے حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ نہتے لوگوں کے خلاف بہادری کے مظاہرے کرنے والی فوج ترکوں کے سامنے چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہر سکی تھی اور اس طرح شکست کھا کر بھاگی کہ پہاڑوں میں دور تک ان کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ نئے فرقتے کے لوگوں نے جان بچانے پر ترکوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس قوم نے ایک انوکھا فیصلہ کیا جو اس سے پہلے دنیا کی شاید ہی کسی قوم نے کیا ہو۔ اپنے ہم مذہبوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ سب کے سب ایک ساتھ مسلمان ہو گئے اور یہی لوگ آج بوسنیا کے مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ ترک یا وسط ایشیائی نہیں ہیں جیسا کہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے بلکہ یہ ایک یورپی قوم ہے۔ اسی نسل کے مسلمان البانیہ اور پورے مشرقی یورپ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

سفیہ کے گاؤں کے لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور اسی جگہ آباد رہے۔ جنگیں خونریزی جاری رہیں۔ ان کے علاقے پر کبھی ترک قابض ہو جاتے اور کبھی عیسائی غالب آ جاتے۔ جب عیسائی آتے تو وہ ان کی زندگی اجہرن کر دیتے۔ ان کا قتل عام کرتے اور ان کی بستیاں اور کمیتیاں اجاڑ دیتے تھے۔ پھر جب ترک آ جاتے تو وہ سکون کا سانس لیتے تھے۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ یورپ میں سردی کے لیے مشہور ہے اس عشرے میں بے پناہ سردی پڑی تھی اور گرمیاں بہت مختصر سی آئی تھیں۔ اس سردی نے جہاں انسانوں کو پریشان کیا وہیں جنگل کے جانور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ سردی کی وجہ سے ان کو خوراک کم ملتی تھی۔ درندوں کی خوراک کم ہوئی تو انہوں نے بوکھلا کر انسانی آبادیوں کا رخ کیا کیونکہ وہاں انہیں کھانے کے لیے پالتو جانور قتل کیے جاتے تھے۔

ایک سرما کے آخری دن تھے اپریل کا آغاز ہو چکا تھا اور ابھی تک برف باری جاری تھی۔ سردی ایسی تھی کہ انسان

گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دن جنگل میں لکڑی کاٹنے والے چرواہوں نے وہاں چند بھیڑ دیکھے۔ حالانکہ یہ اس موسم میں چنے میدانوں کی طرف جاتے تھے اور جب برف پھل جاتی تو اوپر پہاڑوں پر جاتے تھے۔ اس گاؤں کے آس پاس اس سے پہلے بھیڑے نظر نہیں آئے تھے۔ یہ بھوکے تھے اور انہوں نے چرواہوں کا گاؤں تک پیچھا کیا۔ شروع میں لوگوں نے ان بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے چند دن بعد جنگل میں جانے والی دو عورتوں پر بھیڑیوں نے حملہ کرنا اور انہیں ہلاک کر کے کھا گئے۔ جب ان کے گھر والے ان کا تلاش کرنے لگے تو ان عورتوں کی بس چند ہڈیاں ہی تھیں۔

پہلی بار لوگوں کو احساس ہوا کہ بھیڑیے نہ صرف ان کے علاقے میں آچکے ہیں بلکہ وہ بھوک مٹانے کے انسانوں پر حملے سے بھی دریغ نہیں کر رہے۔ اس کے ان لوگوں نے جنگل جانا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات گاؤں کے پاس سے پوری کرنے لگے مگر اس دوران میں گاؤں کے بھیڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر کیونکہ یورپ میں سب سے خطرناک جانور بھیڑیے کو سمجھا جاتا ہے مشرقی یورپ کے بھیڑیے خونخواری اور سفاکی شیروں کو بھی مات دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہوئے تھے۔ جب کسی علاقے میں بھیڑیوں کی تعداد بڑھ گئی جنگل کے جانور ان کے لیے کم پڑ گئے تو انہوں نے آبادی کا رخ کیا اور پالتو جانوروں کے ساتھ انسانوں پر بھی مارنے لگے۔

گاؤں والے اس بات سے واقف تھے اس نے انہوں نے بھیڑیوں کا تدارک کرنے کے لیے مقامی نژاد حکام سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ تربیت یافتہ ہی ان کا صفایا کر سکتی تھی۔ اس کام کے لیے دو نوجوان ہوئے جو پہلے بھی شہرتک جا چکے تھے لیکن جب وہ گھوڑوں سوار ہو کر نکلے تو انہوں نے کئی سو بھیڑیوں کو اپنے رامہ میں موجود پایا۔ بھیڑیے طویل سرما میں بھوک سے پاگل تھے کچے لہذا جب انہوں نے کھانے کے قابل انسانوں کو گھوڑوں کو سامنے دیکھا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ دو نوجوان بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر گاؤں واپس آئے ان کے گھوڑے بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور وجہ سے ان کی جان بچی تھی کیونکہ بھوکے بھیڑیے گھوڑوں

گھولنے لگے تھے اور انسانوں پر ان کی توجہ اتنی نہیں تھی۔ گاؤں سے نکلنا ناممکن لگ رہا تھا اور اب گاؤں والوں کو اس بات کی فکر لائق ہو گئی تھی کہ کہیں بھیڑیے گاؤں پر حملہ نہ کر دیں۔ اگرچہ گاؤں کے گرد ایک چھوٹی سی پتھروں والی چار دیواری تھی لیکن بہت سارے گھر چار دیواری کے باہر تھے اور بھیڑیے آسانی سے ان گھروں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لوگوں نے خوف زدہ ہو کر اپنے گھروں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پھر ان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ باہر جانے کی ناکام کوشش کے دو دن بعد بھیڑیے گاؤں کے آخری سرے پر واقع ایک مکان سے ملحق باڑے پر حملہ آور ہوئے۔ وہ بھوک سے پاگل ہو رہے تھے۔ مکان کے مالک نے تیر ہلا کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر بھیڑیے اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کی پروا کیے بغیر باڑے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور موسیئوں کی چیز پھاڑ کرنے لگے۔ چرواہے بسی مکان کی چھت سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس نے تیر مار کر کئی بھیڑیوں کو ہلاک کر دیا تھا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب تک گاؤں والے مدد کو آتے بھیڑیے اس کے سارے جانوروں کو مار چکے تھے اور ان کی لاشیں کھا رہے تھے۔ مداخلت کے آثار دیکھ کر وہ کئی لاشیں بھیج کر ساتھ لے گئے۔

اس واقعے کے بعد لوگوں نے فوری طور پر گاؤں کی چار دیواری میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جن کے مکان باہر تھے وہ اپنے اہل خانہ اور جانوروں کو چار دیواری میں منتقل کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چار دیواری کو گود نچا اور مضبوط بنا شروع کر دیا تاکہ بھیڑیے اسے پار نہ کر سکیں۔ جن کی تعداد اب ہزاروں میں پہنچ گئی تھی۔

بھوک سے بے تاب یہ بھیڑیے خالی مکانات کا پتھر لے لے گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ چار دیواری سے باہر سارے مکان خالی ہو چکے ہیں اور وہاں نہ انسان ہیں اور نہ جانور تو انہوں نے گاؤں کی چار دیواری کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے چار دیواری پھلانگنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ ادھیڑی تھی کہ وہ اسے پار نہیں کر سکے۔ گاؤں کے لوگ جنگجو نہیں تھے ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے بس چند ایک ہتھیار تھے۔ خاص طور سے تیر مکان محدود تھے اور وہ بھی چند افراد کے پاس تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور نیزے اور ہتھیار تھے۔ انہوں نے چار دیواری سے تیر چلا کر بھیڑیوں کو ادا لے کی کوشش کی لیکن چالاک بھیڑیے اپنے چند ساتھیوں

کا نقصان اٹھانے کے بعد ایسی جگہوں سے دور رہنے لگے تھے جہاں سے ان پر حملہ ہو سکتا تھا۔ گاؤں والے چار دیواری میں محفوظ تھے اور بھیڑیے اسے پار نہیں کر سکتے تھے لیکن اتنے افراد چار دیواری میں آنے سے دوسرے کئی مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ صفائی کا فقدان ہو گیا تھا اور انسانی بول و بیزاری کو بوسے دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ چار دیواری میں پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا وہ برف پکھلا کر اسے استعمال کر رہے تھے۔ پھر جلانے کے لیے لکڑی بھی کم پڑنے لگی۔ البتہ ان کے پاس خوراک خاصی تھی۔ چار دیواری کی حد میں موجود برف تیزی سے ختم ہونے لگی اور اب نئی برف باری کا امکان نہیں تھا اور نہ ہی بارش کا موسم تھا۔

دوسری طرف بھیڑیے مسلسل اس تاک میں تھے کہ کسی طرح انہیں چار دیواری میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔ ان کی بھوک بڑھتی جا رہی تھی۔ موسم سرما طویل ہونے سے وہ ابھی اوپر نہیں جاسکتے تھے اور ان کی خوراک کے ذرائع بھی محدود تھے۔ اگر انہیں جلد کھانے کے لیے کچھ نہ ملتا تو وہ بھوک سے مر جاتے۔ چند جانور مار کر ان کی بھوک نہیں ختم ہوئی تھی۔ پھر چند بھیڑیوں نے چار دیواری میں ایک کمزور جگہ بھانپ لی۔ اس جگہ دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا اور وہ اس سے چھلانگ لگا کر دیوار کے دوسری طرف جاسکتے تھے۔ جہاں ان کی خوراک کے لیے بہت کچھ تھا۔

بھیڑیوں نے اس جگہ کو تازہ لیا اور گاؤں کے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بہ ظاہر اس جگہ سے تغافل برتنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک منصوبے کے تحت گاؤں کے لوگوں کو بے آرام کرنا شروع کر دیا۔ وہ رات ہوتے ہی چار دیواری کے پاس جمع ہو کر اتنا شور کرتے کہ اندر موجود لوگوں کا سونا محال ہو جاتا۔ وہ بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں سن کر جاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ بھیڑیے کسی جگہ جمع ہو کر ایسا شور کرتے جیسے حملہ کرنے والے ہوں اور گاؤں والے اس طرف دوڑے آتے تھے۔ جب وہ اس طرف آتے تو بھیڑیے کسی دوسری جگہ جمع ہو کر ایسا ہی شور شروع کر دیتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کے اعصاب شل کرنا تھا تاکہ جب وہ اصل میں حملہ کریں تو کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔

گاؤں کے لوگ دن رات جاگ جاگ کر واقعی نڈھال ہونے لگے تھے۔ اوپر سے پانی اور ایندھن کی کمی بھی

رنگ لاری تھی۔ بچے کچھ پانی پر لوگوں میں جھڑے ہوئے لگے۔ انہوں نے ایک ایک جگہ سے برف حاصل کر کے استعمال کر لی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کنویں نہیں کھودے جاسکتے تھے اور ان کی پانی کی تمام ضروریات گاؤں کے باہر موجود چشمے پوری کرتے تھے۔ لکڑی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے سردی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی جن کو آگ جلانے کے لیے لکڑی نہیں ملتی تھی وہ ساری رات بھٹکتے رہتے تھے۔ بہت سارے لوگ خوراک کچی کھانے پر مجبور تھے کیونکہ کھانا بنانے کے لیے بھی لکڑی نہیں رہی تھی۔

ایک رات جب تھکے ہارے گاؤں والے سو رہے تھے اور پہرے پر چند اگتھے ہوئے افراد تھے تو بھیڑیوں نے ٹاڑی ہوئی جگہ سے چار دیواری پھلائی اور اندر داخل ہو گئے لیکن انہوں نے یہ کام بہت خاموشی سے کیا تھا ان کی کوشش تھی کہ اندر موجود افراد کے خیردار ہونے سے پہلے وہ اچھی تعداد میں اندر پہنچ جائیں۔ ذرا سی دیر میں درجنوں بھیڑے اندر آچکے تھے۔ لیکن انسانوں سے پہلے رکھوالی والے کتوں نے ان کی موجودگی محسوس کر لی اور وہ بھونک بھونک کر لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔ مگر تھکے ہوئے اور گہری نیند میں ڈوبے لوگوں کو جانے اور باہر آنے میں کچھ وقت لگا تھا اور اتنی دیر میں سیکڑوں بھیڑے اندر گھس آئے تھے۔ جب لوگ باہر آئے تو بھیڑیوں نے پہلے ان پر ہی حملہ کر دیا۔ کئی سو بھیڑیوں کو گاؤں کی چار دیواری میں باکر لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو پلٹ کر واپس گھروں میں گھس گئے اور جو باہر رہ گئے تھے وہ بھیڑیوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ انسانوں پر حاوی آنے لگے۔ درجن بھر پہرے داری پر موجود انسانوں کو ختم کر رہے تھے اس کے بعد بھیڑے جانوروں پر پل پڑے۔

ایک شور برپا تھا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید کانپ رہے تھے۔ بھیڑے مسلسل چار دیواری میں داخل ہو رہے تھے اور مارے جانے والے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی بھینٹوڑ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارے ہی جانوروں کو ختم کر دیا اور ان سے اپنی شکم آگ بجھائی۔

ساری رات بھیڑے لاشوں کو بھینٹوڑتے اور کھاتے رہے۔ ان کی غراہٹوں سے گھروں میں قید لوگوں کا خون

خٹک ہو رہا تھا انہیں معلوم تھا کہ جانوروں کے بعد ان کی ہی باری ہے۔ لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جن گھروں کے افراد مارے گئے تھے وہ بھی مارے خوف کے محل کران کا غم نہیں منا رہے تھے۔ کوئی رو رہا تھا تو اپنی آواز اپنے سینے تک محدود رکھ کر۔ کیونکہ ان کو خوف تھا۔ بھیڑے ان کی آواز سن کر ان کے مکانوں میں گھس آئیں گے۔ جن کے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھڑکیاں تھیں۔ وہ ان کی مرمت کرنے میں لگ گئے۔ اب بھیڑیوں سے جنگ انفرادی ہو گئی تھی سب کو اپنی اپنی جان خود بچانی تھی۔

ساری رات بھیڑے تباہی مچاتے رہے اور صبح تک انہوں نے چار دیواری میں موجود ہر جانور کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کا گوشت کھا کر ان کی شکم سیری ہو گئی تھی لیکن ابھی وہ یہاں سے جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابھی یہاں کھانے کے قابل اور بھی بہت کچھ ہے۔ گھروں کے بند دروازوں کے پیچھے سے انہیں انسانوں کی بو آ رہی تھی۔ صبح تک سارے ہی بھیڑے اندر گھس آئے تھے اور روشنی ہونے پر بھی وہ ہر طرف بٹھری لاشوں کو بھینٹوڑتے رہے۔ جھریوں سے نظر آنے والا منظر بہت خوف ناک تھا۔ ہر طرف خون تھا یا لاشیں اور ہڈیاں بٹھری ہوئی تھیں۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر لوگوں کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

دھاکوں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ بچے سہم کر سفینہ سے لپٹ گئے۔ علیینہ نے سبے اعزاز میں پوچھا۔ ”ماما یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ سفینہ نے ان کو تسلی دی۔ ”سامنے والے گاؤں میں لڑائی ہو رہی ہے۔“

بچے مطمئن نظر آنے لگے۔ غازی کو کہانی کا خیال آ گیا اور وہ اشتیاق سے بولا۔ ”ماما پھر کیا ہوا؟“

وہ پہلے کی باری کہانی سن چکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ پھر کیا ہوا لیکن وہ ہر بار اتنے ذوق و شوق سے سنتے تھے جیسے پہلی بار سن رہے ہیں۔ سفینہ نے اپنا دھیان باہر سے آتی آوازوں سے ہٹایا اور انہیں پھر کہانی سنانے لگی۔

☆☆☆

ہزاروں کی تعداد میں بھیڑے گاؤں کی چار دیواری میں آزادانہ گھوم رہے تھے۔ اگرچہ انہیں خوراک کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی رال بند گھروں میں

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دودن اور گزر گئے تھے۔ ایک طرف بہت سارے گھروں میں خوراک ختم ہو گئی تھی اور پانی تو شاید ہی کسی گھر میں تھا۔ تو دوسری طرف بھیڑیے بھر سے بھوک سے چناب ہونے لگے تھے۔ انہیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے دودن گزر چکے تھے اور ان کے پیٹ بھر سے خالی تھے۔ جب ان کی تاب ختم ہو گئی تو انہوں نے گھروں میں گھسنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ دروازوں اور کھڑکیوں سے خود کو کھارہے تھے اور انہیں توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اندر سے آتی زندہ جسموں کی بو انہیں اور بھی بے تاب کر رہی تھی۔

بھیڑیے جن گھروں میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے یکنیں خوف کے باوجود مدافعت کر رہے تھے اور اندر رہتے ہوئے بھیڑیوں کے خلاف ہر ممکن ہتھیار استعمال کر رہے تھے لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ زیادہ دیر مدافعت ممکن نہیں تھی۔ ایک بار بھیڑیے کی گھر کا دروازہ توڑ دیتے تو گھر والوں کو صرف خدا ہی بچا سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر خدا کو یاد کرنے لگے۔ بھیڑیوں کی گاؤں میں موجودگی کو پانچواں دن طلوع ہوا تو ان کے تپور خراب تھے اور روشنی ہوتے ہی انہوں نے گھروں میں گھسنے کی دیوانہ وار کوشش شروع کر دی۔ ان کی گزشتہ دن کے حملوں سے کئی مکانات کے دروازے کنزور ہو گئے تھے اور وہ ان کے تازہ حملوں کے آگے لرزنے لگے تھے۔ ان سے زیادہ اندر موجود لوگ لرز رہے تھے۔ انہیں موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

پھر جیسے اچانک موسم تبدیل ہوا اسی طرح بھیڑیوں کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا اور وہ حملہ کرتے کرتے رک گئے اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سوچنے لگے۔ لوگ انہیں حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ بھیڑیوں کا رویہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ پھر اچانک گاؤں کی چار دیواری کے داخلی دروازے کی طرف سے شور بلند ہوا اور ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوا۔ یہ ایک ترک فوجی دستہ تھا جو اس علاقے میں گشت کر رہا تھا اور اتفاق سے یہاں چلا آیا تھا۔

بھیڑیوں نے اس فوجی دستے پر حملہ کیا لیکن فوراً ہی اسے لینے کے دیئے پڑ گئے جب ترکوں نے بھیڑیوں کو تلواروں اور نیزوں کی نوک پر رکھ لیا۔ جب ان میں سے درجنوں مارے گئے تو پھر انہیں اعلیٰ غلطی کا احساس ہوا اور وہ پلٹ کر بھاگے لیکن اس احاطے میں کہیں جانے پناہ نہیں تھی کیونکہ باہر جانے کے دو ہی راستے تھے ایک سے گزر کر

موجود انسانوں پر پیکنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ گھروں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے اور مرد مائیں رو کے بیٹھے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ یہ آفت اتنی آسانی سے جانے والی نہیں ہے۔ اس دن اور آنے والی رات بھیڑیے پنی کچھ لاشوں کو بھیڑتوڑتے رہے اور اگلے دن تک وہ ان کی ہڈیاں بھی چبا چکے تھے۔ بے فک جاکو بہت سارے تھے لیکن کھانے والے بھیڑیوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی اور وہ سردیوں میں کئی ہفتوں سے بھوکے تھے۔

لوگ مایوس ہو کر اب خدا سے دعا کر رہے تھے کہ اس آفت کو ٹال دے۔ پھر رات کسی وقت ہوا میں اچانک تبدیلی آئی اور موسم کی قدر گرم محسوس ہونے لگا۔ جب اگلی صبح طلوع ہوئی تو لوگوں نے جھریوں اور پھتوں پر بنی کھڑکیوں سے دیکھا کہ آس پاس کے پہاڑوں پر برف پھسل رہی تھی۔ درخت جو کل تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے ان کی شاخیں نظر آنے لگی تھیں۔

موسم کی اس تبدیلی نے بھیڑیوں کو بھی چونکا دیا اور انہوں نے ان بلند پہاڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جو گرمیوں میں ان کا مسکن تھے اور جہاں وہ افزائش نسل کرتے تھے۔ موسم بدلتے ہی انہیں اپنے بھٹ یاد آنے لگے تھے اور پھر انہوں نے چار دیواری سے باہر جانا شروع کر دیا۔ بھیڑیے جا رہے تھے۔ لیکن سب نہیں بہت سارے اب بھی لالچ میں یہاں رکے ہوئے تھے۔ رہ جانے والوں نے جانے والوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن جو فطرت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ روکنے کو تیار نہیں تھے اور جو فطرت پر اپنی ذہانت کو ترجیح دے رہے تھے وہ وہیں رہ گئے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ شاید ہزاروں میں سے چند سو بھیڑیے ہی گاؤں میں باقی رہ گئے تھے اور باقی دوسرا دن طلوع ہونے سے پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔

گاؤں والے فخر تھے کہ باقی بھی چلے جائیں تو وہ باہر نکلیں۔ اگلے روز موسم مزید بہتر ہوا اور بہار کے واضح آثار نظر آنے لگے۔ درختوں اور گاؤں کے آس پاس پہاڑوں سے برف تقریباً صاف ہو گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے بھیڑیوں میں سے بھی کچھ فطرت کی آواز کو نظر انداز نہ کر سکے اور حسرت و یاس لیے گاؤں پر آخری نظر ڈال کر وہاں سے رخصت ہو گئے لیکن ابھی بہت سارے بھیڑیے وہاں موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے باہر نکلنے کا سوال

بھیڑے اندر آئے تھے اور دوسرے سے فوجی دستہ اندر آیا تھا۔ یہ راستہ بند تھا اور دیوار والا راستہ مشکل تھا۔ اس سے ایک وقت میں ایک ہی بھیڑ یا باہر جاسکتا تھا۔ جب تک بچ جانے والے بھیڑیے اس راستے سے باہر جاتے ان میں سے بھی نصف سے زیادہ مارے جاتے تھے۔ سپاہی باہر نکل کر کھوڑوں پر ان کا پچھا کر رہے تھے اور اپنے تیروں سے انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر دوسو سے زیادہ بھیڑیے مارے جاتے تھے۔ گاؤں کے اجاطے میں اور اس کے باہر ان بھیڑیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

جب بھیڑیوں کے اس حملے کی اطلاع مقامی ترک حکام تک پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو محفوظ کرنے کے لیے اس پورے علاقے میں بھیڑیوں کے خلاف ایک شکاری مہم شروع کی اور سپاہی جنگلوں میں بھیڑیوں کو گھیر کر ہلاک کرنے لگے۔ چند مہینوں میں ہزاروں کی تعداد میں بھیڑیے مارے جاتے تھے اور اب مقامی لوگوں کو ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

کہانی سننے سننے بچے سو گئے تھے۔ سفینہ کو بھی نیند آنے لگی۔

☆☆☆

سفینہ کئی برس بعد اپنے گاؤں آئی تھی۔ اب یہاں سوائے جلتے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات اور بلبے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چار سال پہلے جب سرب یہاں حملہ آور ہوئے تھے تو اس گاؤں کی آبادی کوئی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ پہلے انہوں نے حسب روایت بے پناہ گولہ باری کی۔ تو پھر اور مارٹنز کے گولے ان کے گھروں اور پناہ گاہوں پر برسنے لگے تھے۔ ایک جاہلی مہمی، ایک قیامت خیزی جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ جن کے گھر بمباری کا نشانہ بنے وہ ان کے بلبے تلے دفن ہو کر رہ گئے اور جو بچ گئے وہ پناہ کے لیے دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن برستے گولوں میں نہیں جانے اماں نہیں تھی۔

سفینہ کا مکان بھی ایک مارٹنز گولے کا نشانہ بنا اور وہ اپنے بچوں کو سینے پیٹی تھی۔ گولے سے مکان کا اوپری حصہ تباہ ہوا تھا اور اس میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ خانہ بچ گیا تھا لیکن اگر وہ یہاں سے نہ نکلے تو کچھ برس میں یہ ان کا مقبرہ بن جاتا۔ سفینہ نے بچوں سے جموٹ بولا تھا کہ سرب برابر والے گاؤں پر گولہ باری کر رہے تھے۔ وہ ان کے گاؤں کا محاصرہ کر چکے تھے اور اس روز اس محاصرے سے نکلنے کی

کوشش کرنے والے تمام ہی مسلمان سربوں کی مشین گنوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد مسلمان اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جو چند مرد لڑنے کے قابل تھے وہ ناقابل ذکر قسم کے ہتھیاروں سے گاؤں کا دفاع کر رہے تھے لیکن صاف نظر آ رہا تھا ان کی کوشش لاعاثر تھی۔ سرب جلد ان کے گاؤں پر قابض ہونے والے تھے۔

سربوں نے اپنی توپیں اور مارٹنز گنیں نصب کیں اور گاؤں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ چاروں طرف آگ و آہن کی بارش جاری تھی۔ سفینہ کا گھر نشانہ بنا تو اس نے بچوں کو لے کر وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا اور نہ وہ یہیں جل کر مر جاتے۔ لیکن جب وہ اوپر آئی تو اسے پتا چلا کہ آگ نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ بچوں کو لے کر دیوانہ وار اس آگ سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ اس کوشش میں غازی اور علیہ کہیں گئے ہو گئے اور وہ صرف علی کے ساتھ گھر سے نکل سکی تھی۔ آس پاس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ تقریباً سارے ہی گھر سمار ہو چکے تھے اور جو بچے تھے ان پر گولے برس رہے تھے۔ سفینہ کو علیہ اور غازی نہیں نظر نہیں آ رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح انہیں تلاش کر رہی تھی۔ اسے برستے گولوں اور گولیوں کی پروا نہیں تھی۔ علی اس کے ساتھ ساتھ کھست رہا تھا پھر اس نے علی کو حفاظت کے خیال سے ایک چھوٹے سے مکان کی آڑ میں بٹھا دیا اور وہ اپنے جلتے مکان کی طرف واپس آ رہی تھی کہ اسے عقب سے دھماکا سنا دیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مکان غائب تھا جہاں اس نے علی کو بٹھایا تھا۔ کسی گولے نے اسے صفحہ ہستی سے نابود کر دیا تھا۔ چند منٹ کے اندر سفینہ اپنی ساری کائنات لٹا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر پٹی پٹی لگا ہوں سے غائب مکان کو دیکھتی رہی اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ سمجھتا نہ گی کہ اسے ہوش ہی کیوں آیا۔ وہ سربوں کے ایک جنگلی کیمپ میں تھی جہاں اس جیسی بے شمار مسلمان عورتیں اور لڑکیاں بند تھیں۔ سرب ان جو ان اور خود برہمسلمان خواتین کے بطن سے اپنی افزائش نسل کے قابل نفرت منصوبے پر عمل کر رہے تھے۔ سفینہ بی آئی تھی اور جلد اسے بھی ان حالات سے گزرنا پڑا جس کا یہاں موجود عورتیں شکار تھیں۔ اس کیمپ میں آنے کے تیسرے مہینے وہ حمل سے ہو گئی۔ اس کے بعد اسے بخش دیا گیا کیونکہ سربوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کے بطن سے

پہلا بحری حملہ

حضرت عمرؓ نے 15ھ (35-634ء) میں عثمان ابن ابی عاص ثقفی کو بحرن اور عمان کا گورنر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں سب سے پہلے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ پر قبضے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عثمان ابن ابی عاص نے ایک بحری بیڑہ تیار کر کے بمبئی کے قریب تاند (تھانہ) بندرگاہ پر جواب بھی موجود ہے 15ھ (636ء) میں پہلا بحری حملہ کیا اور یہاں سے بہت سامان غنیمت لے کر عمان پہنچے۔ یہ مسلمانوں کا ہندوستان پر پہلا بحری حملہ تھا۔

مرسلہ: زاہد سلطان، پشاور

وہ گاؤں پہنچی تو اسے دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ جلے ہوئے اور گرے ہوئے کھنڈروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا اسے ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملیں گے لیکن پھر بھی اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ البتہ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ یونینیا کی حکومت کے رضا کار یہاں موجود لاشوں کو نکال کر ان کی باقاعدہ تدفین کر چکے تھے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب یہ گاؤں اجڑا تھا۔ بھیڑیوں کے حملے کے بعد کئی بار انسان نما بھیڑیوں نے اسے تاراج کیا تھا۔ ان کو مسلسل مسلمان ہونے کی سزا ملتی رہی تھی لیکن وہ اجڑ کر پھر اسے آباد کر لیا کرتے تھے۔ دکن کے پاس انہیں اجاڑنے کی طاقت تھی تو اس کمزور قوم کے پاس ہر بار اجڑ کر آباد ہونے کی طاقت بھی لیکن اس بار گاؤں ایسا اجڑا تھا کہ لگتا تھا اب کبھی آباد نہیں ہوگا۔ وہ یونینیا کے بے شمار گاؤں کی طرح ہمیشہ کے لیے نابود ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان بستیوں پر جن بھیڑیوں نے حملہ کیا تھا ان کے پیٹ بھی نہیں بھرتے تھے اور ان سے بچانے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس بار بھیڑیے کامیاب رہے تھے۔

سفینہ سرد آہ بھر کر ایک بار پھر سے سبز ہو جانے والے جلے درخت کے تنے سے ٹک گئی۔ اس نے سوچا۔ کیا وہ اکیلے اس گاؤں کو پھر سے آباد کر سکے گی؟ اس کے اندر ایک عزم ابھرا کہ اسے یہ کام کرنا ہی ہے۔ اگلے روز سے اس

مریوں کے بچے پیدا کر کے صدیوں پہلے مسلمان ہو جانے والی اس قوم سے انتقام لیا جاسکے۔

اس کیمپ میں جو عورت حمل سے ہو جاتی اسے ایک اور کیمپ بھیج دیا جاتا تھا جہاں بچے کی پیدائش تک اس کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور جب بچہ ہو جاتا تو اسے عورت سے بچپن کر کسی مشنری ادارے کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بہت ساری عورتیں تو پہلے ہی کیمپ میں خودکشی کر لیتی تھیں۔ بہت ساری اس کیمپ میں آ کر اپنی جان ختم کر لیتی تھیں اور اکثر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس بچے کو ختم نہ دیں جو جبراً ان کی لکھ میں لایا گیا تھا۔ اس میں کچھ کامیاب ہوتی تھیں اور کچھ ناکام ہو جاتی تھیں۔ سفینہ نے بھی اس بچے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی اور اسے بچے کو ختم دینا پڑا لیکن اسے اس بچے کے چھن جانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود اس کو دیکھ نہیں چاہتی تھی۔ جو عورتیں فارغ ہو جاتی تھیں انہیں دوبارہ رہسید کیمپ بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ ایک بار پھر مریوں کے بچے پیدا کرنے میں استعمال ہو سکیں۔ مگر سفینہ کی خوش قسمتی کہ ان ہی دنوں یونینیا کی مسلم فوج نے اس کیمپ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور یہاں موجود عورتوں کو آزاد کر لیا۔ پھر سفینہ کو ایک پناہ گزین کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ جنگ کے خاتمے تک رہی تھی۔ کیمپ سے نکلنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے بچوں اور شوہر کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورے یونینیا میں قائم ہر پناہ گزین کیمپ میں گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید جس طرح وہ بچ گئی اسی طرح اس کے بچے بھی بچ گئے ہوں۔ اس نے یونینیا میں فوج اور رضا کاروں کے چھگے سے اپنے شوہر کا جو یک کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بارے میں پتا چلا کہ آخری بار وہ سر برینکا میں موجود تھا اور پھر سرب اس شہر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور وہاں موجود کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔

پورے ایک سال تک اپنے پیاروں کو تلاش کرنے کے بعد سفینہ نے ہار مان لی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ ان میں سے کوئی اب اس دنیا میں نہیں ہے اور اسے ان کے بغیر ہی زندہ رہنا ہوگا۔ پھر وہ گاؤں کی طرف آئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا لیکن وہ پھر بھی آئی اس نے سوچ لیا تھا، اگر وہ اپنے گاؤں کی بچنے والی آخری فرد ہوئی تب بھی وہ اس گاؤں کو دوبارہ آباد کر کے رہے گی۔

نے اپنے جل کر کھنڈر ہو جانے والے گھر کی صفائی شروع کر دی اور ایک ہفتے میں اس کا سارا الملبا نکال دیا۔ اب وہ اس کی جگہ نیا گھر بنانے کے لیے تیار تھی۔ فی الحال رہائش کے لیے اس کے پاس ایک خیمہ تھا اور اسے خوراک حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ اس نے خوراک دینے کے لیے آنے والوں سے اوزاروں کی فراہمی کی درخواست کی اور انہوں نے اسے اوزار فراہم کر دیے تھے۔

سفینہ نے سارے گرمائی سخت محنت کر کے اپنے لیے چھوٹا سا اور موسموں سے محفوظ گھر تلاش کر لیا تھا۔ ابھی تک وہ یہاں اکیلی تھی اور اسے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ جو دیکھ اور بھگت چکی تھی اس کے بعد وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر اور زمین کو آباد نہیں کر سکتی اسے حکومت کی طرف سے امداد ملتی رہتی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مردیوں کے بعد اپنی زمین پر کام کرے گی۔ پھر وہ سرما میں سر اجیو چلی گئی اور وہاں عورتوں کی بحالی کے ایک مرکز میں بطور رضا کار کام کرنے لگی۔ اس وقت اس کی قوم کو ایک ایک فرد کی ضرورت تھی لہذا وہ سرما اپنے محفوظ گھر میں آرام کر کے نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اس مرکز میں وہ عورتیں تھیں جو جنگ میں اپنے رشتے اور اپنی عصمت دونوں کھو چکی تھیں ان میں سے کئی کی گود میں ایسے بچے تھے جن کے باپ سرب تھے۔ یہ شدید ذہنی اور جسمانی خرابیوں کا شکار تھیں اور مرکز میں ان کی بحالی کی کوشش کی جاتی تھی۔

یہیں سفینہ کی ملاقات اسد الدین سے ہوئی۔ وہ سربر نیکا کا رہنے والا تھا اور ان چند افراد میں سے ایک تھا جو وہاں ہونے والے قتل عام سے بچ نکلے تھے لیکن اس قتل عام میں اس کے خاندان کے سترہ افراد مارے گئے تھے جن میں اس کی بیوی اور دو بچے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے خاندان میں بچنے والا واحد فرد تھا۔ دونوں زخم خوردہ تھے۔ اس لیے جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

یونیا کی حکومت بچ جانے والے جوان مرد اور عورتوں کی شادی کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور ایسے ہر جوڑے کو آباد کاری کے لیے معقول رقم اور زمین بھی دی جا رہی تھی۔ سفینہ نے اسد الدین کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسد اور دوسرے لوگ جل کر اس کے گاؤں کو پھر سے آباد کریں۔ سر اجیو میں بے شمار مسلمان ایسے تھے جو سرب اکثریتی علاقوں سے جان بچا کر آئے تھے اور جنگ کے بعد بھی وہاں واپس نہیں جاسکتے تھے۔ انہیں

یونیا کی بالکل تباہ ہو جانے والی بستیوں میں بسایا جا رہا تھا۔ سفینہ نے اپنے گاؤں کا نام بھی پیش کر دیا۔

جب وہ سرما کے خاتے پر گاؤں جانے کے لیے تیا ہوئی تو اس کے ساتھ تیس سے زیادہ مرد و زن پر مشتمل ایک قافلہ تھا جو اس کے گاؤں میں آباد ہونے جا رہا تھا۔ ان میں اسد بھی تھا لیکن اس نے ابھی تک سفینہ سے شادی کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو برف پھل رہی تھی اور درختوں پر نئے نئے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے پرانے کھنڈرات کے بجائے گاؤں کو نئے سرے سے اور منظم انداز میں بسانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے مسجد کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی اور پھر اس کے گرد اپنے لیے مکانات کی تعمیر شروع کر دی۔ انہوں نے زمین ہموار کی اور اس کے ساتھ ہی کھیت اور باغات کو بھی بحال کرنے لگے۔

اسد نے اپنے لیے کوئی جگہ منتخب نہیں کی تھی وہ سرما میں رہ رہا تھا اور اس قیصر کا زیادہ تر کام وہی کر رہا تھا۔ بہا اور پھر گرم موسم بھی گزر گیا اور مردیوں کے آثار نظر آ گئے۔ تب سفینہ نے ہمت کر کے خود اسد سے کہا۔ ”کیا تم! گھر نہیں بساؤ گے؟“

اسد جیسے اس کے جملے کا خنجر تھا اس نے سفینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اگر تم مجھے اپنے گھر میں جگہ دو گی تو اسے ضرور آباد کروں گا۔“

تب سفینہ کی سمجھ میں آیا وہ اس کی طرف سے پہلے خنجر تھا کیونکہ یہ اس کا گاؤں تھا۔ اسے آباد کرنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت تھی۔ سفینہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میرا گھر اب تمہارا ہے۔“

آج سفینہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اسد اور چار بچوں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس سانحے کو سترہ سال گزر چکے ہیں اور گاؤں کی حد تک اس کے آثار مٹ گئے ہیں۔ لیکن جس نسل نے بربادی جھیل کر آبادی کی ہے اس کے دلوں میں یہ آثار ہمیشہ موجود رہیں گے۔ گاؤں کا آبادی بھرے بڑھ کر کوئی پانچ سو نفوس پر مشتمل ہو گئی ہے اگرچہ ان میں سوائے سفینہ کے کوئی بھی اس گاؤں کا پرا بانی نہیں ہے لیکن سفینہ جانتی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے۔ لوگ آتے جاتے رہتے اور گاؤں آباد رہتے ہیں۔ آج اس کا گاؤں پھر آباد ہو گیا تھا۔



فلمی عمری

شوہین

انور فرہان



ماضی میں پاکستانی فلم انڈسٹری اپنی مثال آپ تھی، پھر گویا ایک سازش ہوئی اور حکومت کے خزانے کو لب لباب دینے والی فلمی صنعت چور چور ہو گئی۔ ہنرمند شرفاً آہستہ آہستہ الگ ہوتے چلے گئے۔ ایسے وقت میں گئے چنے کامیاب لوگ رہ گئے جنہوں نے موت کی کنگار پر پہنچ جانے والی اس صنعت کو سنبھالا دیا اور نامساعد حالات میں بھی جی جان سے محنت کرتے رہے، انہی میں سے ایک بڑے نام کا ذکر جس نے پاکستانی فلمی صنعت کو سنبھال رکھا۔

فلمی صنعت کے ایک اہم فرد کی داستان جہد داستان

کریں تو ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں سال بھر میں خاصی فلمیں بنا کر بیچتی تھیں اور اچھی فلمیں بھی اچھی تعداد میں ہوتی تھیں مگر وقت سدا ایک سانپیں رہتا۔ اس لیے فلم سازی کے میدان میں بھی تبدیلی آئی۔ اچھے فلم میکرز آہستہ آہستہ فیڈ

فلمیں بنی تو بہت ہیں مگر اچھی فلمیں کم بنتی ہیں۔ یہ بات صرف ہم پر ہی صادق نہیں ہوتی۔ پوری دنیا کی فلم انڈسٹریز کا یہی حال ہے۔ کیونکہ اچھی فلمیں اچھے فلم میکرز ہی بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنے وطن عزیز کے تناظر میں بات

آؤٹ ہوتے گئے اور ان کی جگہ غلط قسم کے اور نان-ٹیکنیکل لوگ آتے گئے۔ جس کا نتیجہ سامنے آتا ہی تھا وہ آپا مگر اللہ کا شکر ہے کہ بڑے وقت میں بھی کچھ اچھے لوگ اچھی فلمیں بنا کر فلمی صنعت کی ڈھونڈ نیا کو بچا رہے ہیں۔

اچھے لوگ چاہے زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ آج ہم اس نشست میں ایک ایسی ہی فلمی شخصیت کی باتیں کریں گے جو بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ جس سے ہماری فلم انڈسٹری کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ جس نے فلم سازی کے کئی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس لیے وہ شو بڑی دنیا میں سب کے لیے قابل احترام۔

ہمارے ہاں ایک بہت غلط رواج ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی، بڑا فنکار، بڑا اکلاکار، بڑا ادیب بڑا شاعر اس جہان فانی سے گزر جاتا ہے تو تب لوگ اس کے گمن گاتے ہیں۔ اس کے بارے میں اپنی محبت اور عقیدت کے پھول بچھا دیتے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں اسے صفر بنائے رکھتے ہیں۔

ہم اسی غلط روایت کو توڑنے کے لیے ہی اپنے ایک لہجہ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہی آپ کے پاس موجود ہیں۔

یہ عہد حاضر کے بہترین ہدایت کار اور اپنی ذات میں اکیڈمی کی حیثیت رکھنے والے شو مین سید نور ہیں۔

یہ بات ہم نے یوں ہی نہیں کہی ہے۔ جیسے جیسے اس تحریر میں آپ ان کے بارے میں پڑھتے جائیں گے ہماری بات کی سچائی آپ پر روشن ہوتی جائے گی۔

سید نور کو پاکستانی فلمی صنعت کا ”شو مین“ کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ بہت بڑا خطاب ہے اور ہر کسی فنکار کو عطا نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے راجہ پور اور سید نور جیسے گراں قدر خدمات درکار ہوتی ہیں۔ پاکستان میں ”تیری یاد“ کے دور سے اب تک کسی اور فلمی شخصیت کو اس اعزاز سے نوازا نہیں گیا۔ اس لیے ہمیں سید نور پر فخر ہے۔

سید نور سے پہلے ہمارے شو مین کا خطاب راجہ پور کو ان کی فنکارانہ عظمت اور بہترین فنی خدمات کے صلے کے طور پر اس خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی بہترین خدمات کے لیے جو انہوں نے فلمی صنعت کے شدید ترین بحران کے دور میں نہایت عہدگی سے سرانجام دیئے اسی پر ان کو شو مین کا خطاب عطا کیا گیا۔

ہمارے شو مین نے انتہائی آزمائشی دور میں نہایت عمدہ اور مثالی فلم میکنگ کا مظاہرہ کر کے اپنی فنی استطاعت کا جو ثبوت دیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے تفریحی، اصلاحی اور کامیاب ترین سپر ہٹ فلمیں تخلیق کر کے فلمی صنعت کو زوال کے پھنوس سے نکالا۔ ان کا یہ کارنامہ کسی صورت بھی کسی دور میں فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ فلمی تاریخ کا مؤرخ ان کے اس کارنامہ کو سنہری حروف میں لکھے گا۔

سید نور کے کئی فنی روپ ہیں۔ وہ ایک کامیاب فلم رائٹر ہیں۔ ایک مستند ڈائریکٹر ہیں اور ایک قابل اعتماد فلم ساز بھی ہیں۔ شائقین صرف ان کا نام دیکھ کر فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایسے کئی آرٹسٹ فلم انڈسٹری سے متعارف کرائے جو پاکستانی فلمی صنعت کا اثاثہ ثابت ہوئے۔

سید نور نے جب اپنا فلمی کیریئر شروع کیا تھا، وہ پاکستانی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ایسے دور میں کسی نئے اور نوآموز کا قدم جمانا بڑا دشوار ہوتا ہے مگر ان کے اندر پوشیدہ فنی صلاحیتوں نے اجاگر ہو کر انہیں بڑے بڑوں کے سامنے ثابت قدم رکھا۔ انہوں نے فلمی صنعت کا سنہری دور بھی دیکھا اور زوال کا صبر آزما زمانہ بھی۔ زوال کے دور میں جہاں بہت سے لوگ انڈسٹری کا ساتھ چھوڑ گئے کہ اب یہاں موجود رہنا مناسب نہیں مگر یہ جوان ہمت سید نور تھے کہ انہوں نے ایسے بڑے حالات میں بھی ہنگامہ گوارا نہ کیا۔

ان پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ انہیں گن پوائنٹ پر مجبور کیا گیا کہ تم پنجابی ہو پھر بھی اردو فلمیں لکھتے ہو اور اردو فلمیں بناتے ہو تمہیں پنجابی فلمیں بھی بنانی ہیں۔ اپنی ماں بولی میں اگر فلم نہیں بناؤ گے تو نقصان میں رہو گے۔

پنجابی میں فلم نہ بنانا سید نور کا جرم ضرور تھا مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ پنجابی فلم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ خود اس کی خواہش تھی کہ وہ پنجابی فلم بنائے لیکن اس دور میں بارودھا عریانی اور فحاشی سے بھرپور پنجابی فلمیں بنانی جاری تھیں سید نور اس نوعیت کی فلم نہیں بنا سکتے تھے۔

مگر انسان کو جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ مرتا کیانہ کرتا، لہذا سید نور نے کہا۔ ”ہندو کی نال ہٹاؤ۔ میں پنجابی فلم بناتاؤں گا۔“

اس کے بعد انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ سید نور

زندگی نامہ
خاندانی نام..... محی الدین نور
قلمی نام..... سید نور
پیدائش..... 21 فروری 1951ء
تعلیم..... صحافت میں پچھڑی ڈگری
قلمی کیریئر..... 1970 میں قلم انٹرنری جوائن
کر لی کیریئر کا آغاز بطور فچر رائٹر کیا۔
1970 سے 1975ء تک ایس سلیمان کے
ساتھ بطور اسٹنٹ کام کیا۔ 1976 میں پہلا قلم
اسکرپٹ لکھا جس پر سوسائٹی گرل نام سے قلم بنی۔
پہلی قلم بطور ہدایت کار..... جنم جو 1993ء میں
ریلیز ہوئی
اب تک 55 کے قریب فلمیں ڈائریکٹ کر چکے
ہیں۔
شادی..... دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی صفائی
ادبیہ و شاعرہ رخصانہ نور سے 20 اپریل 1984ء کو
دوسری اداکارہ صائمہ سے 2005ء میں۔
بچے..... رخصانہ نور سے چار بچے ہیں۔ تین
بیٹیاں ایک بیٹا۔ بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور بال بچے
دار۔ بیٹا لاہور میں باپ کے ساتھ ہیڈ اکیڈمی
سے وابستہ ہے۔

کے بار پہنانے اور تمہارا منہ میٹھا کرانے کے لیے پورے شہر
میں تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔“
”کیوں کیا چوڑیاں کی رپورٹ اتنی خراب ہے کہ تم
لوگ.....“

”نہیں شاہجی خراب نہیں، بہت اچھی رپورٹ ہے۔
ہم تو زیادہ سے زیادہ سنیما گھر ایجنج کرنے کی کوشش کر رہے
ہیں۔“

نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اچھائی کی پذیرائی ضرور
ہوتی ہے۔ ”چوڑیاں“ اس لیے پرہٹ ہوئی کہ پنجابیوں کو
اس میں اصل پنجاب نظر آیا۔ وہ جوائنکشن کے نام پر مار
دھاڑ، خون خرابہ دیکھتے رہے تھے ان سے انہیں نجات ملی
تھی۔

”دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن در سہرا۔“ کے
مصدق ہر قلم بین دوسرے سے کہتا۔ ”جاؤ دیکھو چوڑیاں

لے پنجابی قلم بنائی ضرور مگر اس میں پنجابی قلموں کا مال مسالہ
نہیں ڈالا۔ نہ گنڈ اساتقانہ برادری اذم کی لڑائی بھڑائی۔ نہ
ہلہب کے اصل کلچر کو بدنام کرنے والے عریانی اور فاشی کی
بے ہودگی تھی۔ سید نور نے جو پنجابی قلم بنائی اس میں پنجاب
کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا۔ اس قلم کی تکمیل کے
اور ان میں جن لوگوں نے اس کی شوٹنگ دیکھی، انہوں نے
ہلکی کہا۔ ”یہ تو ایک ڈاکومنٹری قلم ہے۔ پنجابی قلم دیکھنے
والوں کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں۔“

سید نور کبھی اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی اس قلم کا
کیا حشر ہوگا اور اس بات کا ڈر بھی تھا کہ اب کی بددوق برادر
ان کی اس گستاخی کا کیا جواب دیں گے۔ لہذا اپنی سلامتی
کے لیے وہ اس قلم کی نمائش سے پہلے دینی چلے گئے۔ نمائش
کے روز وہ لاہور سے کسی دوست کے فون کے منتظر تھے کہ جو
ہے بتاتا۔ ”یار! وہ سنیما گھر جس میں تمہاری قلم ریلیز ہوئی
ٹاشائیوں نے اسے نہیں نہیں کر دیا۔ تمہارا بھی حشر ہوگا
تمہاری تلاش جاری ہے۔“

اپنی سوچ میں سبم وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیلی فون
کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر جب ٹیلی فون کی کھنٹی بجی اور
ابھون نے ریسپونڈ کان سے لگایا تو ان کی حالت دیدنی تھی۔
آواز آئی۔ ”شاہجی۔ چوڑیاں ہٹ ہو گئی سپر ہٹ۔“

”مذاق نہ کر یار! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ سچ بچ
تاؤ۔“

”بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ اتنا اچھا رسپانس شاید ہی
تمہاری کسی قلم کو ملا ہوگا۔“

اب بھی سید نور کو دوست کی بات کا یقین نہیں آ رہا
تھا۔ کیونکہ انٹرنری میں ”چوڑیاں“ کو ایک ڈاکومنٹری قلم
سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی مگر یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ کیسے ہو
گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈرامہ سکون ہوئے تو خود
لاہور فون کیا اور ایک دو جاننے والوں سے پوچھا۔

”چوڑیاں“ کی کیا رپورٹ ہے؟“

”سپر ڈپر ہٹ۔“

”کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔“

ہر ایک نے جب ایک ہی جیسا جواب دیا تو انہوں
نے اپنے ڈسٹری بیوٹر سے رابطہ کیا۔ ان کی آواز سن کر تقسیم
لاہور پڑا۔ ”ارے یار! تم کہاں ہو۔ ہم تو تمہیں پھولوں

ایسی ہوتی ہیں پنجابی فلمیں۔“

اس کے بعد ”مجاہدین“ اور کئی دوسری پنجابی فلمیں بنا کر سید نور نے پنجابی فلموں کی آبرو بچائی۔ ان پر ہندو کی نال رکھنے والوں کو پنجابی فلم بنانے سے مطلب تھا، سید نور نے ان کا مطالبہ پورا کیا اور ایسی پنجابی فلمیں بنائیں جنہیں باکس آفس پر بھی پذیرائی ملی اس طرح وہ پنجابی فلموں کے نجی دولہا بن گئے۔

سید نور کا فنی سفر بھی جہاں بہت پُر نور ہے وہاں بڑا عجیب بھی ہے۔ سید نور نے سید سلیمان جیسے کامیاب اور لہجہ ڈائریکٹر کے اسٹنٹ کی حیثیت سے اپنا فنی کیریئر شروع کیا۔

جس شخص کی تربیت اس قدر عمدہ ماحول میں رہ کر ہوئی ہو، جس ماحول میں آکر لوگ خود پر فخر کیا کرتے تھے تو یہنا وہی سب کچھ اس میں آگیا۔ شخصیت، کردار اور فنی کی وہ ہی بلندی اس میں آگئی۔

جب سید سلیمان سے ہدایت کاری کی تربیت حاصل کرنے والے سید نور نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تو لوگ حیران ہوئے بغیر نہیں رہے۔ کیونکہ اس نے ہدایت کاری کو یکسر بن دیا تھا، بھی تو لوگ کہہ رہے تھے۔

”ارے اس نوجوان نے تو ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی تھی مگر یہ کیا، اس نے فلم رائٹر کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں پہلا قدم رکھا۔“

یہ سنگیتا کی پہلی فلم ”سوسائٹی گرل“ تھی۔ 16 اپریل 1976ء کو ”سوسائٹی گرل“ سینما گھروں کی زینت بنی اور سید نور کی منفرد کہانی کی وجہ سے ہٹ ہو گئی۔ فلم والوں کی حیرانگی بجا تھی کہ ہدایت کاری کی بجائے اس نے فلم رائٹنگ کا شعبہ اپنایا تھا اور کمال کر دیا تھا۔ ایسی کہانی لکھی تھی کہ سنگیتا جیسی نو آموز کو کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

☆.....☆

سید نور کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء سے ہی تھا۔ وہ لکھتے بھی تھے اور چھپتے بھی تھے۔ لاہوریوں بھی لکھنے پڑھنے والوں کا شہر ہے۔ سید نور کو بھی یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں نے لکھنے لکھانے کی طرف مائل کیا۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے انہوں نے کچھ دنوں تک صحافت بھی کی مگر جب اپنے مستقبل کی منزل کے تعین کا وقت آیا تو فلم انڈسٹری کا ہی انتخاب کیا۔ فلم رائٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو آج تک

کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ فلمیں بنا بھی رہے ہیں، ان کی ہدایات بھی دے رہے ہیں اور ان کی کہانیاں مکالمے اور اسکرپٹس لے بھی لکھ رہے ہیں۔

دراصل یہ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ چھٹی نہیں منہ سے یہ کافر لکھی ہوئی۔ ان کے اس لکھنے لکھانے کا شوق ہی تھا جس نے اپنی شریک حیات کے لیے ایک ایسی ہی لڑکی کا انتخاب کیا جو خود بھی رائٹر تھی۔ شاعرہ تھی۔ ادیب تھی۔ صحافی تھی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں رخسانہ نور کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ جو ان کی پہلی منکوحہ بیوی تھیں۔ اللہ انہیں غریبی رحمت کرے۔ (آمین)

سید نور مصنف ہیں، ہدایت کار ہیں، فلم ساز ہیں، یہ سب لوگ جانتے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ یوں بھی دیکھنے میں وہ ایک وجہ اور مرکز کش جوان ہیں اور دیکھنے والوں کو۔۔۔ ہیرو ہی نظر آتے ہیں مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ ان کی بطور اداکار پہلی فلم ”جدائی“ تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ یہ 1984ء میں سینماؤں کی زینت بنی تھی۔ اس کی کاسٹ میں سید نور کے علاوہ رانی، نازلی، ننھا وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ مشہور بھارتی فلم باغبان، جدائی کی کاپی تھی۔ اس کی کہانی ”جدائی“ کی کہانی سے مستعار لی گئی تھی۔ ”جدائی“ کے بعد بھی نور صاحب متعدد فلموں میں بطور اداکار پیش ہوئے لیکن اہم کرداروں میں نہیں، ثانوی کرداروں میں یا مہمان اداکار کے طور پر۔ پھر شاہ جی نے خود ہی اداکاری ترک کر دی۔ کیونکہ وہ فلم میکے کے ساتھ ساتھ اشار میکر بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف کئی سٹے لڑکے لڑکیوں کو اداکاری کے میدان میں لا کر بہترین پر فارم بنایا بلکہ کئی ٹھماٹے ہوئے ستاروں کو چاند سورج بنا دیا۔ فلمی صنعت کے زوال کے باعث ناکام ہو جانے والے شان کو اپنی فلم ”کھوکھٹ“ سے ایسا کامیاب کرایا کہ وہ پھر اشار بن گیا۔ عام اداکاروں میں شامل ہونے والی صائمہ کو سید نور نے دوہرہ حاضری سب سے بڑی ہیروئن بنادیا۔ یہ سید نور ہی تھے جنہوں نے پابریلی اور ریم جیسے جواں سال ہیرو ہیروئن متعارف کرائے۔ اداکار اور گلوکار عدنان مسیح کو نور صاحب نے اپنی فلم ”سرم“ میں پہلی بار پیش کیا۔ اسی فلم سے شہرت حاصل کر کے وہ بولی ووڈ کے پھر کھلا کار بنے۔

سید نور ایک دن میں شومین نہیں بنے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بطور رائٹر ان

کی پہلی فلم ”سوسائٹی گرل“ 1976ء میں ریلیز ہوئی۔
 ”دہی چلو“ ان کے فنی کیریئر کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس کے
 انہوں نے صرف مکالمے لکھے تھے۔ یہ 1979ء میں نمائش
 پر ہوئی تھی۔ ”سورہاتے جوانی“ ان کی وہ پہلی فلم تھی جس
 کی کہانی اور مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے۔ یہ پنجابی فلم
 1981ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ فلم ”جسم“ ان کی وہ پہلی فلم تھی
 جس سے انہوں نے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اپنے
 کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ یہ فلم 1993ء میں نمائش کے لیے
 پیش کی گئی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ وہ دور تھا جب
 پاکستانی فلمی صنعت انتہائی زوال کا شکار تھی۔ یہی وہ دور تھا
 جب غیر معیاری فلم میکنگ کے باعث دل برداشتہ ہو کر
 جناب الیاس رشیدی نے نگار ایوارڈ کا سلسلہ بند کرنے کا
 اعلان کر دیا تھا۔ زوال کے اس بدترین دور میں فلمی صنعت
 کی ڈوبتی نیا لچکانے کے لیے سید نور کی آمد فلم انڈسٹری کے
 لیے ہوا کا تازہ مجموعہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے یکے بعد
 دیگرے سنگم، سرگم، زیور، ہوائیں، ہم ایک ہیں، کمانڈو،
 محافظ جیسی شاہکار فلمیں بنائیں۔ پھر چور چائے شور،
 دیوانے تیرے پیار کے، جیوا، گھونگھٹ، ڈاکو رانی، بھاجن
 جیسی سپر ہٹ فلمیں پیش کیں۔ ان کی فلم ”چوڑیاں“ نے
 کامیابی اور بزنس کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

ان کی کامیابیوں کے پیچھے جو عوامل کار فرما ہیں ان
 میں سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ ہمیشہ مختلف
 موضوعات پر متنوع فلمیں بناتے ہیں۔ گھر، یلو، رومانی،
 تفریحی اور اصلاحی فلم میکنگ کے وہ ماہر مانے جاتے ہیں۔
 ایکشن فلمیں انہیں پسند نہیں لیکن فرمائشی طور پر انہوں نے
 ایکشن فلمیں بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایکشن فلمیں بھی بنا
 سکتے ہیں۔ ان کی دیگر فنی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ
 وہ کہانی کار بھی ہیں۔ ہر فلم کے لیے ایک نئی اور اچھوتی کہانی
 لکھتا اور ان پر فلم بناتا ان کا طرہ امتیاز ہے۔ مجھے ان میں
 ظہیر رحمان جیسی کچھ باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ میں سابق
 مشرقی پاکستان کے ماہر تازہ مصنف و ہدایت کار ظہیر رحمان
 کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے متعدد منفرد اور یادگار بنگالی
 فلموں کے علاوہ پاکستان کی پہلی رنگین فلم ”سنگم“ اور پہلی
 سنہا اسکوپ فلم ”بہانہ“ بنائیں۔ ظہیر رحمان بھی بنیادی طور
 پر لکشن رائٹر تھے۔ وہ خود اپنی فلموں کی کہانی لکھتے تھے۔ جو
 موضوع اور تھیم کے لحاظ سے اچھوتی ہوتی تھیں جب کہ ان
 کی ڈائریکشن کا معیار بھی بلند تھا۔ اچے کاردار جیسے پختہ

سید نور بطور ہدایت کار

قسم۔ جیوا۔ چور چائے شور
 سنگم۔ چوڑیاں۔ بھاجن۔
 ڈاکو رانی۔ گھونگھٹ۔ کمانڈو۔ زیور۔ زور
 دیواریں۔ ہوائیں۔ راجو بن گیا۔ جنٹلمین۔
 دیوانے تیرے پیار کے۔ دو پنا جل رہا ہے۔
 جنگل کوئین۔ باغی لڑکی۔ دل دیوانہ ہے۔ سرگم۔
 ہم ایک ہیں۔ محافظ۔

☆☆☆

سید نور کی بطور کہانی نویس فلمیں

سنگدل۔ ڈائمنڈ جوبلی
 دلہیز۔ ڈائمنڈ جوبلی
 بونی۔ ڈائمنڈ جوبلی
 ڈاکو رانی۔ ڈائمنڈ جوبلی
 چور چائے شور۔ ڈائمنڈ جوبلی

☆☆☆

سید نور کی وہ فلمیں جن کی کہانیاں خود نہیں لکھیں

سید نور جنہوں نے بطور مصنف بے شمار فلموں کی
 کہانیاں لکھیں، وہاں انہوں نے خود اپنی کئی فلموں کی
 کہانیاں تحریر نہیں کیں۔ ان کی کہانیاں ان کی شریک
 حیات رخسانہ نور نے تحریر کیں جو کامیاب بھی ثابت
 ہوئیں اور ان پر بطور کہانی نویس رخسانہ نور کو ایوارڈز
 اور اعزازات بھی ملے۔ ان فلموں میں ”ہوائیں۔
 چوڑیاں۔ مہندی والے جتھ اور سنگم“ قابل ذکر ہیں۔
 ان میں ”ہوائیں۔ چوڑیاں، مہندی والے جتھ“ کو
 بہترین کہانی نویس کے نگار ایوارڈز ملے جبکہ ”سنگم“
 اور ”چوڑیاں“ کو بہترین کہانی نویس کے قومی ایوارڈ
 سے نوازا گیا۔

ان کے علاوہ بھی سید نور کی دیگر فلمیں ہیں جن
 کی کہانیاں اور مکالمے رخسانہ نور نے لکھے۔ ان میں
 ”دیوانے تیرے پیار کے“۔ زیور۔ دیواریں۔ دو پنا
 جل رہا ہے۔ جنگل کوئین۔ دل دیوانہ ہے۔ باغی لڑکی
 اور مجموعہ قابل ذکر ہیں۔

ہدایت کا ظہیر ریحان کے پہلے استاد تھے۔ فیض احمد فیض صاحب نے انہیں بین الاقوامی معیار کی فلم ”جاگو ہوا سویرا“ کے یونٹ میں شامل کیا تھا۔

ہمارے ہاں زیادہ تر فلم میکراچی کہانیوں کا شعور نہیں رکھتے۔ پیش در کہانی کا رے جو کچھ لکھ کر دے دیا اس پر فلم بنائی۔ ایسی کہانیاں زیادہ تر عامیانا انداز کی ہوتی ہیں۔ جب کہ کچھ فلم ساز و ہدایت کار کسی سپر ہٹ فلم کا حوالہ دے کر رائٹر سے کہتے ہیں۔ ”بس..... اسی طرح کی کوئی کہانی لکھ دو۔“

مگر قہر مکر کے طور پر بنائی گئی یہ فلمیں پہلی فلم جیسی کامیابی حاصل نہیں کرتیں۔ سید نور نے بطور مصنف دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لیے بھی جو کہانیاں لکھیں ان میں بھی اس بات کا خیال رکھا کہ وہ بھی منفرد ہوں۔ مثال کے طور پر سنگدل، دلہیز اور بولی۔ ان تینوں فلموں نے ڈائمنڈ جوہلی کا اعزاز حاصل کیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوئی کسی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو منواتا بڑا مشکل اور صبر طلب کام ہے۔ کارکردگی ہی حسن کارکردگی کے اعزاز اور اکرام سے نوازتی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اچھے کام کو اچھا انعام ضرور ملتا ہے۔ پھر بھلا سید نور کو ان کی بہترین کارکردگی کا صلہ کیوں نہیں ملتا؟ انہیں قومی صدارتی اعزاز ”تمغہ حسن کارکردگی“ اور تمغہ امتیاز سے نوازا گیا اور مختلف شعبوں میں سال بھر کی بہترین کارکردگی پر 20 سے زائد نگار ایوارڈز بھی حاصل کیے جب کہ پرائیویٹ طور پر دیگر ایوارڈز دینے والوں نے بھی ان کی فنی خدمات پر اعزاز و اکرام سے نوازا۔

سید نور خاصے پڑھے لکھے اور ہاشور فلم میکراچی ہیں۔ اس لیے میڈیا کا مقابلہ بھی بڑی جواں مردی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی 41 سالہ فنی زندگی میں بہت سے تشیب و فراز دیکھے ہیں۔ نرم گرم، تلخ ترش حالات سے گزر رہے ہیں اس لیے صحافیوں کے سخت تنقید و تہرے پر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے نہیں، بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ حال ہی میں جب ان کی تازہ ترین فلم ”چمن آئے نہ“ نمائش کے مرحلے میں تھی ایک میڈیا مین نے ان سے کہا۔ ”شاہ جی! آپ پر الزام ہے کہ گزشتہ پانچ سالوں میں آپ نے کوئی فلم عوام کے لیے نہیں پیش کی اور اس سے قبل آپ نے پنجابی فلموں کو زیادہ پروجیکٹ کیا جس کی وجہ

سے آپ کی اردو فلموں کی تعداد کم ہو گئی۔“

شاہ جی نے بڑے اعتماد اور پُر سکون انداز میں جواب دیا۔ ”پنجابی بھی ہمارے ملک کی زبانوں میں سے ایک ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے جوڑیاں، عجائبان اور مہندی والے جتے جیسی محرکہ الاار پنجابی فلمیں بنا کر عوام کو میوزیکل فلمیں دیں جو تشدد اور بارود کا رے سے پاک ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ دیگر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے سوائے کل و غارت گری اور برادری ازم پر مبنی فلمیں بنائیں جن سے ہمیں نقصان پہنچا جب کہ میں نے 90ء کی دہائی میں اردو فلمیں بنائیں تو میرے ساتھ ہی میڈم شمیم آراء، سنگیتا بیگم، اقبال کا شمیری اور حسن عسکری وغیرہ نے بھی قومی زبان کی معیاری فلمیں بنا کر میرا اور فلم انڈسٹری کا حوصلہ بڑھایا۔ جب کہ پنجابی فلموں میں ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ سید نور نے اس موقع پر یہ بھی کہا۔ ”ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پاکستانی سینماؤں پر بھارتی فلموں کا راج ہو گیا جس کی وجہ سے پاکستانی اردو فلمیں سینما مالکان کی ضرورت نہ رہیں۔ اس طرح ہماری بڑی بڑی فلمیں مناسب سینما گھر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں جو ان کا حق تھا۔ اس کی سب سے بڑی اور زندہ مثال ”بھائی لوگ“ اور ”لو میں گم“ ہے جو حقیقتاً معیاری فلمیں تھیں۔ انہیں نمائش کا بہترین موقع ملتا تو وہ ہا کس آفس پر نمایاں کامیابی حاصل کر سکتے لیکن وہ سینما آئرز کی مفاد پرستی کی بحیثیت چڑھ گئیں۔“ اس کے بعد شاہ جی بولے۔ ”میں وہ واقعات اور حالات سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے میں نے کچھ عرصہ تک ایک خاص سرکٹ کے لیے فلمیں بنائیں اور صحیح وقت کا انتظار کیا اور عوام کو پانچ برس تک مجھ سے دور رہنا پڑا لیکن عوام کے دلوں میں میری جو محبت اور قدر ہے وہ برقرار رہی۔ میں اس عوامی جذبے کو سلام تحسین پیش کرتا ہوں اور اپنے چاہنے والوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ فلموں میں طویل گپ نہیں آنے دوں گا۔“

سید نور کے بارے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ ان کا ایک اپنا انداز ہے۔ جب کن پوائنٹ پر ان سے پنجابی فلم بنانے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں پنجابی فلم بنائوں گا۔“

انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر اپنی جان بچانے کے لیے اپنے اصولوں کا خون نہیں بہایا۔ جیسی صاف ستھری اور با مقصد اردو فلمیں بناتے تھے ویسی ہی گھری اور ستھری پنجابی

قلم بنا کر معترضین کے منہ بند کر دیئے۔

جب کسی شخصیت کی حیثیت عوامی ہو جائے تو اسے اس کے چاہنے والے جہاں اس پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برساتے ہیں وہاں تیز و تند الزامات کے تیر بھی چلا تے ہیں۔ ان پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ شان اور خصوصاً صائمہ کے بغیر قلم نہیں بنا سکتے۔

اس سلسلے میں شاہ جی نے اپنی صفائی یوں پیش کی۔
 ”شان اور صائمہ پاکستانی قلم انڈسٹری کے بڑے اشارز ہیں۔ اس کا اعزازہ اس بات سے بھی لگائیں کہ آج بھی کسی عوامی مقام پر ان دونوں اشارز کو کھڑا کر دیں۔ آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ شہرت اور مقبولیت کیا ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شان اور صائمہ کی مقبولیت کم ہو چکی ہے تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ گزشتہ دو برسوں میں کراچی میں بنائے گئے کئی ٹی وی ڈراموں میں صائمہ نے مرکزی کردار ادا کیے۔ جن میں انہیں بے حد پسند کیا گیا اور ان ڈراموں کی ریٹنگ نمبروں رہی۔ آج کل بھی اے آر وائی پر صائمہ کا ڈراما سپر ہٹ ہے۔ ٹی وی کمرشل کے لیے بھی وہ موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ حال ہی میں ہم نے ترک کا کمرشل کیا جس کا ہم دونوں کو ریکارڈ محاذ مضبوط کیا گیا۔ اسی طرح شان آج بھی کارپوریٹ سیکٹر کی پہلی چوائس اور فلموں کی ضرورت ہے لیکن اس کا اپنا مزاج ہے وہ جس کے مطابق کام کرتا ہے لیکن مقبولیت میں اب بھی نمبروں ہے۔

بے شک یہ دونوں سپر اشارز ہیں مگر مجھ پر یہ الزام درست نہیں کہ میں ان کے سہارے اپنی فلموں کو کامیاب کراتا ہوں۔ ان کے بغیر قلم نہیں بناتا اگر ایسی بات ہوتی تو میری تازہ ترین رومانوی فلم ”چھین آئے نہ“ میں یہی دونوں رومانوی ہیرو ہوتے لیکن اس قلم میں ان کی بجائے میں نے نئے اور ابھرتے ہوئے اداکاروں اور اداکاروں کو کاسٹ کیا۔

میں ہمیشہ کہانی کی ڈیمانڈ کو پیش نظر رکھ کر کاسٹنگ کرتا ہوں۔ جہاں شان یا صائمہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کو کاسٹ کرتا ہوں۔ جہاں ان کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں نہیں لیتا۔ میری اس نئی فلم ”چھین آئے نہ“ کی کہانی میں ایک بیک لڑکی اور لڑکا درکار تھے جو اپنی پہلی محبت شروع کرتے ہیں اس لیے ان کرداروں میں صائمہ اور شان کی جگہ نہیں بنتی تھی۔ جب کہ فلم کے دیگر کردار بھی ان کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اس لیے زبردستی انہیں کاسٹ نہیں کیا

سید نور

پہلی فلمی کہانی..... سوسائٹی گرل
 پہلی بطور اداکار قلم..... جدائی (پنجابی)
 پہلی بطور ہدایت کار قلم..... قسم
 پہلی بطور فلساذ قلم..... تسلیم

پہلی پنجابی قلم بطور ہدایت کار..... چوڑیاں
 بطور اسٹریپٹسٹ پنجابی قلم..... دو بے چلو

پہلی قلم بطور مصنف و مکالمہ نگار..... سوہراتے جوانی

سید نور کی کہانی کا بھارتی چرہ بہ

سید نور کی یادگار پنجابی قلم ”سوہراتے جوانی“ کو بھارت میں ”بہنی مون“ کے نام سے بنایا گیا۔ ممتاز اور علی اعجاز نے جو کردار کیے تھے وہ رشی کپور اور ایک نئی بہن ورن سے کردائے گئے۔ مگر ”بہنی مون“ کو سوہراتے جوانی جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ سوہراتے جوانی کی کہانی سید نور کی تحریر کردہ تھی جبکہ اس کے ہدایت کار حیدر چوہدری تھے موسیقی طاغوثی تھی۔ اس کی کاسٹ میں مستانہ علی اعجاز، نضا، تہنا، شجاعت ہاشمی اور وردانہ رحمن شامل تھے۔ یہ عمل کامیڈی قلم تھی۔

سید نور کی تحریر کردہ دوسری قلم جس کا بھارت میں کامیاب چرہ بہ بنایا گیا وہ پنجابی قلم ”جدائی“ تھی۔ بھارت میں اسی کہانی کو ”باغبان“ کے نام سے فلمایا گیا جس میں ایسا تھ بچن اور بیہمانی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ ”جدائی“ 1986ء کی فلم ہے۔ جس میں رائی نازلی، نضا اور سید نور نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

سید نور کے دادا استاد

سید نور نے ہدایت کاری کے اسرار ر موز تا مور ہدایت کار ایس سلیمان سے حاصل کیں۔ انہوں نے کئی برسوں تک ایس سلیمان کے اسٹنٹ کے طور پر کام کیا جبکہ ایس سلیمان نے اپنا ابتدائی زمانہ لیمڈ ڈانسر کٹر انور کمال پاشا کی شاگردی میں گزارا تھا۔ یہ پاشا صاحب ہی تھے جنہوں نے ایس سلیمان کو ہدایت کاری سکھائی۔ اس طرح سید نور انور کمال پاشا کو اپنا دادا استاد قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری استادی کا سلسلہ محترم و کرم انور کمال پاشا سے جا ملتا ہے۔

جاسکتا تھا۔“

انہی دنوں کی بات ہے۔ میرے ایک صحافی دوست نے ان سے کہا۔ ”شاہ جی! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب لاہور کے پروڈیوسرز ڈائریکٹرز فلمیں نہیں بنا سکتے کراچی والے زیادہ بہتر کام کر رہے ہیں۔“

شاہ جی نے برملا کہا۔ ”یہ سب بکواس ہے۔ کوئی لاہور اور کراچی والی بات نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب فلم انڈسٹری لاہور میں تھی لیکن کراچی کے فنکار، فلم ساز، ہدایت کار، تدوین کار اور دیگر ٹیلنٹسٹو نے لاہور آکر اپنا نام اور مقام بنایا۔ مل جل کر فلم انڈسٹری کو 60 برسوں تک چلایا۔ دراصل ہماری فلم انڈسٹری نہیں بلکہ سینما انڈسٹری زوال پذیر ہوئی۔ پھر پاکستان میں جیسے ہی سینما انڈسٹری نے ترقی کی ویسے ہی عوام کا مزاج بھی تبدیل ہوا۔ انڈسٹری ہمارے سنگل اسکرین سینماؤں کی دگرگوں حالت کی وجہ سے برباد ہوئی۔ ان کا حال آج بھی برا ہے۔ اسکرینز پرانی ہیں، کینٹین غیر معیاری، ہاتھ روم، سیٹیں اور بہت کچھ نامناسب ہے۔ اصل میں سینما فیل ہوا تھا فلم نہیں۔ عوام کا مزاج اب بدل چکا ہے۔ وہ معیاری سینماؤں میں فلم دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لاہور ہو یا کراچی اچھا سینما وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو لوگ لاہور اور کراچی کی باتیں کرتے ہیں وہ فلم ”جھن آئے نہ“ سینما گھروں میں آکر دیکھیں۔ انہیں اپنی بات کا جواب مل جائے گا۔“

ذرا پہلے اداکارہ صائمہ کا ذکر خیر ہوا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے اس فنکارہ کا کچھ ذکر آفاک ہو جائے اور شاہ جی کے حوالے سے ہی ہو۔ یہ بات تو اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ یہ موصوفہ صائمہ سے صائمہ نور بن چکی ہیں اور یہ خوشگوار ”وقوعہ“ رخسانہ نور کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش نہیں آیا، ان کی موجودگی میں روئنا ہوا۔

رخسانہ نور ایک طویل عرصہ تک اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھیں۔ وہ دنیا میں خود کو خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ انہوں نے جسے چاہا اسے حاصل بھی کر لیا۔

پھر ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے محبوب شوہر نے اپنی فلموں کی فلوٹ ہیر دن سے خفیہ طور پر شادی کر لی ہے۔ ایسی شادیاں زیادہ دنوں تک خفیہ نہیں رہتیں۔ ایک دن اس کا بھانڈا پھوٹ گیا اور سید نور کو باضابطہ

اعلان کرنا پڑا کہ انہوں نے واقعی صائمہ سے شادی کر لی ہے۔

رخسانہ نور ایک دیدہ ور صحافی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قلم نگری کے مردوں کی یہ پرانی ریت ہے کہ وہ فلموں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ خوشگوار محلات گزرتا اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں بھی وہ زیادہ خوش فہم نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قلم سازی اور ہدایت کاری کی محکمان اتارنے کے لیے وہ ایسی تفریح کا سہارا لے لیتے ہوں گے مگر انہیں اس بات کا ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی فلموں کی ہیر دن کو اپنی حقیقی ہیر دن بنالیں گے۔

رخسانہ نور کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکیں۔ اس سانحے نے ناسور کی صورت میں انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔

صائمہ بے شک ایک اچھی اور باصلاحیت اداکارہ ہے۔ اسے ہر اشارہ بنانے میں بلاشبہ سید نور کا بڑا کردار ہے مگر رخسانہ نور بھی کوئی گئی کزری شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ وہ ایک شاعرہ تھی ایک ادیبہ تھی ایک صحافی تھی اور پھر سید نور کی شریک حیات بننے کے بعد اس نے قلم انڈسٹری میں بھی بطور کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ سید نور کی ایک باوقار بیوی تھیں۔ ایسی بیوی کے ساتھ اس کے شوہر کا ایسا سلوک حقیقتاً بڑا تکلیف دہ تھا۔ کوئی بھی بے پناہ چاہنے والی بیوی اپنے شوہر کی ایسی بے وفائی برداشت نہیں کر سکتی۔

یہ کہنا کافی نہیں کہ شاہ جی بھی ایک انسان ہیں اور انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ ان سے بھی یہ غلطی ہو گئی۔ لیکن نہیں سید نور کوئی عام آدمی نہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اچھی سوجھ بوجھ کے مالک اور ایک دانادینا دانشور ہیں۔ انہیں ایسی انمول بیوی، اس قدر چاہنے والی جیون ساتھی جس نے ان کے لیے اور ان کے بچوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس پرسون کا ایم لا کر بلاسٹ کر دیا۔ یہ غلطی معافی کے قابل نہیں۔

قلم والے اپنی ساتھی اداکاراؤں کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا بری بات نہیں۔ نذیر نے سورن لٹا سے شادی کی۔ سنتوش کمار نے صبیحہ خانم سے، درپن نے نیر سلطانہ سے، ایس سلیمان نے پنا (زریں) سے، محمد علی نے زیبا سے شادی کی مگر ان شادیوں سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ سید نور اگر رخسانہ نور سے پہلے کسی اداکارہ سے شادی

سید نور کی پنجابی فلمیں

سید نور کی وجہ شہرت ان کی ہدایت کاری میں بننے والی منفرد فلمیں ہیں۔ مگر کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انہوں نے بے شمار فلمی کہانیاں بھی تحریر کی ہیں جن میں پنجابی فلموں کی تعداد خاصی ہے۔ فلسازی اور ہدایت کاری شروع کرنے کے بعد انہوں نے قومی زبان کی ہی فلمیں بنائیں تو کچھ لوگوں نے انہیں پنجابیوں کا دشمن سمجھ کر انہیں گن پوائنٹ پر پنجابی فلمیں بنانے پر مجبور کیا۔ ان کو غالباً اس بات کی خبر نہیں تھی کہ جیسے وہ پنجابی فلموں کا دشمن قرار دے رہے ہیں اس نے کتنی ہی کامیاب پنجابی فلموں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ سوہراتے جوانی (1980ء) مفت پر (1981ء) پوشی (1981ء) چاچا بھتیجا (1981ء) دوہنی دا سوال اے (1982ء) راکھا (1983ء) دادا استاد (1989ء) کالیا (1984ء) چور چوکیدار (1984ء) جمن دشمن (1985ء) جدائی (1986ء) شیر بہادر (1987ء) قلم دا طوفان (1986ء) فقیر یا (1987ء) شیر باز خان (1988ء) گوری دیاں جھانجھراں (1990ء) جنگ امی جن (1990ء) محلہ جٹ (1990ء) خاندانی بد معاش (1990ء) چورال دی رانی (1990ء) سائران (1990ء) جیلر (1990ء) بڈھا سمجھ (2003ء) دوہنی لے کے جانی اے (2010ء) جگنی (2011ء) شریکا (2012ء)

عروج تک پہنچا ہے۔ اپنی متعدد اچھیائیوں کی وجہ سے یہ فلم پاکستانی فلموں کا مجموعہ کہلانے کی مستحق ہے۔ سید نور کی اپنی کامیاب فلموں میں بھی یہ ایک سپر کلاسک فلم کے طور پر نمایاں حیثیت کی حامل فلم ہے۔

”زبور“ کے فلم سازانیم شتیق بٹ ہیں جب کہ اس کی کاسٹ میں باہر علی، ریمیا، صاحب، جان ریو اور شاہد کلیدی کردار میں شامل ہیں۔ اس کی کچھ شوٹنگو ترکی اور استنبول میں بھی کی گئیں۔ شاہد جن کو صنف اول کے ہیرو میں شریکا جاتا تھا اس فلم میں اس نے مننی کردار ادا کیا تھا۔ ریمیا نے

کرتے یا رخسانہ نور کی وفات کے بعد تو ان کے چاہنے والوں کو اس بات کا دکھ نہیں ہوتا۔ بہر حال جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔

جہاں تک صائمہ کا تعلق ہے۔ اس کے جسم کی آب و تاب میں بھی اب پہلی ہی بات نہیں رہی ہے جس کی حدت سے شاہ جی پھل کر موم ہو گئے تھے۔ اب فلموں میں بھی اس کی وہ مانگ نہیں رہی ہے۔ شاہ جی خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اب بی وی ڈراموں اور کرکشل ہی میں ان کی منجائش رہ رہی ہے۔

یہ میرے جذبات و احساسات نہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شاہ جی کے چاہنے والوں اور پرستاروں کے محسوسات ہیں جو میں نے پیش کیے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں شاہ جی کو ان کے فنی محاسن کی وجہ سے بہت بڑا فنکار اور فلم میکر سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہماری فلم انڈسٹری کو بڑے فائدے پہنچے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھی ہم ان سے گراں قدر فائدے حاصل کریں گے۔ انہوں نے جو منفرد اور یادگار فلمیں بنائی ہیں وہ انہیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گی۔

یوں تو ان کے کریڈٹ میں متعدد کامیاب فلمیں ہیں مگر چوڑیاں، زیور، جیوا، ڈاکو رانی، گھونگھٹ، ہوائیں اور ڈکیت جیسی آل ٹائم سپر کلاس ان کی یادگار فلمیں ہیں۔

اس موقع پر میں ان کی معاشرتی فلم ”زیور“ کا خصوصی طور پر ذکر کر دوں گا۔ زیور ہمارے معاشرے کی عورتوں کی خاص کمزوری ہے۔ اس کو موضوع بنا کر سعادت حسن منٹو نے ایک یادگار کہانی ”جھکے“ لکھی تھی جس پر ”بدنام“ نامی فلم بھی بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے یہ مکالمے آج بھی ضرب الملح کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

کہاں سے آئے یہ جھکے؟

کون لایا تھا یہ جھکے؟

کس نے دیئے ہیں یہ جھکے؟

علاؤ الدین جو اس فلم میں ایک غریب تانگے والا ہے اپنی بیوی زمرہ کے کانوں میں جب سونے کے جھمکے دیکھتا ہے تو جذباتی ہو جاتا ہے۔

سید نور نے غالباً اسی فلم سے متاثر ہو کر ”زیور“ بنائی۔ جو خواتین کی زیور سے متعلق دلچسپی اور چاہت کو احاطہ کرتی ہے۔ سید نور نے فلم کے تقسیم کو کہانی، اداکاری اور ڈائریکشن کی اعلیٰ ترین خوبیوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ نکتہ و

قلم دیکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ صائمہ کا بھی کسی اردو قلم میں پہلا بھرپور کردار تھا۔ ”مکھوٹھ“ ریلیز ہوئی اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی پورے پاکستان میں سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس قلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی کا بھی اہم کردار تھا۔ کئی گانوں نے تو دھوم مچادی جن میں

☆ دیکھا جو چہرہ تیرا موسم بھی پیارا لگا۔ کانوں میں جھمکا تیرے ہم کو ستارا لگا۔

اور صائمہ پر پچھرا اترنے والی گیت۔
☆ گلوڑی کیسی جوانی ہے۔
عوامی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ اس قلم میں سید

نوری کی ہدایت کاری کا معیار بہت بلند تھا۔ اس قلم کو خواتین نے بھی بے حد پسند کیا۔ اس قلم کی اہم بات یہ ہے کہ اس قلم کی وجہ سے اداکار شان کوئی زندگی ملی۔ شاہجی نے ان سے وہ کام لیا کہ دوسرے ہدایت کار حیران رہ گئے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ کراچی سرکٹ میں شان کی فلمیں کوئی تقسیم کار لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا مگر اس قلم کے بعد وہ اس قدر معروف ہو گئے کہ ان کی لگا تار فلمیں آئیں۔ 12 جولائی 1996ء میں ریلیز ہونے والی اس کامیاب قلم کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ اس کے تقسیم کار ادارے شیر فلمز نے اسے اتار کر سگیتا کی نئی اردو قلم ”کھلوتا“ لگا دی جس سے ”مکھوٹھ“ گولڈن جوبلی سے محروم رہ گئی۔

اس قلم کی کاسٹ میں محسن حسن خان، رشم، ارباز خان، عنایب، صائمہ، شان اور سارہ خان شامل تھے۔ ارباز خان کو چاکلیٹی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو شاہجی کا ہی کارنامہ تھا۔

قلم بے شک ٹیم ورک ہے۔ بہت سے لوگوں کی کارکردگی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے مگر ہدایت کاری کی حیثیت فوج کے سپہ سالار جیسی ہوتی ہے۔ اس کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی وجہ سے فتح حاصل ہوتی ہے۔ سید نور بھی ایسے ہی ڈائریکٹر ہیں جو اپنی فلموں کی ایسی منصوبہ بندی کرتے ہیں جن کی کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ کس سے کس طرح کا کام لیتا چاہیے اس ہنرمیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ قلم میکنگ کے سلسلے میں ان کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست عظیم خداوندی ہے۔

”مکھم“ ان کی رنگین اردو قلم تھی جو ریلیز ہوئی تو اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ قلم ابتداء میں فحش کا شکار رہی۔ قلم ساز ایس بی حسین کی یہ رومانی قلم 1995ء

اس قلم میں اپنا کردار اس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ تمام ناقدین اور مبصرین نے اسے ان کی تمام فلموں سے زیادہ معیاری اور سپر کلاس قرار دیا ہے۔ ”زیور“ ہر لحاظ سے ایک ایسی قلم تھی جسے ریکارڈ کامیابی حاصل کرنی چاہیے تھی مگر اس کے قلم ساز اور تقسیم کار نے قلم کی نمائش سے پہلے جو اہم اور ضروری فریضہ انجام دینا چاہیے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ قلم چاہے جتنی بھی اچھی ہو، اس کی تشہیر بہت ضروری ہوتی ہے مگر اس پر نہ قلم ساز نے توجہ دی نہ تقسیم کار نے، قلم مکمل ہوتے ہی اس کی تشہیر کے بغیر جلد بازی میں اسے ریلیز کر دی۔ جس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ قلم دیکھنے والوں کو پتا ہی نہ چلا کہ قلم کب آئی اور کب گئی۔ اس طرح ایک سپر کلاس قلم باکس آفس پر سپر فلاپ قرار دے دی گئی۔ اس قلم کی تاریخ نمائش 6 مارچ 1998ء ہے۔

تشہیر یا پسندنی کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو سید نوری قلم ”ہوائیں“ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس قلم کے ٹریلر نے قلم کی نمائش سے بہت پہلے ملک بھر کے سینما گھروں میں چل کر دھوم مچادی اور عوام بڑی بے صبری سے اس قلم کا انتظار کرنے لگی اور جب نمائش پڑی ہوئی تو بہت پسند کی گئی۔ اس قلم کی کامیابی سے متاثر ہو کر بعد میں اسی کہانی پر ”یہ وعدہ رہا“ اور ”دی سسٹم“ بنائی گئی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ندم نے ”ہوائیں“ میں جو کردار ادا کیا تھا وہی کردار ان سے ”یہ وعدہ رہا“ اور ”دی سسٹم“ میں بھی کرایا گیا اور ان کا گیت اب بھی ”ہوائیں“ والا ہی رکھا گیا۔ مگر یہ دونوں فلمیں ”ہوائیں“ جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ سید نوری قلم میکنگ کا جو انداز ہے اس انداز میں دوسروں کے لیے قلم بنانا آسان نہیں۔ ”ہوائیں“ میں سید نوری کی ہدایت کاری فن کی بلند پوچھی۔ اگرچہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ”ہوائیں“ بھارتی قلم ”ارجن“ کی کہانی پر بنائی گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ یہ الزام کہاں تک درست ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں فلموں کی کہانیوں میں کچھ مماثلت ہو۔ ”ارجن“ ایک کامیاب قلم تھی۔ کامیابی کے لحاظ سے ”ہوائیں“ بھی یادگار قلم ہے۔

قلم ساز شہزاد رفیق کی میوزیکل اور رومانوی قلم ”مکھوٹھ“ کا شاندار ٹریلر بھی ”ہوائیں“ کے ساتھ پورے پاکستان میں ریلیز ہوا تھا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ خاص کر اس ٹریلر میں شان کی آخر میں جو انٹری تھی اس نے

”سرگم“ کی طرح سپر ہٹ ہوئی۔

”سرگم“ میں شاہ جی نے زیبا بختیار، مدنان، بی. ندیم، مہاراج کھکھ اور مصطفیٰ قریشی سے ایسا کام لیا کہ وہ اپنے کرداروں میں انگوٹھی کے جھکنے کی طرح فٹ نظر آئے۔

اس موقع پر یہ تلخ حقیقت بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ شاہ جی کے ساتھ ان کی اکثر فلموں کی نمائش کے وقت ناروا سلوک کیا گیا۔ سنگل اسکرین کے سینماؤں کے دور میں سینما گھروں کی کمیابی کی وجہ سے ان کی کئی فلمیں جو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بزنس کر رہی ہوتی تھیں، ان کے تقسیم کار انہیں اتار کر اپنی نئی فلم لگا دیتے تھے۔ جس سے طوفانی کامیابی حاصل کرنے والی فلم کو بڑیک لگ جاتا تھا۔ چند فلموں کی مثالی پیش کروں گا۔ رگین اردو فلم ”سگم“، فلم دیکھنے والے خواتین، حضرات بے حد ذوق و شوق سے دیکھ رہے تھے کہ اس نئے سیم کا رننے سے اتار کر جاوید شیخ کی نئی فلم ”میں پاس“ لگا دی۔ جسے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جبکہ سگم کی نمائش کے دوران اردو فلمیں کرم داتا۔ ڈریم گرل اور گھاس ریلیز ہوئیں مگر کوئی بھی سگم جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اس طرح سید صاحب کی فلم ”گھونگھٹ“ کے ساتھ بھی ظلم ہوا جب تقسیم کار حاجی شہر نے تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی فلم ”گھونگھٹ“ کو اتار کر سیکسٹا بیگم کی نئی فلم ”کھلونا“ لگا دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گھونگھٹ سے جب جی بھر کر کمالیہ، نئی فلم ”کھلونا“ لگاتے یا گھونگھٹ کی نمائش کو ڈسٹرب کئے بغیر نئے سینما ایجنج کرتے ”کھلونا“ ریلیز کرتے۔

یہی کچھ ”ہوائیں“ کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے تقسیم کار ادارے راشد اینڈ کو نے 47 ہفتے میں چلتی ہوئی فلم ”ہوائیں“ کو اتار کر نئی فلم ”چوروں کے گھر چور“ لگا دی جو فلاب ہو گئی۔ اس ادارے نے تین ہفتے کا بھی انتظار نہیں کیا کہ اس کی گولڈن جوبلی ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری فلم لگائیں۔

رونا محض سنگل اسکرین سینما مالکان کا نہیں، اب جبکہ ملٹی پلکس سینماؤں کا دور ہے تو کون سا پاکستانی فلموں کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟ شاہ جی کی نئی فلم ”چھین آئے نہ“ جو 2017 کی ایک یادگار فلمی فلم ہے۔ جسے اس کے تقسیم کار اور سینما مالکان نے توجہ نہ دے کر سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ ورنہ عوام نے تو اس فلم کو بے حد سراہا۔ لیکن مناسب شو نہ ملنا

میں شروع ہوئی مگر سسل لیٹ ہوئی چلی گئی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ پوں محسوس ہونے لگا کہ یہ فلم بھی مکمل نہیں ہوگی۔ اس دوران فلم ساز فرزند علی نے اسے حاصل کر کے نہ صرف اسے مکمل کر دیا بلکہ اس کی زبردست تشہیر بھی شروع کرادی۔ پھر جب یہ ریلیز ہوئی تو اس نے لاہور اور کراچی سرکٹ میں طوفانی کامیابی حاصل کی۔ امجد بوبلی کی موسیقی اور رخسانہ نور کے نغمات نے بھی سگم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرگم بادلوں میں

اور

دل توڑ کے نہ جا

نے دھوم مچا دی۔ باقی نغمات بھی بہت پسند کیے گئے۔ ”سگم“ میں شان کی اداکاری اے ون تھی۔ سید نور کی یادگار ہدایت کاری نے اس فلم کی اہمیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ خواتین نے بھی اس فلم میں خصوصی دلچسپی لے کر اس کی کامیابی کو چار چاند لگایا۔ سگم ہمیشہ اچھی اور کامیاب فلموں میں شمار ہوگی۔ آج بھی راہ چلتے ہوئے جب اس فلم کا کوئی گانا سنائی دیتا ہے تو قدم رک جاتے ہیں اور سید نور کی فنی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس فلم کی کاٹ میں شان، ریشم، شام، تنہا، آغا حاش اور اسلم شیخ شامل ہیں۔ اس کی تاریخ نمائش 4 جولائی 1997ء ہے۔

سید نور جنہیں عرف عام میں لوگ شاہ جی کہتے ہیں، ان کی ایک فلم ہے ”سرگم“ اس کے نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع موسیقی ہے۔ موسیقی جسے روح کی فدا قراردی گئی ہے اور کہا گیا ہے

سُر سے جس کو پیار نہیں

وہ مورکھ انسان نہیں

شاہ جی نے اس موضوع پر اتنی خوب صورت فلم بنائی ہے کہ اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اسے دیکھتے وقت قماشائیوں کے منہ سے ہر منظر پر واہ دا اگلتی ہے۔ فلم دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اسے دیکھتے وقت ہم اس میں ایسے کم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔ جب فلم ختم ہوتی ہے وہ ہم چونک کر گویا بیدار ہوتے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ جہاں جاؤ سرگم کے گانے بچ رہے ہوتے تھے۔ ریکارڈ تعداد میں اس کے آڈیو فروخت ہوئے۔

اس فلم ”سرگم“ کی کہانی پر بھارت کے نامور ہدایت کار رنجے لیلہ بھسالی نے ”ہم دل دے چکے سنم“ بنائی وہ بھی

اس فلم کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

”چین آئے نہ“ 11 اگست 2017 کو نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن کراچی سمیت ملک بھر کے مالکان خصوصاً ملٹی پلکس سینماؤں نے پاکستانی فلم کو مناسب ٹائم نہیں دیا۔ اور چنانچہ کچھ کسٹمرز مارننگ اور لاسٹ شوز دئے۔ حد تو یہ تھی کہ 14 اگست کے دن بھی بے حس ملٹی پلکس مالکان نے بھارتی فلم ”ٹائلٹ“ چلائی۔ کم از کم یوم آزادی کی عظمت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس دن پاکستانی فلمیں۔ ”چین آئے نہ“ اور ”جیوسراٹھا کے“ عوام کی کثیر تعداد نے سنگل اسکرین سینما کپری پر دیکھا اس دن کپری میں پورے دن چار شوز چلائے گئے۔ جن میں دو شوز ”چین آئے نہ“ اور دو شوز ”جیوسراٹھا کے“ کے تھے۔ اگر شوز کے ٹائم مناسب ہوتے تو یہ دونوں فلمیں بھر پور بزنس حاصل کرتیں۔

سید نور بلاشبہ پاکستان فلم انڈسٹری کی پہچان ہیں۔ کل بھی وہ معیاری اور منفرد فلمیں بناتے تھے اور آج بھی اعلیٰ معیار کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو ایک ذہن نیک مگر ثابت کر رہے ہیں۔ ان کے کریڈٹ پر بنائی فلمیں ان کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ”چین آئے نہ“ ڈائریکشن کے اعتبار سے ایک بڑی فلم ہے۔ جس کے ایک ایک سین پر محنت کی گئی ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں میں سوائے ندیم بیک، نیل قریشی، یاسر نواز اور دوجاہت رؤف کے کوئی بھی فلم بنانے کا فارمولہ سمجھ نہیں پایا۔ جس کی وجہ سے ڈراما ٹائپ فلم بنتی گئیں۔ ”چین آئے نہ“ ایک مکمل فلم لگتی ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم کی وی ڈراما نہیں واقعتاً فلم دیکھ رہے ہیں۔ سید صاحب نے ثابت کر دیا، مصوبہ خان جیسے نئے چہروں نے بھر پور کام لیتا ان ہی کا خاصا ہے۔ شاہ جی نے بطور ہدایت کار ان نئے تیلوں سے توقعات سے بڑھ کر کام لیا ہے۔ ندیم صاحب جیسے لیجنڈ کو فلم میں سرفہرست رکھا۔ جبکہ مصطفیٰ قریشی سے بھی خوب کام لیا۔ گالوں کی کچھ اڑیشن میں تو شاہ جی نے کمال کر دیا۔ فلم کی کہانی کو سننے انداز سے خوبصورت ٹریٹمنٹ دیا جس کی وجہ سے فلم مزید خوبصورت بن گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنگل میں مورنا چاکس نے دیکھا؟

یہاں تو بے چارے مور کو اپنا دل نشین رقص دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ کیا یہ سید نور جیسے لیجنڈ کے ساتھ ساتھ ہماری فلم انڈسٹری کے ساتھ فلم نہیں؟ یارو! اتنا تو پاکستانی بنو

کہ اپنے وطن عزیز کی مصنوعات کو پھولنے کا موقع دو۔ پاکستانی فلموں کی آبیاری کرو۔ بھارتی فلمیں ضرور دکھاؤ۔ لیکن اپنی حب الوطنی کا اتنا ثبوت دو کہ قومی فلموں کو بھی نمائش کا مناسب موقع فراہم کرو۔

سید نور جیسے لیجنڈ فلم میکر کی ایک ایسی فلم کو جان بوجھ کر شائقین تک نہ پہنچانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ ان پر ہی نہیں، پوری فلم انڈسٹری کے ساتھ زیادتی ہے۔ شاہ جی کی یہ فلم ”چین آئے نہ“ ایک مکمل فلم ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ فلم 90 سیما اور ماڈرن ایج کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس فلم میں وہ سب کچھ ہے جو ماڈرن سینما کے نام پر ہم دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

بہت سے تمناہیں کو یہ فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس فلم کے بارے میں خاص خاص باتیں بتاؤں۔

پاکستانی نژاد امریکی جاوید صدیقی اور نعیم ہارون ساکھیا ”چین آئے نہ“ کے پروڈیوسر ہیں جبکہ سید نور بھی اس فلم کے شریک قلمساز ہیں۔ اس کی کہانی مکالمے اور اسکرین پلے شاہ جی نے اپنے جاوڈی فلم سے خود لکھے ہیں۔

اس فلم کی کاسٹ میں سید نور نے اپنی روایات کے مطابق نئے ستاروں پر انحصار کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر افراد کا تعلق فلمی گھرانوں سے ہے۔ اس فلم کا ہیرو شہروز، سینئر اداکار بہروز سبزواری کے بیٹے ہیں۔ عادل مراد، وحید مراد کے، فرزند ارجمند ہیں۔ فلم کی ہیروئن حشر خان مصیہ خاتم اور ستوش کمار کی نواسی ہیں۔ دانش نواز، یاسر نواز کے پتر ہیں۔ فلم کے فوٹو گرافر عرفان مرزا لیجنڈ فوٹو گرافر کا مران مرزا کے بیٹے ہیں۔ نامور سنگر وارث بیک کے سنگر بیٹے عمار بیک نے بھی اس فلم میں گاکر اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہے۔

نئے اور ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کے ساتھ ساتھ شاہ جی نے اپنی اس فلم میں سینئر، پختہ کار اور نامور فنکاروں کو بھی پیش کیا ہے۔ ندیم، مصطفیٰ قریشی، بہروز سبزواری، عتیقہ اوڈھو کو کہانی کے اہم کرداروں میں پیش کیا ہے۔ ندیم صاحب نے فلم میں ہیروئن کے باپ کا کردار کیا ہے۔ عتیقہ اوڈھو ایک خاتون سیاستدان ہیروئن کی والدہ ماجدہ کے طور پر نظر آتی ہیں۔ مصطفیٰ قریشی نے فلم کے ولن کے باپ اور ایک وڈیرے چانڈیو کے روپ میں بڑا جاندار کردار ادا کیا ہے۔

دوسرے فلمسازوں اور ہدایت کاروں

کے لیے لکھی فلمیں جو بہت مشہور ہوئیں

سوسائٹی گرل۔ عشق عشق۔ لاڈ پیار بیٹی۔ مس ہانگ کاٹک۔ نہیں ابھی نہیں۔ سنگدل۔ آہٹ۔ دبلیئر۔ بونی۔ لازوال۔ ہم سے ہے زمانہ۔ مس سنگاپور۔ زنجیر۔ ایک ہی راستہ۔ خیلا کے جانا۔ بارود کی چھاؤں میں۔ بلندی۔ قیامت کے بعد۔ مشکل۔ لاکھوں میں ایک۔ اف۔ یہ بیویاں۔ لیڈی اسکالر۔

بطور اسکرپٹ رائٹر

سید نور کی لکھی ہوئی پہلی فلمی کہانی ”سوسائٹی گرل“ 1976ء میں تحریر کی گئی۔ اس کہانی پر بننے والی فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے تو سلسلہ ایسا چل نکلا کہ تقریباً سب بڑے ہدایت کاروں نے ان سے کہانیاں لکھوائیں۔ 1992ء تک وہ 200 فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکے تھے۔ جن کی تعداد ادب سواچار سوسے زیادہ ہو چکی ہے۔

بہترین اسکرپٹ رائٹنگ پر انہیں بے شمار ایوارڈز مل چکے ہیں۔ جن میں نیشنل فلم ایوارڈز، نگار ایوارڈز کے علاوہ متعدد دیگر ایوارڈز بھی ہیں۔

سید نور کے پرستاروں کی انجمن

ادا کاروں کے فین کلب تو ہوتے ہیں تقریباً تمام ہی بڑے فنکاروں کے پرستاروں نے مختلف ناموں سے فین کلب بنائے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض فنکاروں کی موت کے بعد بھی ان کے چاہنے والے ان سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ جیسے حیدر امرو، محمد علی اور سلطان راہی وغیرہ۔ مگر کسی ہدایت کار کے نام پر پہلی بار سید نور کے پرستاروں نے آل پاکستان لورڈز آف سید نور فین کلب بنارکھا ہے۔ جس کے بانی اور چیئرمین محمد خان اعوان ہیں۔ جبکہ وائس چیئرمین اداکار اجمی خان ہیں۔ عبدالسلام صدر اور بلال خان جنرل سیکریٹری ہیں۔ تہواروں کے موقع پر فلمی اخباروں میں اپنے کلب کا اشتہار چھپواتے ہیں۔



جین آئے نہ کی کہانی رومانی اور ڈرامائی مناظر سے مہر پر ہے۔ کبھی رومانی فلم میں موسیقی ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی ہے۔ اس فلم کا میوزک سن کر احساس ہوتا ہے کہ ایک بار پھر پلے بیک سٹوٹس کا ٹریڈ ان ہونے جا رہا ہے۔ سید نور کے اس میوزیکل رومیٹک فلم کا میوزک ایم ارشد نے دیا ہے۔ جو اس سے پہلے بھی سید نور کے ساتھ بے شمار ہنس دے چکے ہیں۔ ایم ارشد نامور موسیقار ایم اشرف کے صاحبزادے ہیں۔ اس فلم کے پلے بیک میں راحت فتح علی خان، وارث بیک، عماد بیک، مینا خان، اور ڈی جے غنی نے اپنی آوازوں کا جادو جگایا ہے۔ اس فلم کے راحت فتح علی خان کی آوازیں دوسوٹ سوٹس فلم کی ریلیز سے قبل ہی میوزک چارٹس پر دھوم مچا چکے تھے۔ راحت فتح علی خان نے اس فلم کے لیے

”ہونا تھا پیار ہو گیا“۔ ”میری وفا میرے وعدے پر اعتبار کرو“

جیسے میلوڈی گیت گائے ہیں۔

شاہجی نے اس فلم کا پوسٹ پروڈکشن ورک بنکاک سے کرایا ہے۔ ٹرائی ایگل لوائسٹوری میں وہ سب کچھ ہے جن کی آپ سید نور سے توقع کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ ناپسندیدہ رواج ہے۔ چاہے جتنی بھی اچھی فلم ہو، اسے جلدی اتار دی جاتی ہے۔ اس کا مستقبل توڑ دیتا ہے۔ چاہے جتنی بھی اچھی فلم ہو ہمیشہ کے لیے اس پر فلاپ کی چھاپ لگ جاتی ہے۔

”جین آئے نہ“ کے ساتھ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ اس سے ان کے چاہنے والوں کو بھی بہت دکھ، بہت صدمہ ہوا۔ مگر شاہجی فولادی اعصاب کے مالک ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ آنے والے دنوں کے حوالے سے بہت پر امید اور پر عزم رہے اور ”آئینہ نو“ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

نئے اشارز جنہیں اس فلم میں پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔ سید صاحب ان کی مایوسیوں کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش میں رہے۔

”آج کل اکثر فلمساز اپنی فلموں کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ندیم صاحب کو کاسٹ کرتے ہیں۔ کیا آپ نے بھی“

سوال کرتے صحافی کی قطع کلامی کرتے ہوئے شاہجی نے کہا تھا۔ ”نہیں..... میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ندیم

صاحب کو محض خانہ پری کے لیے نہیں بلکہ کہانی کی ڈیماٹھ کے عین مطابق کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں ان کا کردار ایک سیاست داں بیوی کے شوہر کا جو اپنے ارد گرد ہونے والے حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر اور اپنی عزت اور وقار کی خاطر خاموش بھی ہے۔ لیکن فلم کے اختتام پر وہ اپنی بھرپور قارم میں نظر آئے۔“

اپنی اس فلم کی موسیقی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ”ہر کامیاب فلم میں اس کے نعمات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اچھا اور معیاری میوزک فلم کی جان ہوتا ہے۔ جسے سن کر اور دیکھ کر عوام انجوائے کرتے ہیں۔ میری سابقہ فلمیں میوزک کے اعتبار سے بھی سپر ہٹ تھیں۔ جن میں جیوا۔ گھونگٹ۔ سرگم۔ دیوانے تیرے پیار کے وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان فلموں کی میوزک نے فلموں کو چار چاند لگا دیے۔ جنہیں عوام آج بھی یاد کرتے ہیں۔ میری فلم ”چھین آئے نہ“ بھی ایک مکمل اور بھرپور میوزیکل فلم۔ جس میں 7 گانے تھے۔ ہر گانا ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہے۔ جبکہ ان تمام کی پیکجائزیشن بھی لا جواب ہے۔ انہیں گانے والے گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے انہیں شاہکار بنادیا ہے۔“

ایک فلم پر اس کے تخلیقی کارکس قدر محنت کرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک شعبہ پر کس قدر توجہ دیتے ہیں۔ ایک ایک فریم کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا کیا جن نہیں کرتے۔ مگر انفس صد انفس کہ کچھ لوگ محض اپنے تھوڑے سے ذاتی مفاد کی خاطر فلم میکر کی ساری محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ”چھین آئے نہ“ اس فلم کا ایک اداکار خصوصی طور پر

قابل ذکر ہے۔ یہ لیجنڈ فنکار وحید مراد کا فرزند ارجمند ہے۔ اگرچہ عادل مراد بحیثیت پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ایکٹر متعدد ٹی وی ڈراموں اور سوپ کرتا رہا اور شو بزم میں اپنے والد کے حوالے سے ہٹ کر بھی اپنی فی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ مگر کسی فلم کے لیے اسے کاسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ کراچی میں جہاں اس کی رہائش ہے، اب خاصی فلمیں بن رہی ہیں جن میں ٹی وی آرٹسٹوں کو بھی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ سید نور نے اسے پہلی بار اپنی فلم میں بطور اداکار شامل کیا۔ جنوری 2016ء میں شاہ جی کراچی آئے تو عادل مراد کو بلا کر کہا۔

میں ایک رومانٹک اور میوزیکل فلم بنانا ہوں اور تمہیں ایک خاص رول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ عادل مراد نے ہاں یا نہ کہنے سے پہلے کہا۔ ”مجھے اس فلم کی کہانی سنا لے اور اس

میں میرا کیا کردار ہے بتائیے۔“ شاہ جی نے اقتصار کے ساتھ کہانی سنائی اور کہا۔ ”تمہارا کردار ایک وڈیرے کے بڑے ہوئے بیٹے کا ہے جو U.K سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور دولت کے نشے میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔“

عادل مراد سوچنے لگا یہ کردار بہت مشکل ہے۔ کیا میں کرسکوں گا؟ پھر بھی اس نے ہابی بھری تو اس کی توقعات کے مطابق شاہ جی نے اس کردار کی ڈیماٹھ کے مطابق اسے بنانا سنا کر کہہ کرے کے سامنے پیش کیا۔ اس کے لیے جس گاڑی کا بندوبست کیا وہ RANQUE ROVER تھی۔ اس کا شاہانہ لباس معروف ڈیزائنر امیر عدنان سے تیار کروایا۔ اس کی جیاشی کے لیے ایک قارم ہاؤس کا بھی انتظام کیا۔

چونکہ یہ لیجنڈر تیس زادہ سگار کا بھی شوقین ہے لہذا اس کے لیے سگار پورے خاص طور پر سگار ... منگوائے۔ ایک حقیقت پسند ڈائریکٹر ہونے کے ناتے سید صاحب نے اس کردار کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرنے کے لیے تمام سہولتیں مہیا کیں۔ تاکہ ہر زاویے سے وہ ایک سیاست دان وڈیرے کا بڑا ہوا بیٹا نظر آئے۔ یہ سب کچھ اس کردار کی ہابی لائسنس ہیں۔ عادل مراد بطور اداکار ایک باصلاحیت آرٹسٹ ہے۔ سید نور نے اس کی اس صلاحیت کو بھرپور طور پر اجاگر کیا اور اس سے جس طرح چاہتے تھے، اسی طرح ہر قارم کروایا۔ فلم مکمل ہوئی تو اس کی اداکاری سے جہاں وہ مطمئن تھے وہاں سینئر فنکاروں نے بھی اس کی تعریف کی۔

وحید مراد کے کچھ پرستاروں نے اس سے شکایت کیا۔ ”وحید مراد جیسے سپر ہیرو کے صاحبزادے کو فنی کردار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ آپ اپنے والد کے نقش قدم پر چلیں۔“

عادل مراد نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ اگر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا ہوں تو شاید میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ میں زندگی بھر اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

یہ سب باتیں بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ہدایت کار سید نور نے جب فلم کے ایک ولن کے کردار پر اتنی محنت کی تو فلم کے ہیرو، ہیروئن اور دیگر اہم کرداروں کو زندگی سے قریب دکھانے کے لیے کیا کیا جن کیے ہوں گے۔ کتنی

مصلوں سے گزرے ہوں گے؟ کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ وہ ہزار ہی ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ جس فلم میں انہوں نے اتنی جان ماری کی اس کا انہیں صلہ نہیں ملا۔ اس کے باوجود دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ وہ پُر عزم رہے۔ ان کے اعصاب پر اس بات کا اثر نہیں۔ اپنے باڈی لینگویج سے وہ اپنے ولادی اعصاب کا جتنا بھی اظہار کریں، میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ انہیں ان کی محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ نہیں۔ وہ اندر سے بہت دکھی ہیں۔

میں نے اپنے اس خیال کا ذکر جب اپنے ایک صحافی دوست سے کیا تو اس نے بھی میری بات سے اتفاق کیا۔ ”یقیناً شاہ جی کو اس بات کا دکھ ہے، اور ہونا چاہیے، یہ ایک فطری عمل ہے۔ جب کسی کو اس کی محنت کا ثمر نہیں ملتا تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ صدمہ ہوتا ہے۔“ پھر ذرا رک کر دوست نے کہا۔ ”یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کو اپنا دکھ درد تو محسوس ہوتا ہے۔ مگر وہ دوسروں کے دکھوں کو دکھ نہیں سمجھتے۔ انہیں دکھ میں دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا، ملال نہیں ہوتا۔“

میں نے دوست سے کہا۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میرے صحافی دوست نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اعزازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر خود بھی دکھی ہے۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”شاہ جی کو اس دکھ کی سولی پر تو لٹکانا ہی تھا۔ انہوں نے دوسرے کو دکھ دیتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا مکافات عمل بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی وہ خود بھی قحطی اور ذہنی طور پر دکھوں کے صلیب پر مصلوب کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ ہر ایک کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے۔“ ”یاریا تم اتنی باتیں کہہ گئے۔ مگر ہنوز میری ناقص عقل میں کچھ نہیں آیا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

وہ جو بالکل سنجیدہ تھا۔ ”تم شاید بھول گئے کہ شاہ جی نے رخسانہ نور کو ایک بڑا دکھ دیتے وقت یہ یاد نہیں رکھا تھا کہ انہوں نے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا تھا۔ جو وہ اس وقت بھول گئے جب اس نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیا۔ ان پر اور ان کے بچوں پر اپنی پوری زندگی وادوی“

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرا صحافی دوست کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے خاموش اور سوچنا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو یہ لو اسے

پڑھو..... اس نے ایک اہل کام اور اہل علم بڑھایا۔ اخبار کی پیشانی پر 31 جولائی 2007 کی تاریخ تھی۔ اس صفحہ پر ”شاہ جی کی مرید بی بی بن کر جیوں گی۔“ کی سرٹلی سے ایک انٹرویو لگا تھا۔

سید نور سے شادی کے اقرار پر صائمہ کا پہلا انٹرویو تھا اگرچہ میں صائمہ سے شادی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا جس کا اظہار میں اس تحریر میں بھی کر چکا ہوں۔ مگر چونکہ یہ صائمہ نور کا انٹرویو تھا جو پہلی بار اس نے اس شادی کے بعد دیا تھا۔ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

”رات کے آٹھ بجے کے قریب میں جب ماڈل ٹاؤن میں صائمہ کے گھر پہنچا تو ان کی چھوٹی بہن روبینہ نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈرائنگ روم میں سرخ و سفید صائمہ کالے رنگ کی شلوار قمیض میں بڑی پُر وقار دکھائی دے رہی تھیں۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے کہا۔

”ہر عورت کا خواب ایک گھر اور پیار کرنے والا شوہر ہے۔ میں اب اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں لہذا فیصلہ کیا ہے کہ شاہ جی (سید نور) سے اپنے رشتے کو دنیا سے نہیں چھپاؤں گی۔“

”شوہر سے وابستہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ دونوں کی شادی بہت سال پہلے ہو گئی تھی۔“ اس سوال کے جواب میں صائمہ نے کہا۔

”یہ درست نہیں ہے۔ شادی ہونے دو سال قبل 24 جولائی 2005ء کو سادگی سے ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”عاجن“ کی شوٹنگ جاری تھی۔ اس شادی کو پوشیدہ اپنی پروفیشنل مجبوریوں کے باعث رکھا۔ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ شاید ہمارے پرستار اور فلسفہ کو ہمارا یہ رشتہ اچھا نہ لگے۔ ہمارے ہاں یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ شادی شدہ ہیروئن کی مقبولیت کم ہو جاتی ہے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ یہ سوچا کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ماضی میں زیبا محمد علی، صبیحہ ستوتوس اور اب بھارت میں ایثور یا اور ابھیچک کو بھی اچھی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے میرے پرستاروں کو میری شادی کی بھی خوشی ہوگی اور وہ ہم دونوں کے لیے دعا بھی کریں گے۔“

”صائمہ! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ سید نور پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے“ صحافی نے کہا۔

”خدا کیا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل اس وقت میں اس کے جذبات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں تک میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ بولا۔

”صائمہ جی نے کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا میں دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ اور میں دوسری بن کر رہوں گی۔

بے شک، ایک شوہر کی ایک سے زیادہ بیویاں بھی ہوتی ہیں اور وہ ایک ساتھ بھی رہتی ہیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب شوہر پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کر کے دوسری یا تیسری شادیاں کرتا ہے۔ صائمہ جی بی بی نے تو ان کے بقول

پونے دو سال تک شاہ جی کی دوسری بیوی ہونے کی خبر پوشیدہ رکھی۔ اس میں سید صاحب بھی برابر کے حصے دار ہیں۔ میں رخسانہ نور کا نہ پرستار ہوں نہ ان کا کوئی عزیز

رشتے دار۔ میں تو ایک نیوٹرل جرنلسٹ ہوں۔ جو دیکھتا ہوں۔ جو محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح شاہ جی کی فنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا معترف

ہوں۔ لیکن ان کی صائمہ سے خفیہ شادی کے اقدام کو غلط سمجھتا ہوں۔ جب دوسروں کے ساتھ رخسانہ نور کو بھی شادی کا پتا چلا تو ان پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا اس کا نتیجہ کینسر اور اس کا

انجام موت رہا۔ رخسانہ نور، کوئی عام خاتون نہیں۔ وہ ایک حساس دل و دماغ رکھنے والی شاعرہ تھیں، ادیبہ تھیں، صحافی تھیں۔ انہوں نے اپنے اس دکھ کا ڈھنڈورا نہیں بپایا۔ کوئی

پریس کانفرنس کر کے دکھ دینے والوں کے خلاف کوئی احتجاج ریکارڈ نہیں کرایا۔ خاموشی کے ساتھ اس صدمے سے بھرا۔۔۔ پڑیں اور خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے سدھار

گئیں۔“

یہ تو تھا صائمہ جی کا ایک پرانا انٹرویو کا قصہ جو انہوں نے 2007ء میں صائمہ نور بننے کے بعد دیا تھا۔ اب دس سال بعد 2017ء میں اس دوہتیوں کے جوڑے کا تازہ ترین انٹرویو، یا گپ شب جو دونوں نے ایک ساتھ اپنے

کچھ پرستاروں کے ساتھ کیس۔ یہ انٹرویو یا بات چیت لاہور میں صائمہ نور کی نئی رہائش گاہ میں ہوئی جو شاہ جی نے انہیں بنا کر دیا تھا۔ وہاں ہونے والی باتوں کا بھی خاص خاص حصہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

اپنی حالیہ ریلیز شدہ فلم ”چمن آئے نہ“ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔

صائمہ پوری سچائی سے بولیں۔ ”سید نور اور رخسانہ کے بچے میرے بھی ہیں۔ خدا مجھے تو یقین دے گا۔ میں اپنے بچوں کو ان کی ماں بن کر ان کا خیال رکھوں گی۔ میں اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کروں گی۔ اور اپنے بیٹے

عل شاہ کے سر پر سہرا بھی سجاؤں گی۔ میں ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ میں دوسری بن کر رہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے

صائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو اس نے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے شاہ جی کی سرمدی بن کر جینا چاہتی ہوں۔ خدا را اجازت دے میں بھی زندگی جی لوں۔“

اس سے پہلے کہ صحافی کوئی دوسرا سوال کرتا صائمہ خود ہی بولیں۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ شاید میں اُمید سے ہوں اس لیے مجبوراً شادی کا اعلان کر رہی ہوں مگر فی الحال ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر

کر رہے ہیں۔

”آپ خود بھی بنا چاہتی ہیں؟“

”میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں کہ سید نور کے بچے میرے اپنے بچے ہیں۔ پھر میرے گھر میں بہنوں کے بہت سارے بچے ہیں۔ ہر وقت روتی گئی رہتی ہے۔ مگر میری خواہش ہے کہ میں خود بھی ایک بچے کو جنم دوں تاکہ اس

مرتبے پر فائز ہو سکوں جس پر صرف ایک ماں ہی ہوسکتی ہے۔“

سید نور اور صائمہ کی شادی کا باضابطہ اعلان ہدایت کار سعود بٹ کی فلم کے سیٹ پر کیا گیا۔ یہاں صرف اکیلی صائمہ تھیں۔ سید نور سے متعلق بتایا گیا کہ وہ کراچی میں ایک

نچی ٹی وی کے پروگرام میں شریک ہیں۔ مذکورہ انٹرویو کے دوران بھی سید نور موجود نہیں تھے۔ صائمہ نے اس انٹرویو کے دوران بتایا کہ شادی بے حد سادگی سے ہوئی جس میں

کسی فلمی شخصیت نے شرکت نہیں کی۔ اس موقع پر سید نور نے مجھے انگوٹھی اور میں نے انہیں کھڑی تھنڈے میں دی۔ حق مہر شرعی

رکھی گئی۔“

انٹرویو کے اختتام پر صائمہ بولیں۔ ”میں نے سید نور سے بچی محبت کی ہے۔ خوش نصیب ہوں کہ ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔“

میں نے اخبار خاموشی کے ساتھ دوست کی طرف بڑھایا۔ اخبار واپس لے کر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”شاہ جی کی دوسری خواہصورت پسند کا انٹرویو پڑھ کر تم نے کیا نتیجہ

رکھی گئی۔“

میں نے اخبار خاموشی کے ساتھ دوست کی طرف بڑھایا۔ اخبار واپس لے کر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”شاہ جی کی دوسری خواہصورت پسند کا انٹرویو پڑھ کر تم نے کیا نتیجہ

رکھی گئی۔“

میں نے اخبار خاموشی کے ساتھ دوست کی طرف بڑھایا۔ اخبار واپس لے کر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”شاہ جی کی دوسری خواہصورت پسند کا انٹرویو پڑھ کر تم نے کیا نتیجہ

اس فلم کی ریلیز سے ایک ہفتہ قبل ہی میں بنگاک سے پاکستان پہنچا تھا۔ اس فلم کے تقسیم کار کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اس کی ذرا بھی پبلیٹیٹی نہیں کی ہے۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ”آپ ٹی وی کے مارننگ شو میں اس کی پبلیٹیٹی کرلو۔ میری یہ فلم بہت اچھی تھی۔ جس نے بھی دیکھی تعریف کی۔ مگر کچھ ناقدین نے میری اس فلم کے خلاف اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ فلم بینوں کی اکثریت یہ فلم دیکھ ہی نہ سکی۔“

مجھے تعجب ہے اس کی گفتگو کے دوران شاہ جی نے مٹی پلکس سینما مالکان کے ناروا سلوک کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جبکہ ہمیں آئے نہ کی نمائش کے بعد انہوں نے مکمل کر لٹی پلکس سینما آئرز کے خلاف کہا تھا کہ انہوں نے میری اس فلم اور ”جیوسر اٹھا کے“ کو مناسب شوز نہیں دیے۔ صرف مارننگ شو یا آخری شوز دیے جبکہ 14 اگست کے دن بھی ہماری فلموں کی بجائے بھارتی فلم ”ٹائلٹ“ کی نمائش کی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اس موقع پر انہوں نے سنگل اسکرین سینما کیریئر کی تعریف کی تھی کہ کیریئر نے چودہ اگست کے دن چار شوز چلائے دو ”ہین آئے نہ“، ”دوروپ“، ”جیوسر اٹھا کے“، آگے بات کرتے ہوئے شاہ جی بولے۔ ”اس فلم کی

ناکامی سے میں حوصلہ نہیں ہارا ہوں۔ جب تک تن میں جان ہے فلم انڈسٹری کی خدمت کرتا رہوں گا۔ حالانکہ اس فلم سے مجھے مالی طور پر بہت نقصان ہوا ہے۔ میری بہت ساری زمینیں بک گئی ہیں۔ میں مالی طور پر بہت کراؤ میں آ گیا ہوں۔ لیکن فلم بنانے کا حوصلہ اور جرات میرے اندر اب بھی باقی ہے۔ میں انشاء اللہ ایک بار پھر ماضی کی طرح خوبصورت اور کامیاب فلمیں اپنے فلم بینوں کو دوں گا۔ شاہ جی کے اس بیان سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ فلم

(ہین آئے نہ) انہوں نے عمل طور پر اپنے سرمائے سے بنائی ہے۔ اگرچہ فلم کی تکمیل اور نمائش کے دوران یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے فلسازان کے دو دست جو پاکستانی نژاد امریکی ہیں۔ انہوں نے پروڈیوس کی ہے۔ ہاں کچھ سرمایہ انہوں نے بھی لگایا ہے اور وہ بھی شریک فلساز ہیں۔

اس سے پہلے کہ اس انٹرویو کی دیگر باتیں بتاؤں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اور جس گھر میں یادگار گفتگو ہوئی۔ اس عظیم الشان اور شاعرانہ گھر کے بارے میں بھی آپ کو معلومات فراہم کر دوں۔

سید نور صاحب نے ابھی حال ہی میں شہر سے کچھ

صائمہ

صائمہ نور نسلۂ پنهان ہیں۔ ان کی مادری زبان پشتو ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے پشتو فلموں میں قسمت آزمائی کی بجائے پنجابی فلموں کو ترجیح دی اور اداکارہ انجمن کے بعد سلطان راہی کے ساتھ ان کی ایسی جوڑی بنی کہ سلطان راہی کی حادثاتی موت کے بعد ایسا لگا کہ ان کا فلمی کیریئر ختم ہو گیا ہے مگر ایسے میں سید نور نے انہیں اردو فلم کھوکھٹ میں پیش کیا تو وہ اور فلموں کی بھی کامیاب اداکارہ بن گئیں۔

☆☆☆

ڈاکورانی

”ڈاکورانی“ کہنے کو تو ایک فلم ہے لیکن سمجھنے والوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس فلم کا موضوع استعمالی اور ظالم قوتوں کے خلاف کمزوروں کا ایک اعلان بغاوت ہے۔ فلم کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنے والی رانی کی کمزور آواز نے ڈاکورانی بن کر ظالموں کو کفر کر دار تک پہنچایا۔

یہ کہانی اس وقت تک دہرائی جائے گی جب تک ظالم اور مظلوم کا وجود باقی ہے۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو پھر ڈاکورانی جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے والی ہماری قوم خان، وڈیروں، چوہدریوں، سرداروں کے ظلم سے اب بھی آزاد نہ ہو پائی ہے۔ سید نور نے اس فلم کے لیے جس جرأت مندانہ موضوع کا انتخاب کیا وہ قابل تحسین ہے۔

☆☆☆

سید نور کا کارنامہ

سید نور فنکاروں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی اس خوبی کے تحت انہوں نے کئی نئے فنکار متعارف کرائے اور کچھ کو گہرے نایاب بنایا۔ جیسے شان، صائمہ، شاہ، بابر علی، رشیم، معمر رانا، اربانہ خان، سعود، عندلیب، محمد اسلم شیخ وغیرہ ایسے فنکار جن میں سے کسی کو متعارف کرایا تو کسی کو انمول کر دیا۔

پاکستان آ رہی ہیں میری خواہش ہے کہ ان کے سری لنکا سے پاکستان آنے پر ایک قلم ان کے ساتھ کروں۔ لہذا آپ جلد از جلد مجھے کوئی ریڈی میڈ اسکرپٹ بنادیں تو میں نے کہا۔
”اس وقت تو دلہیز ہی کے چرچے ہیں۔ آپ کو بھی لکھ دیتا ہوں اس پر نذر شباب بولے۔“ شاہ جی! دلہیز تو ابھی سیمناؤں میں چل رہی ہے۔ اس پر میں نے کہا۔

دلہیز کو ایسا نیا کرکھوں گا کہ کوئی کہہ نہیں سکے گا کہ یہ دلہیز والی کہانی ہے۔ یہی ہوا بہت کم لوگ جان سکے کہ دلہیز اور بوبی ایک ہی کہانی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ بوبی میں محمد علی کا کردار اور دیگر چیزوں نے بوبی کو ایک جداگانہ رنگ دے دیا تھا۔

محمد علی کے علاوہ نئے اداکاروں پر بھی میں نے خوب محنت کی میری ایک قلم ”ہم سے بے زمانہ“ اس میں شیوا والا کردار میں نے جاوید شیخ کے لیے لکھا تھا۔ اس قلم کا تمام پونٹ کھنڈن و پھنک گیا تھا لیکن جاوید شیخ نہیں پہنچے۔ جاوید فاضل صاحب غصے کے بہت تیز تھے۔ انہوں نے کہا کہ جاوید شیخ کو چھوڑ دیں۔ ہم یہاں نیپال سے ہی اس کردار کے لیے کسی آرٹسٹ کو لے کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس پر میں نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ قلم کا اہم ترین کردار ہے اور یہ لکھا ہی جاوید شیخ کے لیے گیا ہے۔ قدر پر خان صاحب نے بھی کہا کہ جب تک ہم دوسرے فنکاروں کا کام شوٹ کر لیتے ہیں۔ مگر جاوید فاضل صاحب کسی کی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ انہیں جاوید شیخ پر بہت غصہ تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پھر میں یہ قلم چھوڑ رہا ہوں۔“

جاوید فاضل صاحب کے غصے کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہم نے نیپالی نوجوانوں کے آڈیشنز لینے شروع کر دیے۔ مجھے یاد ہے، نوجوانوں کی ایک لمبی قطار آڈیشن دینے کے لیے کھڑی تھی۔ قطار کے درمیان میں کھڑے شیوا پر جیسے ہی میری نظر پڑی مجھے یہ نوجوان سر سے پاؤں تک مکمل فلمی لگا اور میں قطار کے درمیان سے اس کو نکال لایا۔ اور یوں ہم سے بے زمانہ میں ہم نے شیوا کو کاسٹ کر لیا۔ قارئین کرام! اگر آپ نے یہ قلم دیکھی ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ شیوا انیم صاحب کے ساتھ اداکاری کرتے ہوئے کافی آگے نکل گیا تھا۔

بالکل اسی طرح ”چف صاحب“ میں جاوید شیخ نے نیلی والے کردار کے لیے پہلے صائمہ نور کو کاسٹ کیا تھا مگر بعد میں یہ کردار نیلی سے کرایا۔

فاصلے پر ٹھوکر نیاز سے تقریباً 10 کلومیٹر آگے از میر ٹاؤن میں ایک۔۔۔۔۔ شاندار اور عالی شان گھر صائمہ کو بنا کر دیا ہے۔ یہ گھر اپنی طرز تعمیر کے حوالے سے سید نور کی ذہانت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس پورے گھر کو شاہ جی نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے۔ اس گھر میں ان دونوں کا بیڈ روم بھی تخلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ بیڈ روم کے ساتھ صائمہ نور کا ڈریسنگ روم ہے جس میں درجنوں الماریاں ہیں اور الماریوں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ان کے ڈریسر ہیں۔ پورے پاکستان میں اتنا وسیع ڈریسنگ روم شاید ہی کسی اور فنکار کا ہو۔ ڈریسنگ روم کے ساتھ ایک جدید جم بھی ہے۔ جس میں دنیا بھر کی جدید ترین ایکسرسائز مشینیں موجود ہیں۔ گھر کے اوپر والے حصے میں بنائی گئی آگسٹی ہے۔ اس آگسٹی کو بھی بہت ہی خوبصورت انداز میں ڈیزائن کیا گیا ہے۔ شاہ جی کے بقول اس پورے گھر کو انہوں نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے اور ابھی چند روز قبل یہ وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔

سید نور گھر بنانے کے لیے گھر بنانے کے معاملے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ آپ کو یاد ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بیوی رخسانہ نور کو کبھی شادی سے پہلے لاہور کے اقبال ٹاؤن میں ایک کوشی بنا کر دی تھی۔ ٹھیک ہے وہ اس نوع کی نہیں تھی جیسی صائمہ نور کی ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ وہ شاہ جی کا اور دور تھا۔ اب ان کا اور دور ہے۔ وہ رخسانہ نور تھی، اہل قلم تھی یہ صائمہ نور ہے، ایک پراسرار ہے۔

مہمانوں نے شاہ جی سے پوچھا آپ کی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں لکھی ہوئی ایسی فلمیں ہیں جنہیں پڑوسی ملک نے کاپی کی۔ جیسے دلہیز پر انہوں نے ”اونچے لوگ“ بنائی مگر ان کی قلم دلہیز کی گہر کو کبھی نہ پہنچی سکی۔

شاہ جی بولے۔ ”دلہیز کا پورا اسکرپٹ سلمیٰ آغا انڈیا لے کر گئی تھیں۔ یوں سمجھیں میرے ہی لکھے اسکرپٹ پر قلم تیار کی گئی ہے دلہیز اصل میں ایک انگلش ناول کی کہانی پر ہے اور اس ناول پر دلہیز سے قبل انڈیا میں دو فلمیں ”پچل“ اور ”بدلاوا“ بنائی جا چکی تھیں۔ مگر انہیں بھی وہ کامیابی نہ مل سکی جو ہماری قلم دلہیز کو ملی۔ دلہیز ہی نہیں، بلکہ ایسا ناول پر سپر ہٹ قلم ”بونی“ بھی لکھی اور دونوں ہی فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ جن دونوں دلہیز کا میانی سے زیر نمائش تھی نذر شباب مرحوم میرے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ ماہ سیتا

ہنگامی زبان کی یہ تینوں ہی فلمیں آپ کی اور صائمہ جی کی نئی صلاحیتوں کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔ آپ کو ذاتی طور پر ان تینوں میں کون سی فلم زیادہ پسند ہے۔ ”مہمالوں میں سے ایک نے پوچھا۔

تینوں ہی وہ فلمیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کمپیئر کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ لیکن جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر ”مہندی والے ہتھ“ بہت زیادہ پسند ہے۔ شاہ جی نے کہا تھا کہ صائمہ بول اٹھی۔

”مجھے ان سب سے زیادہ ”ڈاکورانی“ پسند ہے۔“
 ”ڈاکورانی میں آپ نے دونوں ہاتھ چھوڑ کر گھوڑا دوڑایا تھا۔ اس کی تعریف نہ کرنا بدذوقی ہوگی۔“

”ڈاکورانی کا یہ سین جب میں شوٹ کر رہا تھا اور اچانک سم (صائمہ) نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر شارٹ دیا تو میں گھبرا گیا کہ شاید گھوڑا بک گیا ہے۔ یا سم کو کوئی مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً کٹ کی آواز لگائی اور سم کی جانب دوڑا تو انہوں نے بڑی مصوعیت سے پوچھا۔
 ”شات آپ نے لے لیا نا؟“

میں نے کہا نہیں، میں تو گھبرا گیا تھا تو سم نے کہا کہ سین میں ریٹیلیٹی کے لیے میں نے خود دونوں ہاتھ بلند کر کے گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہ شارٹ دیا تھا۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہ جی، صائمہ کو پیار سے سم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) ڈاکورانی میں سم کو بہترین اداکارہ کا قوی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ لیکن ان کی عجیب طبیعت ہے، آپ نے دیکھا ہوگا یہ کبھی بھی نہ کسی ایوارڈ شو میں یا دیگر تقریبات میں جاتی ہیں نہ کسی کو انٹرویو دیتی ہیں۔ نہ کسی سے زیادہ بات چیت کرتی ہیں۔ بس اپنے کام سے کام رہتی ہیں۔ مجھے بے حد حیرت ہے کہ آج یہ اتنے اچھے موڈ میں اور اتنا فریڈٹی آپ لوگوں سے خوب باتیں کر رہی ہیں۔

(صائمہ، شاہ جی کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے ان کے کندھے پر سر رکھے بڑی مصوعیت سے اپنے بارے میں ان کے متکلم سن رہی تھیں)

شاہ جی نے ڈاکورانی کے حوالے سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس روز قوی ایوارڈ کی تقریب ٹی وی میں نے سم کو تختی سے تاکید کی کہ یہ تقریب ضرور اینیڈ کرنا۔ یہ تمہارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایوارڈ اپنے ہاتھ سے وصول کرنا تو مجھے اس نے بڑی محبت سے کہا۔ ہاں میں

ہوا یہ تھا کہ جن دنوں جاوید شیخ ”چیف صاحب“ شروع کر رہے تھے ان دنوں نیلی اور جاوید شیخ میں اختلافات چل رہے تھے۔ جاوید شیخ نے اس فلم کی بیرون ملک شوٹنگ پر جانے کے لیے، صائمہ نور کا پاسپورٹ بھی لے لیا تھا اور فیکر کو لا کر ڈیسٹر کے لیے ٹاپ بھی لے گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ جاوید شیخ نیلی کو لے کر اپنے پورے پونٹ کے ساتھ ترکی چلے گئے ہیں۔ انہوں نے صائمہ کو بتانا تو درکنار پاسپورٹ تک واپس دے کر نہیں گئے۔ کیونکہ ان کی نیلی سے صلح ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے گھونگھٹ میں نیلی کی جگہ صائمہ آگئی تھی۔

سلطان راہی کی وفات کے بعد صائمہ بالکل فارغ تھی۔ گھونگھٹ میں پہلے نیلی کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ مگر اللہ جانے کس بنا پر نیلی سے جاوید شیخ کی نہ بن سکی تو شہزاد رفیق صائمہ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میری فلم ”گھونگھٹ“ میں کام کریں۔ ان دنوں صائمہ کو اردو فلم کرنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ٹھیک ہے آپ اپنے اسٹوری رائٹر کو کہیں کہ وہ آکر میرا کردار سنائے۔ اگر مجھے سمجھ آیا تو کر لوں گی۔ شہزاد صاحب نے جب یہ بات بتائی تو سید نور غصے میں آگیا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی نہ سم صائمہ کو جا کر اسٹوری نہیں سنائی۔ میں اس کل کی لڑکی کو جا کر اسٹوری سناؤں گا؟“

بہر حال ان دنوں صائمہ کو کام کی ضرورت تھی۔ اس نے شہزاد رفیق کے کہنے پر فلم سائن کر لی۔ اس فلم میں اس کا ایک مختصر سا کردار تھا۔ وہ اپنے کردار کے حوالے سے کوئی بھی بات کرتی یا اپنا کوئی مسئلہ ڈسکس کرتی تو میں جھنجھلا کر کہتا۔ ”آپ کی جو بھی شکایت ہو، جو بھی مسئلہ ہو۔ آپ پروڈیوسر سے کہا کریں۔ جس پر وہ شہزاد صاحب سے بولی۔ سیٹ پر ڈائریکٹر ہوتا ہے پروڈیوسر نہیں۔ میں کہاں بار بار آپ کو ڈھونڈتی پھروں گی۔ لہذا میں آپ کے ڈائریکٹر کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔“

شہزاد صاحب نے اسے سمجھا بجا کر رام کیا۔ پھر جب اس نے فلم کا پہلا شارٹ دیا تو اس کی رفتار منس دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ اور پھر میرا کارڈ میرے ساتھ خاصا بہتر اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد رفتار منس کو دیکھتے ہوئے اس فلم میں مختصر کردار کو مزید بڑھا دیا۔ شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! چوڑیاں، مہندی والے ہتھ، اور مہاجن،

ضرور جاؤں گی۔ بس آپ میری سیٹ روک کر رکھنا۔ میں آجاؤں گی۔ میں تقریب کے دوران ان کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے ایوارڈ کے بعد جب بہترین اداکارہ کا ایوارڈ اناؤنس کیا گیا تو اس کو وصول کرنے کے لیے مجھے اسٹیج پر بلایا گیا۔ اور میں نے ان کا وہ ایوارڈ وصول کیا۔ یہ تقریب بی بی وی لائیو دکھارہا تھا۔ میں یہ تقریب انٹینڈ کر کے جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ یہ ملازمہ سے اپنے سر میں تیل لگوا رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ تھا۔ میں نے کہا۔ تم نہیں آئیں نا ایوارڈ شو میں۔ تو وہ بڑی مصحومت سے بولی کہ میں بی بی وی پر یہ ساری تقریب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ یہ ایوارڈ آج تک انہیں نہیں دیا اور ان کا وہ ایوارڈ آج بھی میں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

اس اثنا میں صائمہ نور ایک دم کھڑی ہو گئیں اور پولیں۔ ”ناشنے کو کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں آپ سب کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ایک پرستار نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”صائمہ جی ایک بڑی فنکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دیدار خاتون بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار شب معراج کے موقع پر سعود بٹ نے ان کی لاکھ تیش لیں لیکن ان کا موقف تھا کہ۔ ”آج بڑی رات ہے۔ لہذا میں کام نہیں کروں گی۔“

”ہاں سعود بٹ نے مجھے بھی فون کر کے کہا تھا کہ آپ کسی طرح صائمہ کو رضی کر لیں۔ میرا صرف ایک سین رہتا ہے۔ کل شان ملک سے باہر چلا جائے گا اور کافی عرصہ بعد واپسی ہوگی۔ میں نے بھی سیم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی گنا یا ڈانس وغیرہ کی شونگ نہیں ہے صرف ایک سین رہ گیا ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیم کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ عبادت کی رات ہے اور اس رات میں میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ شاہ جی اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے، ایک بار آدمی رات کو میری آنکھ کھلی تو مجھے سسکیوں سے کسی کے رونے کی آواز سنا دی۔ میں ہل بڑا کر اٹھ بیٹھا تو دیکھا۔ سیم جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر اور گونگرا کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے۔ واضح رہے کہ سیم بڑی باقاعدگی سے ہمیشہ نماز پنجگانہ کا اہتمام کرتی ہے۔“

میں یہ واقعہ پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”یہ کون سے گناہ ہیں جن کی معافی صائمہ نور رو کر اللہ سے مانگتی ہیں؟

پھر میرے ذہن میں ایک بجلی سے کوئدی۔ کہیں یہ ایک شادی شدہ اور بال بچے دار خاتون کے حق پر ڈاکا ڈالنے کا احساس تو نہیں؟ شاید..... شاید..... شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رخسانہ نور جس طرح اس صدمے سے بیمار ہوئیں اور جس طرح اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ بے حد تکلیف وہ واقعہ ہے۔ اس وقت شاید صائمہ کو بھی اس تکلیف کا احساس نہیں ہوگا۔ لیکن بعد میں دوسروں کی طرح وہ بھی اس بارے میں سوچنے لگی ہوں کہ انہوں نے حقیقتاً بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید اس کا مجھی کسی کے سامنے اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن اندر سے یہ احساس انہیں ہمیشہ کچھ کے لگا تار رہتا ہو۔

شاہ جی کی بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ صائمہ کے ہمراہ گھر کا ملازم چائے کی ٹرالی لے کر داخل ہوا۔ صائمہ جی نے سب لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے چائے پیش کی۔

ذرا دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد موضوع بدلتے ہوئے ایک مہمان نے شاہ جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی! ”جین آئے نہ“ کی ہیروئن کو لوگوں کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

بات دراصل یہ ہے کہ جب مجھے پتا چلا کہ وہ کراچی میں کام تلاش کرتی پھر رہی ہے تو میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس فیملی کی لڑکی جس فیملی کے ہماری قلم انڈسٹری پر بہت احسانات ہیں۔ محترمہ صبیحہ خانم کی نواسی اور پھر سب سے بڑھ کر میرے استاد محترم سید سلیمان صاحب کی بھی وہ نواسی ہیں تو میں نے انہیں فون پر ہی اپنی فلم کی ہیروئن سائن کر لیا۔ مجھے آج بھی اپنے اس فیصلے پر کوئی شرمندگی یا عداوت نہیں ہے۔ لوگوں کا کام باتیں کرنا ہے سو وہ حوالہ میں کرتے رہیں گے۔ تیسری اس فلم پر تو زیادہ تر ان لوگوں نے تنقید کی جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں۔

شاہ جی بول چکے تو ایک پرستار نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بلاشبہ شاہ جی کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اس فلم پر تنقید کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت شامل ہے جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں ہے۔ اور پھر ان کے مخالفین نے اس فلم کی آڑ لے کر نہ جانے کیسے کیسے گھٹیا الزامات شاہ جی پر لگائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ یہ وہی سید نور ہیں جنہوں نے ہمیشہ اس ڈویتی ہوئی فلم انڈسٹری کو اپنی محنت اور لگن سے قسم، سگم، سرگم، جیوا، گھوگھٹ، چور چائے شور، چوڑیاں، ڈاکو رانی، مہندی

کینسر کے پھیلاؤ کی عکس بندی

جسم میں کینسر کے خلیوں کی نقل و حرکت کو جاپان میں ویڈیو کے ذریعے عکس بند کیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں جسم کے عام خلیوں کو سبز رنگ میں اور کینسر زدہ خلیے سرخ رنگ میں دکھائے گئے ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹوکیو اور رینکن کونائٹو بائیو لوجیکل سینٹر کا کہنا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کی مدد سے اس مہلک عمل کی وضاحت ہو سکے گی۔ اس تحقیق کے دوران چوہے کو استعمال کیا گیا ہے تاہم یہی طریقہ جلد ہی انسانوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔ کینسر کے جسم میں پھیلنے کے عمل کو میٹاسٹس کہتے ہیں۔ کینسر کے پھیلنے سے پہلے ہی کینسر کو رد کنا آسان ہوتا ہے لیکن اگر یہ پھیل جائے تو پھر کنٹرول بہت مشکل ہے۔ کینسر کا پھوڑا خود تو بڑھتا ہی ہے لیکن اس کے کچھ حصے الگ ہو کر جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور مزید جگہوں پر کینسر کے خلیے بن کر زخم بناتے رہے ہیں۔ تجربے کے دوران ڈاکٹرز نے چوہے کے جسم میں کینسر کے ٹشوز ڈالے۔ اس کے بعد اس بیماری کے پھیلاؤ کو جانچنے کے لیے ایسے کیمیائی مادے اس کے جسم میں ڈالے جس کی مدد سے چوہے کے جسم کے اندرونی اعضا بہت زیادہ شفاف ہو گئے۔ اور کینسر کے خلیوں کی شناخت ہو سکی۔ سیل رپورٹ نامی جریدے میں شائع تحقیق میں کینسر کے خلیوں کی پیمائشوں، آنتوں اور جگر میں پھیلاؤ کی تفصیل شامل کی گئی ہے۔ تحقیق میں شامل ڈاکٹر کوہی میا زولو کا کہنا تھا، کینسر کے بیشتر خلیے دوران سفر مر گئے لیکن کینسر نے ان کے دوبارہ بڑھنے کے لیے پھر سے کیمیائی سنگنز بھیجنے شروع کر دیے۔ محققین نے ان میں سے ایک کے اثرات کو بھی پرکھا جسے ٹی جی ایف بیٹا، کہا جاتا ہے اور دیکھا کہ یہ ڈرامائی انداز میں بہتر ہوا اور پیمائشوں میں کینسر کے خلیوں کی کالونی بنادی۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو خود بخود ٹھیک ہو جانے والی بیماریوں سمیت کئی دوسری بیماریوں کے لیے بھی استعمال کیا جاسکے گا۔

مرسلہ: وارث علی، ملتان

والے تھے، دیوانے تھے بے پیار کے، دو چٹا چل رہا ہے۔ اور مہاجن جیسی سیرکلاس فلمیں دے کر فلم انڈسٹری کو سہارا دیا۔ ان کی ایک فلم کی ناکامی پر سوشل میڈیا پر ان کے خلاف جس طرح دوا بولا چھایا گیا وہ بے حد شرمناک ہے۔ انہیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شاہ جی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس انڈسٹری سے ساری زندگی جو کیا وہ اسی انڈسٹری پر لگایا ہے۔ آج بھی ”چھرا گون“، فلم اکیڈمی اور ان کی پروڈیوس کردہ فلمیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

قارئین! ہینا اس بات کا انتظار کر رہے ہوں گے کہ اب تک رخسانہ نور کے بچوں کا ذکر نہیں آیا تو آخر... میں ان کا ذکر بھی کر دوں۔

آج سے دس سال پہلے جب صائمہ نور نے سید نور سے ہونے والی شادی کو دو سال تک خفیہ رکھنے کے بعد اس کا اعلان کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ میں شاہ جی کی مرید بن کر رہوں گی۔ رخسانہ نور کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھوں گی۔ بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے رخصت کر دوں گی اور محل شاہ کے سر پر سہرا سجاؤں گی۔ ہو سکتا ہے انہیں اسی وقت یہ احساس ہو گیا ہو کہ یہ کام رخسانہ نور کی بجائے ان ہی کو کرنا پڑے گا۔

آج سے کوئی تین سال پہلے کی بات ہے۔ یعنی 2014ء کو جب رخسانہ نور حیات میں اور امریکا میں تھیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک مستند صحافی نے شاہ جی سے ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ میری تین بیٹیاں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ امریکا، برطانیہ اور جاپان میں ہیں۔ خیر سے نانا بھی بن چکا ہوں۔ وہ مجھ سے ادب اور پیار سے ملتے ہیں میں خود بھی ان سے ملنے جاتا ہوں۔ جبکہ میرا بیٹا محل شاہ آج کل لاہور میں ہے اور میرے ساتھ ہی شاہ اسٹوڈیو (چھرا گون) میں کام کرتا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ میں نے 50 برس کی عمر میں صائمہ کے ساتھ شادی کر کے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو رلا لیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سلطان راہی کی ناگہانی موت کے بعد لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ قرار دے دیا تھا بے چاری کا کیریئر تباہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عدت کے دن گزار رہی ہے۔ انہی دنوں میں نے صائمہ کو اپنی فلم ”گھونگھٹ“ میں بالکل ایک نئے انداز میں متعارف کرایا۔ اردو زبان کی فلم میں صائمہ کے اس نئے روپ کو دیکھ کر قلم بین حیران رہ

کریں میں نے بڑی..... عمر کے شخص سے شادی کر کے دس سال کا عرصہ گزار دیا اس کے باوجود خوش ہوں۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ مسادی سلوک کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کے حوالے سے میری نظر میں کافی ہے۔“

صائمہ سے گفت گو کے بعد شاہ جی نے صحافی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کی بھابی (رخسانہ نور) اور اپنی پہلی بیوی سے جب عشق کیا تو اس کو اپنایا۔ سب جانے ہیں، شی از جرنلٹ، رخسانہ میرا انٹرویو کرنے آئی تھی۔ فرسٹ انٹرویو میں وہ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے الٹا اس کا انٹرویو کر کے جھٹ جھٹ پٹ شادی کر کے اسے بیوی بنالیا۔

شاہ جی نے خود پر لگائے جانے والے الزام کی نفی کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ رخسانہ نور اور صائمہ نور سے صحافی کی بات کروا کر اسے مطمئن کر دیا۔ مگر جہاں تک رخسانہ نور کی بات ہے۔ یہی کہا اور سمجھا جائے گا کہ وہ ایک وفا شعار بیوی تھیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ اپنے دکھ درد کا پچا کر کے کی قائل نہیں تھیں۔ غالباً اسی لیے وہ خاموشی کے ساتھ امریکا چلی گئی تھیں۔ شاہ جی کا یہ کہنا کہ وہ ان سے ناراض نہیں اور انہوں نے دل سے صائمہ کو قبول کر لیا تھا۔ درست نہیں۔ شاہ جی اور صائمہ نے دو سال تک اس شادی کو خفیہ رکھا اور جب کسی مجبوری کی وجہ سے اس شادی کا اعلان کیا تو رخسانہ نور کے پاس اس کے علاوہ اور کیا راستہ تھا کہ وہ خاموشی سے یہ قلم برداشت کر لیں۔

دوسری شادی کے بعد شاہ جی کے بچے کس حال میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب شاہ جی کے ایک تین سال پرانے انٹرویو سے مل گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس انٹرویو کے تذکرے کو میں یہیں ختم کر دوں مگر اس بولڈ انٹرویو میں صحافی مذکور نے شاہ جی پر جو مزید الزامات لگائے، وہ بھی بڑے دلچسپ ہیں اور ان کے جواب سے بھی معلومات کے کچھ بندرستے کھلتے ہیں اس لیے سب نہیں۔ کچھ مزید سوال جواب بھی حاضر خدمت ہیں۔“

انٹرویو میں صحافی نے پوچھا۔ ”آپ پر الزام ہے کہ آپ ایک سفید ہاٹی ہیں جو فلساذوں کے ساتھ ہم قلم کے باوجود گھٹائے کا سودا کرتے ہیں۔“

شاہ جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ مجھے لوگ بطور ڈائریکٹر سفید ہاٹی کہتے ہیں۔ مگر یہ الزام صرف ان لوگوں نے لگایا جنہیں میں

مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں خود صائمہ کے دام عشق میں پھنس گیا ہوں۔ آپ یقین کریں جب میں نے صائمہ سے پہلی بار اظہار محبت کیا۔ وہ ایک باشعور لڑکی تھی اور ٹاپ کی ہیروئن وہ خود دل ہی دل میں مجھے آئیڈیل شوہر تسلیم کر چکی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تمام کر کہا تھا۔

”شاہ جی! یہ ہاتھ پکڑا ہے تو اس کو بھی چھوڑنا مت۔“ اور میں نے وعدہ وفا کر کے اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لیے تمام کر صائمہ سے طرٹ، عشق، اسکنڈل کرنے کے بجائے انہیں عزت سے اپنی دوسری بیوی بنالیا اور جہاں تک یہ بات کہ میری دوسری شادی کی وجہ سے میری پہلی بیوی ناراض ہوگئی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ مجھے تین جوان بیٹیوں کی موجودگی میں یہ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر مجھے اوپر والے کی ذات پر یقین تھا۔ اگر میرا دل سچا ہے تو میری پہلی بیوی اور بیٹیاں مجھے معاف کر دیں گی اور الحمد للہ رخسانہ نور نے دل سے صائمہ کو قبول کیا ہے اور میری تینوں بیٹیوں نے بھی مجھے معاف کر دیا ہے۔ جہاں تک رخسانہ نور کی ناراضگی کی بات ہے میں ابھی آپ کی بات بذریعہ موبائل فون ان سے کرواتا ہوں۔

شاہ جی نے اس وقت اپنے موبائل فون سے امریکا میں رخسانہ نور سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر فون انہوں نے چھادیا۔

ادھر سے رخسانہ کی آواز سنتے ہی صحافی نے پوچھا۔ ”آپ کو شاہ جی کی یاد آتی ہے؟“

”شاہ جی کے بغیر ایک لمحہ بھی جی نہیں سکتی۔ شاہ جی کو جلد ہی میرے پاس بھیجیں۔“

اس کے بعد شاہ جی نے صائمہ سے فون پر لاہور رابطہ کیا (واضح رہے یہ انٹرویو کراچی میں ہو رہا تھا) اور صائمہ سے پنجابی زبان میں علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔

”میرے صحافی دوست سے بات کرو۔“ اور فون اسے چھادیا۔

صحافی نے پوچھا ”آپ اس وقت شاہ جی کے بغیر کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“

”ان کے بغیر مجھے لاہور اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ شاہ جی ایک پیار کرنے والے انسان ہیں۔ حالانکہ میری فیملی کے لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ صائمہ تم 60 سال کے ایک شادی شدہ شخص سے جو چار بچوں کا باپ ہے، اس سے شادی کر رہی ہو بعد میں تم بہت پچھتاؤ گی۔ مگر آپ یقین

غلطیاں جنگ کے میدان کی۔

ہٹلر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی تھا۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جو جتنا بڑا انسان ہوتا ہے۔ اس کی حماقتیں بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔ ہٹلر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے روس کو فتح کرنے کی پلاننگ کی اور فوجوں کو روس کی طرف روانہ کر دیا۔ بہت زبردست فوج تھی۔ اور یہ جذبہ بھی تھا کہ ہر حال میں فتح حاصل کرنی ہے۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ایک تو سردی کا موسم۔ اور وہ بھی روس کی سردی۔ ان بے چاروں کو موسم گرما کی وردیاں پہنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ پوری فوج سردی سے ٹھہر کر رہ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہلاک ہو گئے۔ اور فتح جانے والوں کا دشمنوں نے صفایا کر دیا کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: نیا زکوسو، لبیلہ

یورپ میں ایک جنگ بہت مشہور ہوئی۔ یہ جنگ Agin court کی جنگ کہلاتی ہے۔ یہ جنگ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کا دل چپ پہلو یہ ہے کہ فرانس والوں کو عددی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہار گئے۔ اس ہار کی وجہ بھی بہت دل چپ تھی۔ فرانس کی فوجوں کے لیے اسلحہ ڈیزائن کرنے والا ایک شخص تھا۔ جس نے اس زمانے کے لیے کام کیا اور تیر بنا کر دیے۔ ان کمالوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کمائیں انسانی قد سے بڑی تھیں۔ اس ماہر اسلحہ ساز کا کہنا تھا کہ ان کمالوں سے چلائے ہوئے تیروں میں بہت فوری ہوتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ عین جنگ کے وقت ان کمالوں کو کھینچ ہی مشکل ہو گیا۔ بے چارے فرانسی فوجی کمالوں سے تیر چلانے کی کوشش ہی کرتے رہے اور برطانوی فوجوں نے انہیں تباہ کر دیا۔

مرسلہ: واجد الحسن، کراچی

لے ہٹ، سپر ہٹ فلمیں ماضی میں بنا کر دیں۔ اس وقت وہ سب خوش دکھائی دیتے تھے جب میں نے لکھ بچی کو کروڑ بچی لکھا بنا دیا تو وہ کرکٹ مجھے کوئی نہیں دیتا ہے۔ آپ کو پتا ہے، میری سپر ہٹ فلم ”چوڑیاں“ کا بجٹ صرف 55 لاکھ روپے تھا اور اس فلم نے 50 کروڑ روپے کا بزنس کر کے برصغیر کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ میری اس فلم سے قلمساز کروڑ بچی بن گیا۔ میں نے بھی قلمساز کی رقم ضائع نہیں کی۔ ہمیشہ بجٹ میں رہ کر فلم بنائی۔ ایمرینو پچر زکی ”دیوانے تیرے پیار کے“ اپنے دور کی ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ گل برادران نے مجھے مالی طور پر جو بجٹ دیا تھا میں نے اس سے کم میں یہ فلم بنائی۔ اس فلم کی کامیابی اور اسے پیش کرنے کے اعزاز کو شہزاد گل اور سجاد گل نے بے حد پسند کیا۔ اور مجھے انعام سے نوازا۔ میرے کرکٹ میں فلم اڈامی کے زوال کے وقت چند فلمیں ہیں۔ میں نے جس طرح فلم عمل کر کے قلمسازوں کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا جتن چلایا۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر یہ میری مجبوری تھی۔ کیونکہ ہمیں قلمسازوں اور سینسار کٹ نے مجبور کیا کہ اس ٹائپ کی فلمیں بنائیں۔ مگر مجھے بعد میں اس کا احساس ہو گیا۔ اس لیے میں نے قوی زبان کی فلم ”مجموعہ“ بنائی۔ مگر اس فلم کی ناکامی سے میں بے حد مایوس ہو گیا تھا۔ کیونکہ سینا گھروں کے مالکان نے نا انصافی کا مظاہرہ کر کے اس خوبصورت اور اعلیٰ معیار کی فلم کو ہمیشہ کے لیے فلاپ ڈیکلر کر کے ڈیوٹ میں بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا۔“

”فلمی دنیا آپ کی ناکامی کی وجہ صائمہ کو قرار دیتا ہے کہ آپ نے صائمہ کے عشق میں اپنی ذاتی زندگی اور فلمی زندگی... سے ایک بہت بڑا اجوا اٹھلایا ہے۔ آپ کی پہلی بیوی رخصانہ نور اور آپ کے بیٹے آپ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اردن ملک شفٹ ہو گئے۔“ ایک دکھتا ہوا سوال کیا گیا۔

”یہ ایک نیا الزام ہے۔ سب سے پہلی بات میں نے اگر عشق کیا دوسری شادی کی ہے تو کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ جو میرا ذاتی معاملہ بھی ہے۔ مگر ہم چونکہ پبلک پرائیوی ہیں، لوگوں کو بالکل یہ حق ہے کہ وہ ہمارے حوالے سے گفت و شنید کریں مگر خدا را مجھ پر میری ذاتی زندگی کے حوالے سے اس طرح فضولیات پر مبنی سن گھڑت باتیں نہ کریں۔ ایسے الزامات پر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ آپ کا الزام نہیں ہے۔ آپ مجھ سے وہ سوالات پوچھ رہے ہیں جو الزام

میرے مخالفین مجھ پر لگاتے ہیں۔“ شاہ جی نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

”شاہ جی آپ پر ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ آپ گزشتہ سات سال سے لالی ووڈ میں موجود ہیں مگر سوائے چند روایتی پنجابی فلموں کے عملی طور پر کچھ نہیں کر رہے ہیں، باقی میں آپ نے بے شمار سپر ہٹ فلمیں قومی زبان کی تخلیق کیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ہر چھ ماہ بعد چند فلموں کے اعلانات کر کے محض خبروں میں ان رہنے کے لیے ڈراما کر کے غائب ہو جاتے ہیں؟“

”ایک اور الزام کا تیر چلا۔ میں نے کوئی سلیمانی ٹوپی نہیں پہنی ہے؟ میں روزانہ آپ کو اسٹوڈیو، وی دی کے ٹاک شو، فلم والوں کی تقریبات، سینما گھروں میں نئی فلموں کے پریمر کے حوالے سے ہر جگہ نظر آتا ہوں۔ جہاں تک مجھ پر الزام ہے کہ میں گزشتہ سات سال سے کوئی فلم نہیں بناتا ہوں، مانا کہ میں نے اس عرصے میں کوئی ٹھوٹھٹ، چوہا، ڈاکواری، سرگم، سگم، چوڑیاں، مجاجن کی طرح بڑی فلمیں نہیں بنائیں۔ مگر یہ الزام غلط ہے کہ میں محض اپنے آپ کو خبروں میں زندہ رکھنے کے لیے یہ کرتا ہوں۔ میں اس کٹنی کرتا ہوں۔ فلم انڈسٹری کے حوالے سے ہمارے ملک کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جب بول، وار، میں ہوں شاہد آفریدی جیسی فلموں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ میں نے سب سے پہلے ان فلموں کو ویکم کیا اور بڑے فخر سے کہا کہ ان فلموں نے بھارتی فلموں کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ہماری قوم آج بھی ہماری فلمیں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اسی اثنا میں میں نے ایک ساتھ تین قومی زبان کی فلمیں شروع کرنے کا صرف اعلان نہیں کیا بلکہ باقاعدہ پلان کیا ہے۔ ان فلموں میں ”پرائس آف آنر“ ”بھائی وانڈ“ اور ”فرسٹ لو“ شامل ہیں۔ ان تینوں فلموں کے موضوع ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سید نور کو خبروں میں زندہ رہنے کے لیے شوشے کا شوق ہے۔ ان لوگوں کو میرا یہ جواب ہے کہ مجھے ان ہتھکنڈوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ مجھے قریب یا دور سے جانتے ہیں ان کو پتا ہے کہ سید نور ان فضولیات سے بالاتر ہے۔ میں نے 21 سال کی عمر میں جس ماحول میں شب و روز کی جھجھک کی آج 67 سال کی عمر میں پاکستان فلم انڈسٹری میں عزت و شہرت اور دولت مجھے ملی ہے اس کے لیے میں اپنے رب کا شکر بجالاتا ہوں اور سال رواں میں میری پہلی فلم

عاشورہ کے بعد ”پرائس آف آنر“ ریلیز ہو رہی ہے۔ اگلے سال 2015ء میں مزید دو فلمیں ”بھائی وانڈ“ اور ”فرسٹ لو“ پیش کر دوں گا۔ آج کل ہماری پاکستانی فلمیں زبردست کامیابی سے ہٹتا رہی ہو رہی ہیں اور میں ایک بار پھر سینما انڈسٹری کی طرح فلم انڈسٹری کی بحالی کے حوالے سے کام کر رہا ہوں۔ میری یہ عملی جدوجہد کچھ حاسدین کو شاید غصہ نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے اس قسم کے الزامات الیکٹرونکس و پرنٹ میڈیا کے علاوہ موبائل SMS کے ذریعے پھیلا رہے ہیں مگر آنے والے وقت میں میرا کام دیکھ کر ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔“

واضح رہے کہ یہ باتیں، یہ وعدے شاہ جی نے اپنے ایک انٹرویو میں 2014ء میں کیے تھے لیکن آج تین سال بعد یعنی 2017ء میں نہ ان کی فلم ”پرائس آف آنر“ ریلیز ہوئی ہے نہ ”بھائی وانڈ“ البتہ ”فرسٹ لو“ غائب چھین آئے نہ“ کے نئے نام سے پیش کی جا چکی ہے۔ مذکورہ پہلی دو فلمیں کیوں تاخیر کا شکار ہوئیں؟ کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں، جو ان کے کچھ مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ صائمہ نور کی وجہ سے ان کی فلمی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ کہیں کہ اس دوران شاہ جی نے اپنی زیریںٹیل فلموں کو مکمل کرنے سے زیادہ دلچسپی اپنی حقیقی ہیر ذن کے لیے شیش محل کی تکمیل میں لی۔ کہنے والوں کے منہ کون بند کر سکتا ہے، ہر تو شاہ جی کی طرف سے یہی جواب دے سکتے ہیں کہ کچھ فلم میکرز تو ایک فلم بنانے میں تین چار سال لگا دیتے ہیں۔ شاہ جی نے تو ایک فلم ریلیز کر دی ہے اور دو فلمیں 2015ء میں نہ سبھی 2017ء میں ریلیز کر دیں گے۔

شاہ جی نے مزید کہا کہ یہ بھی مجھ پر ایک بڑا الزام ہے کہ میں کراچی کی فلموں کو سپورٹ نہیں کرتا۔ جتنا میں اپنی پاکستانی فلموں کو سپورٹ کرتا ہوں شاید ہی کوئی کرتا ہوگا۔ آپ اندازہ لگائیں میں اپنی فلم ”بھائی وانڈ“ کو گزشتہ عید الفطر کے حوالے سے پلان کر چکا تھا۔ مگر کراچی کے اسلام بھٹی اور گل حمید بلوچ نے اپنی ہیوی بجٹ کی قومی زبان کی فلم ”سلطنت“ کو کنفرم کیا۔ جس کے لیے میں نے اپنی فلم کی نمائش ملتوی کر دی تھی اور اس سال عید الاضحیٰ کے موقع پر دو قومی زبان کی فلموں ”021“ اور ”نامعلوم افراد“ کے لیے سینماؤں کے حصول اور دیگر امور کے لیے میں نے اپنے آپ کو مصروف کر رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے زیا بختیار کی فلم ایک بھارتی فلموں کے تقسیم کار کے پاس ہے مگر زیا

کراچی، سندھ میں ماٹری والا گروپ کے نواب صاحب اور پنجاب سرکٹ کے لیے ہم دونوں کمر بستہ ہیں۔ مالاکہ ہماری دونوں فلموں کے مقابلے میں بھارت کی دو ٹیلی فلمیں ہیں مگر ہم گھبرانے والوں میں نہیں۔ ہماری فلمیں انٹرنیشنل کران کا مقابلہ کریں گی۔“

وہ جو کہتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے تو صحافی کی بات کا جواب دیتے ہوئے شاہ جی نے جن نواب صاحب کا والد دیا۔ انہی نواب صاحب نے مذکورہ صحافی اور سید نور کی گفت و شنید سے چند روز پہلے شاہ جی کے اعزاز میں ”ایک ٹام سید نور کے نام“ ترتیب دی تھی۔ یہ نواب صاحب کوئی اور نواب نہیں، ماٹری والا انٹرٹینمنٹ (پرائیویٹ لمیٹڈ) کے ڈائریکٹر ڈسٹری بیوٹن ہیں۔ عرصہ پچاس برسوں سے سینما انڈسٹری اور فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں اور ایک مستند تجربہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے تجربوں سے قومی اخبارات اور فلمی جرائد کو ایک نئی جہت اور روشنی ملتی ہے۔ سابقہ سینما نشاط اور موجودہ ایٹریم سینما کے حوالے سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ سید نور سے ملنے اور احباب کو ملانے کی اس تقریب کو نام تو ”شام“ کا دیا گیا مگر ہفتائے معاشیے کی تقریب بھی جو 12 ستمبر 2014ء کی شام سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی میں واقع الحاج بندو خان ریسٹوران کی بالائی منزل میں ایئر کنڈیشنر مینی ہال میں ترتیب دی۔ سید نور کی فلم ”پرائس آف آرز“ کراچی اور سندھ شہر کے لیے سائن کی تھی۔ یہ تقریب غالباً اسی خوشی کے اظہار کے طور پر تھی۔ نواب صاحب نے سید نور کے اعزاز میں ترتیب دی تھی۔

جب مہمان خصوصی سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو شاہ جی نے بڑے دکھ کے ساتھ ایک ایسے SMS کا تفصیلی ذکر کیا جو انہیں اسی دن 12 ستمبر کو ملا تھا۔ انہوں نے تا یہ SMS کچھ یوں تھا، سید نور نے 1969 میں ایس لیہان کا اسٹنٹ بن کر انڈسٹری میں قدم رکھا۔ اب ان کی عمر 70 سال ہے۔ سب سے زیادہ مشکل 25، 26 فلاپ فلمیں دینے والے کو ”شو مین“ کا لقب دینے والے سوچ لیں۔ سب سے زیادہ کامیابی کا اسکور 40 ملین ملکا ہے۔ جن کی دو فلمیں ناکام اور باقی سب کامیاب ہوئیں۔ جبکہ شباب کیرانوی کی ہر دوسری یا تیسری فلم کامیاب ہوا کرتی تھی۔ شباب کیرانوی نے قلساز، اہت کار، رائٹر اور شاعر اور اسٹوڈیو آف آرز کے طور پر فلم

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد گرجہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم مبتلا ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553ء کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹین نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قیدی سزا ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چڑا کر فرار ہو گیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آگیا۔ فورٹین نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کر لیا ہے۔ اپنی اسی ”دریافت“ پر فورٹین کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کر لیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آ گیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی گئی۔ بلکہ اس کی عمرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشہ بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دو سو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہر حال اس غلطی کی اصطلاح 1776ء میں اس وقت ہوئی جب جان ڈی انزانے جا کر اصل صورتحال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشے واپس لیے گئے جو دو سو برسوں تک ران رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دو سو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار و سیم، کراچی

کیپٹن جارج کسٹر نے امریکی قبائل پر چڑھائی کا ارادہ کر دیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”بہادرو۔ یقین کرو کہ تم ان چند سو لوگ کو برباد کر کے رکھ دو۔ اور امریکہ کی تاریخ میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ جارج کسٹر وہ آدمی تھا۔ جسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ کسی نئی طرح اس کا نام تاریخ میں مشہور ہو جائے۔ وہ جلد سے گزرے لوگ اشارہ کریں کہ وہ دیکھو امریکا کا بہادر انسان جارہا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ ”کیپٹن کیا ہمیں قبائلیوں کی تعداد کا علم ہے۔“

”ہاں۔ وہ تین چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ لہذا تین چار سو کے پکر میں وہ لوگ قبائلیوں سے جا کھرائے۔

اور جب ادھر ادھر کی جھاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں قبائلی نکل نکل کر سامنے آنے لگے تو کیپٹن اور اس کے آدمیوں کے ہوش اڑ گئے۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قبائلیوں نے انہیں چن چن کر مار دیا۔ یہ واقعہ 1876 میں پیش آیا تھا۔

مرسلہ: فہیم الدین، بسیلہ بلوچستان سیزرینیٹ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ کہانی ہے روم کے مشہور کردار جولیس سیزر کی۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اس کی بیوی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ”نہیں سیزر۔ آج تم سینیٹ میں نہیں جاؤ گے۔“

”وہ کیوں؟“ سیزر نے پوچھا۔

”میں نے تمہارے لیے ایک برا خواب دیکھا ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”خواب؟“ سیزر مسکرایا۔ ”کیوں ایسے واہوں کو ذہن میں آنے دیتی ہو۔“

”نہیں سیزر۔ بہت ہی بھیاں خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔“

لیکن سیزر نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کا مذاق اڑاتا ہوا سینیٹ کے اجلاس میں چلا گیا اور وہاں اسے اپنی اس غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس پر حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر کر مار دیا۔

مرسلہ: انعام حفیظ، کوئٹہ

انڈسٹری کی بے پناہ خدمت کی۔ پرویز ملک اور شاہ کیرانوی کی بجائے سید نور کو ”شوشین“ کہنا کہاں کا انصاف ہے۔ سید نور تو قلم آئینہ کو چار سال نمائش پذیر رہنے والی فلم نہیں مانتے۔ صرف ایک صوبے میں کامیاب ہونے والی اپنی فلم ”عماجن“ کو پاکستان کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم قرار دیتے ہیں اور پے در پے 20، 25 فلپ فلمیں دے دالے سید نور کو ”شوشین“ کہتے ہیں۔ کیا آئینہ کی بجائے ”عماجن“ زیادہ چلنے والی فلم ہے؟

عشایے کے تمام شرکاء نے کھل کر اس منجھک خیر، بھوٹے اور حسد آمیز SMS کی خدمت کی جس کے بعد شاہ جی کا موڈ کسی قدر نارمل ہوا اور انہوں نے اس SMS کے جواب میں انتہائی عاجزی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ”پرویز ملک اور شاہ کیرانوی تو میرے لیے ولی ہیں۔ میں ان کی خاک پا بھی نہیں۔ پرویز ملک صاحب کی پچھل آپ دیکھیں۔ ٹھیک ہے میری ناکام فلمیں بھی ہیں میں مانتا ہوں مگر وہ فلمیں جو میری کہانیاں مکالموں اور اسکرین پلے کی وجہ سے سپر ہٹ ہوئیں۔ ان کا یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں۔ سید سلیمان کا میں تو یہ اسٹنٹ سے لے کر سٹنٹ اسٹنٹ تک تھا۔ محمد جاوید فاضل بھی میرے ساتھ سلیمان صاحب کے چیف اسٹنٹ ہو کرتے تھے۔ فاضل صاحب کی صائمہ، دلہیز، لازوال صاحب اور کندن وغیرہ آپ سب کے سامنے ہے۔“

شاہ جی نے اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے کہا۔ ”میں جس زمانے میں ”سوسائٹی گرل“ کی کہانی پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت میری عمر تیس اکیس سال تھی۔ آغا حسن احتشال صاحب نے محترم حسن طارق کو جاکر بتایا۔ ایک نوجوان جس کا نام سید نور ہے۔ ایسی کہانی لکھ رہا ہے جو آپ کی فلم ”اک گناہ اور سبھی“ سے ملتی جلتی ہے بلکہ اس کی کاپی ہے۔ ایک دن ایورنڈو اسٹوڈیو کے فوارے پر حسن طارق صاحب مجھے دیکھ کر برس پڑے۔ مجھے مغفلات بھی سنائیں جنہیں میں نے بڑی خندہ پیشانی سے سن لیا۔ حسن طارق صاحب بے حد غصے میں تھے کہ میری فلم کو تم سوسائٹی گرل کے نام سے لکھ رہے ہو۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے بعد میں سیف الدین سیف صاحب سے ملان کو سارلی بات بتا کر اپنی کہانی سنائی تو انہوں نے کہا، صرف کچھ کردار عیسائی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی دونوں کہانیاں منقسم ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ حسن طارق صاحب چونکہ

دہی: بڑھاپے کا سہارا

زیادہ عمر کے افراد میں ڈیری خوراک کے استعمال پر ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ خوراک میں دہی کا زیادہ استعمال بڑھاپے میں کوہنہ کی بڑی کو مضبوط بناتا ہے۔ مگر نہ کی وجہ سے بڑھاپے میں اس بڑی کے ٹوٹنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات مستقل معذوری پیدا ہو جاتی ہے۔ دہی کے استعمال سے بڑھاپے میں بڑیوں کی کمزوری کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ یہ تحقیق آئرلینڈ کے دو تعلیمی اداروں کے اشتراک سے ہوئی ہے۔

مرسلہ: بنشی عزیزے۔ لڈن دہاڑی

کردیا۔ سخت سردی کے دن تھے سلیمان صاحب کے پونچنے سے پہلے اپنا اکلوتا سونٹا اتارا اور کیلے فرش کی، رگڑ رگڑ کر اس سونٹے سے صفائی کر دی۔ سلیمان صاحب میری اس حرکت پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں نے ایسی deediction کسی اسٹنٹ میں نہیں دیکھی۔ نور! تم بہت آگے جاؤ گے۔“

اب کوئی بھی کام ہوتا تو وہ مجھے بلا لیتے۔ پان کھانے کے وہ شروع سے شوقین تھے۔ پان مجھ سے منگواتے تو فوراً لا کر دیتا۔ ایک دفعہ انہیں پان کی طلب ہوئی۔ مجھ سے کہا کہ پان لاؤ۔ تو میں نے جھٹ جیب سے پان نکال کر پیش کر دیا۔

سوسائٹی گرل کے زمانے میں کہانی سنانے طیب حسین زیدی کے گھر گیا تو سگیتا دروازے کی اوٹ سے کئی کہانی سن رہی تھی۔ زیدی صاحب نے کہا۔ کیوں نہ اس فلم کو جعفر شاہ بخاری سے بنوائیں۔ لہذا ایک دن زیدی صاحب مجھے ساتھ لے کر جعفر شاہ بخاری کے گھر پہنچ گئے۔ کہانی انہوں نے سنی تو کہا۔ ”یہ تو بہت bold سنجیک ہے۔ کیا انہیں ہوسکتا کال گرل پیسے لے کر آجائے اور اس کے ساتھ کچھ ہو بھی نہ۔ ہم بخاری صاحب کے گھر سے واپس آئے تو یہ طے ہوا کہ سگیتا بیگم سوسائٹی گرل کی ڈائریکشن دیں گی اور میں ان کو اسٹ کر دوں گا۔ اور آپ سب نے دیکھا کہ سوسائٹی گرل نے کیا رزلٹ دیا۔ اتفاق سے میری یہ فلم اور حسن طارق کی ”اولاد“ ایک ہی دن ریلیز ہوئیں۔ اولاد غلاب ثابت ہوئی اور سوسائٹی گرل کو کامیابی

آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں لہذا آپ سے درخواست ہے آپ ان کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اس طرح حسن طارق کا فہرہ کا نور ہوا۔“ یہ واقعہ شہر شاہ جی نے ایک لمبی سانس لی لہو لے۔ ”دوستو اور ساتھیو! میں بے حد صابر و شاکر بندہ ہوں۔ خبر سے 64 برس میری عمر ہو گئی ہے۔ میں کسی کی بات کا برا نہیں مانتا مگر اس SMS سے مجھے دلی دکھ ہوا ہے۔“ پھر انہوں نے پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ جب حسن طارق کی کچھ فلمیں غلاب ہوئیں تو انہوں نے مجھے اپنی پیر ہٹ فلم ”سنگدل“ کی کہانی مکالے اور اسکرین پلے لکھنے کے لیے بلایا۔ میں سید نور بن کر ان کے پاس گیا۔ میں بھول چکا تھا 1971ء کے اوائل میں ہونے والے واقعات کو۔ سنگدل ہٹ بلکہ پیر ہٹ ہوئی۔ کامیابی کی خوشی میں حسن طارق نے چند دوستوں کو یورینو اسٹوڈیو میں واقع اپنے آفس میں مدعو کیا۔ مجھے بھی بلایا تھا۔ میں پہنچا تو اٹھ کر گلے لگایا اور برملا کہا۔ ”یہ ہے میری فلم سنگدل کا رائٹر سید نور۔“ اللہ انہیں عزتی رحمت کرے۔

شاب کیرانوی صاحب نے بھی مجھ سے کہانی لکھوانی چاہی اور دس ہزار روپے مجھے ایڈوانس بھی دیے۔ جو میں نے شکر کیے کے ساتھ واپس کر دیے کہ وہ میرے ولی تھے۔ بزرگ تھے۔ بد قسمتی کہ وہ جلد دنیا چھوڑ گئے۔ آج الحمد للہ میں ان کے شاب اسٹوڈیو کا آئروں جہاں پیراگون فلم اکیڈمی بھی فعال ہے۔ SMS..... جس نے بھی بتایا وہ بھول گئے۔ ”ہم سے ہے زمانہ۔“ ”بولی۔“ ”مس سنگاپور۔“ ”زنجیر۔“ ”روٹی۔“ ”فیصلہ۔“ ”فقیریا۔“ ”بلندی۔“ ”خند۔“ ”آدم جی۔“ ”پھول۔“ ”خشل۔“ اور بہت سی فلموں کو کامیابی ملی؟ جن کا معنیف میں ہوں۔

میں غریب گھرانے کا فرد تھا۔ 70 سال کی دہائی میں اسکرین پیل اپنے گھر واقع منگلو وارڈ سے اسٹوڈیو جاتا تھا۔ میں خواب بنا کرتا تھا۔ سید سلیمان میرے حسن ہیں۔ ان کے ساتھ 18 فلمیں اسسٹ کیں۔ ایک دفعہ ”غیری صورت میری آنکھیں“ کے سیٹ پر کام ہو رہا تھا۔ ٹھہر دیا کہ ساتھ والے فلور پر ”تاج محل“ کے سیٹ پر جا کر SWEEPER کو بلا کر لاؤ اس سے فرش کی صفائی کرائی ہے۔ میں فوراً دوڑ کر گیا تو سوپر وہاں کام میں مصروف تھا۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ میں واپس آ گیا۔ سلیمان صاحب نے پوچھا۔ سوپر کیوں نہیں آیا؟ جاؤ اسے لے کر آؤ۔ میں پھر تاج محل کے سیٹ پر گیا تو سوپر نے پھر انکار

نصیب ہوئی۔ سوسائٹی گرل کے بعد تو اللہ کی کرم نوازی ایسی ہوئی کہ میں نے بیک وقت بیس بیس اسکرپٹوں کو پانگوں کی طرح لکھا۔ بس خیر کی اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ کبھی کبھی چونٹی بھی ہاتھی کو کھاتا ہے۔

”آپ کو یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔“ ذرا توقف کے بعد شاہ جی بولے۔ ”جب حسن طارق صاحب نے مجھے سنگدل کے لیے بلایا تو ان کے کمرے میں جاتے ہی میں نے بے ساختہ رونا شروع کر دیا۔ طارق صاحب گھبرا گئے۔“

”کیا ہو گیا بھائی؟ کیوں رو رہے ہو؟“ میں نے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں ہوا۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنی قلم کے لیے مجھے بلایا۔“

الحاج بندو خان ریسٹورنٹ میں سارے شرکائے عشا تیرہ تن گوش تھے اور شاہ جی گز رہے دنوں کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک انہیں صائمہ کی یاد آگئی اور بولے۔ ”سلطان راہی صاحب دنیا چھوڑ گئے تو لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ کہنا شروع کر دیا۔ ایسے میں نے اسے سہارا دیا اور اپنی اردو فلم گوگھٹ میں ایک مختصر کردار کر دیا۔ جس کے بعد ان کا تہا شدہ فلمی کیریئر دوبارہ بحال ہو گیا اور وہ باضابطگی کے ساتھ میری فلموں میں کام کرنے لگیں۔ میں نے اپنی کسی فلم کی ڈائریکشن دیتے وقت، جب سین سمجھاتے ہوئے صائمہ کا ہاتھ تھاما تو اس نے برجستہ کہا۔ ”شاہ جی! اب یہ ہاتھ نہ چھوڑنا۔۔۔۔۔۔“

اور پھر میں نے واقعی اس کا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ جنگل کوئین اور مجاہد کے درمیانی عرصے میں ہماری صائمہ سے شادی ہو گئی۔

کسی نے اس موقع پر ان سے یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت آپ نے رخسانہ نور کے بارے میں کیوں نہیں سوچا کہ اس طرح ایک اداکارہ کو بیوی بنانے پر ان پر کیا گزرے گی؟ یہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ یہ کوئی انٹرویو کا سلسلہ نہیں تھا۔ مہمان خصوصی کے طور پر وہ اپنی یادوں کے دریچے کھول رہے تھے اور سارے حاضرین جن میں ہمارے صحافی بھائیوں کی مقول تعداد بھی تھی اور اس وقت وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا ماحول تھا۔ البتہ جب شاہ جی گویا تھک کر ذرا رکے تو میرزا نواب حسن صدیقی نے ایک واقعہ سنایا۔

”ان دنوں کی بات ہے جب لاہور کے گلستان سینما میں بھارتی فلم ”مغل اعظم“ کی تھی اور میٹروپول سینما

مجاہد کے بڑے بڑے پوسٹرز آویزاں تھے۔ شان پاؤں میں گھٹکر دبانے اور ڈھونگ تھامے کھڑا تھا (پوسٹر میں) ہم گلستان سینما کے مالک لالہ جی کے ہاں ناشتے پر مدعو تھے۔ دورانِ ناشتا میں نے کہا۔ ”لالہ جی! میں جب آپ کے پاس آ رہا تھا تو میٹروپول پر مجاہد کی زبردست پہلی سنی نظر آئی اور مجھے سید نور کے تیور صبح نہیں دکھ رہے تھے۔ کیونکہ شان گھٹکر دبانے اور ڈھونگ تھامے حبِ عشق میں ڈوب کر گانا گانے گا۔۔۔۔۔۔ تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھا۔“

جی! مجھے نہ جانے کیوں خوفِ سائیکوس ہو رہا ہے کہ کہیں ”مغل اعظم“ کے شہنشاہ اکبر کا تخت مجاہد نے نالٹ دے۔“ میری بات سن کر لالہ جی پریشان ہو گئے کیونکہ گلستان سینما میں ”مغل اعظم“ کی تھی اور انہوں نے بڑا ایڈوانس دیا ہوا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مجاہد نے مغل اعظم کا جینا دو بھر کر دیا۔“

حاضرین نے مجاہد کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا۔ شاہ جی کے چہرے پر بھی مسرت کا نور صاف نظر آ رہا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی بات کا ری ایکشن دیکھ کر ایک اور واقعہ سنایا۔

ایک بار کارا قلم فینیل میں شرکت کے لیے میٹھس بھٹ کراچی آئے ہوئے تھے۔ اکثر کارا فینیل کی فلمیں نشاط میں دکھائی جاتی تھیں۔ میٹھس بھٹ نے مجھ سے کہا ”یار! یہ سید نور کتنا بڑا فلسفہ اور ہدایت کار ہے؟“ وہ اسی دن مجاہد دیکھ کر آئے تھے۔ ”یہ سید نور تو مجھ سے بھی بڑا فلسفہ اور ہدایت کار لگتا ہے۔“

میں نے بھٹ صاحب سے کہا۔ ”آپ کے پاس مجھ FINANCE ہے وہ نور کو میسر نہیں اور اسے سینا کو بھی حاصل نہیں۔ اب ان حالات میں اور اس کم بجٹ میں نور مجاہد جیسی فلمیں بناتا ہے تو میری نظر میں نور محبوب خان اور راج کپور سے کسی طور کم نہیں ہے۔“

نواب صاحب یہ واقعہ بتا کر ڈرار کے پھر گیا ہوئے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ سید نور کو اس قدر کیوں چاہتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں۔ ”دل دیا تو لگیا تو کون جاندے۔ میں جاندی نے میرا رسا جاندے۔“

حاضرین نے کھل کر ہتھ بٹھکا لگایا اور تقریب کشم زعفران بن گئی۔

سیریل کلر

شیراز خان

ہر معاشرے میں ایسے افراد بھی جنم لیتے ہیں جو صرف ذہنی
آسودگی کے لیے انسانی جان لینے سے ہچکتے نہیں ہیں۔ ایک
جیتے جاگتے شخص کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں کہ انہیں
خون بہانے سے لطف ملتا ہے۔ ایسے دہندے نما اشخاص ایک
دو نہیں، پچاس پچاس اور سو سو انسانوں کو قتل کر دیتے
ہیں۔

انسانی شکل میں ایسا کوئی درندہ کہیں آپ کے قریب تو نہیں ہے۔

یہ اصطلاح ان کے لیے استعمال کی جاتی ہے جنہوں
نے دو یا زائد انسانوں کا خون کیا ہو۔
پوری دنیا میں ایسے درندوں کا وجود رہا ہے۔ یہ لوگ
لشیائی مریض ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے مشہور
لوگ گزرے ہیں جن کا کام ہی خون بہانا تھا۔ ان کا شکار
عورتیں، مرد، بچے سب ہوتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کو خون بہا کر لذت محسوس ہوتی
ہے۔ سیریل کلر کی تعریف یوں ہے کہ وہ شخص جو تین یا زائد



کھائے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً پانچ لاکھ سال سے ساڑھے تین سال پہلے کے انسانوں نے اس عمل کا آغاز کیا۔ دو درجہ پید کے انسانوں میں بھی کئی گروہ ایسے نکلے جنہوں نے اس قبیلہ عمل کو دہرایا۔ پوری دنیا میں اس عمل کو دہرایا جاتا رہا۔ بلکہ ”جنگی“ کو تو کسی زمانے میں آدم خوروں کا جزیرہ کہا جاتا تھا۔

آدم خوری بنیادی طور پر دو طریقوں کی ہوتی ہے۔ اندرونی آدم خوری اور بیرونی آدم خوری۔

اندرونی آدم خوری وہ ہوتی ہے جس میں اپنے ہی قبیلے یا برادری کے انسان کو مار کر کھا لیا جاتا ہے اور بیرونی آدم خوری باہر کے کسی بندے کو پکڑ کر اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اس کی وجوہات میں سے شدید قحط، پاگل پن وغیرہ ہیں۔

child murder۔ بچوں کا قتل، یہ انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اس میں چھوٹے بچوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جیسے کسی سے دشمنی ہو، تو اس کے بچے کو مار کر دشمن کو ساری زندگی کے لیے ترسیا دیا جاتا ہے۔

آپ نے اس قسم کی خبریں سنی ہوں گی کہ ایک سوکن نے دوسری سوکن کے بچے کا خون کر دیا ہے۔ یا سونگی ماں باپ نے مار ڈالا۔ یا پھر تانہاد جادوگر کسی سے بچے کا خون طلب کر لیتے ہیں اور عقل کے اندھے کسی معصوم کا خون کر کے پیتے ہیں کہ ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔

تجبی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بچہ یا بچی کسی جرم یا گناہ کا عینی شاہد بن جاتا ہے تو اس کو مار کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

consensual homicide۔ بعض علاقوں میں اس قسم کی موت یا قتل کو قانونی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مریض کرب کی حالت میں ہو۔ اس وقت وہ التجا کرتا ہے کہ اسے موت دے دی جائے اور ڈاکٹر زکو بھی اس کے زندہ بچنے کی کوشش امید نہ ہو۔ تو اس حالت میں اس کو تکلیف سے بچانے کے لیے اسے مار دیا جاتا ہے۔ (ہمارے یہاں اس کی دوسری شکل سامنے آئی۔ اگر کوئی اپنے کسی پیارے کو مسلسل تکلیف میں دیکھتا ہے تو اس کے لیے دعا کی جاتی ہے کہ خدا اس کو موت آسان کر دے)

کرائے کے قاتل یا کرائے کے قتل۔ اس کا راجہ

پوری دنیا میں ہے۔ خود ہمارے یہاں بھی اس کی شکل

افراد کو قتل کرے۔ مختلف حکومتوں نے اس کی تعریف مختلف کی ہے۔ بعض کے نزدیک جو تین افراد کو قتل کر دے اسے سیریل کلر کی کٹیگری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بعض کے یہاں پانچ یا چھ افراد اور بعض کے نزدیک دس افراد لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بھی سیریل کلر ہوئے ہیں جنہوں نے سو سو آدمیوں کے خون کیے تھے۔

یہ ایک شدید قسم کی نفسیاتی کیفیت ہے، اس کو نفسیات دان **psychopaths** کہتے ہیں۔ بظاہر یہ نارمل لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود میں نفرت کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ یہ ہر ایک کو مار دینا چاہتے ہیں۔ کسی دشمنی، کسی جواز کے بغیر۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کو ہتھوڑا گرد پ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ گرد پ گھروں سے باہر سونے ہوئے لوگوں کے سروں پر ہتھوڑے مار کر انہیں ہلاک کر دیتا تھا۔

اس سنک کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ مذہبی جنونی بھی ہوتے ہیں۔ جنسی جنونی بھی اور خون دیکھ کر لذت حاصل کرنے والے بھی۔ امریکا کے ایک سیریل کلر وائس نے بہت سی عورتوں کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں شیطان کے چہرے دیکھا کرتا تھا اور دنیا کو شیطان سے بچانے کے لیے اس نے عورتوں کا خون بہانا شروع کر دیا تھا۔

رچرڈ جیمس اپنے مقتولین کا خون پیتا بھی تھا اور ایک ٹب میں خون جمع کر کے اس میں نہاتا بھی تھا۔

اس قسم کے قاتلوں کے چہروں پر ہرگز لکھا نہیں ہوتا کہ وہ ایک جنونی قاتل ہیں۔ بظاہر وہ عام سے ہوتے ہیں لیکن موقع ملتے ہی ان کے اندر کا درندہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو مارنے لگتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ خود کو گناہ گار بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں جو کچھ ہوا ہے ٹھیک ہی ہوا ہے۔

انسانی خون بہانے کی بے شمار وجوہات ہیں تو اس قسم کے قتال کا نام بھی الگ الگ ہے۔

assassination۔ یہ وہ قتل ہے جو کسی خاص مقصد سے کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ مقصد سیاسی ہو یا پیسوں کے لیے۔ پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا اساسی نیشن ہوا تھا۔ لیاقت علی خاں کا قتل بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

cannibalism۔ آدم خوری یا مرد خوری، اس عمل کو کہتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کا گوشت

ہاں ہے۔

Honor killing - غیرت کے نام پر قتل۔ یہ

ہاں بھی تقریباً پوری دنیا میں ہے۔ ہر سال دنیا کے کسی سے اندھا لک میں ہزاروں عورتوں کو ان ہی کے عزیز و اقارب کی جانب سے خاندان کی عزت و آبرو کے تحفظ کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ قاتلوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی عزت اور لہجہ خاندان کے نام سے جڑی ہے۔ اسی لیے انہیں جب بھی اپنے خاندان کی بدنامی کا اندیشہ ہونے لگتا ہے تو وہ موت کے نام پر قتل کرنے لگتے ہیں۔ یہ رسم بھارت، پاکستان اور عرب ممالک میں بہت حد تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ رسم پاکستان میں بلوچستان اور سندھ میں عام ہے۔ مہروراج کے مطابق اپنے خاندان کی (ان کے نزدیک) گمراہ عورت اور اس کے شرک جرم کو قتل کرنا جائز ہے اور فال مزاسے صاف بچ جاتا ہے۔

سندھ میں اس رسم کو کاروکاری کہتے ہیں۔ پنجاب میں والا کالی، خیبر پختونخواہ میں طور طورہ اور بلوچستان میں سیاہ لاری۔

اس رسم کا غلط استعمال کچھ یوں تھا کہ اپنے کسی دشمن کو ایلا دیکھ کر مار دیتے تھے اور اپنے خاندان کی کسی زیادہ عمر کی عورت یا بیٹی کو مار اس کی لاش دشمن کی لاش کے پاس ڈال کر لہا دیتے تھے کہ دونوں کو غلط کام کرتے دیکھا تھا اسی لیے مارا اور ان کا کچھ بگڑتا بھی نہیں تھا۔

قتل کی ایک اور رسم بھی تھی یا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بہت سے ملکوں میں اس قسم کے قتل ہوتے ہوں۔ یہ قتل دیویوں اور پوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہوا کرتے ہیں جس کو بھینٹ پڑھانا کہتے ہیں۔ عام طور پر بچوں کو اس درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

infanticide - شیر خوار قتل۔ یہ قتل عام طور پر ارگہ ہے۔ ایک کھنے سے لے کر چوبیس گھنٹوں تک کے بچوں کو غیرت یا مفلسی کے خوف سے قتل کر دیا جاتا ہے یا بولی کیفیت میں یہ معصوم دنیا سے رخصت کر دیے جاتے ہیں۔

mass murder قتل عام۔ ایک مختصر عرصے میں عام طور پر ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں کو قتل کرنے کا عمل ہے۔ اس کی بھی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عام طور پر ملکوں میں قتل عام ہوا کرتا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو جیسے لوگوں نے

قتل عام کروایا تھا۔ حالیہ دنوں میں برما میں ہونے والے فسادات ہیں جن میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس کے علاوہ (مشرقی پاکستان میں چلنے والی) بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران ہزاروں مردوں اور عورتوں کو مار کر پھینک دیا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت لاکھوں افراد۔۔۔ اس وحشت اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔

بد قسمتی سے ہمارے یہاں جو آرڈی پبلک اسکول کا ساتھ ہوا تھا وہ بھی اسی کمیونٹی میں آتا ہے۔ آج بھی ایسی خبریں آیا کرتی ہیں کہ دشمنی کی بنا پر گھر میں گھس کر پورے کے پورے خاندان کو مار دیا گیا۔

ایسے قاتل نفسیاتی طور پر اس درجہ بے حس ہوتے ہیں کہ مقتول کے تڑپنے، مقتول کے جسم سے اگلے خون کو دیکھ کر لطف محسوس کرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں اور خود کو نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی چند قاتلوں کا مختصر مختصر تعارف کرادوں۔

Zodiac killer:

اس قاتل نے اپنا بھی نام مقرر کیا تھا۔ وہ ہر قتل کے بعد ایک خط پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیا کرتا تھا۔ جس میں وہ بتاتا تھا کہ اس نے فلاں مقام پر کسی کو مار کر ڈال دیا ہے اس کی لاش جا کر اٹھا لو۔

یہ قاتل 1960ء اور 1970ء کے درمیان کیلی فورنیا میں فعال رہا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے 37 افراد کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنے خطوط میں ایک خاص قسم کی علامت بناتا تھا وہ علامت ایک دائرہ ہوتا تھا جس کو کراس کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی اصل شناخت کیا ہے۔ اس کی حالات زندگی اس لیے دستیاب نہیں ہے کہ یہ شخص بھی قانون کی گرفت میں نہیں آیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کی فائل بند کر دی گئی کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو پھر ایک خط موصول ہو گیا اور فائل کھول دی گئی۔ اس کی فائل ابھی تک کھلی ہوئی ہے۔ وہ جو خطوط لکھتا تھا وہ اس قسم کے ہوتے تھے۔ ”میں زوڈیاک ہوں اور یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میں نے فلاں شخص کو فلاں مقام پر مار کر ڈال دیا ہے اس کو مارنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک انسان تھا اور مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ کیوں کہ روئے زمین پر انسان سے بری کوئی مخلوق نہیں ہے۔ اس کو مرنا چاہیے اور میں یہی کام کر رہا ہوں۔ یہ عورتیں مرد بچے سب کے سب خبیث ہیں۔ میں ان کا خاتمہ کر رہا ہوں۔“

اس نے زیادہ تر نوجوانوں کو مارا تھا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ڈیوڈ آرتھر (سترہ برس) اور بیٹی کوئنسن (سولہ برس)۔ ان دونوں کو مئی دسمبر 1968ء کو ”ہیل ہرماں“ کے پاس گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ مائیکل ریناٹ کو بارکنگ میں گولی ماری گئی۔ پال لی کو سر میں گولی ماری گئی۔ اس قسم کے جیسیوں قاتل ہیں جن کے نام مضمون کی طوالت کی وجہ سے دئے نہیں پایا۔ یہ قاتل یا تو اب تک آزاد گھوم رہا ہے یا پھر مر چکا ہے اس بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔

گامسکن:-

یہ نام خوف اور دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اتنی سے نوے لوگوں کو قتل کیا ہے (سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں یہاں اگر کسی حساس شخص کی کار کے پیچھے جلی بھی آکر مر جائے تو اس کا افسوس کرتے رہتے ہیں)۔ ڈونالڈ ہنری گامسکن ایک ایسا شخص تھا جو دیکھنے میں بہت مہذب دکھائی دیتا تھا لیکن کون جانتا تھا کہ اس کے وجود میں کیسا بھیڑیا چھپا ہوا ہے۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ ہائی ویز سے لوگوں کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور انہیں تشدد کے ذریعے مار دیتا تھا۔ اس کا طریقہ بہت بے رحمانہ تھا۔ یہ شخص 1933ء میں ساؤتھ کیرولینا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی بہت ستم زدہ گزری ہے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس کی ماں نے اس کے باپ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا لیکن اس دوران اس کی ماں شواہیاں کرتی رہی اور اس کے ہر نئے شوہر کا رویہ گامسکن کے ساتھ بہت بے رحمانہ ہوتا تھا۔ وہ سب اسے بری طرح پیٹتے تھے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس نے ایک بوتل مٹی کا تیل پی لیا تھا جس کے اثرات اس پر عمر بھر رہے۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ راتوں کو اٹھ کر چیخنے بھی لگتا تھا۔ اسے بیماریاں خواب سنایا کرتے تھے۔ اس کو معاشرے نے ایک عرفیت دی تھی ”پی دی“۔ یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ گامسکن کو اپنے اصل نام کا پتا اس وقت چلا جب اسے پہلی بار عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا جرم بارہ تیرہ برس کی عمر میں کیا تھا۔ اس نے کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر چوریاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لڑکی کا رپ بھی کیا تھا۔ اس کو یہ جرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے اصلاح خانے بھیج دیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ مغرب میں انسانی ہمدردی اور

انسانی حقوق کے نام پر ایسے مجرموں کو سخت سزا نہیں جاتی۔ دو تین سال کی سزا ہوتی ہے اور جب وہ باہر آتا ہے پہلے سے زیادہ مکروہ بن جاتا ہے۔

جن دنوں وہ اصلاح خانے میں تھا تو وہاں بھی اس کے ساتھ مسلسل زیادتی ہوتی رہی۔ یہ زیادتی اس کے ساتھ کیا کرتے تھے جو اس سے زیادہ طاقت ور تھے شاید ان سب باتوں نے اسے انتاح کر دیا تھا۔

1951ء میں جب وہ اٹھارہ سال کا تھا تو اسے اصلاح خانے سے فرار ہو گیا۔ اسے تباہ کوکے کھیتوں میں لپکے مار کر ہلاک کر دیا۔ تفتیش کے دوران اس نے بتا کہ اس لڑکی نے اس کی توہین کی تھی جو وہ برداشت نہیں کر سکا۔ اسی لیے اس کا خون کر دیا۔ 1953ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا جہاں اس نے ایک سرکاری اہل کار کا خون کر دیا۔ اس بار اسے مزید تین سال کی سزا ہو گئی۔

1955ء میں وہ کچرے کے ٹرک میں چھپ کر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن جلد ہی وہ پھر گرفتار ہو گیا اور بے رول پر رہا ہوا لیکن کچھ عرصے بعد پھر گرفتار عملی میں آئی۔ اس بار اس کا جرم اور بمیاب تھا۔ اس نے تین قتل کیے تھے۔ انتہائی تشدد کے ساتھ۔ اس پر ایک بار الزام یہ بھی تھا کہ وہ اپنے شکار کو بار کران کا گوشت کھاتا تھا۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے اتنی سے لے کر نوے انسانوں کا خون کیا ہے۔ ان میں دو سال کی بچی بھی شامل تھی۔ اس نے ڈنار لے نام کے ایک اخباری رپورٹر کو مار پوری کہانی سنائی تھی۔

اس کی زندگی پر کئی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس انجام یہ ہوا کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

سوتو میوازاکی:- sutomu Miyazaki
اس کا تعلق جاپان سے تھا اور یہ موجودہ دور کا ایک انتہائی بے رحم سیریل کھڑ تھا۔ اس کو انسانی ڈرنگولا بھی کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ اپنے شکار کا خون پیتا تھا اور سب سے ظالماہ بات یہ تھی کہ صرف چھوٹی چھوٹی بچیوں کا خون کرتا تھا۔

ایسی بچیاں جو دس گیارہ برس سے زائد کی نہیں ہوتی تھیں۔ یہ بے رحم نہ صرف ان کا خون کرتا بلکہ ان کے ساتھ زیادتی بھی کرتا تھا۔ اس نے بھی ایک محروم اور انتشار والی زندگی گزاری تھی۔ اس کی پیدائش 1960ء میں ٹوکیو کے

اہل لواطی علاقے میں ہوئی تھی۔ یہ pre mature اس کا ایک ہاتھ مفلوج جیسا تھا۔ اس لیے یہ احساس اس کے ساتھ زندگی بھر رہا تھا۔ پھر گھر کے بگڑے ہوئے حالات نے اسے اور ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابتداء میں نوکیوں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہو رہا تھا لیکن پھر اس کی ریسٹلنگ خراب ہونے لگی۔ اس کو کبھی بالیوڈسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا۔ پہلے وہ انگلش پڑھ کر استاد بننا چاہتا تھا لیکن داخلہ نہیں ملا تو اس نے نو فوٹو میٹنگ بننے کے لیے داخلہ لے لیا۔ اس کے باپ کا ایک اخبار تھا۔ مقامی طور پر وہ ایک معروف صحافی تھا لیکن ساتو موکو صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے اندر ہر وقت ایک طوفان برپا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی ایک بڑی بہن کو اس وقت دیکھنے کی کوشش کی جب وہ غسل خانے میں تھی۔ بہن نے جب شور مچایا تو سو تو سونے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا پر اہلم احساس کتری تھا۔ وہ عام سی گل کا آدی تھا جس کی خواہشات پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ ایک تو اس کا ہاتھ مفلوج تھا پھر وہ چلی ہوئی جنسیت کا انسان تھا۔ اسی لیے اس نے محسوس کیا کہ وہ بڑی عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس نے چھوٹی عمر کی بچیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور پھر اس کی درندگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہوتا یہی ہے۔ اس قسم کے لوگ عام طور پر ذہنی مریض ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ ابتداء میں ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے اور وہ اس قسم کی وارداتیں کرنے لگتے ہیں۔

1988ء سے لے کر 1989ء کے دوران (یعنی صرف ایک سال میں) اس نے چار لڑکیوں کا بھہانہ خون کیا۔ ان لڑکیوں کی عمریں چار سے نو برس تک تھیں۔ اس نے اپنے ایک شکار کا خون بھی پیا تھا اور اس کا ایک ہاتھ بھی کھا گیا تھا۔

اخبارات چیخ اٹھے تھے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ دن کے وقت اس کے معمولات نارمل ہوا کرتے تھے۔ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر اس بے ضرر نظر آنے والے انسان کے اندر ایک خبیث روح موجود ہے۔ ایک انتہائی بے رحمانہ فعل یہ تھا کہ وہ ہر قتل کے بعد اپنے شکار کے گھروالوں کو ایک خط بھیج دیتا تھا جس میں مرے لے لے کر بتایا کرتا کہ اس نے کس طرح ان کو کیا۔ کس

وادی سندھ کی تہذیب میں بڑے شہر بسانے کا رجحان 2500 ق م میں اپنے عروج کو پہنچ گیا جیسا کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اس تہذیب کی زیادہ معروف اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں، شاندار شہری منصوبہ بندی، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں اور چھوٹے چھوٹے گھر، وسیع پیمانے پر اجتماعی پیداوار، ثقافتی چیزوں کی بناوٹ کا اعلیٰ معیار، مثلاً بت، مجسمے، مہر، مٹی کے برتن، دور دراز فاصلوں تک بیرونی تجارت کا اہتمام، معاشرے کی طبقاتی تقسیم اور رسم الخط کی ترقی۔ آب نکاسی کا نظام موجودہ بہترین شہروں کے مقابلے پر تھا۔ چھوٹی چھوٹی تالیاں بڑی تالیوں میں آکر ملتی تھیں۔ ہرنالی پنڈت اور اوپر سے اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حفظان صحت کے اصولوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان قدیم کھنڈروں میں موئن جو دڑو کا حمام اور ہڑپہ کا انانج گھر قابل ذکر ہیں۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو میں وادی دجلہ و فرات کے سویری شہر، بابل و نینوا کے محلات کی طرز کے محلات نہیں ملتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرز حکومت جمہوری اور عوامی تھا لیکن ان لوگوں کی مذہبی زندگی پر کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ کوئی مندر وغیرہ نہیں ملتا اور نہ قدیم مصر کی طرح یہاں اہرام اور مقبرے تعمیر کیے گئے۔ یہاں گندم اور جو بکثرت ہوتا تھا۔ لوگ گھریلو پالتو جانوروں کے علاوہ دریائی جانور مگر مچھ، مچھلی، کچھوا اور کھٹے جنگلوں کے درندے چیتا، گھریال، ہاتھی، گینڈا، زبیرا وغیرہ سے واقف تھے کیونکہ مہروں پر یہ تمام جانور نہایت مہارت سے بنائے گئے ہیں۔

مرسلہ: قرۃ العین، افراسی، کراچی

طرح قتل کیا اور کس طرح ان کے ساتھ زیادتی کی۔ جس دن اس کی جھبیسوں سالگرہ تھی اس دن اس نے ایک اور چار سالہ بچی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ وہ بچی اپنی ایک دوست کے گھر کے باہر کھیل رہی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اسے

لاٹج دے کر اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ اسے ایک ہل کے نیچے لے گیا جہاں اس نے بچی کو مارا پھر اس کی لاش کی بے رحمی کی۔

اس نے اس بچی کے کپڑے اتار کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس نے بچی کی ہڈیوں کا سفوف بنا کر ایک پارسل میں وہ کپڑے اور وہ سفوف اس بچی کے گھر بھیج دیئے۔ اس نے ایک خط بھی لکھا تھا کہ اپنی بچی کی باقیات سنبھال کر رکھ لو۔

اس طرح کی اور بھی وارداتیں وہ کرتا چلا گیا۔ اس نے ایک دہشت پھیلا دی تھی۔ والدین بچوں کو تنہا نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کی گرفتاری بھی اتفاق سے ہوئی۔ ایک پارک میں ایک بچی کھیل رہی تھی۔ وہ دور بین سے اس بچی کا جائزہ لے رہا تھا۔ بچی کے والدین نے یہ دیکھ لیا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے آکر اسے گرفتار کر لیا۔

وہ کوئی جواز نہیں پیش کر سکا بلکہ الٹے سیدھے بیان دینے لگا۔ پولیس نے اس کے فلیٹ کی تلاشی لی، اس تلاشی میں انہیں اس درندے کے خلاف بہت سے ثبوت مل گئے۔ اس نے جن بچیوں کو ہلاک کیا تھا ان کے کپڑے ویڈیو فلمیں، ہڈیوں کے سفوف اور سب سے بڑھ کر اس قسم کے خطوط جو وہ والدین کو بھیجا کرتا تھا۔ جب تفتیش کی گئی تو اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔

30 مارچ 1990ء کو اس کی ٹرائل شروع ہوئی اور 2001ء میں موت کی سزا سنائی گئی۔

احمد سراجی:- Ahmed Suradji

ایک انڈونیشی سیریل کُمر۔ اس کی پیدائش انڈونیشیا کے علاقے میڈان میں دس جنوری 1949ء کو ہوئی۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے چالیس عورتوں اور لڑکیوں کو قتل کیا تھا۔ جن کی عمریں سترہ سال سے چالیس کے درمیان تھیں۔ یہ بے رحم شخص جادو کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں یا لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اسے بے پناہ ثروت حاصل ہو جائے گی۔

اس کے گھر کے پیچھے گنے کا کھیت تھا جہاں وہ لاشوں کو اس اینگل سے دفن کرتا تھا کہ ان کے رخ اس کے گھر کی طرف رہیں۔ اس طرح اس کے خیال کے مطابق جادو کا اثر جلدی ہو سکتا تھا۔

اس نے اپنے اعترافی بیان میں کہا کہ ایک بار اس

کے مرحوم باپ کی روح اس کے خواب میں آئی تھی جس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں کو مار کر ان کا خون پی لے تو اس کو بے پناہ طاقت مل جائے گی۔

اس نے کہا کہ تفتیش کے درمیان بتایا کہ وہ جلد از جلد یہ کتنی پوری کرنا چاہتا تھا لیکن صرف چالیس ہی کو مار سکا ہے۔ یہ اس کی ناکامی ہے اگر وہ ستر کی کتنی پوری کر لیتا تو اس کو طاقت مل جاتی پھر پولیس اس کو بھی گرفتار نہیں کر پاتی۔

24 اپریل 1997ء کو سری دیوی نام کی ایک لڑکی نے ایک رکشا ہار کیا۔ اس نے رکشا چلانے والے کو اپنی منزل بتائی اور گنے کے کھیتوں کے پاس اتر گئی۔ دو دنوں کے بعد اس کی لاش دریافت ہوئی۔ یہ لاش ایک مقامی شخص نے دیکھی تھی۔ اس نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس نے ثبوت کی تلاش میں چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ احمد سراجی کا گھر قریب ہی تھا۔ پولیس والے یوں ہی سرسری معلومات کے لیے احمد کے گھر پہنچ گئے۔

پہلے تو وہ انکار کرتا رہا کہ اسے نہیں معلوم کہ کس نے قتل کر کے لاش کھیتوں میں پھینک دی ہے لیکن اتفاق سے تلاشی کے دوران احمد کے گھر سے سری دیوی کا پنڈ بیک اور اس کا برآمدہ دستیاب ہو گیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ ابھی تک یہ صرف شبہ تھا لیکن جب اس نے اپنے جرائم اور قتل کی وارداتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا تو پولیس والے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس نے اسی کھیت میں چالیس لاشوں کو دفنانے کا اعتراف کیا تھا۔ کھدائی کے دوران ان لاشوں کی باقیات مل گئی تھیں۔

اسی اعتراف میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے باپ کی روح اس کے خواب میں آکر کہا کرتی ہے کہ بس شاباش۔ تمہارا خون اور۔ اس کے بعد قوت مل جائے گی۔ اس نے بتایا کہ وہ مارنے کے بعد اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق لاش کا خون بھی پیتا تھا۔

جولائی 2008ء میں اس بے رحم شخص کو فائرنگ اسکوڈ کے سامنے کر دیا گیا جہاں درجنوں گولیوں نے اس کو بمون کر رکھ دیا۔

اس قسم کے پاگل اور جنونی بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی ہیں۔ جو دولت کے لیے طاقت کے لیے بچوں کی قربانیاں دیا کرتے ہیں اور وہ یہ سارا فعل باباؤں کے کہنے پر کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کے جرائم کی اصل وجہ وہ بابا ہوا

سیلفی لیتے ہوئے ہلاکتیں

ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں سیلفی لیتے ہوئے سب سے زیادہ افراد بھارت میں ہلاک ہوئے۔ موبائل کیمرہ ایجاد ہونے کے بعد سیلفی کی وبا نے ہر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ بچے ہو یا بڑا ہر شخص سیلفی کے نشہ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ لیکن دیگر منشیات کی طرح بسا اوقات سیلفی کا نشہ بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ خطرناک جگہوں پر سیلفی کی کوشش کے دوران ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور زخمی ہو چکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق مارچ 2014 سے ستمبر 2016 تک سیلفی لیتے ہوئے 127 افراد ہلاک ہوئے جن میں سے سب سے زیادہ 76 بھارت میں ہوئیں۔ امریکی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 2014 کے دوران ملک بھر میں 33 ہزار افراد ڈرائیونگ کے دوران سیلفی لیتے ہوئے زخمی ہوئے۔ امریکا کی کارنگی میلن یونیورسٹی اور بھارتی جامعہ اندرا پراسٹا انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن و ہلپی کے محققین نے "سی، مائی سیلف ایڈ ماڈل کی" کے نام سے مشترکہ طور پر یہ تحقیق کی ہے۔ جان لیوا سیلفی کو "کل نی" کہا جاتا ہے۔ 2013 میں آکسفورڈ ڈیشنری نے سیلفی کو سال کا لفظ قرار دیا۔ انسان میں مشہور مقبول اور ہر دل عزیز بننے کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ انہی جذبات کے تحت انٹرنیٹ صارفین اپنی بہترین سے بہترین انفرادی یا اجتماعی تصاویر بھیج کر فیس بک، ٹویٹر، انسٹا گرام سمیت سماجی رابطوں کی مختلف ویب سائٹس پر اپ لوڈ کرتے ہیں اور لوگوں سے لائکس اور شیئرز کی شکل میں خوب واہ واہ وصول کرتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ لوگ مقدس مقامات پر بھی عبادات میں دل لگانے اور توجہ مرکوز کرنے کی بجائے سیلفی کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لاکھس اور شیئرز کے حصول کے لیے خطرناک مقامات پر بھی سیلفی لینے کا رجحان بڑھ رہا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: علی سبانی، ملتان

لرتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے معاشرے کو ایسے باباؤں سے کب نجات ملے گی؟
لوئیس گراوٹیو۔

یہ سیریل کلر شاید سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے اندازاً تین سو بچوں کا خون کیا تھا جب کہ اس نے اپنے اعتراف میں صرف ایک سو چالیس کا ذکر کیا ہے۔
یہ شخص 1957ء میں کولمبیا میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اپنے والدین کی ساتویں اولاد تھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور اس درجے کا اسے اپنا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا۔

نئے نئے وہ لوئیس کو بے تحاشا مارا کرتا اور اس کی ماں بھی اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ ان سب باتوں نے اسے گھر سے متنفر کر دیا۔ باپ کے خلاف نفرت تو کبھی ہی۔ ایک بار وہ اپنے باپ کو زخمی کر کے گھر سے فرار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔

اس کے بعد اس کی زندگی بہت دشوار رہی۔ اس نے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دیں اور اپنے آپ کو کسی طرح زندہ رکھنے لگا۔

دیکھا بھی گیا ہے کہ اس قسم کے محرکات کی جڑیں بچپن سے جا کر ملتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جوان ہو کر اچانک ہی اس قسم کا مجرم بن گیا ہو بلکہ اس قسم کے جرائم کے تانے بانے بچپن کی محرومیوں سے جا کر مل جاتے ہیں۔

لوئیس کے جاننے والے اسے ایک ہمدرد اور پر خلوص انسان سمجھتے تھے۔ یعنی اس کے دو چہرے تھے۔ ایک چہرہ مہربان اور رحم دل تھا جب کہ دوسرا انتہائی بے رحم اور سنگ دل۔ وہ دوستوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ہنسا بولتا، یعنی اس میں کوئی ایسی علامت نہیں پائی جاتی تھی جو اس کے قاتل ہونے کا پتہ دے سکے۔ وہ عام انسان کی طرح رہا کرتا تھا۔

لوئیس کا طریقہ واردات کچھ یوں تھا کہ وہ چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچوں کو اپنا شکار بنایا کرتا۔ بچے گھر بچے، بھٹکے ہوئے بچے۔ اس زمانے میں کولمبیا میں خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بہت سے بچے بے گھر ہو گئے تھے۔

لوئیس ایسے ہی بچوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ وہ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ ان کو کھانے پینے کی چیزیں دلاتا، پیسے دیتا اور وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگتے تھے، تو ان کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کا خون کر دیتا تھا۔

وہ اپنے شکار کو سنان علاقوں میں لے جاتا اور اس پر

قابو پاک کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بے بس کر دیتا تھا۔ منہ میں پینز اٹھوٹس دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنا شیطانی کھیل کھیلتا، پھر ٹرل کر دیا کرتا تھا۔

جائے واردات پر شراب کی خالی بوتلیں بھی پائی گئی ہیں یعنی وہ اذیت دینے سے پہلے شراب نوشی بھی کرتا تھا۔

1992ء کے آغاز میں کولمبیا کی گلیوں سے چھ سے

سولہ سال تک کے بچے جب غائب ہونے لگے تو ایک ہنگامہ

مچ گیا لیکن اس وقت تک حکام نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کیوں کہ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ان واقعات کو

گمشدگی کا کیس سمجھا گیا۔ یہ سلسلہ 1998ء تک چلتا رہا۔

پھر ایک دن ایک پہاڑی کے پاس دو بچوں کی لاشیں برہنہ

حالت میں پائی گئیں۔ دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے

اور انتہائی بے رحمی سے ان کی گردنوں کو کاٹ دیا گیا تھا۔ اب

پولیس متوجہ ہوئی۔ ایک ہفتے کے بعد اسی مقام سے کچھ قاصلے

پرایک اور لاش ملی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ اس لاش کے

پاس ایک نوٹ بک بھی ملی جس پر ایک پتا اور نام درج تھا۔ یہ

نام ایک لڑکی کا تھا جو لوئیس کی دوست تھی۔ پولیس فوری طور پر

اس پتے پر پہنچ گئی۔ وہ لڑکی مل گئی۔ اس نے بتایا کہ اس نے کئی

مہینوں سے لوئیس کو نہیں دیکھا ہے۔

اس لڑکی نے پولیس کو ایک بڑا سا بیک دیا جو لوئیس اس

کی تحویل میں دے گیا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اس نے اب

تک اس بیک کو کھول کر نہیں دیکھا۔ اس بیک کو جب کھول کر

دیکھا گیا تو اس میں سے لوئیس کے خلاف بے شمار شواہد اور

ثبوت مل گئے۔ لڑکوں کی تصویریں۔ ہر خون کے بعد ایک

لذت بھرا اعتراف اور بھی بہت کچھ۔ اس نے یہ بھی لکھ رکھا تھا

کہ اس نے فلاں لڑکے کو کہاں سے اٹھایا تھا۔ اس کو کہاں

لے گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

لڑکی نے لوئیس کا پتا بتا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ خود بھی یہ

سب دیکھ کر چمکا کر رہ گئی تھی۔ لوئیس کے پتے پر چھاپہ مارا گیا

لیکن وہ مکان خالی تھا۔ لوئیس نہیں مل سکا تھا۔ لوئیس کی

گرفتاری 22 اپریل 1999ء کو ہوئی۔ اس قسم کے ہر قاتل

کی طرح اس نے بھی شروع میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے

کی کوشش کی لیکن جب اس کی ڈائری اسے دکھائی گئی اور اس

کی دوست لڑکی نے جب اسے یہ بتایا کہ اس کا بیک اسی نے

پولیس کے حوالے کیا تھا تو اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کرنا

شروع کر دیا۔ اس نے ایک اجتماعی قبر بھی تیار کر رکھی تھی۔ اس

میں سے ساٹھ بچوں کی باقیات ملیں۔

کولمبیا میں چونکہ موت کی سزا نہیں ہے اس کے علاوہ

تیس سال سے زیادہ کسی کو قید میں بھی رکھا نہیں جاسکتا۔ اسی

لیجے اسے تیس سال کی انتہائی سزا دی گئی لیکن جب اس کو سزا

دی گئی تو اس کے خلاف کولمبیا میں ایک شدید قسم کا احتجاج

شروع ہو گیا۔ مطالبہ تھا کہ ایسے بے رحم درندے کے لیے

قانون کو بدلا جائے۔ موت کی سزا ہونی چاہیے۔

الیکو نڈر پی چسکن: Alexander

Pichushkin

روس کا سیریل کلر۔ اس کی نوعیت ہی سب سے الگ

تھی۔ الیکو نڈر شطرنج کا کھلاڑی تھا۔ وہ شطرنج کی بساط

سامنے رکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ اس کی پیدائش

1974ء میں ماسکو کے نواح میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو

کچھ بھی ہوا وہ حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ وہ ایک نازل

بچہ تھا جس طرح کے دوسرے بچے ہوا کرتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے

ہوئے۔ ایک بار وہ ایک پارک میں بچوں کے ساتھ جھولا

جھولتے ہوئے منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے سر کے اگلے حصے کو

چوٹ لگی تھی۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ پتا چلا

کہ اس کے دماغ کا وہ حصہ متاثر ہو گیا ہے جو ذہنی توازن

برقرار رکھتا ہے۔ اس قسم کی چوٹ کے بعد عام طور پر مزاج

میں تشدد کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

وہی ہوا۔ الیکو نڈر کے مزاج میں ضد شامل ہو گئی۔ لڑنا

بھڑنا شروع کر دیا۔ گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے۔ اس

کے اسکول سے شکایات آیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں نے اسے

اس اسکول سے ہٹا کر ایک دوسرے اسکول میں داخل کر دیا

لیکن اس کے مزاج کی تبدیلی بڑھتی چلی گئی۔

دوسرے اسکول میں اس کے سماجی بچوں کا رویہ اس

کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اسے پاگل پاگل کہہ کر چھیڑا کرتے

تھے۔ اس بات نے اس کے اندر ایک درندے کی پرورش

شروع کر دی۔ اب وہ بظاہر خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے

اندرا یک خونخوار درندہ پروان چڑھنے لگا تھا۔

ماہرین نفسیات نے اس کے باپ کو مشورہ دیا کہ اسے

کوئی گیم سکھائیں۔ شاید اس طرح اس کے مزاج کا رخ بدلا

جاسکے۔ اس کا باپ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ اس نے الیکو نڈر کو

بھی سکھانا شروع کر دیا۔ یہ کھیل الیکو نڈر کو اپنے مزاج کے

مطابق معلوم ہوا۔ اس نے وچپی یعنی شروع کر دی اور اس

کے باپ کو محسوس ہوا کہ وہ اچھا خاصا کھیلنے لگا ہے۔

ہی ضروری ہے جتنا تمہارے لیے کھانا اور سانس لینا۔
ماہرین نفسیات نے اس عمل کو اپنی سوشل پرسنالٹی
ڈس آرڈر قرار دیا تھا۔

ایلیونڈراس وقت گرفتار ہوا جب ایک عورت کی لاش
اس پارک میں پائی گئی جہاں وہ وقت گزارا کرتا تھا۔ اس لاش
کے پاس ماسکو میٹرو کا ٹکٹ تھا۔ اس کی مدد سے پولیس
ایلیونڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس نے پچاس کے قریب کل کا اعتراف کیا اور اس
بات پر انہوں نے اظہار کرتا رہا کہ اسے ٹارگٹ مکمل کرنے کا
موقع نہیں ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ شطرنج کے چونسٹھ خانوں
کے حساب سے چونسٹھ کل کرنا چاہتا تھا۔

چارلس ایلمنڈ:-

اس شخص کو قاتل فرشتہ کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے
اپنے آپ کو فرشتہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا فرشتہ جو بیمار اور
پریشان انسانوں کی مدد کے لیے آسمان سے اتارا گیا ہے۔
چارلس 1960ء میں نیو جرسی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے
والدین کی آٹھویں اور آخری اولاد تھا۔ جس وقت وہ پیدا ہوا
اس کا باپ ایک بس ڈرائیور تھا اور جب وہ سات مہینوں کا تھا
تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی نفسیات کچھ عجیب
ہی تھی۔ اس میں بچپن ہی سے خودکشی کا رجحان تھا۔ اس نے
پہلی کوشش اس وقت کی جب وہ صرف نو برس کا تھا۔ اس کے
بعد وہ جب تک زندہ رہا۔ اس قسم کی کوششیں کرتا رہا تھا۔ اس
نے تعلیم حاصل کی اور اسے امریکن نیوی میں ملازمت مل
گئی۔ وہ اپنی آفیسر کے عہدے تک پہنچ گیا۔

اپنی ملازمت کے دوران اس نے سات مرتبہ خودکشی
کی کوشش کی تھی۔ بالآخر اسے میڈیکل گراؤنڈ پر 1984ء
میں نیوی سے فارغ کر دیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اس
نے نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنی شروع کر دی۔ اپنی کلاس
میں وہ واحد مرد تھا۔ اس کے علاوہ سب عورتیں تھیں۔ اس کی
ماں کا بھی ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اکیلا ہی
تھا۔ بھائی بہن تو تھے لیکن اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
اس کو اپنی زندگی خود ہی گزارنی تھی۔

اس نے نرسنگ کا امتحان پاس کر لیا اس کے بعد ایک
اسپتال میں اسے میل نرس کی ملازمت مل گئی اور یہاں سے
اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ نہ جانے ایسے لوگوں
کے ذہنوں میں کیا ہوتا ہے۔ یہ خود کو نجات دہندہ سمجھنے لگتے
ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو دکھوں سے نجات

شہر کے ایک پارک میں شطرنج کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔
اس کے باپ نے اس کو ان مقابلوں میں شریک کر دیا جہاں
اس نے اپنے سے کئی گنا زیادہ عمر کے شاطروں کو شکست
دے دی۔ اب اس کے چار چاند بن گئے راستہ مل گیا تھا۔
اسی دوران اس کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ الیکوئٹر
اپنے دادا سے بہت قریب تھا۔ دادا کی موت نے اس کے
ذہن پر برا اثر ڈالا۔ اس نے دوڑ کا پتلی شروع کر دی۔ وہ
نشے میں رہنے لگا تھا۔ اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ شراب
لوٹی اور شطرنج کھیلنا۔ وہ پارک میں جا کر مقابلہ کیا کرتا۔ اس
پارک میں بہت سے شاطر آپا کرتے تھے۔ ایک دن اس پر
ایک انکشاف ہوا کہ چھوٹی عمر کے بچے اس کو بہت
attract کرتے ہیں۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا
شروع کر دیا۔ ان کو لالچ دینے لگا۔ ایک دن وہ ایک کم عمر
بچے کو اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ اس کا فلیٹ ساتویں
منزل پر تھا۔ بچہ اس کے ہکا دے میں آکر اس کے ساتھ چلا
آیا تھا۔ اس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی بچے کو بے بس کر
کے اس کی ٹانگیں باندھ کر اسے کھڑکی سے لٹکا دیا اور دمکی دی
کہ اگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اسے نیچے کرادے
گا۔ بچہ رونے لگا اور اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔

اس طرح اس کے ایک گناؤں نے مشغلے کا آغاز ہو گیا۔
اس نے پہلا معلوم قتل 1992ء میں کیا تھا۔ یہ سلسلہ
2001ء تک جاری رہا۔

اس کا طریقہ واردات مختلف تھا۔ وہ پارک میں جا کر
ایسے بچوں کو تلاش کرتا جو آوارہ گرد یا بھکاری ہوں۔ وہ ان کو
دوڑ کا لالچ دے کر اپنے فلیٹ میں لے آتا۔ جی بھر کر دوڑ کا
پلٹا اور جب وہ نشے میں مدھوش ہو جاتے تو ان کو قتل کر کے
ان کی کھوپڑی میں سوراخ کرتا اور دوڑ کا کی بوتل اس شکاف
میں ٹھونس دیتا۔

اس کے بیانات بھی بہت عجیب ہیں۔ اس نے کہا کہ
جب وہ کسی کو قتل کرتا ہے تو خود کو حاکم محسوس کرنے لگتا ہے۔
کیونکہ وہ پہلے اپنے شکار کو بے ہوش کرتا ہے اور جب وہ شکار
بے بسی کی حالت میں اس کے سامنے پڑا رہتا ہے تو اسے ایسا
لگتا ہے جیسے اس شخص پر اس کو مکمل اختیار ہے چاہے تو زندگی
بخش دے یا چاہے تو موت کے گھاٹ اتار دے۔

اس وقت وہ اپنے اندر ایک جیجان، ایک سرشاری سی
محسوس کرتا تھا۔ وہ خود کو خدا سمجھنے لگا تھا کہ زندگی اور موت پر
اس کو اختیار ہے۔ اس نے کہا کہ کسی کو مارنا میرے لیے اتنا

ایک ایسے مریض کے کمرے میں موجود تھا جس کمرے میں اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس کے پاس سے انجکشن برآمد ہوا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے بعد جو اس نے اپنے کیے ہوئے قتل کی فہرست کنوینی شروع کی ہے تو پولیس والے حیران رہ گئے اس کے مطابق اس نے اپنے سولہ سالہ کیریئر میں تین سو سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

علی اصغر برودری:-

اس ٹھنڈے دل و دماغ کے بے رحم قاتل کا تعلق ایران سے تھا۔ اس کی پیدائش ایران کے شہر برودری میں 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ مرزا ایک رہزن تھا۔ وہ قاتلوں کو لوٹا تھا اور قتل کرتا تھا۔ یعنی علی اصغر کو جرم اس کی وراثت میں ملا تھا۔ اس شخص کے بے رحمانہ کارناموں پر ناظر بھی لکھے گئے ہیں۔ ایران میں بیسویں صدی کا وہ پہلا سیریل کُلتھا۔

اس کے گھر والے عراق منتقل ہو گئے تھے۔ اس نے صرف 14 برس کی عمر سے بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے اور انہیں ہلاک کرنے کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایسا قاتل تھا جس نے پولیس کو چیلنج دے رکھا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت ہو تو سامنے لائیں۔

وہ بچوں کی لاشوں کو تیزاب میں ڈال کر گھلا دیا کرتا تھا۔ مرنے والوں کی باقیات بھی باقی نہیں رہتی تھیں۔ اس کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب وہ ایران واپس آ کر اپنے مکروہ فعل میں مشغول تھا۔

اس نے ایک پارک میں ایک بچے کو اپنا نشانہ بنایا اور جب وہ اس کو ہلاک کر رہا تھا تو ایک دوسرے بچے نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ اس نے جا کر اپنے والدین کو بتا دیا۔ اس کے باپ نے پولیس کو رپورٹ کر دی۔ اصغر کی حرکتیں تو پہلے ہی سے مشکوک تھیں۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔

اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا اور پولیس کو وہ جگہیں بھی دکھادیں جہاں وہ بچی کھچی چیزیں دفن کیا کرتا تھا۔ اس نے ستر بچوں کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ جنوری 1934ء میں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

یہ چند لوگ تھے۔ تاریخ ایسے مکروہ اور بے رحم ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اجتماعی قاتل ہوں یا انفرادی قاتل۔ سب انسان کے دشمن ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی نام سے ہوں۔

دلانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

چارلس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک خاص مشن پر اسپتال کی ملازمت دلوائی ہے۔ لہذا قدرت کی مرضی کو پورا کیا جائے۔ اس نے اپنی بے رحمی کا آغاز اسی اسپتال سے کر دیا۔ اس کا تعلق چونکہ میڈیکل کے شعبے سے تھا۔ اسی لیے ہر قسم کی دوائیں وہ حاصل کر لیتا تھا۔

اس نے اپنے مشن کا آغاز ایک بوڑھے مریض سے کیا تھا۔ وہ بے چارہ اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ چارلس کی ذمہ داری تھی۔ اس نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ یہ مریض اب ٹھیک تو ہونے سے رہا تو کیوں نہ اسے تکلیف سے نجات دلا دی جائے۔ یعنی وہ کام کیا جائے جس کے لیے اسے بھیجا گیا ہے۔ لہذا اس نے ایک دن اس بوڑھے کو زہر کا انجکشن لگا دیا۔ بوڑھا کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سینٹ بارن ہاس کے اسپتال میں اس نے اس طرح کئی وارداتیں کیں۔ اس نے ایڈز کے مریضوں کو وقت سے پہلے موت کی نیند سلا دیا۔

اسپتال والوں کو اس کے خلاف شبہ ہونے لگا تھا۔ کیوں کہ اس کے چارج میں جو دوائیں ہوتی تھیں ان میں کمی آنے لگی تھی۔ اس نے جب محسوس کیا کہ شبہ یقین میں بدل رہا ہے تو اس نے اسپتال کی ملازمت چھوڑ دی۔

اس نے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ یہاں بھی اس نے کئی مریضوں کا خاتمہ کیا۔ ایک بار اسے نہ جانے کیا سوچھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کی رہائش گاہ میں رات کے وقت داخل ہو گیا۔ وہ نرس اور اس کا بیٹا اس وقت سو رہے تھے۔ نرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو جاگنا دیکھ کر چارلس فرار ہو گیا۔ نرس نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ چارلس کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اس پر کسی کے گھر میں داخل ہونے کا الزام تھا۔ اسی لیے اسے صرف ایک سال کی سزا دی گئی۔

ایک سال قید میں رہنے کے بعد اس نے نیوجرسی کے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ جس کا نام ”سمریٹ میڈیکل سینٹر“ تھا۔ اس کی حرکتیں یہاں بھی جاری رہیں۔ یہاں اس کو پھر شبہ کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ دوائیں غائب ہونے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کو اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے رپورٹ کر دی۔ چارلس سے انکوائری ہوئی۔ اس نے اقرار کر لیا کہ وہ دوائیں چوری کرتا رہا ہے۔ اس جرم پر اسے اسپتال سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جگہ ملازمت کی اور اس وقت پکڑا گیا جب وہ

گمشدہ شہزادی

فرزانہ لکھت

یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ جن کے ساتھ رہ رہی تھی ان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور وہ کوئی معمولی ہستی بھی نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو ایک شاہی خاندان سے ہے۔ وہ ایک گمشدہ شہزادی ہے۔



خانہ جنگی سے پیدا ہونے والا ایک دلچسپ واقعہ۔

اپریل 2004ء میں بالآخر سارہ کلیرن کو وہ کال مل ہی گئی جس کا وہ تیس سال سے انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ لاس اینجلس میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ایک مڑبھوم ساحلی کینے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہاں ایسا شور مچا ہوا تھا کہ اسے دوسرے سرے سے بولنے والے کی آواز بہ شکل ہی سنائی دے رہی تھی۔ جو گیارہ ہزار کلومیٹر دور افریقہ سے بول رہا تھا۔ ”یہ تمہارا باپ جوزف کوینا کیا سووا ہے۔“ اس آواز نے سارا نے اسے ہولڈ آن کرنے کو کہا اور کینے سے نکل کر مڑبھوم سڑک پر دوڑتی ہوئی کپڑے کے ایک اسٹور میں داخل ہو گئی۔ وہاں نئے اور پرانے کپڑے تختوں پر بڑھیر کی صورت میں بڑے تھے۔ لیکن شور نہیں تھا اور وہ فون کی آواز صاف سن سکتی تھی۔

”معاف کرنا۔ میں نہ جانتا تھا کہ تمہیں کیسے تلاش

کروں۔“ فون کرنے والے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”معذرت خواہ ہوں۔ میں تمام عمر آپ سے شاکہ کی رہی لیکن اب ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔“ سارا بولی۔

اٹھائیس سالہ سارا کا اس سے پہلے بھی اپنے والدین سے رابطہ نہ ہو پایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے تلاش کرنے اور اس سے رابطہ کرنے سے محنتب تھے۔ امریکا میں اس کے والدین جم اور جوڈی کلبرن نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا باپ سلیم کالج مغربی ورجینیا یونیورسٹی میں سیرایون سے متبادل طالب علم کے طور پر پہنچا ہوا تھا۔ وہاں اس کے ایک سفید فام لڑکی سے تعلقات قائم ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دیں گے۔ اس کے بعد دوئوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ سارا کا باپ اپنے وطن لوٹ گیا۔

اب وہ اپنی بیٹی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کے پاس چلی آئے اور اس سے ملے۔

”ایک شاہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے تم ایک نہ ایک دن یہاں کی حکومت سنبھالو گی۔“ اس نے اس سے کہا۔

اس لیے سارا نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا مہذب دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ وہ اب چھوٹے جنگ زدہ غیر معروف سے گاؤں سے جڑی تھی۔

سارا مغربی ورجینیا میں ایک نابل امریکی لڑکی کی طرح چلی بڑھی۔ جم، ورجینیا ویسٹ یونیورسٹی کے پروفیسر اور جوڈی خصوصی تعلیم کی ٹیچر نے اس پر محبت اور حوصلہ افزائی کے بھرپور خزانے لٹائے۔ اس کے باوجود وہ اس احساس سے بھی چھٹکارا

نہ پاسکی کہ وہ اپنے خوب صورت بالوں والے خاندان یا کیونٹی سے ہرگز تعلق نہیں رکھتی تھی۔ بیشتر گود لیے بچوں کی طرح وہ بھی

ایک طرح کے احساس عدم تحفظ اور بے چینی میں مبتلا تھی۔ ایسی صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ گود لینے والے والدین میں سے اگر

ایک چھوڑ دیتا ہے تو پھر دوسرا بھی کیوں کر رکھے گا یا وہ سوچا کرتی تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اچھی بچی بننے کی کوشش کرنی چاہیے

تاکہ وہ مجھے چھوڑنے کا بھی نہ سوچیں۔

سارا اچھی طالبہ اور بلند پایہ ایتھلیٹ تھی۔ وہ طلبہ تنظیم کی صدر بھی تھی اور فلاجی کاموں کی شوقین بھی۔ ”وہ لوگوں کو خوش

کرنا جانتی ہے۔“ جوڈی کا کہنا تھا۔ ویسٹ ورجینیا یونیورسٹی میں تھیزر کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سان فرانسسکو میں

امریکن کنزرویٹری تھیزر کے گریجویٹ اسکول چلی گئی۔ وہاں 1999ء میں اس نے اپنے اصل والدین کی تلاش کا آغاز کیا۔

اس کے گود لیے جانے والے کاغذات میں اس کے حقیقی والدین کے نام جس طرح درج کیے گئے تھے اس سے ان کا پتا

چلانا مشکل تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں تلاش و جستجو کی ٹھان لی۔

جب اس نے جوڈی کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کو تلاش کرنا چاہتی ہے تو جوڈی نے اسے بتایا کہ جس عورت نے اسے جنم دیا

تھا وہ دس سال پہلے انتقال کر چکی تھی۔ اس کے باپ کے بارے میں البتہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ سارا کو خاصی مایوسی ہوئی اس نے

اپنے اصل باپ کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو تذبذب اور ہچکچاہٹ کا شکار ہوئے محسوس کیا۔

2001ء میں وہ لاس انجلس پہنچی اور ٹیلی ویژن اور فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے لگی۔ اس دوران اس نے

ہائی اسکول کے طلبہ کو قفس کی تعلیم دینا بھی جاری رکھا۔ پھر جب وہ بیس سال سے اوپر کی عمر کو پہنچی تو اس پر ایک بے نام سی

اداسی اور مایوسی طاری رہنے لگی۔ وہ جب کسی مرد کے قریب ہوتی تھی تو بے خوف کہ وہ ہمیں اسے چھوڑ ہی نہ دے اسے خود اس

سے اپنے تعلقات توڑنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

2004ء میں سارا نے ایک قیادت ترقیاتی کورس میں داخلہ لے لیا۔ ایک سیشن پر انسٹرکٹر نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ اپنے آگے پیٹھے ہوئے آدمی کو بتاؤ۔“ وہ

آدمی اس کا پرانا دوست آرٹ تھا۔ ”میں اپنے حقیقی باپ کی تلاش سے خوف زدہ ہوں۔“ سارا نے اس کے سامنے اعتراف

کیا۔

آرٹ نے اسے تسلی دی کہ اس کی تلاش اسے اطمینان و سکون عطا کرے گی۔ آرٹ نے اسے بتایا کہ وہ ایک ایسے

سراغرساں سے واقف تھا جو صرف سوڈا میں اس کے باپ کے تلاش کر سکتا تھا۔

اس سراغرساں نے صرف تین گھنٹے کی تفتیش و جستجو کے بعد میری لینڈ میں ایک نام جوزف کو نیا کپاسو واڈھوڑ نکالا۔

سارا نے ایک تعارفی نوٹ پر محنت کی اور انتہائی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اسے پہنچ دیا۔ جلد ہی اسے ایک عورت کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ ”میں ایون لین ہوں تمہاری

خالہ۔ میں تمہاری پیدائش کے موقع پر موجود تھی۔“ سارا سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ یہ جوزف دراصل اس کا چچا تھا۔ رابطہ ہونے پر اس نے اسے

فون کیا اور بولا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ تم ایک شہزادی ہو؟“ اسی نے اسے بتایا کہ وہ سیرالیون کے جنوب میں مینڈے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ تراغتم افریقا میں بحر اوقیانوس کے کنارے واقع ساتھ لاکھ کی آبادی کے ملک سیرالیون میں اس کا دادا چھتیس ہزار نفوس پر حکمران تھا جب وہ مرا تو سارا کا باپ اپنے آپ کو اس کا وارث قرار دیتے ہوئے مینڈے قبیلے کا حکمران بن گیا تھا لیکن اس نے حکمرانی پر ایک مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی ملازمت کو ترجیح دی اور اس کا بھائی جو اس کا ہم نام تھا۔ قبیلے کا سردار بن گیا۔ یہ قبیلہ جنوبی سیرالیون کے ایک بہت بڑے گاؤں میں آباد تھا جس کا دارالحکومت پیسے تھا۔ ان اطلاعات نے سارا کا دماغ ہلا دیا۔ پھر جب دو بیٹے بعد اس کے باپ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تمام معاملات کو زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھ گئی۔

جب سارا حصول تعلیم پھر ملازمت میں مشغول تھی تو اس عرصے میں جوزف کو نیا کاپو سدا افریقا کی انتہائی خونریز خانہ جنگی میں بھاگ کر جنگ لڑ رہا تھا۔ 1999ء اور 2002ء کے درمیان انقلابی متحدہ محاذ کے گوریلے جن میں زیادہ تعداد بگڑے ہوئے بچوں اور توجو بھائی کی تھی، نے سیرالیون میں خوف و ہشت کا راج قائم کر رکھا تھا۔ اس خانہ جنگی میں مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ پچاس ہزار کے لگ بھگ لگایا جاتا ہے۔ یہ خانہ جنگی چھڑنے سے پہلے جوزف نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ 1994ء میں جب شری پسند پیسے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے بیوی بچوں اور منشی بھر رشتے داروں کے ساتھ پیسے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ چار سالوں تک قرب و جوار کے دیہاتوں میں چھپے، دوسرے مہاجرین کے ساتھ تنگ و تاریک گھروں میں رہتے رہے۔

پھر جب باغی پسپا ہو گئے تو جوزف پیسے واپس آ گیا جو اس وقت مہیب تباہی و بربادی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ باغیوں نے آدھے سے زیادہ گاؤں جلا کر رکھ کر دیا تھا اور جوزف کی ایک بہن بھی ان کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ پیسے ہائی اسکول کی جست کی چھت باغیوں نے ہتھیار بنانے کے لیے اتاری تھی اور ڈیک اور کتابیں چولہے جلانے کے لیے استعمال کر لیے تھے۔ انہوں نے لیبارٹری کا سامان بھی توڑ پھوڑ کیا تھا۔

اس اسکول کی بنیاد 1963ء میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے وہاں سیرالیون بھر سے اور آس پاس کے ملکوں سے چھ سو کے لگ بھگ طلباء آ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب یہ جے کا ڈیمر بن چکا تھا۔ جوزف اور اس کے رفقاء نے اس کی تعمیر نو کا

آغاز کیا مگر اس کی رفتار سست تھی۔

جوزف کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی سے رابطہ کرے جسے وہ امریکا میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اس نے اسے تلاش کر لیا تھا۔ اس نے موبائل پر سارا کو کال کی۔ پھر جب اس نے اس کی بیٹی کی آواز سنی تو اسے بے اختیار وہ روت یاد آ گئی جس سے اس نے کئی سال پہلے محبت کی تھی۔ اس نے سارا کو بتایا کہ وہ اور اس کی ماں اسے دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے کتنے دھکی اور مغوم ہوئے تھے لیکن ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویز اپر آیا ہوا ایک نجی دست طالب علم تھا اور اس کی ماں ایک چائے خانے میں ملازمہ تھی۔ ان کے لیے اس کی پرورش و پرداخت ممکن نہیں تھی۔

اس نے سارا کو اپنے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثات اور مصائب کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کی بدولت وہ طویل عرصے تک اس سے رابطہ نہ کر پاتا تھا۔ جب اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی تو اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس سے بڑھ کر اہم اور مہمتر دن میری زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے بعد میں بتایا تھا۔

اس ماہ دسمبر میں سارا اپنے دوست اور کوچ جان ولرے کے ہمراہ سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن کے ایئر پورٹ پر اتری۔ اس کا باپ جس کے بارے میں اس نے تصور کر رکھا تھا کہ وہ ایک دراز قد اور وجہہ شخص ہو گا وہاں اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کے تصور کے برعکس وہ ایک کوتاہ قامت معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس نے اسے سینے سے لگایا اور آبدیدہ ہوا۔ سارا کے جذبات بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ ”وہ مجھے بے حد قاطبی محبت معلوم ہوا تھا۔“ سارا نے بعد میں بتایا تھا۔

پھر جوزف نے سارا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف کھڑے درجن مہاجر افرو خاندان سے ملوانے لے چلا۔

رات بہت اندھیری تھی۔ شدت جذبات سے مغلوب سارا اوٹل کی طرف جاتے ہوئے گرد و پیش کے ماحول کی طرف کوئی توجہ نہ دے رہی تھی۔ اگلی صبح وہ ورائے اور اس کا باپ جوزف کی کھٹارائی لینڈ روور میں سوار ہوئے اس وقت سارا کو گرد و پیش کا ماحول دیکھنے کا موقع ملا۔ شہر کا بیشتر حصہ ابھی تک کھنڈر بنا ہوا تھا۔ عمارات پر گولیوں کے نشانات تھے۔ سڑک کے کنارے چھتھروں میں لمبوس بچے مائلے فروخت کر رہے تھے۔ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ پانچ گھنٹوں کی مسافت پر واقع پیسے ڈھلوان چھوٹ

نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

پھر ذمہ داری کے سوالوں سے جنگ کرتی سارا لاس اینجلس لوٹ آئی۔ ”وہ اس ماحول میں اپنا کردار تلاش کر رہی تھی۔“

جہاں وہ رہنے لگا تھا۔ ایک جزوقتی قرض کی تعلیم دینے والی، اپنا مقام بنانے کی جدوجہد میں مصروف اداکارہ ان لوگوں کے لیے کئی توانائی اور رقم خرچ کر سکتی تھی؟

وہ رہنے لے اس سلسلے میں سارا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اور سارا نے مل کر پیسے کے ہائی اسکول کے لیے دولاکھ ڈالر جمع کرنے کے لیے کپاسودا فاؤنڈیشن قائم کی۔ سارا جس اسکول میں قرض کی تعلیم دیتی تھی۔ وہاں اس نے ایک میلہ منعقد کیا جس سے اسے ساڑھے آٹھ سو ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ایک کنسرٹ کے انعقاد سے اسے سولہ ہزار ڈالر مل گئے۔ اس کے گوریلے والدین بھی مختلف طریقوں سے فنڈ جمع کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے۔

مارچ 2007ء میں سارا اور ولرے افریقا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک، این جی او قائم کی جس نے گاؤں والوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اسکول کی تعمیر نو کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس وقت تک فاؤنڈیشن کے فنڈ میں چوبیس ہزار ڈالر جمع ہو چکے تھے۔ اس رقم سے اسکول کے کمروں پر چھتیس ڈالی لگیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بنوائے گئے۔ کتابیں خریدی گئیں۔ آج وہاں طلباء کی حاضری پینتالیس فی صد سے بھی تجاوز ہے۔

جب سارا نے پیسے کا دوسرا دورہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اختیاری والدین سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ”سارا اپنے دونوں باپوں کو ایک جیسا پسند کرتی ہے اسی لیے اس نے ہماری آپس کی ملاقات کا سوچا۔“ جم کلبرن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

جوزف کپاسودا بھی اس سے متفق تھا۔ ”میں کلبرن میاں بیوی کا ممنون احسان ہوں جو کچھ ہوا ہے اسے ایک بڑا انعام ہی کہنا چاہیے۔“

جہاں تک سارا کا تعلق ہے تو اس نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ قدرت اس سے اتنا بڑا کام لے گی کہ اس کے ہاتھوں پسماندہ افریقا کا ایک تباہ شدہ گاؤں تعلیم کی روشنی سے منور ہونے لگے گا۔ وہ کہتی ہے۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ میں یہ سب کچھ کیونکر کر سکوں گی لیکن اب میں جو جانتی ہوں وہ یہ ہے کہ یہ میرا خاندان ہے۔“



والے گھروں پر مشتمل ایک مختصر سی بستی تھی جس کے ارد گرد دو دور دور تک اردو اور آلوؤں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بستی کے باہر بے شمار لوگ ان کی آمد کے منتظر کھڑے تھے۔ انہوں نے لینڈ روور کو گھیر لیا اور اپنی زبان میں بلند آواز سے گیت گانے لگے۔ جوزف نے سارا کو کورس کا ترجمہ سنا۔ ”خوش آمدید شہزادی خوش آمدید سارا۔ تم اپنے آبائی گھر آگئی ہو۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم تم سے بہت محبت رکھتے ہیں۔“ سارا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی گاڑی سے اترتی اور وہاں مجمع عورتوں کی ہر اہی میں ایک بڑی سی سرخ عمارت کی طرف ہوئی جو جی بنی ہوئی تھی جس کے گرد بلندو بالا کھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ وہاں شاندار ضیافت کا انتظام تھا۔ وہ اپنے باپ اور دیگر عبادین کے ساتھ ایک میز پر جا بیٹھی۔ ضیافت کے اختتام پر قرض و موسیقی کی محفل پر پاپا ہوئی جو غروب آفتاب تک جاری رہی۔

پیسے میں سترہ دن قیام کے دوران سارا اور جوزف کی بیوی میری کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ سارا کی سوتیلی بہن بیس سالہ حبیہ اور پندرہ سالہ بھائی ہائیڈ بھی اس سے بے تکلف ہو گئے۔ سارا نے انہیں خاصا ذہین و فہم اور مہذب و خیردار پایا۔ دوسرے رشتے دار بھی اس سے ملنے آتے رہے۔ جب وہ آتے اس کے لیے مرغی ضرور لاتے کیونکہ سارا نے بتایا تھا کہ مرغی اور چاول اس کی پسندیدہ خوراک ہے۔

یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہاں مرغیاں شاذ ہی عام لوگوں کی خوراک میں استعمال ہوتی تھیں۔ انہیں صرف نہایت معزز مہمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔

”میں نے اپنی زندگی اس احساس کے ساتھ گزاری تھی کہ مجھے کوئی بڑا فائدہ بخش کام کرنا چاہیے۔ جب میں اس گاؤں میں پہنچی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جگہ میرے اس مقصد کے لیے بہترین تھی۔“ سارا نے بعد میں کہا تھا۔

سارا کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا تھا کہ وہاں ایسے بچے اور بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو باغیوں کے ہاتھوں اپنے مختلف اعضاء سے محروم ہو چکے تھے۔ صاف پانی اور ضروری ادویات بہت کم دستیاب تھیں اور گاؤں کی بیشتر آبادی طبریا میں جٹلائی۔ اس کے باپ کے اسکول کے دو سو طالب علم بغیر چھت کے کمروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ وہ زندگی میں اپنا مقام بنانا چاہتے تھے۔ ”یہ لوگ تو جہنم سے گزر کر آئے ہیں۔ پھر بھی یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں خواہ کتنی ہی قیاس میں ہم پر ٹوئیں ہم تعلیم سے منہ نہ موڑیں گے۔“ سارا



شمشال سے طورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوسر سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ ستر کہانی کا انیسواں حصہ

پری جمال کی والدہ اس رشتے سے خوش نہ تھی لیکن اس کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

پھر کسی دور کے رشتے دار کی شادی میں پری جمال اپنی ماں کے ساتھ شریک ہوئی۔ وہاں ایک اور خاندان بھی شریک تھا جو اپنے امریکا میں مقیم لڑکے کے لیے کسی انتہائی

پری جمال کا رشتہ اس کے پھوپھی زاد سے بچپن میں طے پا چکا تھا۔ وہ شروع سے ایک ساتھ لے پڑھے تھے اور دلوں میں چاہت بھی گھر کر چکی تھی۔ یہ شکل ہی بہت اچھی تھی اور پھوپھی زاد بھی اس کے جوڑ کا تھا۔ وہ میہیں لاہور میں باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا اور مالی طور پر ان لے بہتر بھی تھا۔

خوب صورت لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ان کی تلاش جب ختم ہوئی جب وہاں انہوں نے حسین ترین لڑکی پری جمال کا جمال دیکھا۔ لڑکے کی ماں نے پری جمال کی ماں سے فون نمبر اور گھر کا ایڈریس مانگا۔ اپنا تعارف کروایا اور پری جمال کی ماں کے ذہن میں ایک اور منصوبے نے جنم لیا امریکا میں کسی کا بیٹا ہو تو پاکستان میں اس کی ماں بہنیں اس کی شادی کے لیے پاکستان کی سب سے خوب صورت لڑکی تلاش کرتی ہیں۔ اس طرح سے پری جمال لڑکے کی ماں کی نظروں میں بھانجی۔

لڑکی کی ماں کے دماغ میں یہ منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی امریکا میں مقیم لڑکے سے ہو جائے گی تو وہ دو طرح کے حذف حاصل کر سکے گی ایک تو پری جمال کا رشتہ اس کے چھوٹی زادے سے ختم ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ بہن اپنے بھائیوں کو امریکا بلوالے گی۔ اس طرح ایک تیر سے دور شکار ہو جائیں گے۔ پری جمال کے والد نے آواز اٹھانے کی کوشش کی مگر اب تو لڑکے بھی اپنی لالچ میں ماں کے ساتھ ٹھل گئے۔ پری جمال کی تو آواز دیسے ہی دب گئی جب والد بھی اپنے ہتھیار بھیج بیٹھا۔

کچھ عرصے بعد اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ چھوٹی زادے کے رشتے کو ٹھکانے لگانے کے لیے دو چار ٹکڑے جھکڑے ہی کافی تھے۔ عید، شبِ برات کے کپڑوں میں نقص نکال کر واپس منہ پر مارنے سے بھی یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور باقی کے دو جھکے اس کو دو لخت کر گئے۔ اب راستہ صاف تھا۔

لڑکے کو لڑکی کی تصویریں بھیجی گئیں۔ اس نے جھٹ پٹ لڑکی کو پسند کر لیا۔ ادھر لڑکی کی ماں اور بھائیوں نے یہ بھی نہ دیکھا اور نہ معلوم کیا کہ لڑکا امریکا میں کیا کرتا ہے اور اس کی اسٹیٹس کیا ہے۔ فون پر نکاح ہوا اور لڑکی اسکا پپر رخصت ہو گئی۔ بہت محاسناں نہیں، لڑکی کی قسمت بر رخصت کیا گیا۔ ایک بڑے ہوٹل میں دعوت دی گئی تو لڑکی کی ماں نے جمو مر ڈانی کہ ایسی نیک بخت لڑکی اللہ ہر ایک کو دے۔

اب پری جمال اپنے گھر میں امریکا جانے کے لیے سہاگن بنی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے بہانہ کیا کہ وہ چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے پاکستان نہیں آ سکتا حالانکہ وہ سیاحتی ویزے پر امریکا میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس کے پاس امریکا میں کوئی اسٹیٹس نہ تھا۔ وہ امریکا چھوڑنا تو واپس داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پری جمال کو امریکا بلوا بھی نہیں سکتا تھا۔ لڑکے نے کسی ایجنٹ کو

دس لاکھ روپے دیئے اور کسی اور کے پاسپورٹ پر فوٹو تبدیل کر کے لڑکی کو کینیڈا پہنچا دیا جہاں کینیڈا پہنچ کر ایک اور ایجنٹ نے دو ہزار ڈالر لے کر پری جمال کو امریکا کی بارڈر پار کروائی تھی مگر سوئی قسمت کہ وہ امریکیوں کے ہاتھ پکڑی گئی۔ انہوں نے اس کی فائل چیک کی تو معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا ابھی غیر قانونی طور پر غلط طریقے سے آئی ہے۔ انہوں نے اسے کینیڈین امیگریشن کے حوالے کر دیا اور انہوں نے کل اسے ہولڈنگ سینٹر میں بند کر دیا اور آج وہ بیٹھی مجھے اپنی کہانی درود کر سنا رہی تھی۔

اس کی کہانی جب ختم ہوئی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اسی دوران میں نے بریک بھی نہ لی تھی۔ بیدی نے ایک دو بار فون کر کے مجھ سے بریک کا پوچھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ پری جمال کو اس کا کھانا کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ تم یہ کھانا کھاؤ اور میں خود بریک روم میں بیٹھا سوچوں میں ڈوبا جائے لی رہا تھا۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی مدد کیا ہے نہیں کہ اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ مجھے یہ قوی امید تھی کہ امیگریشن کینیڈا والے بھی اس کے سامنے یہ امر رکھیں گے کہ یا تو وہ ڈی پورٹ ہو جائے یا پھر وکیل کی بھاری فیس ادا کر کے جج کے ہاتھوں ڈی پورٹ ہو۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ پھر سے اپنے چھوٹی زادگی ہو جائے۔ امریکا میں اس کا شوہر اسے بلوائیں سکتا اور اگر کسی طرح سے بلوا بھی لیا تو ساری عمر اس سے پراسٹروں یا ریسٹورنٹ پر کام کر دئے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور دوبارہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سامنے یہی تجویز رہی اور کہا کہ اب بھی وقت ہے اس فراڈ سے باہر آ جاؤ۔ اس سے طلاق تم با آسانی لے سکتی ہو اور اپنی زندگی کو جہنم مت بناؤ۔

میں تو سمجھا تھا کہ اس کو سمجھانے پر مجھے بہت محنت کرنی پڑے گی مگر وہ تو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ وہ دل سے راضی تھی تو باقی کا کام میرے لیے آسان تھا۔ اس سے کہا کہ یہاں کے امیگریشن آفیسر کو صرف یہ کہنا کہ کسی بھی طرح اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس کے علاوہ گھر پاکستان میں فون کر کے یہ بتانا کہ کس فلائٹ سے تم واپس آ رہی ہو۔ میں نے پری جمال کو نصیحت کی کہ گھر پہنچ کر ڈٹ جانا کہ اس سے طلاق ملتی ہے یہ بھی اسے بتایا کہ یہ مطالبہ

کرنے سے پہلے اپنے پھوپھی زاد سے بات کر لینا۔ نکٹ کے پیسے اس کے پاس تھے، مجھے دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اب تشکر کے آنسو تھے۔

جب میں ڈیوٹی ختم کر کے واپس جا رہا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں۔

اگلے مہینے ہولڈنگ سینٹر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پری جمال پچھلے منگل کو پاکستان واپس چلی گئی ہے۔

بے وفا کے طور اور کینیڈا کا موسم ایک جیسا ہے۔ دونوں کو... بدلے دینے لگتی۔ ہم بہار کی ہواؤں سے لطف

اندوز ہو رہے تھے کہ ایک شام بادل گھر آئے۔ آسمان ڈھک گیا اور اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر بارش ہوئی اور اگلی صبح

تک ہوئی رہی۔ درجہ حرارت گر گیا اور بہار کی آمد ایک بار پھر موقوف ہوئی نظر آنے لگی۔ درجہ حرارت گرا تو دھند کے

بادل زمین کی سطح پر اتارنے لگے۔ ماحول دھواں دھار ہو گیا اور سرجی دوبارہ جاڑے کی آمد سے جھوم اٹھے۔ اپنی جیکٹس

جو تھہ کر کے افسردہ دل سے اپنے بیک میں رکھ چکے تھے دوبارہ سے نکال لی۔ شہباز پھرائی نظروں سے سرجی کی

حرکات دیکھ رہا تھا اور وہ اپنی جیکٹ کو سونگھ کرین کو یاد کرتے جا رہے تھے۔

شہباز سرجی سے مخاطب تھا۔ ”میری مایا اور تمہاری یں کو ندیم بھائی یا نسرین کی بددعا لگ گئی ہے۔ ورنہ وہ اتنی بے وفا بھی نہ تھیں۔“

سرجی شہباز سے بولے۔ ”بے وفا مایا نہیں بلکہ تم تھے جو اس کے اتنے بڑے گھر کا رکڑ کا بھی نہ لیتے تھے۔“

یہ صورت حال کسی جھگڑے کی جانب جانے ہی والی تھی کہ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ اپریل کی برف

باری پر مفتی حیران تھا۔ میں نے حیرانگی کی وجہ پوچھی تو بولا۔ ”اس سال اپریل میں برف باری نہیں ہونی چاہیے تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

تو مفتی کی بجائے سرجی بولے۔ ”اپنے بہنوئی سے شرط لگا لی ہوگی۔“

مفتی غصے میں آ گیا اور اس حالت میں چائے کا کپ ختم کر گیا اور پھر بولا۔ ”پچھلے سال اپریل میں برف پڑی تھی۔ اگر ایک سال بڑے تو دوسرے سال نہیں پڑتی۔“

سرجی نے مفتی کی بات سنی ان سنی کردی اور باہر پڑی برف کو دیکھتے رہے جس نے ساری زمین پر چند منٹوں میں

ایک سفید چادر سی بچھا دی تھی۔ درخت بھی یہ لباس پہن کر

مسکرا رہے تھے۔ عمارتیں سفید برف کی چادر میں کھڑی زیادہ دلفریب نظر آ رہی تھیں۔

”کیا موسم ہے یہاں کا؟“ ابھی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک بارش ہوئی تو ساری عمارتیں، سڑکیں اور

پارک محل گئے اور نئے گور نظر آنے لگے۔ پھر برف باری نے منظر تبدیل کر دیا۔ قدرت نے سب دھو دھلا کر اسے

سفید لباس پہنا دیا، ماحول بکھر نظر آنے لگا۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ موسم زیادہ دن رکے والا نہیں ہے۔ چند دن کا مہمان

اگر خوب صورت ہو تو بھلا محسوس ہوتا ہے۔ بدلتے موسم کس طرح سے انسان کے حواج پر اثر

انداز ہوتے ہیں، اس کا اندازہ پہلے بھی کیا بار ہوا تھا اور آج بھی ہو رہا تھا۔ برف کے نئے نظاروں سے بسورتے سرجی

چپک رہے تھے اور چپکنا مفتی منہ بسورے بٹھا تھا۔ برف کی سفید چادر مجھے میرے بچوں کے پاس لے آئی تھی اور شہباز

پر نہ موسم اثر کرتا تھا اور نہ گل درنگ، اس کا حواج کھانوں کی خوشبو پر خوشگوار ہوتا اور بچن کے برتن دھونے پر سوگوار.....

زندگی اپنے حسین اور دلکش پہلو دکھلاتے ہوئے آسکتی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اگر کچھ سخت موڑ بھی آئے تو وہ بھی یادگار

لمحات میں بدل گئے۔ دکھوں کی چادر اوڑھے نہیں رہی بلکہ اسی چادر میں قدرت کے رنگوں کے پھول بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔

آج بیوی اور بچے بے انتہا یاد آرہے تھے۔ قدیل میری چار سالہ بیٹی اپنی تو قلمی آواز میں پوچھتی۔ ”بابا ہمارا

دیزا کب آئے گا؟“ یہ الفاظ مجھے بے چین کر دیتے کہ اپنی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر اور ماتھے کو نڈیے

دوں۔ اریہ ابھی چند ماہ کی تھی اور نہ اپنے بابا کو پہچانتی تھی اور نہ بابا اس سے مانوس ہوئے تھے۔ میری شریک حیات

سمجھ بھی مجھ سے اس لیے لڑتی کہ میں خود مرے میں ہوں اور بھی مجھ پر ترس کھاتی کہ آپ کی کتنی مشکل زندگی ہے۔

وہ دونوں صورتوں میں مجھے اس لیے قبول تھی کیونکہ میں اسے چند سال پہلے تین بار قبول کر چکا تھا۔ اب وہی میرے لیے سب کچھ تھی۔

بچوں کی یاد نے دل پارہ پارہ کر دیا تھا۔ دل رور رہا تھا جدائی کھل رہی تھی لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ ابھی اپریل کا مہینا

تھا دوستوں کا اندازہ تھا کہ دیزا لٹنے میں چھ ماہ لگ جائیں گے مگر مجھے یقین تھا کہ میری فیملی دو تین ماہ کے اندر پہنچ

جائے گی۔ یہیں میرے پاس ہوگی۔ ان کا میڈیکل تو

بگ بینک سے کائنات کیسے وجود میں آئی؟

انسان شاید اس دنیا کی وہ سب سے محسوس مخلوق ہے، جو ہر وقت نہ صرف اپنے ماحول بلکہ اس وسیع کائنات کی ہر شے کو کھوجے، اس کی حقیقت جاننے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ یہی کھوج اسے آج چاند ستاروں اور کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع کہکشاؤں تک لے گئی ہے۔ جو سوال ہمیشہ سے اس کے دماغ میں کلکلاتے رہے ہیں ان میں اول کائنات کے ان سرایتہ رازوں کا حصول ہے جن میں سے کچھ سے پردہ اٹھایا جا چکا ہے اور بہت سوں کی کھوج ابھی باقی ہے۔ ہزاروں سال سے جاری سائنسی تحقیق، سوال و جواب اور دریافتوں کا سلسلہ اپنی جگہ، مگر آج سے تقریباً چار سو سال پہلے یورپ میں جو سائنسی انقلاب برپا ہوا، اس کی وجہ سے ہزاروں سال پرانے نظریے اور مفروضے غلط قرار پائے، وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ فزکس میں نئے نئے اصول وضع کیے گئے، اور ایسے آلات وجود میں آئے جن سے کائنات کی اصلیت اور ابتدا کو کافی حد تک سمجھنے میں مدد ملی۔ انسان آج بھی نت نئے طریقوں سے اس کوشش میں ہے کہ کائنات کی ایک جامع اور واضح تصویر عیاں ہو جائے بگ بینک 'کائنات' تو آپ نے سنا ہوگا، اور ہو سکتا ہے اس حوالے سے ٹھوس بہت بڑا اور سائنسی ہو، چلیے آج میں آپ کے سامنے اس کی واضح تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ بگ بینک انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بڑے دھماکے کے ہیں۔ بگ بینک دراصل وہ دھماکا ہے جس سے ہماری یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے تمام مادہ ایک سوئی کے ہزاروں حصے کے برابر نہایت خفیف جگہ میں قید تھا۔ اگر مادے میں بہت زیادہ توانائی ہو، دنیا کے کسی بھی ڈرپے سے حاصل کردہ توانائی سے زیادہ، تو کوششِ فعل یعنی گرہ بونی چیزوں کو اپنی جانب کھینچنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور دھکیلنے والی قوت بن جاتی ہے۔ چنانچہ سائنس کے مطابق یہی بگ بینک کا وہ نکتہ آغاز تھا، جب تمام مادہ ایک دھماکے جیسی صورت حال کے بعد انتہائی تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہونے لگا اور خلا میں پھیل گیا۔ اس وقت اس کی رفتار اس قدر زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ کائنات تیزی سے پھیلنے لگی۔ آج اس بگ بینک، یعنی ہماری کائنات کے تخلیق آغاز کو 13.8 کھرب سال ہو چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر لوگ یہ سوچیں گے کہ بھلا کائنات کی عمر کوئی کیسے بتا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب ہمیں "ہبل خلائی دوربین" نے دیا ہے۔ اس دوربین کی مدد سے لی گئی تصاویر میں ہمیں جو سب سے پرانی کہکشاں ملتی ہے، وہ زمین سے 13.4 کھرب نوری سال دور واقع ہے نوری سال 'دراصل وقت کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ فاصلے کا پیمانہ ہے اور ایک نوری سال کا فاصلہ تقریباً 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے۔ یہ فاصلہ روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں ایک نوری سال ہی 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے تو 13.8 کھرب نوری سال کتنے کلومیٹر کے برابر ہوں گے۔ اگر ہم پیمائش کر سکیں کہ کسی دور دراز ستارے یا کہکشاں سے روشنی ہم تک آنے میں کتنے سال لگے ہیں، تو ہم اس طرح قدیم سے قدیم تر کہکشاؤں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اب تک ہم نے جس قدیم ترین کہکشاں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ چوں کہ 13.4 کھرب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی عمر اس کے آس پاس ہی بنتی ہے۔

سائنس کا کہنا ہے کہ 13.8 کھرب سال پہلے نہ یہ سورج تھا، نہ یہ ستارے، نہ یہ کہکشاں، نہ یہ نظارے، بلکہ صرف

اشہاد دیکھ کر اسٹارپ بھاڑ لیتا ہے اور بعد میں اسی نمبر پر فون کے ذریعے رابطہ کرتا ہے۔ میری کہنا ہے کہ یہ سو سال سے واپسی ہوئی۔ اپنی جاب سے واپس آتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا اور میں اپارٹمنٹ کی بجائے گھائی مارکیٹ میں اتر گیا، مجھے کچھ گروسی کرنی تھی۔ اس دن سردی نے بدحواس کر دیا تھا۔ سبھی میں اپریل کے مہینے کو کھانا جس میں یہ سردی اٹھ آئی تھی اور بھی ٹورنٹو سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا۔ گو میری یہ ساری آہ و بکا رانیاں تھیں مگر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے میں لگا تار بڑبڑاتا تھا۔

میرے ہی ساتھ ہو گیا تھا۔ تمام کاغذات مکمل تھے ایکسی میں پہنچ چکے تھے۔ فیس بھی میں نے جمع کرادی تھی۔ اب صرف پیپر ملنے تھے اور جیسے ہی پیپر ملے، میں ٹکٹ کنفرم کر دیتا لیکن اس سے پہلے مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا جو ایک مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔

یہاں اگر کسی کو کوئی چیز چھٹی ہو یا خریدنی ہو، کرائے پر لینی ہو یا دینی ہو تو وہ ایک کاغذ پر اشتہار بناتا ہے اور اسے مختلف بس اسٹاپ پر لگا دیتا ہے۔ اس اشتہار کے نیچے اپنے فون نمبر کی متعدد اسٹارپ بھی لٹکا دی جاتی ہیں غرض مند

دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے ہائیڈروجن بلیس کے بادل تھے۔ خلا میں موجود ان بادلوں کے جن حصوں میں ہائیڈروجن اور ہیلیم کی مقدار زیادہ تھی، ان حصوں میں گیسز سکڑنے لگیں اور سکڑتے سکڑتے کافی گرم اجسام کی شکل اختیار کر گئیں جنہیں ہم ستارے " کہتے ہیں۔ مزید برآں ان ستاروں کے آس پاس جہاں گیسز کی مقدار کم تھی، وہاں بھی گیسز سکڑتی گئیں اور گرم (ستاروں سے کم گرم) اجسام بنے جو ستاروں سے چھوٹے تھے، اور کسی اپنے سے بڑے نزدیکی ستارے کی بہت زیادہ کشش کی وجہ سے اس (ستارے) کے گرد مدار میں پکڑ لگنے لگے۔ ان اجسام کو ہم سیارے " کہتے ہیں۔ کئی ستارے آپس کی کشش کی وجہ سے جبرمٹ کی شکل اختیار کر گئے اور اس طرح ککھشائیں وجود میں آئیں۔ ہمارا سورج اور زمین جس ککھشاں میں ہے اس کا نام مکی دے " ہے۔ اس کا نام مکی دے اس لیے رکھا گیا ہے کیوں کہ اس کے بہت سے ستارے سفید نظر آتے ہیں، اس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دودھ کی نہر یا راستہ " ہو " مکی دے " کا اردو ترجمہ ہے دودھ یا راستہ۔ جب زمین مکی تو اپنے محور اور سورج دونوں کے گرد بہت تیزی سے چکر لگا رہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ زمین کی اپنی پیدائش کے وقت شکل بالکل ایسی تھی جیسے ہر جگہ آتش فشاں پھٹ رہے ہوں۔ لیکن جیسے ہی درجہ حرارت کم ہونے لگا تو زندگی بھی جنم لیتی گئی۔ تب نہ کوئی انسان تھا نہ جانور یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جاندار یعنی بیکٹیریا تک کا وجود نہ تھا۔ لیکن تب بھی زمین پر ان سب کو جنم دینے والے عناصر یعنی معدنیات موجود تھے۔ پھر کیمیائی ارتقاء کا آغاز ہوا جس میں ان معدنیات کے چھوٹے خلیے ملے اور بالیکھلو بنے اور پھر ان لاکھوں بالیکھلو کے ملنے سے ایسے خلیے وجود میں آئے جو خود سورج کی روشنی استعمال کر کے اپنی خوراک بنانے کے قابل تھے اور ان میں سے ہر ایک کا ایک بنیادی اصول تھا کہ مرنے سے قبل ہر خلیہ ایک سے دو ہو جاتا، اس طرح ان کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ بیکٹیریا ایسے جاندار تھے جنہیں زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی، البتہ یہ خود آکسیجن پیدا کرتے تھے۔ چوں کہ ان کی تعداد کافی زیادہ تھی اس لیے زمین پر نقصاں آکسیجن کی مقدار بڑھنا شروع ہو گئی۔ نقصاں آکسیجن کی مقدار جیسے جیسے زیادہ ہوتی چلی گئی، ویسے ویسے کیمیائی ارتقاء (یعنی مادے سے خلیے بننے کا عمل) تھمتا گیا، یہی وجہ ہے کہ آج کوئی جاندار ایسے جان چیزوں سے نہیں بنکا۔ ارتقاء مٹھنوں، دلوں، یا سالوں پر محیط کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایسی طویل تاریخ ہے جس کی ایک ایک کڑی کے جڑنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اب کیمیائی ارتقاء کے بعد حیاتیاتی ارتقاء یعنی چھوٹے جانداروں سے دوسرے بڑے جانداروں کے بننے کا عمل شروع ہوا۔ بیکٹیریا سے شروع ہونے والا ارتقاء عمل بہت سے خلیوں پر مشتمل جانداروں کی تشکیل کا سبب بنا، جن میں سب سے پہلے چھپکلیاں پیدا ہوئیں، ان کے بعد یعنی خشکی اور تری دونوں میں رہنے والے جاندار (جن میں مینڈک بھی شامل ہے) بنے، پھر یعنی رینگنے والے جانور (جن میں چھپکلیاں، مگر مچھ وغیرہ شامل ہیں)، پھر پرندے، اور سب سے آخر میں ممالیہ جانور (بھیر، بکری، گائے، انسان وغیرہ شامل ہیں) بندرت وجود میں آتے گئے۔ ان پھر پور معلومات اور تیز تر ٹیکنالوجی کے ذرائع میسر ہونے کے باوجود آج بھی انسان کا ناسات کے سر بہتہ رازوں کی گتھیاں مکمل طور پر سلجھانے سے قاصر ہے، کیوں کہ اس طویل ترین تاریخ کی کئی کڑیاں اب تک غائب ہیں۔

مرسلہ: ابووسیم، ملتان

گروسی کرنے کے بعد میں بس اسٹاپ پر آیا تو متعدد خواتین و حضرات کپکپاتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ دھند آسمان سے اتر کر میرے سر کے اوپر منڈلا رہی تھی جسم میں سرد دلہر دوڑ رہی تھی۔ میں نے ان کا رخ موڑنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا شروع کر دیا تبھی میری نظر ایک اشتہار پر پڑی جو بس اسٹاپ کے شیشے پر چسپاں تھا۔ کسی نے اپنے گھر کی ہیمنٹ (نشانہ) کرائے پر دینے کے لیے یہ اشتہار لگا دیا تھا۔ میرے سامنے سولہ منزلہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کا نام 20-ریڈرک ہو تھا۔ اس

کے پیچھے مکانات تھے اور وہ ہیمنٹ انہی مکانوں میں سے کسی ایک کی تھی۔ مجھے اپنی فیملی کے لیے رہائش کی ضرورت تھی اور ہیمنٹ کا کرایہ اپارٹمنٹ سے سستا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس اشتہار میں دلچسپی لی اور آگے بڑھ کر فون نمبر کی اسٹریٹ پھاڑ لی۔ اس ہیمنٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مڈل ٹیک کا اسکول بالکل ساتھ تھا اور میرے بچے بہ آسانی اسکول آ اور جا سکتے تھے۔ اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اس ہیمنٹ کی بجائے سامنے 20-ریڈرک یو بلڈنگ کے چودھویں فلور پر

ایک بیڈروم کا اپارٹمنٹ لے لوں گا۔ خیر وہ تو آگے کی کہانی ہے۔ اس وقت تو میں اس ہسٹمٹ میں دلچسپی لے رہا تھا۔

یہاں ہر گھر کی ایک ہسٹمٹ ہوتی ہے جس کا دروازہ باہر سے بھی کھل سکتا ہے۔ ایک بیڈروم، کچن، ٹی وی، فریج

اور باتھ روم کی سہولت ہر ایک میں ہوتی ہے۔ اگر ہسٹمٹ راؤنڈ لیول پر ہو تو کوئی نہ کوئی چھوٹی سی کھڑکی باہر کی روشنی کے لیے کھلتی ہے ورنہ تازہ ہوا کی کوئی آمد و رفت نہیں ہوتی۔

سردیوں میں زیادہ نمی کی وجہ سے ہسٹمٹ سرد رہتی ہے۔ گوکہ ہیٹنگ کا نظام خود کار ہوتا ہے۔ پھر بھی ٹھنڈ جان کا عذاب جسم سے چپکنا رہتی ہے ہسٹمٹ میں رہنے والے لوگ تازہ ہوا کی

نایابی کے باعث ہمیشہ متضلل رہتے ہیں۔ اگرچی کی شکایات بھی بہت ہوتی ہیں مگر کرایہ اپارٹمنٹ سے بہت کم ہوتا ہے تو لوگ شروع میں ہسٹمٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں تھکا ہوا اور غلط حال سا اسٹریپ ہاتھ میں لیے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سربئی نے حسب معمول ایک دیکھا چو لھے پر

چڑھایا ہوا تھا اور اسے لپٹائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جیکٹ اتاری، گرد سربئی کے حوالے کی اور تھکا

ماندہ کار پینٹ پر لیٹ گیا پھر سربئی سے بولا۔ ”جو لطف تھکاوٹ کے بعد اپنی جگہ پر لیٹنے میں ہے وہ کسی بڑے ہوٹل کے آرام دہ بستر پر بھی نہیں ہے۔“

سربئی کچن میں گرد سربئی کے تھیلے کے اندر جھانکتے ہوئے بولے۔ ”تھکا ہوا اونٹ سرائے کو دیکھتا ہے۔“

میں نے متوجہ نہ ہو کر سربئی کے لیے آپ ”سربئی“ قسم سے سر میں بہت سخت درد ہے خدا کے لیے آپ

محاوروں کا بوجھ میرے تاواں کندھوں پر مت پھینکیں۔“ وہ لہک کر بولے۔ ”نسرین سے ملنے جاتے ہو تو نہیں

تھکتے اور ہمارے محاورے طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”شرافت سے آپ کھانا بنائیں۔ پھر

باہر کسی کام سے بھی جانا ہوگا۔“ باہر حملہ آور ہوئی سرد ہواؤں کو سربئی نے ششے کے پار

دیکھا پھر بولے۔ ”قسم سے موسم بہت سہانا ہو رہا ہے۔ میرا جی کر رہا ہے کہ باہر گھوم آؤں۔“

میں نے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا پھر ڈولتا ہوا شاور لینے کے لیے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ پاگل

سن کی ہزار باتیں ہوتی ہیں۔ پتا نہیں سربئی کس قسم کے پاگل پن کو گلے لگائے ہوئے تھے۔

گرم پانی کا شاور لینے سے روم روم میں تازگی بھر آتی تھی۔ باہر لٹکا تو بٹاشٹ سے کھلا پڑ رہا تھا بھی شہباز پر نظر

پڑی۔ وہ بھی جاب سے آ رہا تھا۔ جب سے اس نے جاب شروع کی تھی اس کا چہرہ متضلل ہو گیا تھا۔ لیکن ساتھ کپڑوں

میں بہتری آگئی تھی۔ بقول سربئی کہ ان اچھے کپڑوں کے پیچھے راز یہ ہے کہ وہاں بہت سی ”مایا“ کام کرتی ہیں۔

میں نے ہسٹمٹ کے لیے اسٹریپ پر دیے گئے نمبر پر فون ملایا۔ دوسری جانب افغانستانی لہجے میں آواز آئی۔ ”جی

فرمائیں۔“ میں یسعی بول رہا ہوں۔ وہ بھی مجھے میری انگریزی کے لہجے سے پہچان گئے کہ میں پاکستانی ہوں۔

میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے مجھے گھر آنے کا کہا تاکہ میں یہ خانہ خود دیکھ

لوں۔ میں نے کچھ دیر میں آنے کی ہائی بھری اور فون رکھ دیا۔

سربئی تو پہلے سے تیار تھے مگر جب شہباز کو ساتھ چلنے کا کہا تو وہ ٹال مول کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری

طرح تھکا ہوا آیا ہے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ ایک کی بجائے تین رائے ہوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے شہباز

سے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ تو بس منہ ہاتھ دھو لے۔“

وہ کراہ کراٹھا اور منمنایا۔ ”کیا سیبا ہے۔ نہ جاب پر چین اور نہ گھر میں سکون۔“

وہ ابھی متضلل کھڑا تھا کہ سربئی نے اپنا محاورہ پھینکا۔ ”ٹٹو کو کوڑا اور تازی کو اشارہ۔“

بس یہ سننا تھا کہ شہباز کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ سچ کا شہباز نظر آنے لگا۔ اس نے لپک کر سربئی کو گردن

سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”یہ ٹٹو کون ہے اور تازی کیا ہوتا ہے۔“ اب سربئی کی چٹنی چٹنی آواز نکل رہی تھی اور اپنا

مطلب سمجھا رہے تھے۔ ”بے وقوف کو مار مار کر تیار کیا جاتا ہے اور عقل مند کے لیے اشارہ بھی کافی ہے۔“

شہباز کو مطلب سمجھ میں آیا تو اس کی گرفت اور سخت پڑ گئی اور سربئی ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ اب میری مداخلت

ضروری ہو چکی تھی۔ میں نے بمشکل سربئی کی گردن آزاد کرانی پھر شہباز کو چندہ منٹ میں تیار ہونے کا کہا اور میں خود سب کے لیے چائے تیار کرنے لگا۔

ہم باہر نکلے تو سردی میں آ رہے جیسی کاٹ تھی ہم

کچھ چٹکلے کچھ باتیں

غالب کو آم بہت پسند تھے اس ضمن میں ان کی ایک مشہور قلم بھی ہے جو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے
نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجے
بس اس فصل میں بھیجے تو آم بھیجے
اس سے متعلق ایک لطیف زبان زد عام ہے
کہ ایک دفعہ غالب مرے لے لے کر آم کھا رہے
تھے کہ ایک دوست آچکا۔ غالب نے کہا حضرت
آئیے آم کھائیے۔

دوست نے انکاری سے کہا۔ ”میں آم نہیں
کھاتا۔“ اتفاق کی بات کہ سامنے گلی میں آوارہ گدھا
فرش پر پڑے آموں کے چٹکوں پر منہ مار رہا تھا۔ کھا
نہیں رہا تھا۔ دوست کو مذاق سوچا تو گدھے کی
طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”دیکھئے آم تو گدھے بھی
نہیں کھاتے۔“

غالب بلا کے حاضر جواب تھے جواب دیا۔
”واقعی گدھے آم نہیں کھاتے۔“

☆☆

ایک بار غالب کے ایک دوست جو کہیں باہر
سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ غالب کہیں
دعوت کھا کر واپس آرہے تھے کہ ایک تنگ سے
کوچے میں قدم رکھا تو گدھا نظر آیا۔ دوست کو مذاق
سوچا تو انہیں مخاطب ہو کر کہا۔ ”مرزا صاحب دلی
میں گدھے بہت ہیں۔“

غالب نے برجستہ جواب دیا۔ ”باہر سے
آجاتے ہیں۔“

حنیف ادیب۔ لاہور

ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ کیسا اپریل تھا جو دبیر کے کوڑے
کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ یہ کیسی بھارتھی جس نے ہمارے
چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اب ایک ہی صورت ہمارے
سامنے پئی تھی کہ دماغ کو جتنے سے بچانے کے لیے پوری
طاقت سے دھڑلگا دی جائے۔ دماغ کا شور مان لیا۔
شہباز جس کو میں مذاق میں بے ڈول نیل کہا کرتا تھا،
اس کی رفتار ہم سب سے تیز تھی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہا تھا۔

جوش میں بغیر مفلر اور کیپ کے نکل آئے تھے گوکہ جیکٹ نے
جسم ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی میں سر ہواؤں کی زد پر تھا۔ میں
نے سوچا کہ واپس اپارٹمنٹ جا کر ٹوپیاں لے لی جائیں مگر
معلوم نہیں کیا سوچ کر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ سرجی
نے ہلکا سا احتجاج ریکارڈ کروایا مگر شہباز کی ایک ہنکار کے
سامنے وہ ڈری ہوئی بلی کی طرح دبک گئے۔ اس پرستزادہ کے

ہم نے فیصلہ یہ کر ڈالا کہ پیدل گلائی مارکیٹ تک جانا ہے
جو کہ شاید ایک کلومیٹر سے ذرا ہی کم ہوگا۔ ہمارے پاس بس
کا نام نہ پاس بھی تھا مگر ہمیں اس ٹھنڈ میں بھی اٹھیلیاں سو جھ
رہی تھیں۔ ہم نے بیٹے سکرارتے بس اسٹاپ کو کر اس کیا اور
ٹورنٹو کے فریزر میں گھس گئے۔ یعنی کہ کھلے علاقے میں
آگئے۔ کچھ دیر تو بلی مذاق میں معلوم بھی نہ پڑا کہ بلا کی ٹھنڈ
ہے مگر جب آدھا راستہ طے کیا تو سر اور ہاتھ آہستہ آہستہ
ٹھنڈا ہونے لگا جیسے کوئی برف سے ٹکڑ کر رہا ہو۔ مجھے کچھ
محسوس ہوا کہ ایسا کچھ ہو رہا ہے جو ٹھیک نہیں ہے مگر وقت کی
ریت ٹھکی سے پھسل چکی تھی۔ اب کچھ بھی ہو نہیں سکتا تھا۔
جبکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دماغ اور ماتھے کے پیچھے جو کچھ
بھی ہوتا ہے وہ جمنے لگا ہے۔ پھر یوں لگا کہ میں چکر کر رہا
ہوں گا۔ یہ ایک واضح موت تھی جس کو ہم نے گلے لگا لیا
تھا۔ شہباز اور سرجی جسم میں گرمی لانے کے لیے اچھل رہے
تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید بھاگ کر بس اسٹاپ تک پہنچ
جائیں گے مگر وہ بہت دور نظر آیا۔ گلائی والا اسٹاپ دیکھا تو
وہ پیچھے والے سے بھی زیادہ دور نظر آیا۔ دائیں ہاتھ پر ایک
کھلا پارک تھا جس کے بعد چند مکانات تھے اور پھر گلائی کے
ساتھ جڑی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ ہم بیچ ٹھنڈا رہیں
بھٹس چکے تھے نہ آگے کے رہے تھے اور نہ پیچھے کے۔ کبھی
بھاگنے لگتے اور جب کوئی افانے کی صورت نہ نکلتی تو رک
جاتے اور ہاتھوں سے سر کو ڈھانپنے لگتے۔

میں نے دیکھا، سرجی اور شہباز کی حالت بھی بہت
بری ہے دونوں کے رنگ قیچے، بلاشبہ میرا بھی یہی حال
تھا۔ شہباز کی کراہیں اور سرجی کے محاورے تک جم چکے
تھے۔ میں بھی خوف زدہ بکری کی مانند اچھل کود کر رہا تھا۔
تاکہ جسم بھی کچھ گرم ہو جائے ہم سب کو اپنی اپنی جان کی
پڑی تھی۔ آتی جانی گاڑیوں کی توجہ بھی ہماری جانب نہ تھی
کہ ذرا رک کرتین معصوم جانیں بچالیں۔ اب اندازہ ہو رہا
تھا کہ ڈوبتے وقت ہر ایک کو اپنی جان کی کیسے پڑی ہوئی

سرجی بھی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ایک بار تو ہانپتے ہوئے مجھے کراس کر کے آگے نکل گئے۔ یہ آگے پیچھے آگے پیچھے کودتے ہوئے دوڑنا رنگ لایا اور ہم کسی نہ کسی طرح اس اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچ ہی گئے۔

بلڈنگ کے کوریڈور میں پہنچتے ہی ایسا لگا جیسے حملہ آور سردی پسپا ہو گئی ہے۔ پھر بھی اس کا اثر باقی تھا۔ جسم کا ہر موئے تن نجد ہو رہا تھا اسی لیے ہم سب ایک قطار میں فرش پر بیٹھ گئے۔ سب نے اپنا اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ہمارے دماغوں کی قفلیں بنتے بنتے رہ گئی تھیں۔

سرجی نے زمین کے ساتھ لگی ڈک سے خارج ہوتی حرارت کے سامنے اپنا ہاتھ ٹیک دیا تھا۔ شہباز اور میں اف اف کہتے ہوئے پھیلی سے سر رکڑ رہے تھے تاکہ کچھ حرارت کھوپڑی کے اندر پہنچ جائے۔ لانی سے گزرتے لوگوں نے ہمیں حیرت سے دیکھا پھر بغیر کچھ کہے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ کسی نے حال تک نہ پوچھا۔

سب سے پہلے سرجی نارمل ہوئے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس طرح ہوا کہ ان کے صبح و سالم دماغ سے ایک مادہ نکلا۔ ”آج تو تمہاری حالت ایسی ہے کہ جیسے تین ٹائف کا گدھا اور نوٹن کا بوجھ۔“

میں سمجھ گیا کہ صرف سرجی نارمل ہو گئے ہیں پھر اس کی دیکھا دیکھی شہباز بھی واپس شہباز بن چکا تھا وہ گدھے پر اڑ گیا اور ایک نئی ٹھکار شروع ہو گئی کہ یہ گدھا کس کو کہا گیا ہے۔

سرجی اپنی اور میری جانب اشارہ کر رہے تھے لیکن جب میں نے گھورا تو شہباز کو بھی اس حلقے میں شامل کر لیا۔ بار بار مطلب پوچھتے یہ یہ بتایا کہ اپنی اوقات سے زیادہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے پر یہ مجاورہ بولا جاتا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ باہر کیسے نکلا جائے کیونکہ سڑک پر سردی کا بدست ہاتھی آوارہ پھر رہا تھا۔ کھائی اسٹور میں سپر مارکیٹ میں آخری شاپ ہائی وے اسٹور کی تھی جہاں سے دو ڈالر میں ہر سامان مل جاتا تھا۔ ان کے پاس گرم ٹوپیاں اور مظہر بھی تھے۔ سرجی اور شہباز دونوں نے میرے کھاتے سے یہ اشیاء خرید لیں پھر ٹوپیاں مظہر پہن کر کشتے میں خود کو بار بار دیکھا اور مطمئن ہو کر میری جانب دیکھا کہ ادا ہو چکی کر دوں۔ میں اس وقت اپنی خریدی ہوئی کیپ درست کر رہا تھا۔ فوراً جب سے رقم نکالی اور ادا ہو چکی کر دی پھر مطمئن ہو کر باہر نکل آئے۔

20۔ ریڈ گر پوڈرائیو کو کراس کر کے اس کی پارکنگ میں آئے۔ اس بلڈنگ کی وسیع پارکنگ کے عقبی حصے میں تھی۔ پارکنگ کو عبور کیا اور کھلے حصے میں آگے اس طرف یہاں سے وہاں تک چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو سڑک کی دونوں جانب دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ گھروں میں دیکھے ہوئے تھے کیونکہ باہر سردی کا تازیانہ لہرا رہا تھا۔ خاموشی چھائی تھی۔ میرے پاس مکان کا نمبر تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آگے بڑھتے ہوئے مجھے دائیں جانب سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا جس کے دروازے پر وہ نمبر چسپاں تھا۔ میں نے ڈور تیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص برآمد ہوا۔

دورمانہ قد، کمزور جسم، ہلکے سیاہ بال اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ یہ تھی صاحب تھے اس گھر کے مالک۔ رنگ ان کا سرخ تھا اور چہرے پر مسکراہٹ، اپنائیت تھی۔ ہمارے چہروں سے سردی کا اثر جھانک رہا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے فوراً دروازہ کھول کر ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔

ہم نے دعوت اس طرح سے قبول کی کہ اگر وہ راستے سے نہ ہٹتے تو ہم انہیں دھکا دے کر گھر میں کھس جاتے ہماری حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہم سردی کے مارے کسی آرام دہ اور گرم گھر کے منتہی تھے۔

یہ کمرد و منزلہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم لیونگ روم میں کھڑے تھے۔ جہاں صوفے رکھے تھے۔ فرش پر افغانی قالین بچھا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک بڑائی دی بند پڑا تھا۔ لیونگ روم کے بعد ایک کچن تھا اور ساتھ ایک کمرہ نظر آتا تھا۔ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور بقول تھی صاحب وہاں تین کمرے اور ایک باغیچہ تھا۔ وہی سیڑھیاں ڈرامھوم کمرے چھوٹے صوفے میں بھی جا رہی تھیں اور ایک بند دروازے پر ان کا اختتام ہو رہا تھا۔ ہمیں صوفوں پر بٹھا کر تھپی صاحب اپنے دونوں ہاتھ لٹے ہوئے کچن کی جانب نکل گئے۔ اس وقت ہمیں ہر بات ناگوار لگ رہی تھی اسی لیے آنکھیں بند کر کے ہم سب نے صوفے سے سر نکالا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم حواسوں میں آئے تو سر اٹھا کر کبھی صحت کو دیکھتے اور کبھی دیوار پر لگی پینٹنگ کو اور پھر ایک دوسرے کی جانب مطمئن نظروں سے دیکھ کر سر جھکا لیتے۔ کچھ دیر بعد تھپی صاحب کچن سے برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی اور ٹرے میں گرم چائے سے بھرے بھاپ اڑاتے کپ تھے۔ قریب

پہنچے ہی انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھا، ہمیں مسکراہٹوں سے نوازا اور بدلے میں ہم سب ایک ساتھ مسکرائے۔ ہمارے مسکرانے پر وہ بے تحاشا مسکرائے اور دوبارہ کچن کی طرف چل دیے۔

سرجی نے کپ اٹھایا، کھونٹ بھر اور ماشاء اللہ کہہ کر کپ دوبارہ میز پر رکھ دیا پھر فرمایا: ”لگتا ہے اب کھانا لینے گئے ہیں۔“

شہباز بولا: ”یہ کھانے کا وقت نہیں ہے۔ شاید جلیبیاں لے آئیں۔“

”سر دیوں میں گرم چائے کے ساتھ ٹھنڈی جلیبیاں خوب مزہ دیتی ہیں۔ دماغ کو طاقت بھی دیتی ہیں۔“ سرجی بولے۔

اسنے میں نصی صاحب ایک اور ٹرے اٹھا کر لے آئے جس میں پٹلیں تھیں اور پٹلیوں میں اسٹک، کشمش اور تپے کے کباب تھے۔ کبابوں کی شکل تو ہم نے سالوں سے نہیں دیکھی تھی۔ اسی لیے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شہباز تھوک نلکے ہوئے بولا: ”سر یہ آپ نے بہت زیادہ تکلف کر لیا ہے۔“

سرجی کشمش کا ایک دانہ منہ میں رکھ کر بولے: ”اتنا زیادہ تو ہم کھا بھی نہیں سکتے۔“

”کباب بھابی نے بنائے ہیں؟“ میں نے پوچھا تو مسکراہٹ کو زیادہ پھیلا کر وہ بولے۔

”دراصل بیگم جاب سے ابھی واپس نہیں آئی ہیں اس لیے فرق میں جو کچھ ملائے آئے۔“ وہ صاف اور شستہ اردو بول رہے تھے کیونکہ کینیڈا آنے سے قبل وہ اسلام آباد میں کئی سال گزار چکے تھے۔

افغانستان میں فارسی بولتے تھے اور یہاں انگریزی۔ اردو سن کر ہم نہال ہو رہے تھے کہ انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”دراصل بیگم ایک فیکٹری میں کافی بیک کرنے کی جاب کرتی ہیں۔“

شہباز نے پوچھا: ”آپ کیا جاب کرتے ہیں؟“ تو جواب دیا:

”مسز ابھی آتی ہی ہوں گے۔“

سرجی یہ سن کر کشمش کا ایک اور دانہ چباتے چباتے رک سے گئے۔ سوال گندم اور جواب چٹا کیا ہوتا ہے وہ آج مجھے معلوم ہو رہا تھا۔ ایک دو بار شہباز نے کباب کھاتے کھاتے دوبارہ کرید اور وہ جواب دینے سے گریز ال نظر

آئے۔ میں نے شہباز کو اشارہ کر کے خاموش کر دیا۔

اسنے میں سرجی نے کباب اٹھایا۔ سوکھا اور پھر کتر کر کھانے لگے۔ ابھی آٹھ سال کی پیاری سی بچی میز پر سے بھاگتی ہوئی نیچے اتری۔ ہمارے پاس آکر سلام کیا۔ ہم نے مسکرا کر جواب دیا۔ شہباز نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا بازو آگے بڑھایا تو بچی خاموش کھڑی رہی۔ شہباز کا ہاتھ فضا میں ہی بلند رہ گیا۔ لڑکی نے کہا کہ میں کسی غیر اور اجنبی سے ہاتھ نہیں ملاتی۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شہباز نے ادھر ادھر دیکھا اور سب کو متوجہ پایا تو شرمندہ ہو کر زرد تر ہونے لگا۔ میں نے بات کا رخ بدلا اور نصی صاحب سے کہا: ”آپ نے ہمیں اتنا سارا کھلا دیا ہے۔ اب تو آپ ہمیں ڈیمنٹ کا راستہ بھی دکھادیں۔“

یہ سن کر نصی صاحب خوش ہو گئے اور بولے: ”ابھی ٹرے کچن میں رکھ کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح کرائے دار کو مالک مکان کی منت سماجت کرنی پڑتی ہوگی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں کرائے دار کی وقعت مالک مکان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مالک مکان کرائے دار کو اپنے حسن سلوک سے متاثر کرتا رہتا ہے کیونکہ کرائے پر لینے کے لیے کئی اپارٹمنٹ بلڈنگ موجود ہیں۔ دس سے تیس منزلہ بڑی بڑی عمارتوں میں اپارٹمنٹ خالی ہوتے رہتے ہیں۔ کرایہ دار کو کسی مالک مکان کے غرے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر کوئی کرایہ دار اپارٹمنٹ کا کرایہ برداشت نہ کر سکتا ہو تو وہ ڈیمنٹ کا رخ کرتا ہے اور جیسے ہی اس کی جیب اجازت دیتی ہے تو وہ ڈیمنٹ چھوڑ کر اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیتا ہے۔ اسی طرح سے مالک مکان کو دوبارہ ڈیمنٹ کے لیے نئے کرایہ دار کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مالک مکان کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کرایہ دار ڈیمنٹ چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ ڈیمنٹ کو کرایہ پر اٹھانا اس لیے بھی ضروری پڑ جاتا ہے کہ برصغیر اور مڈل ایسٹ کے مالک مکان گھر کی سالانہ قسط ادا کرنے کے لیے کرایہ دار پر سارا انحصار رکھتے ہیں جیسے نصی صاحب تھے انہوں نے دو لاکھ کا گھر لے لیا تھا جس کی اٹھارہ سو ڈالر ماہانہ قسط تھی۔ وہ آٹھ سو پر ڈیمنٹ کرائے پر دے دیتے تھے اس طرح ان کی جیب سے صرف ایک ہزار ڈالر جا رہے تھے۔ بیوی اور وہ کم کر دو ہزار ڈالر لاتے تھے۔ اگر ڈیمنٹ کا کرایہ نہ لے تو گھر کے دیگر

لوگ بھی آرہے ہیں اور جو بھی فیصلہ کرنا ہے آج ہی کرلوں۔
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بزرگ فرماتے ہیں کہ جلدی کا
کام شیطان کا ہوتا ہے۔“

اس جواب پر وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ میں نے وعدہ کیا
کہ دو چار دن میں ضرور بتا دوں گا پھر ہم نے گرم جوشی سے
ہاتھ ملائے اور 20- ریڈیو گروپ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے
والے بس اسٹاپ پر آکھڑے ہوئے۔

آتے وقت پیدل چلنے کے تجربے نے جو گت بتائی
تھی، واپسی پر ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

موسم امیر آلود تھا دھند نے ریڈیو بلڈنگ کا اوپری
حصہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فضا غناک تھی اور ہم جلد از
جلد اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ سربئی کی نظریں
20- ریڈیو بلڈنگ کے اوپر دھند پر جمی تھیں۔ کچھ دیکھنے
کے بعد سوچ کر بولے۔ ”ہر اپارٹمنٹ کی یہاں بالکونی بھی
ہے اور لوگوں نے اپنا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا کسی بالکونی میں سائیکل کھڑی تھی تو کسی
میں کرسیاں پڑی تھیں اور گھریلو سامان رکھا ہوا تھا۔ جیسے گھر
کا کوئی اسٹور ہوتا ہے سربئی بولے۔ ”ہیسٹمنٹ لینے سے پہلے
یہاں اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی معلوم کر لو۔ شاید کرایہ مناسب
ہو۔“

بات ان کی ٹھیک تھی۔ اگر اپارٹمنٹ کا کرایہ پچاس یا
سو ڈالر زیادہ بھی ہوتا تو بھی مناسب تھا۔ محل وقوع بھی ایک
ہی تھا۔ سامنے گھاٹی اسٹور سڑک کے پار تھا۔ اسکول اور
پارک بازو میں تھے۔ اپارٹمنٹ ہیسٹمنٹ سے کافی کشادہ ہوتا
ہے۔ سربئی کا مشورہ مناسب تھا۔ ان کے مشورے پر میں
اگلے تین سال تک اسی بلڈنگ میں رہا بعد میں سربئی بھی
یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔

ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے اپنے اپارٹمنٹ پہنچے۔
مفتی کے ساتھ خان اور مطیع اللہ بھی موجود تھا۔ جیسے ہی ہم
اندروں داخل ہوئے مطیع اللہ جیچہ پیچھے کھینچا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔
”تم ان دونوں کو لے کر کہاں گئی تھی؟“

خان قیصر بھی پوچھنے لگا کہ سردی میں کہاں مارے
مارے پھر رہے ہو۔ ان کو ہیسٹمنٹ کی بابت بتانا تو خان پھر
گالیوں پر اتر آیا کہنے لگا۔ بچوں کو ہیسٹمنٹ میں رکھو گے، کیا
انہیں بیمار کرنے کا ارادہ ہے؟“

وہ کہتا چاہ رہا تھا کہ وہاں تازہ ہوا کی آمدورفت نہیں
ہوتی۔ زیادہ نمی کی وجہ سے جرائم زیادہ ہوتے ہیں اور ہر

اغراجات پر اثر پڑتا تھا یوں سمجھیں کہ پورا مینیا مشکلات کا
شکار ہو جاتا۔

نعمتی صاحب ٹرے رکھ کر فوراً واپس آ گئے۔ ہمیں
ایک اعزاز سے اٹھایا اور ہم ان کے پیچھے پیچھے لیونگ روم
نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئے۔ سامنے دروازہ آیا جسے
انہوں نے نہایت آہستگی سے کھولا اور ہم ان کے پیچھے
ہیسٹمنٹ میں اترے۔

جہاں ہم موجود تھے اس کو لیونگ روم کہا جاتا ہے۔
بیس بائی تیس فیٹ چوڑا ایک کمر تھا جس میں کوئی کھڑکی نہ
تھی۔ روشنی اور ہوا کا واحد ذریعہ وہ دروازہ تھا جو کچھ
سیڑھیاں چڑھ کر باہر کی جانب کھلتا تھا۔ یہاں سردی کچھ
زیادہ تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں
اسٹو، فریج اور مائیکرو ویو موجود تھے۔ ساتھ میں ایک ہاتھ
روم تھا۔ لیونگ روم کے پیچھے ایک کمر اور تھا جس کو بیڈ روم
کہا جاسکتا ہے اس میں ایک عدد الماری تھی۔ بیڈ روم میں
ایک ڈبل بیڈ بیچ میٹر میں پڑا تھا۔

نعمتی صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ بھی کرائے میں شامل
ہوگا۔ یہ جگہ ایک ایسے مقام پر تھی جہاں سے شمال جنوب اور
مشرق مغرب کی سب سے آسانی مل جاتی تھی۔ ڈاؤن ٹاؤن
جانے کے لیے مشرقی سمت کی بس ہے ڈیڑھ گھنٹے میں
ڈاؤن پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ معلومات بھی نعمتی صاحب دے
رہے تھے۔

ہم کمرے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ اوپر کی
ڈور تیل بجی اور نعمتی صاحب دروازہ کھولنے اوپر چلے گئے۔
میں نے شہباز اور سربئی کی جانب ان کی رائے جاننے کے
لیے دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مطلب جان گئے۔ شہباز
بولا۔ ”اتنا کھلایا ہوا ہے تو ہیسٹمنٹ یعنی ہی پڑے گی۔“

سربئی نے اپنی رائے دی۔ ”کہیں شرم شرم میں کام
ہی تمام نہ ہو جائے۔“

میں ان دونوں کی قیمتی رائے سے مستفیض ہونے کے
 بجائے تھلا اٹھا۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا نعمتی صاحب
آ گئے۔

میں نے ہیسٹمنٹ کی تعریف کی اور پھر کرائے کی بابت
پوچھا۔ انہوں نے انکساری سے آٹھ سو ڈالر بتایا۔ میرے
خیال میں یہ مناسب تھا مگر میں نے فوری طور پر کوئی بھی
فیصلہ کرنے سے احتراز کیا۔ نعمتی صاحب سے کہا کہ دو چار
دن میں بتا دوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے پاس دوسرے

وقت الہی کی شکایت رہتی ہے۔ مفتی خاموش تھا مگر مطیع اللہ بڑی دانشمندی سے خان کی باتوں پر اپنا سر ہلا رہا تھا۔ شہباز، مطیع اللہ سے پوچھنے لگا۔ ”تم تو ایسے خان کی ہاں میں ہاں ملارہے ہو جیسے بیسٹ میں رہنے کا بڑا تجربہ ہے۔“

لیونگ روم میں مفتی کسی اور کو برداشت نہیں کرتا تھا مگر مطیع اللہ کو صاف جواب دیتا بھی آسان نہ تھا۔ خان مفتی کو چڑھانے کے لیے بولا۔ ”یہ بے چارہ دو گھنٹوں کا سفر کر کے بیسٹ میں آتا ہے تو آج نہیں سکتا یہیں کہیں کوئے میں پڑا رہے گا۔“

مطیع اللہ نے چہرے پر ایسے سنجیدگی طاری کر لی جس طرح آج کل کسی ٹاک شو میں سیاست دان طاری کر کے بیٹھا ہوتا ہے۔ شہباز کی بات پر بولا۔ ”منطق کے لیے تجربے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“

میں نے ارادہ پختہ کر لیا کہ پہلی فرصت میں اپارٹمنٹ بلڈنگ (20-ریڈ گریو) جا کر معلومات لوں گا۔

باہر سردی بڑھ رہی تھی۔ خان قیصر جب کبھی پور ہوتا تو کپ لگنے آ جاتا کرتا تھا۔ مطیع اللہ بہت دنوں بعد آیا تھا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ اتنی سردی میں تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ جواب میں وہ بولا۔ ”یہیں سے گزر رہی تھی تو سوچا کہ چکر لگوں۔“

میں نے کہا۔ ”خان صاحب! ٹھیک ٹھیک پیادہ، ماجرا کیا ہے؟“ دراصل میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ کہیں فریب سے گزر رہا تھا اور ہم سے ملنے آ گیا۔ یہ کوئی چھوٹا سا شہر نہیں کہ کوئی آپ کے آس پاس ہی رہتا ہو۔ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ بیسٹ میں جاب ہو گئی ہے۔“

میرے سوال پر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی جاب ہو گئی ہے اور وہ یہاں شفٹ ہونے کی بات کرنے آیا ہے۔ میرے سوال پر مطیع اللہ مسکرایا اور بولا۔ ”ہاں ان کا کوئی لیڈر وغیرہ تو آیا تھا۔“

وہ اب بھی مکمل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بیسٹ میں کب جوائن کر رہے ہو؟“

وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ اگلے ہفتے جوائن کر لوں۔“

اس بات پر مفتی کے علاوہ سب اسے مبارک باد دینے لگے۔ مفتی قہقہہ پڑ چکا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب مطیع اللہ بھی بوریا بستر لے کر یہاں شفٹ ہو جائے گا۔ مطیع اللہ ہمیشہ بات ادھوری کرتا ہے جسے آپ کو خود مکمل کر کے کوئی نہ کوئی مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ آخر کار اس کی جاب کسی اچھی جگہ ہو گئی ہے۔ ہم ایک کمرے میں تین بندے تھے۔ اس کی کنجاش بہت کم تھی۔

مطیع اللہ نے پوری طرح سے اپنے آپ کو معنوی سنجیدگی میں پکڑ رکھا تھا، خان کی بات پر اس کی زبان حرکت میں آئی اور بولا۔ ”خان بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم تو تکیہ لے کر میز کے نیچے بھی سو جائے گی۔“

خان قہقہہ لگا کر بولا۔ ”خان کہتا ہے کہبتی نہیں ہے۔“ مطیع اللہ بولا۔ ”یہی تو کہہ رہی تھی کہ خان ٹھیک کہتی ہے۔“ اس پر مفتی بھی ہنس پڑا۔

مفتی مجھے، شہباز اور سر جی کو صلاح مشورے کے لیے کمرے میں لے آیا۔ پہلے بغور کمرے کو دیکھا اور پھر بولا۔ ”یہ کمرہ تو تین کے لیے بھی کم ہے اور مطیع اللہ کہاں سوئے گا۔“

میرے ذہن میں فوراً ایک جھماکا ہوا۔ میں نے مفتی کی دھکی رگ پکڑ لی تھی کہ وہ لیٹ نائٹ شو دیکھنے کا شوقین ہے اور بھی بکھار منہ کا اور دماغ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کلب کوک بننے بھی جاتا رہتا ہے۔ میں نے اسے خانے میں مطیع اللہ کو فٹ کرنے کا اچانک سے فیصلہ کر لیا اور مفتی سے بولا۔ ”مطیع اللہ شوقین مزاج پتھان ہے۔ رات گئے لیٹ نائٹ شو بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ کبھی بکھار دیر سے گھر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے مفتی کے چہرے کا جائزہ لیا تو میری بات میں خاصی دلچسپی رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ”وہ تو چند گھنٹے ہی سوتا ہوگا۔“

مفتی اب غور سے مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری پتا پھینکا۔ ”تم کہتے ہو تو اسے منع کر دیتے ہیں اور ویسے ہم اس کے گناہوں میں کیوں شریک ہوں۔“

شہباز اور سر جی دلچسپی سے میری بات سن رہے تھے۔ شہباز مسکرا رہا تھا اور سر جی بات سمجھنے کی کوشش میں بلکان ہو رہے تھے۔ اتنے میں مفتی بولا۔ ”یہ اچھا بھی تو نہیں لگتا کہ اس کو سیدھے منع کر دیں۔ آخر پاکستانی ہے اور ماشاء اللہ مسلمان بھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر اس کی عادات.....“ میری بات کاٹ کر مفتی بولا۔ ”آدی کو اللہ راہ راست پر لے بھی آتا ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے مفتی تیزی

سے باہر نکل گیا۔ مفتی کے جاتے ہی شہباز، سرجی سے بولا۔
 ”ندیم بھائی نے اسے یہاں رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
 ہم کمرے سے باہر لیوٹنگ روم میں آئے تو مفتی، مطیع
 اللہ سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو انکار بھی نہیں کر سکتا بس آپ کو
 گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔“

مطیع اللہ بڑی سنجیدگی اور متانت سے بولا۔ ”گھر کے
 کام تو میں سب کر لیتی ہوں اور درویشاں بھی بنا لیتی ہوں۔“
 میں مطیع اللہ کی سنجیدگی کے پیچھے چھپی جالاکو تبصرہ رہا
 تھا۔ مفتی نے بات فائل کرتے ہوئے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے تم
 کل سے شفٹ ہو جاؤ۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”وہ تو میں آج سے ہی ہو رہی ہوں۔
 سامان کل میں اور آپ اٹھا کر لے آئیں گے۔“
 اس بات پر مفتی فنی چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا
 اور میں منہ پھیر کر کھڑا مسکراتا رہا۔

رات میں ٹھیک سے نہ سو سکا کیونکہ اب شہباز کے
 خرائے، سرجی کی سیٹیاں اور اس کے ساتھ اب مطیع اللہ کی
 تمام جانوروں کو ملا کر بنی کسی ماعطوم آواز نے ایک مفتی
 جاری کر دی تھی۔ میں نے اپنا تکیہ اور کمر ٹراٹھا یا اور باہر
 لیوٹنگ روم میں آکر لیٹ گیا جہاں مفتی اپنے لیٹ ٹائٹ شو
 کے مشغل میں مشغول دیدے پھاڑے لی دی کو دیکھ رہا تھا۔

ایک دن میں ہی سو سال سے 3 بجے سہ پہر نکلا اور بس
 سے 20- ریڈر کیوڈر انیو پارٹمنٹ کے سامنے کچھ معلومات
 لینے کے لیے اترا۔ بلڈنگ کے سامنے بہت بڑا لان تھا جو
 مارٹن گورڈونک پھیلا تھا۔ گوگھاس ابھی تک مرجھائی پڑی
 سو رہی تھی مگر اندازہ تھا کہ گرمیوں میں یہ لٹ گرین ہو کر سر

اٹھائے گی۔ لان میں سرو کے متھو پودے اور چڑ کے
 درخت ایسا تھہرے تھے۔ یہاں کسی بس یا کار کو ہارن بجانے کی
 اجازت نہیں اسی لیے شور بلڈنگ تک بالکل نہیں آتا۔ یہاں
 گاڑیوں کی ہر سال آپکیشن ہوتی ہے کہ آیا کوئی انجن شور تو
 نہیں کرتا یا دھواں تو نہیں چھوڑتا۔ کسی میں ایسی خامی ہو تو وہ
 گاڑی بند کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے کسی گاڑی کا بے تحاشا
 شور یا دھواں آپ کو کسی روڈ پر نہیں ملے گا۔ ٹورنٹو یا کسی بھی
 مغربی شہر کی صاف و شفاف آب و ہوا کی ساری وجہ بھی یہی
 ہے کہ علاقے کی فضا کو ہر قسم کی کثافت سے پاک رکھا جاتا

ہے۔ میں نے اپارٹمنٹ کا مرکزی دروازہ کھولا اور ایک لابی
 میں کھڑا تھا جس کے آگے کا دروازہ لاک تھا۔ اندر جاتے
 لوگ جب سے چابی نکال کر دروازہ کھولتے اور داخل ہو

جاتے ہیں نے شیر کے آفس کا پوچھا تو ایک دیسی بندے
 نے کہا کہ پیچھے پارکنگ سے اندر آنے کا دروازہ کھلا ہوگا۔
 میں محکوم کر بلڈنگ کے پیچھے اس پارکنگ میں آیا جہاں سے
 ہم گزر کر تیسری صاحب کے گھر پیمینٹ دیکھنے کے لیے گئے
 تھے۔ بلڈنگ کے پیچھے ایک چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور وہاں
 سے آمد و رفت جاری تھی۔ میں نے کئی پاکستانیوں کو آتے
 جاتے دیکھے۔ کئی ایک مشرقی یورپ کے بھی تھے۔

اندر داخل ہوا تو اگلے ہاتھ پر پتھار سے میل باکس تھے
 جن پر ہر اپارٹمنٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یقیناً پوسٹ میں اسی
 باکس میں ڈاک ڈال جاتا ہوگا۔ کرایہ دار چابی سے اپنے
 باکس کو کھول کر روزانہ کی ڈاک نکالتے ہوں گے۔ سیدھے
 ہاتھ پر ایک چھوٹا سا آفس تھا جس میں مشرقی یورپ کی عمر
 رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ چھوٹے قد کی لی لی اس بلڈنگ کی
 شیرین نگرانی میں نے پہلو کہا اور وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے
 لگی۔

اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا کہا اور میں شکر یہ ادا
 کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب سوالیہ نظروں سے
 مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ مجھے ایک بیڈروم
 کا اپارٹمنٹ چاہیے۔ اس نے میری نیلی کا پوچھا کہ بچے
 کتنے ہیں۔ میں نے کہا کہ دو بیٹیاں ہیں تو وہ سر جھٹک کر
 بولی۔ ”پھر تم کو دو بیڈروم کا اپارٹمنٹ ہی مل سکے گا۔“

میں نے کہا کہ مجھے تو ایک بیڈروم کا چاہیے تو وہ
 بولی۔ ”دو بچے ایک بیڈروم کے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ
 سکتے۔“

دو بیڈروم کے اپارٹمنٹ کا کرایہ دو سو ڈالر زیادہ تھا
 اور مجھے ابھی اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو
 وہ بولی۔

”ہر اسکول میں بچوں کی مخصوص تعداد ہی داخلہ لے
 سکتی ہے۔ اگر ہم ایک اپارٹمنٹ میں چار چار بچے رکھ لیں تو
 اسکول میں بچوں کی تعداد انچائٹس سے بڑھ جائے گی۔“

میں نے جب یہ کہا کہ میری ایک بیٹی صرف ایک
 سال کی ہے تو اس نے زور سے اوکے، اوکے کہا اور بولی۔
 ”اب ٹھیک ہے مگر جب وہ چار سال کی ہو تو دو بیڈروم میں
 شفٹ ہونا ہوگا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے ایک فارم
 میرے حوالے کیا۔ کہتے لگی کہ اپنے سارے کوائف، جاب
 کی تفصیل، تنخواہ اور ریفرنس کے ساتھ دو ماہ کا ایڈوانس چیک

لگا کر اسے دے جاؤں۔ وہ کہنے لگی کہ چودھویں فلور پر ایک میڈروم اپارٹمنٹ کیم جولائی سے خالی ہو رہا ہے۔ پھر مجھ سے سوال کیا۔ ”تم کو کب شفٹ ہوتا ہے۔“

میں نے کچھ سوچا اور اندازہ لگایا کہ جون کے شروع میں میری پہلی کو لینڈنگ پہنچے زل جائیں گے اور جولائی کے پہلے ملتے میں ان کو بلوالوں گا۔ میں کیم جولائی پر راضی ہو گیا اور فارم لے کر باہر نکل آیا۔ کرایہ آٹھ سو ڈالر ماہانہ تھا۔ جو ڈسمنٹ کے برابر تھا اور سہولتیں وہاں سے بہت زیادہ تھیں۔ ڈسمنٹ کی وہ پرائیویسی نہیں ہوتی جو اپارٹمنٹ کی ہوتی ہے۔ اپارٹمنٹ کی ایک بڑی بالکونی بھی فری تھی جس کا رخ مارن گرورڈ کی جانب تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ڈینگ اور پاور بلڈنگ کی جانب سے فری تھی۔ وہ تو ڈسمنٹ میں بھی تھیں مگر وہاں ان کا نل کیم رکھنے کے لیے مالک مکان ہر وقت آپ کو ٹوکنا رہتا ہے۔ اسی بنیادوں پر میں نے اپارٹمنٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہاں اسکولوں کا نظام ایسا ہے کہ ہر اسکول میں بچوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر اتنی ہی کنجاش رکھی جاتی ہے یہاں ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ایک گھر میں دو بچے ہوں اور ساتھ والے میں دس۔ اگر ایسا ہو تو اسکولوں کا حشر پاکستان جیسا ہو جائے۔ اگر کہیں زیادہ بچے ہوں تو سٹی گورنمنٹ آپ کو وارنٹک دے دیتی ہے۔ ہم دیسی اور ڈیٹ کے لوگ اپنے گھروں کی ڈسمنٹ کرائے پر غیر قانونی طور پر اٹھا دیتے ہیں۔ اس لیے جس گلی میں سو بچے ہونے چاہئیں۔ وہاں ڈیڑھ سو بچے برآمد ہوتے ہیں۔ اسکول کی کنجاش پانچ سو کی اگر ہے تو وہاں آٹھ سو بچے داخلے کے امیدوار ہوتے ہیں پھر اسکول بچوں کے انڈریس کے مطابق اپنا ڈیٹا گورنمنٹ کو دیتا ہے اور اسی طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک گھر میں کتنی فیملی ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسے گھروں کو بھاری جرمانے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری سب سے اہم اور اچھی بات یہ ہے کہ اسکول اور تعلیم کا نظام سب کے لیے ایک ہی ہے اور ہارویس کلاس تک بالکل فری ہے۔ ایسا نہیں کہ تین تین قسم کے اسکول ایک ساتھ چل رہے ہوں اور سب کا نصاب بھی مختلف ہو۔ بچوں کے والدین کی جو بھی آمدن ہو بچے امیر ہوں یا متوسط یا غریب۔ ان سب کے بچے ایک ہی اسکول میں جائیں گے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ امیروں کے لیے الگ نظام تعلیم اور غریب کے لیے الگ نظام، تعلیم ہو صحت اور تعلیم کے

مواقع سب کے لیے برابر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ کا بچہ کسی دوسرے علاقے کے اسکول میں داخلہ لے سکے۔ ہر علاقے کا اپنا اسکول ہوتا ہے۔ بچوں کو صرف اسی اسکول کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے جو سڑک کر اس کرنے کے لیے سب سے زیادہ محفوظ ہو۔ کسی بچے کو پیدل سڑک کر اس کرنے نہیں دیا جاتا۔ اگر کسی بھی وجہ سے بچے کا گھر چوراہے کے دوسری جانب ہے تو پھر اسکول اس کو بس مہیا کرتی ہے۔ کسی مخصوص فاصلے کے باہر کسی کا گھر ہے تو بس اسکول کی جانب سے مفت مہیا کی جاتی ہے۔

اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ فائدہ تھا کہ پارکنگ کے عین سامنے اسکول تھا اور ایک ذیلی سڑک کر اس کرتی تھی۔ بچے ڈسمنٹ میں پیدل اسکول پہنچ سکتے تھے۔

میں فارم لے کر اپنے اپارٹمنٹ میں ایسے داخل ہوا جیسے میرے پاس الاٹمنٹ لیٹر ہو۔

مطیع اللہ دو دن پہلے شفٹ ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے بیسویں سال جو اس نہیں کی تھی۔ وہ سیکورٹی کی جانب پر جاتا اور وہاں آتا تو مفتی اس کے کانوں کے پاس کچھ نہ کچھ کہتا رہتا اور وہ اپنی نظر اس صحت پر جمائے اثبات میں سر ہلاتا رہتا۔ ایک دو بار شہباز مجھ سے بول چکا تھا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نئی مچھڑی پک رہی ہے۔“

سربئی کو اپنی پڑی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی جھٹی ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا ہے۔ دراصل میں نے جو بچ بولیا تھا کہ مطیع اللہ شوقین حراج اور کلبوں کا راسیہ ہے تو تب سے مفتی اس سے کچھ اگلوںا چاہتا تھا یا پھر اپنا ہمو ایتنا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ مطیع اللہ ایسا کوئی شوق نہیں رکھتا تھا کہ اب بات چل پڑی تھی تو میں اس کا انجام خیر دیکھنا چاہتا تھا۔ مفتی بھی کوئی ایسا رنگین حراج نہ تھا۔ اس کی کیفیت اس بچے جیسی تھی جو قیمتی کھلونے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے مگر ان سے ٹھیکے کی ہمت نہیں رکھتا۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی اور مطیع اللہ کے درمیان بقول شہباز کوئی ”مچھڑی“ پک رہی تھی۔ مفتی اب مطیع اللہ کے کان میں کسی سازشی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بے پردہ ہو کر ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ کہہ جا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہے اور پھر سرگوشیاں کیوں ہو رہی ہیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”شائیں کہ دیواروں کی بھی کان ہوتی ہے۔“

میرے آنے کے بعد مفتی انجان بن کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں مطیع اللہ نے فارم دیکھا تو اس کی بابت پوچھا۔ میں نے جب اپارٹمنٹ کے بارے میں بتایا کہ ڈھائی ماہ بعد یکم جولائی سے اسے لیز کر رہا ہوں تو مفتی بڑبڑانے لگا۔ ”کیا ضرورت ہے بچوں کو بلانے کی، پہلے یہاں تھوڑی مشکلات ہیں جو ایک اور دروگ پال لیں۔“ مفتی دو سال سے اپنی فیملی نہیں بلوارہا تھا وہ اکیلے رہنے کا عادی تھا۔ اس کی نظر میں یہی بہتر تھا کہ بچے پاکستان میں رہیں اور آپ انہیں ہر ماہ خرچ بھیجتے رہیں۔ وہ میرے ساتھ بھی کئی بار بحث کر چکا تھا۔ میرا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا۔ میں اس بات پر قائل تھا کہ بچے اور بیوی آپ کے ساتھ رہنی چاہیے تا آنکہ کوئی بڑی وجہ نہ ہو۔ مطیع اللہ بھی شادی شدہ تھا لیکن بچے نہ تھے۔ وہ بھی مفتی کا ہموا تھا اور یہی کہہ کر اپنی جان چھڑوا جاتا تھا کہ کافروں کے ملک میں بچے نہیں لانے چاہئیں۔ (اب مطیع اللہ کے ماشاء اللہ بچے بھی ہیں اور سب مل جل کر کینڈا میں رہتے ہیں) مفتی پہلے تو مجھے سمجھا تا رہا۔ جب میں اس کی بات نہ سمجھ سکا تو میری بات بغیر کہے ہی سمجھ گیا۔ (اس کے بیوی بچے پہلے ہی کینیڈا آ کر اپنا اسٹیشن لے چکے تھے۔ پھر میری فیملی گئے آنے کے بعد مفتی نے بھی اپنی فیملی کو بلوا لیا تھا) کچھ دیر بعد شہباز اور سرجی اپنی جائیں ختم کر کے تھکے ہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کے لیے چائے تیار کی۔ وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مطیع اللہ بولا کہ ندیم بھائی نے اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔

شہباز ایک دم زرد پڑ گیا اور سرجی خاموش ہو گئے۔ چائے کے کپ کارپٹ پر رکھے وہ مجھے دیکھنے لگے تھے۔ دراصل کچھلے چھ ماہ میں ہم تینوں نے مشکل وقت ایک ساتھ کاٹا تھا۔ کہیں سے بھی آتے تو واپس آ کر ایک دوسرے کی باتیں سنتے جس میں جدوجہد اور تکلیفیں بھی ہوتیں اور ساتھ ہی ہنسی مذاق کے قصے بھی ہوتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم چھ ماہ سے نہیں بلکہ مدتوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہوں۔ آج جب انہیں میرے جانے کی خبر ملی تو وہ ادا اس ہو گئے تھے۔ میں خود بھی ان کی کمی کو ابھی سے محسوس کر رہا تھا۔ شہباز بولا۔ ”ندیم بھائی! ہر شام کو آپ کے گھر میں آیا کروں گا۔“ مفتی بولا۔ ”وہ ندیم سے ملنے نہیں بلکہ گھر کی تازہ

روٹیاں کھانے جائے گا۔“ سرجی بولے۔ ”میری فیملی بھی جیسے آئی تو اسی بلڈنگ میں اپارٹمنٹ لوں گا۔ جہاں ندیم بھائی ہوں گے۔“ جب میں یہاں سے شفٹ ہو گیا تو بعد میں یہ لوگ میرے پاس آتے رہے ہم آپس میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے۔ اکٹھے سفر بھی بہت کیے۔ رابطہ جو بن گیا تھا وہ تو ابھی تک برقرار ہے۔

اپریل کا مہینا اب ختم ہو رہا تھا۔ سردی کی لہر جو دو ہفتے پہلے اچانک اند آئی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ بریسیں پھر سے پھسل چکی تھیں۔ بیہوشاں میں میری ٹریڈنگ ختم ہو گئی تھی اور مجھے کراس ٹکنگ میں میری توقع کے برخلاف رکھ لیا گیا تھا۔ ہر ایک میری قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ اتنے ہائی ٹیک سیکشن میں مجھے کام کرنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہفتے کے پانچ دن بیہوشاں میں اور ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے جایا کرتا تھا۔ نسرین سے دو تین بار فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی میرے شیڈول کو جاننے لگی تھی۔ اس نے میری بہت بہت افزائی کی۔ پاکستان اپنے بچوں اور بیوی سے ہر دوسرے تیسرے دن بات کر لیا کرتا تھا۔ ہر ہفتے اسے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ اس کے جواب بھی مسلسل آتے تھے۔ وہ میرے ہل دو ہل سے واقف تھی اور مجھے اپنے اور بچوں کے بارے میں آگاہ رکھتی تھی۔ قدیل میری بیٹی ہر وقت ایک ہی بات مجھ سے پوچھتی کہ بابا آپ نے گاڑی لے لی ہے۔ اسے ماں نے بتایا تھا کہ جیسے ہی بابا گاڑی لیں گے تو ہمیں بلوالیں گے۔ اسی لیے وہ ہر بار گاڑی کا پوچھتی تھی اور پھر میری چھوٹی بیٹی ابھی دس ماہ کی ہوئی تھی ایک نظام چل رہا تھا اور ہم اس کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔

مفتی کے تو قعات تب ٹوٹنا شروع ہوئے جب مطیع اللہ اس کے پسندیدہ لیٹ ٹائٹ شو سے منہ پھیر کر سونے لگا تھا۔ مفتی کے کان میں یہ میں نے ڈالا تھا کہ مطیع اللہ شوقین اور رنگین مزاج پٹھان ہے۔ اس کے بدلے میں مفتی نے اسے لیونگ روم میں سونے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح جاگ کر یہ شو دیکھے گا اور پھر رنگین تہمرے بھی کرے گا۔ مگر مطیع اللہ وہ ذوق نہ رکھتا تھا جو مفتی کے اندر پایا جاتا تھا۔ ایک بار تو مطیع اللہ نے حد کر دی ہم سب نے رات کا کھانا ابھی ختم کیا تھا، سرجی اپنے گرم کپڑے دکر کے دوبارہ اپنے سوٹ کپس میں ٹھونس رہے تھے اور برف باری ختم ہونے پر بہت دھکی بھی تھے۔

ہمارا، مطیع اللہ کو اپنی بغض دکھلا رہا تھا کہ اسے کہیں بخارتو
 لیں تو مطیع اللہ نے کہا تھا۔ ”گلتا ہے تمہارے اندر دو ہارس
 ہار کی کوئی شین چل رہی ہے۔“
 اتنے میں مفتی نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ”آج بہت
 اچھا شو رہا ہے۔“

اس پر مطیع اللہ نے ہمیشہ کی طرح چھت کو اداسی سے
 گھورا اور بولا۔ ”یہ خنزیر شور و زانہ لگتے ہیں؟“
 مفتی یہ بے ادبی برداشت کرتے کرتے برداشت کر
 گیا مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کے باکمال شوق کو
 لہر کا لقب ملا تو وہ شرم اور غصے میں خود سر جھکا گیا تھا۔ میں
 نے مفتی کو تسلی دی کہ ہم جس چیز کو معیوب کہتے ہیں تو پٹھان
 اسے خنزیر کہتے ہیں۔ مفتی نے سراپے ہلایا کہ بات اس کی
 سمجھ میں آگئی ہے مگر شک کی پرچھائیں ابھی بھی اس کے
 ہمارے پر نمایاں تھیں۔

مفتی مطیع اللہ کے کان میں ہر وقت جو سرگوشی کرتا رہتا
 تھا ایک دن وہ سرگوشیاں آشکارہ ہو گئیں۔ ہوا اس طرح کہ
 مفتی کچھ اس کے کان میں بولتا اور وہ کہتا۔ ”انشاء اللہ جولائی
 میں جائے گی۔“

سرحی نے مجھ سے پوچھا۔ ”جولائی میں مطیع اللہ کیا
 پاکستان جا رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب چند سالوں تک وہ بیہوسال کے
 ملاوہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔“

سرحی بولے۔ ”کیا مطلب؟“
 ”خود ہی سمجھ جاؤ گے۔“

مجھے شک تھا کہ مفتی اسے کلب چلنے کا کہتا رہتا ہے اور
 مطیع اللہ کبھی کہتا کہ جون میں جاؤں گا اور کبھی جولائی پر ٹال
 دیتا۔ مفتی اب عاجز آچکا تھا۔ وہ اب باقاعدہ ناراض ہونے
 لگا تھا۔ آج جولائی جولائی کر رہا تھا تو میں نے سرحی کے
 سامنے اس سے پوچھ لیا۔ ”یہ جولائی میں کہاں جا رہے ہو؟“
 مطیع اللہ نے بھی مفتی کے راز عیاں کر دیے اور بولا۔
 ”مفتی ٹورنٹو کے آؤٹ آف باؤنڈ علاقے میں جانے کا پلوی
 ہے اور میں کہتی ہوں کہ جولائی میں جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”چلو یہ اب بتاؤ کہ جولائی کی کس تاریخ
 میں جاؤ گے؟“

اب مفتی کو میری شکل میں اپنا حتمی نظر آیا تو وہ بات
 میں دلچسپی لینے لگا۔ مطیع اللہ نے تنجید کی سے میرے سوال کا
 جواب یہ دیا۔ ”کیا جولائی کی تیس تاریخ ہوتی ہے۔“

میں اس کے جواب میں چھٹی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔
 میں نے اس سے کہا۔ ”جولائی کی تیس تو نہیں پر سنا ہے
 تینتیس تاریخ ہوتی ہے۔“
 مفتی نے پھر کبھی ہمت نہیں ہاری اور اپنی قسمت
 آزمائی پر لگا رہا۔

بیہوسال میں جب بھی کسی کی نئی جاب ہوتی ہے تو بیچ
 روم میں لگے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا کر نئے آنے والے کو
 خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ میں دوپہر کی شفٹ میں ایک بجے
 بیہوسال پہنچا تو دیکھا کہ نوٹس بورڈ کے گرد ایک مجمع جمع
 ہے۔ سب گورے، کالے، اور دہلی کچھ پڑھ رہے ہیں۔
 کچھ ہنس رہے ہیں اور کچھ تبصرے کر رہے ہیں۔ منظر اور
 آخر بھی وہاں موجود تھے۔ یہودی فزیکا بھی مولیٰ عینک کے
 پیچھے نظریں جھپکا رہا تھا۔ بھیڑ پھٹی تو میں نے منظر سے پوچھا
 کہ ماجرا کیا ہے؟

وہ بولا۔ ”خود دیکھ لو۔“
 وہ مسکرا رہا تھا۔ نوٹس بورڈ پر دیکھا تو لکھا تھا۔ ”ہم
 مطیع اللہ، مطیع اللہ کو بیہوسال جو آئے کرنے پر خوش آمدید کہتے
 ہیں۔“

اصل ماجرا مجھے معلوم تھا۔ مطیع اللہ جب کینیڈا کی
 امیگریشن کے لیے فارم بھر رہا تھا تو پہلی لائن میں درج تھا
 کہ مدنی کا پہلا اور آخری نام کیا ہے۔ اب وہ آخری نام پر
 اللہ تو نہیں لکھ سکتا تھا پٹھان بھائی پریشان ہو گیا مجھے خط لکھا
 کہ وہ اس معاملے پر مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ پھر دور
 صدیق کے گن گانے لگا جب بیٹے اور باپ کے نام کے بیچ
 ”بن“ لگا دیتے تھے۔ اس طرح مطیع اللہ کا پہلا نام مطیع اللہ
 اور آخری نام شیر اللہ ہو سکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ نام
 تبدیل کرے۔ اس نے ایک اور سوات کے دوست سے
 مشورہ لیا تو اس نے بھی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس
 دوسرے پٹھان دوست نے تو ایک قدم بڑھ کر اس پر یہ
 احسان بھی کر دیا کہ اس کا نام تبدیل کر کے مطیع اللہ مطیع اللہ
 رکھ دیا۔ اب اسے ایک مطیع اللہ کی مصیبت ختم ہوئی اور ہر
 جگہ اپنا نام تبدیل کر کے کینیڈا میں دو مطیع اللہ لے آیا تھا۔
 اب ایک مفتی وجود جس میں ایک مطیع اللہ کی بھی گنجائش نہ تھی
 اور وہ اس میں دو مطیع اللہ لیے پھر رہا تھا۔ یہ وجود دو مطیع اللہ کا
 بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا اور اسی لیے اس نے جہاں کہیں بھی جاب
 کے لیے درخواست دی تو آگے والوں نے نام دیکھ کر یہ
 بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر ایک مطیع اللہ سخت

پریشان تھا کہ دوسرے مطیع اللہ سے جان کیسے چھڑوائے۔ اس سے پہلے کہ ایک مطیع اللہ دوسرے مطیع اللہ کا بوجھ اتارنے کے بارے میں کچھ سوچتا کہ اس کی جاب بیہوشی میں ہوگئی اور اسے اس غور و فکر سے نجات ملی۔

اب یہودی فزیکا کو نام کی صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ بہت متحیر تھا۔

فزیکا کی پیدا کنی طور پر دونوں آنکھیں ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں پھر گھرے شیشوں والی نظریک عینک بھی لگاتا تھا۔ قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ وہ ہمیشہ ہم پاکستانیوں کے درمیان بیٹھتا تھا۔ شکل سے جادوگر نظر آتا تھا۔ جب ہم میں سے کوئی میز پر طبلہ بجاتے ہوئے یہ گانا گاتا۔ ”جادوگریاں چھوڑ میری باتیں“ تو فزیکا اس کی تال پر ناچنے لگتا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ جادوگر کے نام سے لکرا جا رہا ہے۔ اسے تو بس دھن سے سروکار تھا۔ فزیکا لچ میں صرف کھروں کا اچار لاتا اور اسے بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی اسے لینے آئی، کسی نے دیکھ لیا تو اندر آکر شور مچا دیا کہ فزیکا کی بیوی تو بہت ہی خوب صورت ہے پھر سب جلدی جلدی باہر کا ڈریس تبدیل کر کے لائن میں کھڑے ہو کر اس کی بیوی دیکھنے لگے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی یا پھر فزیکا کے مد مقابل اس کا حسن زیادہ ٹھہرا آیا تھا۔ سب تعریف کر رہے تھے فلپائن کا چھوٹے قد کا گنجافرڈی تو یہ کہتے پایا گیا کہ یہ فزیکا کی بیٹی ہے۔ میں نے فرڈی سے کہا کہ اپنی زبان کو قاقوب میں رکھو کہ کہیں فزیکا مرنے مارنے پر نہ اتر آئے۔ ٹھہر دیکھا تو فزیکا خوشی اور عاجزی سے دوہرا ہو رہا تھا پھر ہم نے حرے لینا شروع کر دیے کوئی کہتا کتنی حسین ہے، کوئی کہتا کہ بہت پُر وقار ہے۔ منظر نے تو حد کر دی اور بول دیا کہ سیکسی بھی ہے۔ اس پر فزیکا نے منظر کو گلے لگالیا اور دوسرے دن سب کے لیے عیروں کے اچار کی پوری بوتل لے آئی۔

کہیں میں نے سنا تھا کہ بہاروں کی خبر ہواؤں سے آتی ہے۔ خوشبو بھری ہوائیں کسی ہوتی ہیں، اس کی پہلے مجھے خبر نہ تھی۔ کینیڈا میں بہار کی آمد ہواؤں پر بندوں اور اپنے اندر کی تہیلوں سے ہوتی ہے۔ ایک صبح میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو پہلی بار یہ ہوائیں مجھے چھو کر گزریں اور میں رک گیا تھا۔ ایک انجانا کس تھا۔ جس سے میں آشنا ہوا تھا۔ حیرت اور مسرت سے میں وہیں پتھر بن گیا تھا۔ بہار کبھی ایسے بھی آتی ہے۔ مجھے یہ اعزاز نہ تھا۔ ایک تھری ہوئی خوشبوؤں

سے بھری اور تازہ ہوا کسی بھی مردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے۔ میں تو پھر بھی زندہ آنکھوں سے آسمانوں پر نظرے گاڑے بیٹھا بہار کے دنوں کا منتظر تھا۔ میں اس ہوا کے سحر سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ سامنے درختوں پر دیکھا تو کوئٹیں بھوٹ رہی تھیں۔ درختوں نے جیسے گلابی پتوں کے ہار پہن لیے تھے۔ آسمان کی جانب دیکھا تو ایسا نکلا کہ جیسے نل کھول دیا گیا ہو۔ کہیں کہیں ابلے بادل جو مستی میں ہواؤں کے زور پر اٹھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع ہونے کو تھا کیونکہ عمارتوں کے سچ ایک سرخی چھائی تھی۔ شاید اسی منظر کے لیے تو اقبال نے کہا تھا۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

یہ وہ بہار تھی۔ جو آج ٹورنٹو میں اتری تھی۔ اپنے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت۔ اس نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔ میں بیہوش سال جا رہا تھا مگر پھر پلٹ کر پارٹمنٹ آیا اور خدائے ذوالجلال کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں سجدے میں تھا اور ڈور وال کے باہر جھانپوں میں چھپی چیزوں نے چہکنما شروع کر دیا۔ باہر آیا تو جہانزیوں سمیت تمام درختوں کے پرندے اپنا اپنا دروازہ بلند بھیاں کرنے لگے۔ بہار ایسے عجیبی اترتی ہے مجھے اور اک نہ تھا۔ محبتیں ایسے بھی بچھاور ہوئی ہیں میں اس سے آشنا بھی نہ تھا۔ ہوائیں ایسے بھی چھوتی ہیں میں ایسے کس کا عادی کبھی نہ تھا۔ پرندے ایسے بھی جھپکتے ہیں میں ایسی اذانوں سے واقف نہ تھا۔ رحمتیں ایسے بھی برکت ہیں میں اس کا شاہد کبھی نہ تھا۔ آج سب کچھ مجھ پر اترا تو میں بندے سے بندہ خدا بننا چلا گیا۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی تو مجھے پاکستان میں اپنے ہاتھ روم کا روشن دان یاد آ گیا۔ جہاں بہار کی آمد کی خبر مجھے ان پرندوں کی بولیوں سے ہوتی جو نئے نئے موسموں میں اپنا پہلا گھر بنایا کرتے۔ ان کی تکراریں سنتا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ بہار آرہی ہے۔ اور پھر میں کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ خوشبو میرے منتھوں سے کھرائی اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ بہار آرہی ہے۔ میں بہار کی نویدوں پر پُرسرت ہوجاتا یہ پرندے میری بہاروں کے پیامبر تھے کیونکہ خود میں بھی ایک پرندہ تھا۔ میرے ٹھکانے مختصر ہوتے تھے۔ میری پرواز بھی مختصر اور کبھی دراز ہوتی تھی۔ چند لمبے سانس درست کرتا اور پھر اپنی نئی وادیوں کو پرواز کر جاتا تھا۔

ہمارے بس اسٹاپ کے پیچھے ایک پارک تھا میں

غالب

غالب روزے نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار کسی نے کہا۔

”آپ روزے کیوں نہیں رکھتے۔“

جھٹ جواب دیا۔ ”شیطان غالب ہے۔“

حنیف ادیب۔ لاہور

☆☆

غالب کو ایک بار جیل کی ہوا کھانا پڑی جس کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ کوئال شہر کو ان سے دشمنی تھی جس نے جوئے کے الزام میں انہیں جیل بھجوا دیا۔ غالب کا یہ شعر اس دور کی یادگار ہے۔

ہم کہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں

جو ہمیں دامن کے بیخوں سے بھی سوا ہیں

انہیں نوکری سے چڑھی اسے اچھا نہیں سمجھتے

تھے۔ غالب کا یہ شعرا کی حقیقت کا عکاس ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکریں ہوں میں

☆☆

غالب کے آباؤ اجداد فوج سے وابستہ رہے۔ ان کا آبائی پیشہ بگڑی تھا۔ یہ شعرا کی حقیقت کا غماض ہے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا پہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی اس

قادر الکلام اور سلسلہ بند شاعر کا سورج نصف

التہار پر چمکتا رہا اور آخر وہ وقت بھی آگیا جب

اسے آخری وقت نے اپنی گرفت میں لے لیا اور

بظاہر حرف و لفظ کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے کہنا گیا مگر

اس کی چمک دمک تابید قائم و دائم رہے گی۔

☆☆

غالب کے بارے میں ایک صاحب نے کیا

خوب فقرہ چست کیا کہ ”غالب تھے غالب مگر ساری عمر

مظلوم رہے۔“ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ ہمیشہ غم و

اندوہ کے نرے میں رہے۔ تمام عمر انہیں آلام و

مصائب نے سرنہ اٹھانے دیا۔ دکھ و درد سے نبرد آزما

رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام کلام رنج و آلام کے

بیان سے بھرا پڑا ہے۔ خوشی کی کوئی رشت نظر نہیں آتی۔

حنیف ادیب۔ لاہور

اسے برف زدہ موسموں میں بھی آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک طرح سے میرا سہمی بن گیا تھا۔ اس کے تلے کی زمین موٹا برف سے دبی رہتی کبھی برف پانی بنتی تو مردہ گھاس بھی نظر آتی تھی۔ اس کی شہنشاہ سوچی اور بے برہنیں وہ پارک کے درمیان بالکل تنہا کھڑا تھا۔ اس درخت کا حسن اس کی تنہائی تھی۔ آس پاس میدان تھے اور شاید کسی کا منتظر تھا مگر آج جب میں اسٹاپ پر آیا تو ایک نیا منظر دیکھا۔ پورے پارک اور فنٹ پاتھ کے ساتھ بھی گھاس پر ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے پیلے پھول سر نکالے مسکرا رہے تھے۔ پیلے پھول ادھ گھاس کا ٹھہرا سبز رنگ ل کر ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اس منظر کو کسی بھی چیز سے تلمیح دینے سے قاصر ہوں۔ میں اسٹاپ پر کھڑا اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ قدرت کا ایک انعام تھا جو مجھے وطن سے ہجرت پر ملا تھا۔

میں بس اسٹاپ پر کھڑا ان پھولوں میں کھو یا ہوا تھا کہ ملی میری جانب چلی آئی۔ ملی ایک سیکڑوٹی گارڈ تھی۔ اس بس اسٹاپ کی بھی اپنی کہانی تھی۔ کئی کردار مختصر سے اور کئی ایک مستقل۔ ان میں ملی مجھے ہر روز ملتی۔ جب میں صبح کی شفٹ میں بیسوی سال جا رہا ہوتا یا اس ٹائم پر کہیں اور جا رہا ہوتا تھا۔ وہ سیاہ فام تھی اپنے مقررہ وقت پر ایک بیک کاندھے سے لٹکائے اور اپنے آپ کو پوری طرح لپیٹے وہ ہر روز اسی وقت اپنی جاب پر روانہ ہوتی تھی۔ اسٹاپ پر ہر روز ملنے والے ایک دوسرے سے شائستگی کی طرح ملتے ہیں اور مل کر اپنے رستے پر چل پڑتے ہیں۔

میں نے ملی سے پوچھا۔ ”ان پھولوں کا نام کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ پھول تو نہیں ہیں۔“

اس کی نظر میں پھول وہ ہوتے ہیں جو گھلوں یا

کیاریوں میں خود لگائے جائیں۔ خود سے اگ جانے

والے پھول دراصل پھول نہیں وہ کاٹنے ہوتے ہیں۔ جو

اکھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”اگر یہ پھول نہیں تو یہ اتنے خوشنما کیوں

ہیں؟ اگر یہ پھول نہیں تو اتنے خوش رنگ کے کیوں ہیں؟ اگر

یہ پھول نہیں تو اچھے کیوں لگ رہے ہیں؟“

وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔

پھر دوسرے دن یہ پھول پہلے سے دو گئے ہو گئے

تھے۔ وہ زمین سے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے مشروم نکلتے

ہیں۔ تیسرے دن اور بھی زیادہ تھے۔ اب میں بھی عادی ہو گیا تھا۔ چوتھے دن دیکھا تو گھاس کاٹنے والی مشین اس پر پھیر کر ان کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ پھول تو نہ تھے بلکہ کانٹے تھے۔ پھول تو وہ ہوتے ہیں جو خود اہتمام سے لگائے جائیں، ان کی آبیاری کی جائے، وہ پھول کہاں ہوتے ہیں جو پھوپھو پڑیوں، ویرانوں یا کسی کی منشاء کے بغیر کھلتے ہیں۔

اس بس اسٹاپ پر مستقل آنے والے ایک مخصوص وقت پر اور تقریباً ایک ہی طرح کے لباس میں ملبوس آپ کو ملتے ہیں۔ ایک مخصوص انداز میں ایک دوسرے کو پہلو کھتے ہیں۔ اور اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان میں گورے بھی تھے مگر زیادہ تر کالے تھے۔ میں جب صبح کی شفٹ میں جاتا تھا تو ایک گوری اور موٹی اپنے آفس ڈریس میں ہماری ساتھ والی بلڈنگ سے آتی دکھائی دیتی تھی۔ بس آنے سے تین منٹ پہلے وہ بس اسٹاپ پر موجود ہوتی تھی۔ کئی بار میں سوچتا کہ اگر کھڑی کا ناہم سیٹ کرنا ہو تو بس دیکھ کر کروں یا اس عورت کو سڑک پار کھڑے ہوئے کروں۔ دونوں اپنے وقت کی پابند تھیں۔ ایک جیسے نقش و نین والی چمچی لڑکی نظر آتی اور آنے کے ساتھ اس موٹی عورت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ وہ زیادہ تر ہلکے رنگ کا لباس کوٹ پہنے ہوئی تھی۔ ایک اور کالی دراز قد لڑکی اپنے وقت پر کہیں سے نمودار ہوتی، وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوتی یا کوئی دعائیہ کلمات ادا کر رہی ہوتی، اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہانسل ہوتی، پاؤں میں اونچی ہیل والی جوتی ہوتی اور اس کے ہوائے کٹ بال تھے، آتے ہی سب کو گڈ مورنگ کہتی اور کہیں کے شیشے سے ٹک لگا کر اپنے ہوٹ چبانے لگتی۔

اس اسٹاپ کے موسم بھی مختلف تھے۔ کبھی برف باری اور کبھی بارش، کبھی برفانی جھگڑ اور کبھی چمکتا ہوا سورج، کبھی دھوپ اور سائے اور کبھی باد بہار۔ لباس بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے تھے۔ ایک شام میں امارٹنٹ کے لیوگ روم میں کارپیٹ پر نیم دراز ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ سر جی بچن میں چو لے پر پیاز بھون رہے تھے۔ شہباز پر اچھے موسم کا اثر ہو رہا تھا کیونکہ اس کے اپنے دماغ میں بکولے اٹھتے رہتے تھے۔ وہ سفید بنیان پہنے سفید کارپیٹ پر لیٹے بھوں بھوں کر رہا تھا۔ مفتی کی نظریں تو فی دی پر تھیں مگر ماتھے کی شکنیں بتاتی تھیں کہ دماغ کہیں اور الجھا ہوا ہے۔ اس پر ان دنوں پریشور بھر رہا تھا کہ اپنی پہلی کوجلد از

جلد بلوائے۔ دوسری جانب مطیع اللہ فریق کا دروازہ کھولے جلیبیوں کے متعدد لفافے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سر جی جلیبیاں پسند کرتے ہیں مگر اتنی مقدار میں پسند کرتے ہیں وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ سر جی سے مخاطب ہوا۔ ”اگر تمہیں دمہ ہے تو مجھے بتائیں میرے دادا کے پاس کالے یرقان اور دمہ کے بہترین نسخے ہیں۔“

اسی بات پر سر جی نے چولھے کی گیس بند کی اور دادیلا کرتے لیوگ روم میں آ گئے۔ میں نے اپنی کتاب کو سائیڈ پر رکھا شہباز یہ کہتا۔ ”اٹھ بیٹھا۔“ ”اب سیپا شروع ہوا۔“ مفتی نے فی دی کی آواز کم کر دی مطیع اللہ بھی سر جی کے پیچھے پیچھے لیوگ روم میں آ گیا۔

اب پھر سے دربار سجا۔ مفتی سرخ بننا۔ سر جی نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ مظلومان میں مطیع اللہ کے ساتھ ساتھ خلاف توقع شہباز بھی شامل تھا، وہ کہہ رہے تھے۔ ”پیاز بھی میں چھیلوں، نماز بھی میں کانوں اور کچھ کام چوروں کی طرح اب مطیع اللہ بھی دانت مجھ پر تیز کرنے لگا ہے۔“

سر جی کام چور کہتے ہوئے کن اکھیں سے شہباز کو بھی دیکھ رہے تھے۔ مفتی نے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ سر جی نے کہا۔ ”مطیع اللہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ مجھے کالی کھانسی ہے۔“

مطیع اللہ صفائی پیش کرنے لگا کہ میں نے کالا یرقان کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کے دادا کے پاس اس کے علاج کا بہترین نسخہ ہے۔

ادھر شہباز اپنی بولی بول رہا تھا کہ سر جی مجھے کام چور کہہ رہے ہیں۔

سر جی مفتی سے کہہ رہے تھے کہ مطیع اللہ نے کالی کھانسی کے ساتھ ساتھ کالے یرقان کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا ہے۔

اب مطیع اللہ گڑبڑا گیا تھا اور وہ اپنی صفائی میں کہہ رہا تھا کہ اس نے تو دمہ کا بولا تھا اب سر جی نے دونوں بیماریوں کے ساتھ ساتھ دمہ بھی اپنے پر لے لیا اور بولے۔ ”میری جلیبیاں تو ہر ایک کی نظر میں چھ رہی ہیں اور اپنا نشتر نظر نہیں آتا۔“ وہ مطیع اللہ کے سوار کو اب اپنی زہر پر لے رہے تھے۔ اب مطیع اللہ حیران پریشان بیٹھا اعلان کر رہا تھا۔ ”یہ تو بہت لڑاکی ہے۔“

اب تو سر جی کا مجھے بھی پتا نہ چلتا تھا کہ واقعی سنجیدہ ہیں یا سنجیدگی دکھا رہے ہیں۔ آخر مفتی نے پہلے شہباز کو خاموش

کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ شفٹ ہو جائیں۔ اب مجھے بھی اشتیاق ہو رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ وہیں چلے آئیں مگر میں اپنا فیصلہ ان پر لا دانا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ صرف چاہتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔ یہ وہاں پر دو بیڈروم کا اپارٹمنٹ لینا چاہتے تھے کرایہ اس کا زیادہ تھا مگر یہ سب اچھی جاب کرتے تو سو ڈالر زیادہ ادائیگی انہیں مگر انہیں گزرنی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے سب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی جا کر اپارٹمنٹ کی بات پر سے کریں گے۔ مفتی بھی راز ہی ہو گیا اور سرجی نے خوشی میں شہباز کو جھجھی ڈال دی۔ میں نے دوستوں کے اس خلوص اور محبت کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

دوسرے دن میں شام کی جاب سے واپس پہنچا تو مفتی اور شہباز بارہویں فلور پر یعنی مجھ سے دو فلور نیچے ایک اپارٹمنٹ کی بات کر آئے تھے۔ اور اب بیٹھے فارم بھر رہے تھے۔ سرجی خوشی میں مطیع اللہ کو جلیبیاں کھلا رہے تھے۔ جلیبیاں کھلا کر شہباز سے بولے۔ ”اب ندیدہ بن مت دکھانا کہ ہر روز ندیم بھائی کے گھر کھانا کھانے پہنچ جایا کرو۔“

شہباز ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہم اپنا سائن بھائی کو دے آیا کریں گے اور ان کا کھانا لے آیا کریں گے۔“ اس رات ہم ٹی وی کے آگے خبریں سن رہے تھے۔ یہ خبر اخبار میں بھی پڑھ لی تھی۔ اس خبر نے مفتی کے تن بدن میں کینڈا کی محبت چکا دی تھی اور پاکستان سے اس کے تقابل کا ایک اور مومن اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک بیت نامی خاتون جو کینیڈا کی شہری ہیں وہ جب ویت نام گئی تو خشیات کی اس گنگ میں دھری گئی، مقدمہ چلا اور ویتنامی حکومت نے مزائے موت سنادی۔ ادھر کینیڈا کی حکومت بھرنے لگی کہ یہ ہماری شہری ہے اور اسے غلط طور پر پھنسا گیا۔ ایک سفارتی جنگ شروع ہوئی جو میڈیا کی زینت بن گئی۔ ویت نام کی حکومت نے اس عورت کو سزائے موت دے دی اور کینیڈا نے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ مفتی بہت خوش تھا کہ کینیڈا کی حکومت اپنے شہریوں کا کس طرح سے خیال رکھتی ہے۔ پاکستان کی مثالیں دیں کہ کس طرح کس کس کو امریکا کے حوالے کیا گیا۔

کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا مگر اس میں ان حکمرانوں کا قصور ہے جو اس میں ملوث تھے۔ پاکستان تو ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں ٹینس کی بول بنا رہا، کبھی ایک کے اور کبھی

کر لیا اور پھر مطیع اللہ سے کہا کہ سرجی نے جھڑی اٹھا رکھی ہے اگر چتا چاہتے ہو تو سب پر واضح کر دو کہ جلیبیاں صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔

مطیع اللہ نے کہا۔ ”میں اعلان کرتا ہوں کہ جلیبیاں فائدہ مند لوگوں کے لیے بہت مفید ہیں۔“

سرجی نے یہ سن کر کچھ غور کیا پھر بولے۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ پھر مسکراتے ہوئے چکن میں گھس گئے۔

مطیع اللہ میرے کان کے قریب آیا اور بولا۔ ”سرجی ایشیائی ہی رہتے ہیں؟“ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ دیکھا سرجی چکن کی کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہے ہیں تو میں اٹھ کر کمرے میں بند ہو گیا۔

میں نے 20۔ ریڈ گر پو ڈرائیو وال اپارٹمنٹ ملانک میں اپارٹمنٹ 1408 کے لیے کرایہ نامہ بمعہ دو بیڈ کا ایڈوائس اور اپنا جاب لیٹر لگا کر دے دیا تھا۔ یکم مئی کو اس نے خالی ہوا تھا۔ میرے پاس ڈھائی ماہ کے تھے۔ مجھے امید تھی کہ فیملی جولاہی کے پہلے ہفتے تک مل جائے گی میرے اپارٹمنٹ لینے سے مفتی، شہباز اور سرجی خفا تو نہیں بلکہ اداس تھے۔ مطیع اللہ بھی کہہ رہا تھا کہ ندیم بھائی کے بغیر پورا ماحول سونا ہو جائے گا۔ ہم کھانا کھا کر بیٹھے جائے ہی رہے تھے۔ ڈور وال کے باہر اندھیرا مہلایا ہوا تھا مگر لیپ کی دودھیا روشنی نے دن کا سما باندھ رکھا تھا۔ بہار کھل کر ٹورنٹو میں گھس آئی تھی، درختوں اور لہاریوں میں گلے کوئٹیں چھوٹ پڑی تھیں، گرم جیکٹوں سے ہماری جان چھوٹ چکی تھی، ہم نے ڈور وال کی ایک کڑکی کھول دی تھی تاکہ خوشگوار ہوا کی آمد و رفت جاری رہے۔ سرجی نے اس کھڑکی کے ساتھ اپنی چمک بٹائی ہوئی گلی اس پر مستزاد گرم جیکٹ بھی پہنی ہوئی تھی۔ ہم سب اہرگ جیکٹ پہنتے تھے۔ یہاں بہار کا مقصد یہ نہیں کہ ہم ایک شرٹ میں ٹھوٹے پھرتے نظر آئیں۔ دن میں اور لاپس کر شام میں موسم خشک ہو جاتا ہے۔ کھڑکی کھلی ہو تو لگتا طاری ہو جاتی ہے۔

سرجی ٹھنڈی ہوا کو اپنے پیچڑوں میں اتارنے کے لیے مفتی سے مخاطب ہوئے۔ ”ہم بھی یہاں سے ندیم بھائی ملانک میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔“ پھر تینویں فلوروں پر شہباز کی جانب دیکھا۔ شہباز نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اللہ نے بھی مدد برائے اعزاز سے اثبات میں سر ہلایا۔“

اب بہت دلچسپی سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ میں نے اس پہلو پر

دوسرے کے چنگل میں رہا۔ مفتی کے ساتھ ساتھ ہم میں سے کوئی بھی گینڈا کا شہری نہیں تھا مگر ایک قافرخ کے جذبے سے ہم اکڑے بیٹھے تھے۔

شہباز نے آواز لگائی مطیع اللہ بھائی۔ ”اب تم پاکستان سے جس آسانی سے لاسکتے ہو پکڑے بھی گئے تو گینڈا انہیں چمڑوالے لگا۔“

مطیع اللہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”اس کام پر ضمیر تو نہیں مانتا مگر پھر بھی سوچے گی۔“

سرجی کاٹوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔ ”اللہ عارت کرے میرے چچا اسی کو اس نے اس پکڑ میں بیوی سے خاصی جھاڑ کھائی تھی۔“

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا تو سر جی یا ادب بیٹھ کر بتانے لگا۔ ”میرے چچا اسی نے پکے سگریٹ کا ایک کش مجھ سے لگوایا تھا تو میری محترمہ نے بیوی بے عزتی کی تھی۔“

شہباز نے پوچھا۔ ”بھائی کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ چڑھائے ہوئے ہیں؟“

سرجی کو بولے۔ ”دراصل میں نے سالن میں نمک کی جگہ چینی ملا دی تھی۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”قربان جاؤں سرجی تمہاری مصعومیت پر۔ پکا سگریٹ پی کر چوٹے پر چڑھ بیٹھے۔“

سرجی بولے۔ ”انسان خطا کا پتلا ہے۔ ایک بار غلطی کی مگر پھر کبھی بھی باغی روٹی سے پہلے کش نہیں لگایا۔“

یہ سن کر اپارٹمنٹ نمبر 103 قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مجھے اپنی فیملی کے گینڈا آنے کا بہت انتظار تھا۔ ہم

نے اکٹھے پچھلے سال میڈیکل کروایا تھا جو ایک سال کے لیے درست مانا جاتا ہے اگر 8 جولائی تک میری فیملی کا

ویزا انہیں آتا تو انہیں بھرے میڈیکل کروانا پڑتا۔ مجھے فکر اس لیے تھی کہ ابھی مئی کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا۔

میرے حساب سے ان کو ویزا اجون کے شروع میں مل جانا چاہیے اگر وہ دوبارہ سے میڈیکل کرواتے تو بات 6 ماہ

آگے بڑھ سکتی تھی۔ میں ادھر ایک ایک دن کا انتظار کر رہا تھا اور اپارٹمنٹ بھی لے لیا تھا۔

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا وہ بتا رہی تھی کہ کل انیسویں والوں کا لیئر آپ ہے کہ

جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے ٹورنٹو نہیں آسکتے۔ میں

تشویش میں جھلا ہو گیا۔ سرجی اور شہباز ہمیشہ کی طرح میرے آس پاس موجود تھے۔ شہباز نے کہا۔ ”یہ تو بھلا سیایا کھڑا ہو گیا ہے۔“

سرجی گویا ہوئے۔ ”یہ اب کیسی والے ہمیشہ غلطی آگ سے جلاتے ہیں۔“

میں نے سرجی سے غصے میں کہا۔ ”ادھر اہل پریشانوں پر سوچنے کے لیے دماغ کام نہیں کر رہا اور آپ

آپ کے محاوروں پر کون سرکھائے۔“

سرجی خفا ہو کر بولے۔ ”میرا مطلب تھا کہ یہ اب کھلی والے دھوکا دیتے ہیں۔“

شہباز بولا۔ ”کون سا دھوکا دیا ہے۔ کیا رشتہ ہے انکار کر دیا ہے؟“

سرجی روٹھے ہوئے انداز میں منمنائے۔ ”رٹھا سے تو انکار نہیں کیا مگر رخصتی بھی تو نہیں دے رہے۔“

مطیع اللہ ابھی کہیں سے آکر ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اس نے صرف رخصتی نہ دینے کی بات کی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ سجائی اور سرجی

بولے۔ ”ہمارے علاقے میں جو رخصتی نہ کرے تو پوری برادری کو میں دنیوں کی دعوت دیتا ہے۔ اور پھر رخصتی بھی دے ہے۔“

میرے لیے اب ان کے بیچ بیٹھنا مشکل ہو گیا اور میں بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

اگلا دن سچر کا تھا اور مجھے ہولڈنگ سیکرٹری بارہ بجے دلا میں جاب کے لیے جانا تھا۔ کمرے میں ڈور وال کو ڈراما

کھولا تو بہاری تازہ اور خوشبو بھری ہوئی۔ میرا... دل اور دماغ معطر کر دیا۔ اس معطر جمونکے نے مجھے اللہ کی یاد دلا

دی۔ اسی وقت وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھ کر اسی سے 11 ماہی جس کے اشارے پر ہوا میں چلتی ہیں۔ دل تو سوجھا

ہی میں مقیم ہو گیا۔ وعائے میرے دماغ کو دل سے جوڑ دیا۔ دل میں سکون کا دریا موجزن ہوا تو میں نے پوٹنگ پل

جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی میں جوڑے استری کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھل

بجی۔ مفتی فون کے قریب تھا۔ اس نے ریسپورڈ اٹھالیا۔ ام کی بات سننے ہی اس کے چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی اس نے

چچ کر کہا۔ ”نہیم فوراً نسرین کے فلیٹ پر پہنچو سعد کا فون ہے ہری اپ جلدی کرو!“

(جاری ہے)

شکیل صدیقی

فوٹوگرافی ایک فن تھا۔ اچھی تصویر کشی صرف منجھے ہوئے عکاس کر سکتے تھے۔ ایسے افراد جو روشنی، زاویہ وغیرہ کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب ایسے خود کار کیمز آچکے ہیں جن سے ایک بچہ بھی اچھی تصویر اتار سکتا ہے۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفہ خاص



پہلے بتا دوں کہ ماضی کے کمرے اور آج کے کمرے میں بہت فرق ہے۔

پہلے ماضی کے کمرے کا تعارف کرادوں۔

ماضی کا کیمرا ایک بند ڈبے کی طرح ہوتا تھا، جس میں کسی طرف سے روشنی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے ایک لینز لگا ہوتا تھا اور اندر فلم کا رول بڑا ہوتا تھا۔ جس چیز کی تصویر لینا مقصود ہو کمرے کے لینز کا رخ اس طرف کر کے مین دبا دیا جاتا۔ تصویر کھینچ جاتی۔ پھر ایسی بہت سی تصویریں کھینچ کر کیمرا اسٹوڈیو میں لے جاتے اور ریل نکلا کر اسٹوڈیو والے کو دے دیتے۔ وہ اس کے پرنٹ نکال کر دو ایک روز بعد حوالے کر دیتا۔ بعض تصویریں اچھی اترتیں اور بعض خراب۔ اس کی بھی

کیمرا اب بے حد عام سی ایجاد بن گیا ہے۔ اس لیے کراہ یہ ہر کس ونا کس کی جیب میں پڑا رہتا ہے۔ میرا اشارہ موبائل یا سیل فون کی طرف ہے، جس میں کیمرا بھی ہوتا ہے۔ جب سے جب جی چاہا، نکالا اور تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔ مگر ایسا بھی تھا جب تصویر کھینچنا ایک فن تھا۔ ہر کس ونا کس تصویر کھینچ نہیں سکتا تھا۔ اس کام کو باضابطہ سیکھنا پڑتا تھا، جنہیں اس کام پر عبور حاصل ہو جاتا وہ کیمرائین کہلاتے تھے۔ تصویر کھینچنے والے بن سنور کر کمرے کے سامنے پوز دیتے تھے اور تصویر کھینچنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ پھر ان تصاویر کو فریم کر کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں کرتے تھے۔ یہ جاوڈی ڈبے کیسے کام کرتا تھا اس پر روشنی ڈالنے سے

وجہ ہوتی تھی، جو بعد میں بتائی جائے گی۔

کیرا خواہ کیسا بھی ہو، سادہ، رنگین یا مودی، سب کا بنیادی اصول ایک ہی ہے۔ ان کے بنیادی پرزے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے وہ مہنگے ہوں یا سستے۔ کیرے کی قیمت کا انحصار اس کے لینز پر ہوتا ہے۔ جتنا اچھا لینز ہوگا تصویر اتنی ہی اچھی اترے گی۔

ماضی کے کیرے کے آگے لینس کے سامنے کے حصے میں شٹر لگا ہوتا تھا جو بہت کم وقفے کے لیے کھلتا اور روشنی کو کیرے کے اندر جانے دیتا۔ کیرے میں فلم رول کے لیے مناسب جگہ ہوتی اور رول کو کھمانے کا انتظام بھی ہوتا۔ ایک چھوٹا سا پرزہ اور ہوتا ہے جسے دیوفا سنڈر کہتے تھے۔ جس چیز کی تصویر لینا ہوتی ہے اسے اسی پرزے کی مدد سے دیکھتے تھے۔

ابتدائی کیرے کی پن کو ہول کیرا کہا جاتا تھا جو بہت سادہ ہوتا تھا۔ اسے پن ہول کیرا اس لیے کہتے تھے کہ اس میں لینز کی بجائے ایک سوراخ ہوتا تھا۔ سب سے پہلے 1856ء میں ایسا کیرا ایجاد ہوا، جس کا موحد ڈیوڈ ریوٹر تھا۔

پن ہول کیرے کو گھر بیٹھے بنایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ نکلوی کا ایک چھوٹا سا ڈبائے لیس اس کے اندر سیاہ کاغذ لگا دیں تاکہ روشنی بالکل اندر نہ جاسکے۔ احتیاطاً سیاہ رنگ بھی بھیر دیں۔ کیرے کا سائز اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ فلم کا ایک ٹکڑا اس میں لگ سکے۔ فلم کے ٹکڑے کو جہاں لگانا مقصود ہے، اس کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے پٹی چپکا دیں۔ پٹی میں پن سے سوراخ کر کے اسے بھی شپ سے بند کر دیں۔

اب فوٹو گرافر سے فلم کا ایک ٹکڑا لے لیں اور اسے اندھیرے کمرے میں جا کر پٹی کے سوراخ کے سامنے لگا دیں۔ وہ سائڈ سامنے کے رخ پر ہونا چاہیے جس پر مسالا لگا ہوتا ہے۔

جب کسی کا فوٹو لینا مقصود ہو تو کیرے کو میز پر رکھ دیں تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ اس کے بعد اس شخص کو کیرے کے سامنے بٹھا کر پٹی پر لگا ہوا شپ ہٹا دیں اور پندرہ منٹ تک روشنی اندر جانے دیں۔ اس کے بعد تاریک کمرے میں لے جا کر فلم کا ٹکڑا نکال لیں اور کاغذ میں لپیٹ کر فوٹو گرافر کی دکان پر لے جائیں۔ وہ اسے دھو کر فلم کا پرنٹ نکال دے گا۔ تصویر اچھی اترے گی۔

حقیقت میں کیرے کا اصول وہی ہے جو ایک ہزار برس پیشتر مشہور سائنس داں ابن الہیثم نے بتایا تھا یعنی یہ کہ جب روشنی کی شعاعیں کسی باریک سوراخ سے گزر کر کسی پردے پر

پڑتی ہیں تو اس پردے پر اس جسم کا الٹا عکس ڈالتی ہے جس کا نقل کردہ آری ہے۔ ابن الہیثم نے ایک سوم بتی کا الٹا عکس ایک پردے پر ڈال کر اس اصول کا عملی مظاہرہ بھی کیا تھا۔

پن ہول کیرے سے تصویر اس طرح سے ملتی جاتی کہ جب پٹی پر لگا شپ ہٹایا جاتا تو روشنی کی کرنیں کیرے میں داخل ہو جاتیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ روشنی خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ سوراخ کے تنگ ہونے کی وجہ سے وہ مخصوص کیرے کے سامنے بیٹھا ہو اس کے سر پر سے گزرنے والی روشنی فلم کے نچلے حصے پر پڑتی۔ جب کہ نچلے حصے سے آنے والی روشنی اوپری حصے پر پڑتی۔ اسی طرح سے دائیں طرف سے آنے والی روشنی بائیں اور بائیں طرف سے آنے والی روشنی دائیں طرف پڑتی۔ گویا فلم پر جو عکس بننا وہ الٹا ہوتا۔ اسے عقیدہ کہتے تھے۔ اس عکس کو فوٹو گرافنگ پیپر پر نقل کیا جاتا تھا تاکہ عقیدہ کا پاز بیٹھ سکے۔

پن ہول کیرے میں سوراخ چونکہ کافی باریک ہوتا ہے، اس لیے طویل وقفہ دیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ روشنی اندر داخل ہو۔ اس عمل کو ایک سپورٹر کہتے ہیں۔ جس شخص کی تصویر لی جاتی اسے سجیکٹ کہتے تھے۔ فلم پر روشنی زیادہ ڈالنے کے لیے کافی دیر تک کیرے اور سجیکٹ کو سامنے پرہتا پڑتا ہے۔ اگر کیرے کے سوراخ کو کشادہ کر دیا جاتا تو روشنی کی زیادہ مقدار کیرے میں داخل ہو جاتی اور تصویر دھندلا جاتی کیونکہ شعاعیں آپس میں ٹکرائی جاتیں۔

پن ہول کیرا درخت طلب تھا، اس لیے کہ کیرے کے سوراخ میں سے زیادہ سے زیادہ روشنی اندر جانے کے لیے ضروری ہوتا تھا سجیکٹ اور کیرا درخت ساکت رہیں اور ایہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ساکت نہیں بیٹھ سکتا اور جب وہ ہل جائے گا تو تصویر خراب ہو جائے گی۔ ان دشواریوں کے باوجود پن ہول کیرا کافی عرصے تک استعمال ہوتا رہا۔ جس شخص کو تصویر چھوٹا ہوتی تھی اسے اپنے چہرے پر گلاب کی گریٹھ لے کر کیرے کے سامنے ساکت بیٹھنا پڑتا تھا۔

اس دشواری پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ روشنی کی زیادہ مقدار لینز سے گزر کر اندر جائے لیکن سجیکٹ کو زیادہ دیر تک ساکت نہ بیٹھنا پڑے۔ یہ مقصد لینز سے حاصل ہوا۔ لینز خشک کا بنایا جاتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ نفیس بنایا جاتا تاکہ وہ روشنی کی شعاعوں کو تیزی سے گزاردے۔

جب کیرے کے عدسے سے گزرنے والی روشنی اندر آتی تو سیدھی جا کر فلم کے رول یا ٹکڑے پر پڑتی۔ وہ نقطہ

حافظ محمد یوسف آزاد

اردو اور ہندی کے ممتاز شاعر سکندر راؤ علی گڑھ (یو) بی) میں شیخ غفر الدین کے علی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فیصلہ شیخ افریقہ کے چشم و چراغ تھے جو فیصلہ بن کلاب اول عالم کدہ کرمد کی نسل مبارک سے ہے۔ شاعری میں اپنے تایا اللہ راشی راہبر کے شاگرد ہوئے۔ سلسلہ تلمذ امیر بیتانی سے جا ملتا ہے۔ آپ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم گلوکار موسیقار بھی تھے۔ ترنم کے ساتھ شاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے اور سحر طاری کر دیتے تھے۔ حفظ قرآن آپ نے علامہ سید محمد ابراہیم سے کیا۔ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار کو ذاتی پیشہ بنا لیا۔ سرکاری ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔ تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا اور مسلم لیگ کے جلسوں میں اپنی پرسوز نظموں سے مسلمانوں کے دل کو گرماتے تھے۔ آپ عربی فارسی اردو ہندی گجراتی پنجابی میں مہارت رکھتے تھے لیکن شاعری اردو اور ہندی میں کرتے تھے۔ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور سرگودھا میں مستقل سکونت رکھی۔ آپ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اہم رکن تھے۔ آپ کے ہم عصر شعراء میں حضرت علی سکندر جگر مراد آبادی علامہ عاشق حسین سیاب اکبر آبادی، سید محمد حسین زیدی قمر جلالوی پروفیسر مولانا سید علی احسن ماہروی، حکیم صغیر حسین زریا ناروی تھے۔ آپ نے اہم ادبی خدمات انجام دیں۔ 30 دسمبر 1979ء میں سرگودھا میں انتقال کر گئے۔ آپ کا اردو شعری مجموعہ ”آئینہ آزاد ہے“ آپ کے کافی شاگرد ہیں جو آپ کا شمن جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

قدرت کا زندہ معجزہ

زم زم کا چشمہ چار ہزار سال قدیم ہے۔ تیرہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ لمبا ہے۔ ایک پاؤفل موثر 8000 لیٹر پر سیکنڈ کے حساب سے اس میں 24 گھنٹے پانی پب کرتی رہتی ہے۔ اس میں آج تک کافی نہیں لگی ہے اور نہ ہی پانی کا ذائقہ بدلا ہے۔ پورا دن پانی پب کرنے کے بعد صرف گیارہ منٹ میں پانی اپنے اصل لیول پر آ جاتا ہے اسی قدرت کی بنا پر آج تک زم زم خشک نہیں ہوا، (سبحان اللہ)

مرسلہ: قرۃ العین، اقراسی، کراچی

یہاں پر شعاعیں مرکوز ہوتی ہیں، اس لینز کا فوکل پوائنٹ کہلاتا ہے جس چیز یا شخص کی تصویر لینا مقصود ہوتا، اسے لازم تھا کہ اس روشنی پذیر ہی ہو۔ یعنی دن کا وقت ہو۔ اگر رات ہو چکی ہے تو مدافنی کا انتظام کمرے میں کرنا پڑتا تھا۔ جو ایک لمحے کے لیے سمیکٹ پر پڑتی اور اسے منور کر دیتی تھی۔ اسے فلیش لائٹ کہتے تھے۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ روشنی سمیکٹ سے منعکس ہو کر لینز میں داخل ہو جائے اور فلم پر مرکوز ہو کر عکس کو اس پر جما دے۔ لینز کو سمیکٹ سے ٹھیک فاصلے پر رکھا جاتا تو داخل ہونے والی شعاعیں سیدی جا کر فلم پر ہی مرکوز نہیں اور تصویر اچھی آتی۔ لیکن لامصلحہ یا زیادہ ہونے سے یا فوکس درست نہیں ہوتا تو کمرے میں داخل ہونے والی شعاعیں فلم سے پہلے ہی مل جاتیں یا بعد میں یعنی نکلیں ٹھیک فلم پر نہیں بننا تو عکس دھندلا جاتا۔

عام طور پر پانچ میٹر کے فاصلے سے تصویر لی جاتی تھی، لیکن ڈیڑھ میٹر سے تین میٹر تک بھی اس سے اچھی خاصی تصویر آ جاتی تھی۔

اب بھی بہت اچھے کیمروں میں قیمتی لینز لگے ہوتے ہیں اس لینز کو آگے پیچھے حرکت دینے کا انتظام ہوتا ہے۔ تاکہ دور اور نزدیک کی چیزوں کو آسانی سے فوکس کیا جاسکے اور عمدہ تصویر بن سکے۔

تصویر لینے وقت لینز جتنا کھلتا یعنی وہ سوراخ جس میں سے روشنی گزر کر کمرے میں جاتی ہے لینز کا اپرچ کہلاتا۔ اچھے کیمروں میں اپرچ کو چوڑا اور تنگ کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر دن کا وقت ہے اور خوب روشنی ہو رہی ہے تو اپرچ کو تنگ کر دیا جاتا ہے تاکہ کم روشنی اندر جائے، جب کہ موسم ابر آلود ہونے پر اپرچ کو چوڑا کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ زیادہ روشنی اندر چلی جائے۔

لینز کے بعد کمرے میں سب سے زیادہ بھیگی چیز اس کا شرے ہے جو لینز کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے لینز کا اپرچ کو کھولنے اور بند کرتے تھے۔ شریک پرزے کی مدد سے چلنا تھا جو کمرے پر لگا ہوتا۔ شریک سیکنڈ کے سوئس جسے تک کے لیے کھل سکتے ہیں۔ ان میں تین سے پانچ تک بلیڈ لگے ہوتے ہیں جو ایک ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ ان میں روشنی کا وقت ایک سیکنڈ سے ایک سیکنڈ کے تین سوئس جسے تک ہو سکتا ہے۔ اب بھی اچھے کیمروں میں شریک رفتار اور اپرچ کے درمیان ایک تعلق موجود ہوتا ہے۔

کمرے کے سامنے کا وہ فاصلہ جس کی وہ صاف تصویر

لے سکتا ہے اس کے فیلڈ کی گہرائی کہلاتا تھا۔ چھوٹے لینز اور کم اپرچ سے زیادہ فاصلے کی تصویر بھی آجاتی تھیں، اس لیے کہ دور سے آنے والی شعاعیں متوازی رہے ہوئے لینز میں داخل ہوتیں۔ بڑے لینز اور زیادہ اپرچ سے فیلڈ کی گہرائی کم ہوجاتی ہے۔

فوٹو کھینچنے وقت تین باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے۔ فاصلے کے مطابق لینز کو فوکس کرنا پھر روشنی کا لحاظ کرتے ہوئے لینز کا اپرچ کم یا زیادہ کرنا۔ آخر میں شری کی رفتار ایسی کرنا کہ وہ روشنی کو درست وقفے کے لیے گزرنے دے۔

اگر اپرچ بڑا ہے تو ایکسپوزر زیادہ ہونا چاہیے۔ عام طور پر تقریباً اپرچ اور زیادہ ایکسپوزر اچھا رہتا ہے۔ کیمرہ ایسا بھی ہو فلم کے بغیر کوئی تصویر نہیں لی جاسکتی تھی۔ سادہ تصویر جو سفید اور سیاہ رنگوں میں ہوتی ہے حقیقت میں وہ عکس ہوتا ہے جو چاندی پر آتا ہے۔ فلم سالے کی بنی ہوئی تھی، لیکن اس پر ایک شفاف مادے کی انتہائی پتلی تہ چڑھی ہوئی تھی، جو چاندی کی فلموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مادہ بہت حساس ہوتا ہے اس سالے میں بہت سے رنگ بھی شامل کیے جاتے تھے تاکہ تصویر لینے وقت مختلف رنگ بھی فلم پر آجائیں۔

جب فلم پر روشنی پڑتی تو چاندی کے سالے کالے ہو جاتے مگر فلم دھونے کے بعد ظاہر ہو جاتے۔ نگینو میں عکس اور سیاہی سفیدی الٹی آتی تھی مگر جب پرنٹنگ پیپر پر نگینو پر عکس لیا جاتا تھا تو تصویر میں اصل منظر آ جاتا۔

عام طور پر کیمرے میں 35 ملی میٹر چوڑی فلم استعمال ہوتی تھی۔ یہ فلم کارٹر ج کہلاتی تھی جسے کیمرے میں لگانا نہایت آسان ہوتا تھا۔ کیمرے کو پیچھے سے کھول کر فلم کا رول رکھ دیا جاتا تھا پھر کیمرے کو بند کر دیا جاتا تھا۔ کیمرے میں رول یا کارٹر ج کو گھمانے اور تصویر کشی کے لیے درست جگہ پر لانے کے لیے کل اور پزے لگے ہوتے تھے۔ فلم کے رول کے پیچھے ایک لمبا سا کاغذ لگا ہوتا تھا جس پر نمبر پڑے ہوتے تھے۔ یعنی اب تک کتنی تصاویر کھینچیں۔ کیمرے کے عقبی حصے میں ایک چوکور سا سوراخ ہوتا تھا جس کے ذریعے دیکھا جاسکتا تھا کہ اب تک کتنی تصویریں کھینچ گئیں اور کتنی باقی ہیں۔ تصویر کھینچنے کے بعد ہینڈل کو گھما کر پازیتو کو گھمایا جاسکتا تھا۔ بعض کیمروں میں یہ طریقہ آٹو میک ہوتا تھا۔ یعنی جب تصویر اتر جاتی تو اگلا پازیتو خود بخود آ جاتا۔

35 ملی میٹر کے کیمروں میں ایک خالی اسپول بھی لگا ہوتا تھا جس پر کارٹر ج کا ابتدائی حصہ پھنسا دیا جاتا تھا اور جب فلم

کے کارٹر ج کو آگے بڑھانا مقصود ہوتا تو ہینڈل کو گھمایا جاتا تھا۔ جب سارا رول تصویر کشی کے بعد ختم ہو جاتا تو تاریک کمرے میں اس رول کو الٹا چلا کر ابتدائی جگہ پر لے آتے تھے اور اسے کیمرے سے نکال لیتے تھے۔ پھر اس رول یا کارٹر ج کو اسٹوڈیو والے کے حوالے کر دیتے تاکہ وہ پرنٹس بنادے۔

فلم کے کارٹر ج پر جو سالہ لگا ہوتا تھا اس کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی تھیں۔ اسے کیمرے میں لگاتے وقت اس کی رفتار کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ وہ رنگوں کو کس حد تک قبول کر رہا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا پڑتا تھا۔ ان ساری چیزوں کا دارومدار کارٹر ج کے سالے پر ہوتا تھا۔

وہ کارٹر ج جس کی رفتار تیز ہو اور زیادہ حساس ہو وہ دھندلے موسم کے لیے مناسب ہوتیں یا پھر گھر کے اندر تصویر کشی کے لیے استعمال کی جاتیں۔ ست رفتار فلموں سے اچھی تصاویر اتر آتی تھیں۔ فلموں کی رفتار اس پر پڑے ہوئے نمبر سے ظاہر ہوتی۔ نمبر جتنا زیادہ ہوگا رفتار جتنی ہی تیز ہوگی۔ فلم کی رفتار کیمرے کا اپرچ اور ایکسپوزر سیٹ کرتے وقت دھیان میں رکھنا پڑتا تھا۔

چھوٹی تصویروں میں گرین نمایاں نہیں ہوتے تھے، لیکن جب تصویروں کو بڑا کیا جاتا تو گرین یعنی نقطے نمایاں ہو جاتے۔ عام طور پر یہ نقطے تیز رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں لیکن ست رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔ بعض افراد فلم کو دکا کر نہیں دیتا چاہے اور اسے خود ڈیولپ کرنا چاہے تھے تو فلم کو مخصوص کیمیکل میں ڈبوئے تھے۔ اس محلول میں ڈبونے کے بعد اسے صاف پانی سے اچھی طرح دھویا جاتا تھا اس کے بعد ایک اور محلول میں ڈالا جاتا تھا جسے کچھ کہتے تھے۔ یہ محلول فلم پر سے چاندی کے تمام کرسٹل اتار دیتا تھا جو روشنی سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ فلم پر صرف عکس باقی رہ جاتا تھا۔ اسے دوبارہ دھو کر لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ یہ نگینو کہلاتا اور بعد میں اس سے پازیتو بنانا پڑتا ہے۔

پازیتو بنانے کے لیے پرنٹ پیپر استعمال کیا جاتا تھا اور جسے فوٹو گرافک پرنٹ کہا جاتا تھا۔ فوٹو گرافک پیپر اسی طرح بنایا جاتا تھا، جس طرح فلم بنائی جاتی تھی۔ اس کا چاندی والا سالہ روشنی کے لیے اتنا حساس نہیں ہوتا جتنا کہ فلم کا ہوتا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے پر نگینو رکھ کر جب روشنی ڈالی جاتی تو کاغذ پر الٹا عکس آ جاتا تھا۔ یہ الٹا عکس ہی اصل تصویر ہوتی۔ پرنٹنگ کے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ نگینو کے سالے والی

اسمارٹ فون

اب یہ بات اکثر دیکھنے میں آ رہی ہے کہ بچے بہت زیادہ غصے میں نظر آتے ہیں۔ مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان وجوہ کی بناء پر والدین پریشان دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسے تمام پریشان حال والدین کے لیے امریکی اکیڈمی برائے اطفال نے نئے رہنما اصول پیش کیے ہیں جس میں والدین کو اپنے بچوں کو سختی سے اسمارٹ فون دینے سے منع کیا ہے۔ امریکا میں واقع یونیورسٹی آف مشی گن کی جانب سے جاری کی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب والدین اپنے بچوں کو کھل اور سکون سے بٹھانے کے لیے انہیں اسمارٹ فون دے دیتے ہیں لیکن بچوں کو سکون سے بٹھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط اور نقصان دہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق بچوں کو سکون میں لانے کے لیے اگر اسمارٹ فون استعمال کیے جائیں تو وہ اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ بچوں کی نشوونما چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہے۔ یہی وہ عمر ہوتی ہے جب بچہ کھیلتا، پڑھتا، اپنے جذبات پر قابو پاتا اور لوگوں سے تعلق قائم کرنے کے طریقے سیکھتا ہے لیکن اسمارٹ فون کا زیادہ استعمال بچوں کو ان کی صلاحیتوں پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ رپورٹ میں شائع کیے جانے والے رہنما اصول میں بتایا گیا ہے کہ دو سے پانچ سال کی عمر کے بچوں کو میڈیا کی کوئی بھی ڈیوائس دن میں ایک گھنٹے سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بچے کی نیند اور اس کی نشوونما اور ذہنی و جسمانی صحت پر غلط اثر پڑتا ہے۔ احسان سحر۔ میانوالی

ماہ کاغذ کے سالے والی سائڈ کی طرف ہوا۔ اس طرح سے الٹی بڑی تصویر کا پرنٹ حاصل ہو جاتا جتنا کہ فلم کا سائز۔ مگر بڑی تصویر حاصل کرنے کے لیے اظہارِ جرجگنا پڑتا تھا۔ پرنٹنگ پیپر پر جو عکس بناؤ نہ نظر نہیں آتا بلکہ اسے بھی کیمیکل میں ڈبو کر ڈیولپ کیا جاتا تھا، جس طرح فلم کو کیا گیا۔ لاڈیولنگ اور پرنٹنگ کے لیے تاریک کمرے یعنی ڈارک روم میں کام کرنا پڑتا تھا تاکہ روشنی میں خام خراب نہ ہو جائے۔ لیکن سرخ رنگ کا بلب جلا لیا جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور کام کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔

آج کے کیمروں کی قسموں کا انحصار آٹو فیک اور فلیکس ہوتا ہے۔ ان کی نفاست اور قیمت کا انحصار ان کے اپرچر، شٹر، ہنڈ اور رفتار پر ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں مارکیٹ میں تیز رفتار کیمرے بہت آئے تھے۔ ان میں لینز کو فوکس کرنے کا اچھا اظام ہوتا تھا۔ ماہر فوٹو گرافر ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چاہے موسم اور وقت کیسا ہی ہو وہ اچھی تصویر بنا لیتے تھے۔

اب بلیک اینڈ وھائٹ کا زمانہ نہیں رہا۔ ہم رنگین تصاویر ہی پسند کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ سفید روشنی میں وہ سارے رنگ دکھائی دیتے ہیں جو ہم قوس قزح میں دیکھتے ہیں۔ رنگین فوٹو گرافی میں وہ سب رنگ آجاتے ہیں جو ہم اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں۔ بہر حال بنیادی رنگ صرف تین ہوتے ہیں۔ سرخ، ہبز اور نیلا۔ انہیں پرائمری رنگ کہا جاتا ہے۔ اگر تینوں رنگوں کو ملا کر کسی پردے پر پھینکا جائے تو سفید روشنی ظاہر ہوگی۔ اگر اس میں سے نئی روشنی نکال دی جائے تو رد روشنی ظاہر ہوگی، اس لیے کہ زرد رنگ نیلے رنگ کو مکمل کرتا ہے۔ اگر سفید روشنی میں سے سبز روشنی نکالی جائے تو نیلی اور سرخ روشنیوں کا امتزاج دکھائی دے گا۔ اگر سفید روشنی میں سے سرخ روشنی نکالی جائے تو نیلی اور ہبز روشنیوں کا مرکب ظاہر ہوگا۔

پرائمری رنگوں کو ملانے سے دوسرے رنگ بن جاتے ہیں۔ رنگین فوٹو گرافی کا تعلق پرائمری رنگوں کو آپس میں ملانے سے ہے۔ اس فن سے بہت ترقی کی اور رنگین فلمیں آسانی سے دستیاب ہونے لگیں۔ ان فلموں پر سارے رنگ اپنی اصلی حالت کے مطابق ظاہر ہو جاتے تھے۔

رنگین فلموں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سے کاغذ پر پس بنائے جاتے ہیں جنہیں ہم بھی اپنے الہم میں لگاتے تھے۔ دوسری قسم کلر ٹرانسپیرنسی کہلاتی ہے۔ جنہیں پردے پر

دیکھا جاسکتا ہے یا پھر ویو فاسٹرز میں لگا کر دیکھا جاسکتا ہے۔
 کلر پرنس تیار کرنے کے لیے رنگین پگھلے ہوئے
 ہیں۔ رنگین پگھلے ہوئے پر تین مسالوں کی ہمیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ہم
 جس چیز کی فلم لینے ہیں اس کا نیلا رنگ سب سے اوپر والی تہ کو
 متاثر کرتا ہے۔ ہزار رنگ درمیانی تہ کو اور سرخ رنگ سب سے
 نیچلی تہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر تہ میں ایک کیمیکل چھپا ہوا ہوتا
 ہے جو کلر کھلاتا ہے۔ جب فلم کو محلول میں ڈالا جاتا ہے تو
 کیمیائی رد عمل سے دوسرے رنگ بھی ظاہر ہو جاتے
 ہیں۔ اسی طرح سے پرنٹنگ پیپر پر بھی تین کیمیائی ہمیں
 چڑھی ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک ایک رنگ کے لیے
 حساس ہوتی ہے۔ جب کاغذ کو عکس لینے کے بعد دھویا جاتا
 ہے تو سب رنگ ابھر آتے ہیں اور بعد میں ایک خاص طریقے
 سے رنگین عکس ابھارے جاتے ہیں۔

جو تصاویر ہم اتارتے ہیں وہ بظاہر تو اچھی ہوتی ہیں، لیکن
 ان میں بہر حال اصل رنگ نہیں ہوتے جو منظر میں دکھائی دیتے
 ہیں۔ مثال کے طور پر بادل جیسے کہ نظر آتے ہیں ویسے فوٹو میں
 نہیں آتے۔ اس انحصار پر قابو پانے کے لیے فلٹر ایجاد کیا
 گیا۔ یہ رنگین شے کا ککڑا ہوتا ہے جسے کمرے کے لینز کے
 سامنے لگا دیا جاتا ہے۔ یعنی لینز میں سے گزرنے والی ساری
 روشنی کو پہلے فلٹر میں سے گزرنے پر آجے۔ فلٹر بعض رنگ جذب کر
 لیتا اور بعض کو آزادی سے گزر جانے دیتا ہے۔

وہ فلٹر جو سیاہ و سفید فوٹو گرافی میں استعمال کیے جاتے
 ہیں وہ رنگین فوٹو گرافی میں استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔ رنگین
 فوٹو گرافی کرتے وقت روشنی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تصویر آؤٹ
 ڈور ہے یا ان ڈور اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ان سب
 چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ہی فلٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کمرے کے چند آلات اور بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ
 ضروری ہے۔ مثلاً ویو فاسٹرز جس سے منظر کو دیکھا جاتا
 ہے۔ جتنا منظر اس سے نظر آتا ہے اتنا ہی فوٹو میں آ جاتا
 ہے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق کمرے کو آگے پیچھے کر لیا جاتا
 ہے۔ ویو فاسٹرز کی بھی کافی قسمیں بنائی گئیں۔ ایک میں لینز لگا
 ہوتا ہے اور ایک آئینہ بھی لگا ہوتا ہے جو سامنے والے عکس کو ایک
 چھوٹے سے پردے پر منتقل کر دیتا ہے۔ بعض کیمروں کے
 ویو فاسٹرز میں چار خطوط کا ایک فریم نظر آتا ہے۔ جتنی تصویر لینا
 مقصود ہو اسے فریم میں بند کر لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریٹج فاسٹرز بھی ہوتا ہے۔ اس آلے کے
 ذریعے فاصلہ آسانی سے ناپا جاسکتا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ

کتنے فاصلے سے تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ اس آلے میں دو کھڑا
 ہوتے ہیں ایک قائم اور دوسرا متحرک۔ دوسرے عکس کو حرکت
 دے کر پہلے والے عکس پر لایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا
 ہے کہ تصویر فاصلے کے مطابق درست طریقے سے فوکس ہوگئی
 ہے۔ بس پتہ دبانے کی دیر ہے۔

فوٹو گرافی کے مزید آلات میں فلیش ایکسپوزیٹر بھی شامل
 ہے جو لینز میں غیر ضروری روشنی داخل نہیں ہونے دیتا۔

1891ء میں ٹامس ایڈیسن کے معاون نے جو اسکاٹ
 لینڈ کا رہنے والا تھا اور جس کا نام لاوری ڈکسن تھا، ایک کیمرا
 متعارف کرایا جسے کانگوگراف نام دیا گیا۔ کیمرے کو طاقت
 دینے کے لیے بجلی کی موثر استعمال کی جاتی تھی۔ یہ کیمرا سیکل
 کے 400 ویں حصے میں تصویر کھینچنے پر قادر تھا۔

1923ء میں ایسٹ مین کوڈک نے 16 ملی میٹر کا
 کیمرا متعارف کرایا جس کی قیمت ایک ڈالر تھی۔ جب
 عام لوگوں کو یہ پتا چلا کہ اب وہ خود بھی تصاویر کھینچ سکتے ہیں تو
 اس پر ٹوٹ پڑے۔

دوڑتی بھاگتی چیزوں کی تصویر لینے کے لیے شٹری رفتار
 زیادہ رکھنا پڑتی ہے۔ روشنی کسی ہے، اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا
 ہے۔ اگر روشنی کم ہے تو اپرچر کا کشادہ ہونا ضروری ہے۔ نیز
 رفتار چیزوں کی تصویر لینے کے لیے آئٹھ کو ویو فاسٹرز پر رکھتے
 ہوئے کمرے کے ذریعے دوڑتی ہوئی چیز کا تعاقب کیا جاتا
 ہے۔ چاہے وہ رینگ کار ہو یا تیز رفتار سی بھاگتا ہوا
 درندہ۔ ایسی تصویر لینے وقت فوٹو گرافر کا تجربہ کام آتا ہے۔

عام کیمرے اور سینما فوٹو گرافی کے لیے استعمال ہونے
 والے کیمرے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عام کیمرے سے ایک
 وقت میں ایک ہی تصویر لی جاسکتی ہے۔ جبکہ سینما فوٹو گرافی
 کیمرے کے ذریعے یکے بعد دیگرے ایک لمبی فلم پر بہت سی
 تصاویر اتاری جاتی ہیں۔ اس کیمرے کے برقی نظام کے
 ذریعے فلم کا رول مطلوبہ رفتار سے چلتا رہتا اور تصویریں تیزی
 سے اترتی رہتی ہیں۔ کیمرے میں دو اسپول ہوتے ہیں۔ ایک
 پر سے فلم اترتی رہتی ہے اور دوسرے پر چڑھتی رہتی
 ہے۔ کیمرے میں دو ٹیمیں بھی ہوتی ہیں جو اسپول کو سیدھا رکھتی
 ہیں۔ تاکہ فلم ٹھیک سے فوکس ہو سکے۔ جب فلم کیمرے میں
 چلتی ہے تو ہر فریم علیحدہ عکس لیتا ہے۔ تصویر لینے وقت کیمرا ہلکا
 نہیں چاہیے۔ یعنی ہر فریم کی تصویر لینے وقت اس کا ساکن ہونا
 ضروری ہے، اسی لیے وہ اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے۔ کیمرے میں دو
 چار پرزے لگائے جاتے ہیں جو اس کام کو آسان بنا دیتے

ہونے لگے ہیں۔ جس سے دیکھنے والا خود کو اس منظر کا حصہ سمجھتا ہے اور اسے خطی خیال نہیں ہوتا کہ وہ کوئی مصنوعی چیز دیکھ رہا ہے۔ سارا منظر مطابق باصل ہوتا ہے۔

موبائل اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے بارے میں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ مگر اس میں جدت نگاروں نے فوٹو گرافی کے لیے کیرا بھی منسلک کر دیا اور اسے اپنی جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلا کیرا فون جاپان میں 2000ء میں فروخت کیا گیا۔ یہ ڈیجیٹل کیرے سے زیادہ سادہ ہوتا ہے اور لینز کی بنا پر کم روشنی میں بھی فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ اس میں علیحدہ سے فلیش لائٹ نہیں لگی ہوتی ہے بلکہ فلیش اندر ہی ہوتی ہے۔ اس میں میموری کارڈ ہوتا ہے جسے حسب منشا نکالا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بلیو ٹوٹھ اور ہائی فائی بھی ہوتا ہے۔ کیرے کو آپریٹ کرنے کے لیے اس کا بٹن علیحدہ ہوتا ہے۔ کیرے کی کارکردگی بڑھانے کے لیے باہر سے بیٹری یا فلیش لائٹ لگائی جاسکتی ہے۔ اس سے جتنی بھی تصاویر کھینچی جاتی ہیں وہ اندرونی میموری میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس میں ایکسٹرنل میموری بھی ہوتی ہے اس لیے تصاویر اس میں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ پہلا اسمارٹ فون نوکیا نے مارکیٹ میں متعارف کرایا تھا۔ اسی کمپنی نے اب تک دنیا میں سب سے زیادہ کیرے فروخت کیے، جن کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔ جس میں باور بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ آج کل فروخت ہونے والے کیرا فون میں سی ایم او ایس (CMOS) ایجنس سسرٹیکنا لو جی استعمال ہو رہی ہے۔ اس کے ذریعے سات منٹ تک کی ویڈیو بھی بنائی جاسکتی ہے۔

وہ تصاویر جو اسمارٹ موبائل فون سے کھینچی جاتی ہیں نہایت آسانی سے کمپیوٹر میں محفوظ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کو بھیجی جاسکتی ہیں، کہ جس میں تار استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ (غیر ملک میں) قانون کے رکھوالوں نے عام افراد کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ چھپ چھپا کر ایسے اشخاص کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں جو کسی جرم میں ملوث ہیں۔ اس کے بعد فوراً ہی ان تصاویر کو پولیس اسٹیشن کی ای میل پر روانہ کر سکتے ہیں۔

اب تک جن کمپنیوں نے موبائل کیرا فون بنایا ہے، ان میں تو شیا، شارپ، نوکیا، سائیبو، سیسک، موٹورولا، ایپل اور ایل جی ایئر ٹو کس شامل ہیں۔

فلم کے کنارے پر جو سوراخ ہوتے ہیں وہ بھی اس میں آسانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر فریم ایک لمحے کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور تصویر اتر جاتی ہے۔ ایک سینڈ میں 24 فریم لزر جاتے ہیں۔ مووی کیرا فرانس رونا لڈس نے 1845ء میں متعارف کرایا تھا۔

جب مووی کیرا ایجاد ہو گیا تو گھروں میں فلم دیکھنے کے لیے پولینڈ کے ایک سائنسدان نے بروجیکٹر ایجاد کیا۔ جس پر پہلے سے چھپی ہوئی فلم لگا کر چلائی جاتی تھی اور سامنے اسکرین پر پردہ رکھ کر فلم دیکھی جاتی تھی۔

اس کے بعد ویڈیو کیرا (کمکوڈر) اور ویڈیو ریکارڈر متعارف ہوا جس کی مدد سے آپ اپنے ٹیلی ویژن پر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ یہ چھوٹا ہوتا تھا اور اسے کاندھے پر رکھ کر بھی فوٹو گرافی کی جاسکتی تھی۔ اس کا بنیاد مووی کیرے کی سی تھی۔ جسے فلمیں دیکھنے کے علاوہ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں فلم ٹیپ استعمال کیا جاتا تھا۔ ویڈیو کیرے کو ٹیلی ویژن کی براڈ کاسٹنگ میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے 1983ء میں سونی کمپنی نے عام افراد کے لیے کمکوڈر بنایا۔ اسی سال جے وی سی نے بھی کمکوڈر متعارف کرایا۔ اس کے بعد پنا سوک اور ہٹاچی نے بھی اپنے کمکوڈر مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کیے۔

اس کے بعد 2006ء میں اس مینلیک نے ترقی کی اور ڈیجیٹل کیرا متعارف ہوا۔ جس میں ٹیپ کے بجائے کیسٹ استعمال ہونے لگا۔ سب سے پہلے ویڈیو کیسٹ ریکارڈر کو جے وی سی اور سونی کمپنی نے بنایا۔ جب کہ 1992ء میں امکس نے بھی یہی چیز متعارف کرائی۔ اس میں میموری کارڈ لگائے جاتے تھے، جسے ایکسچینج اسٹوریج بھی کہتے ہیں۔

مزید ترقی یہ ہوئی کہ میموری کارڈ کی جگہ بلٹن اسٹوریج نے لی۔ اس میں یہ ہولت بھی تھی کہ زیادہ تصاویر محفوظ کرنے کے لیے ایکسٹرنل میموری کارڈ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد تھری ڈی متعارف ہوئی۔ اس میں بیک وقت تین کیرے ریکارڈنگ کرتے تھے۔ دائیں بائیں اور سامنے۔ ان تینوں کو یکجا کر کے جو فلم بنائی گئی اسے تھری ڈی کہا جاتا ہے۔ 2010ء میں جمہو کیرون نے اپنی فلم ”اواتار“ اسی مینلیک پر بنائی تھی۔ 2011ء میں پنا سوک کمپنی نے ایسا کمکوڈر متعارف کرایا جو تھری ڈی شوٹنگ کر سکتا ہے۔

بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ مینلیک نے مزید ترقی کر لی ہے، اب کسی منظر کو شوٹ کرنے کے لیے چھ کیرے استعمال



قسط نمبر: 10

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور اترام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ ذنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو حوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ حافی ناگنے آیا تھا کیونکہ اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب مشعلی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈہ ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تنہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان کی پرالٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک انٹری دی جو تھوڑی سی جگہ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں سی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کر وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا بیچ آسکیا کہ اسے ڈانری کا پارٹ ٹول کیا ہے۔ اگلے دن ذنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈانری کے واقعات جس جس نے رفعت گیل کے واقعے کو مزید ابھار دیا تھا۔ ان دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیریاں بھی تھیں جو کھانہ کی کھش کی گشتگی کا ڈے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیریاں سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو کمی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سترہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف محمد رنیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سننے ہی میں اٹھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آتی شروع ہو گئی تھیں۔ سدا بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڈ میں غشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدا کو رخصت کر کے میں بیٹھا تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او لاڈلور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی پانک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سیای نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے چھڑنے لگے۔ نکلا دیا تھا۔ وہ چھڑا کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیریاں نظر آگیا۔ میں اسے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے منتقل ہو چکا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گھوٹلائی کرادی جس کے ٹرک نے ذنیرہ کی کار کو ٹھکرایا تھا۔ گھر آیا تو کاشت ملنے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ مجھ کو اڈا کھان کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سینٹھ ستار کے جنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سینٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ جی روزی نے کہا کہ سینٹھ ستار جھوٹا بل رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گھنٹن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سینٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کھانچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے منت کر میں نے سینٹھ سے اگلا لیا کہ حاضر کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال آیا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی پہلی کالین تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیل والا، ابلے لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیل والا کے کودھکا دے کر دو سٹغ فٹس اندر آگئے۔ اس سے منت کر میں نے انیسٹر کا کمران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ انیسٹر کا کمران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر ذنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر ذنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور ابھار گیا تو ذنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے ذنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

موقع منظر دیکھا تھا۔ ایک گھٹیلے جسم کا فٹس، جس کے دائیں پہلو سے خون رس رہا تھا، اپنے ذم پر ہاتھ رکھے ہوئے، لڑکھڑاتے قدموں سے نکاسی کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں ہکا بکا سارہ گیا تھا۔

”رک جاؤ ورنہ دوسری گولی چلا دوں گی۔“ چانک اسی کمرے سے میں نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا، وہ ذنیرہ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کا ایک اعشاریہ ڈبل ٹوبور کالیڈر پائل تھا۔ اس کے عقب میں حالہ نجو ہراساں

گولی چلنے کی آواز اور اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ ابھری جسے سن کر میرے تیزی سے دھڑکتے دل میں پہلا ہولناک خیال ذنیرہ کے سلسلے میں یہی ابھرا تھا کہ کہیں وہ خدا نخواستہ دوسری بار دشمنوں کی سفاکی کا نشانہ بن گئی ہو؟

میں تب تک نیچے گھن میں جانے والی میڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا گویا میری ناگوانوں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ میں دو، دو، تین، تین قدم بچھلا نکلا ہوا محض میں تقریباً آگرا تھا اور سنبھلے سنبھلے میں نے ایک چونکا دینے والا غیر

انداز میں جینچ ہوئی لپکی تھیں۔ وہ زہیرہ کو اس اجنبی کے پیچھے جانے سے روکنے کی کوشش میں تھیں۔ گولی چلنے کے بعد وہ نسوانی چیخ شاید خالہ فحجہ کے ہی حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ دونوں خواتین مجھ دیکھ کر چوکی بھی تھیں۔

جب ہی میں پل کے پل میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا، تب ہی میرے دم پہ خود خود میں جیسے لاوا سا دوڑ گیا۔ وہ آدمی ابھی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے جست بھر کر اسے دبوچ لیا۔ وہ پہلے ہی زہیرہ کی چلائی ہوئی گولی سے بے حال تھا اور تیزی اس کے وجود سے عقنا تھی۔ میں نے اسے دبوچ کر پھلتی بھی دے ڈالی۔ وہ گھومتا ہوا زہیرہ کے قدموں میں جا گرا۔

زہیرہ کے چہرے کی دلکشی اور صباحت کی جگہ پر غیظ نے لے رکھی تھی۔ اس نے ہنوز اپنے لیڈر پہ پل کارخ اسی کی طرف کر رکھا تھا اور وہ اسی لہجے میں حملہ آور کو دھمکاتے ہوئے بولی۔ ”خبردار! اب اگر کوئی حرکت کی تو کوئی تمہارے سر میں اتار دوں گی۔“

”زہیرہ! یہ پتول مجھے دو اور تم جلدی سے ری لے آؤ۔“ میں نے اس سے کہا تو زہیرہ نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ پہل مجھے تھما کے اندر سے ری لے آئی۔ اس آدمی کی حالت پہلے ہی غیر ہو رہی تھی۔ بھر مجر احتیاط کے پیش نظر میں نے صرف اس کی دونوں ٹانگیں ہی جکڑنا ضروری سمجھا تھا۔

”تم پولیس کو فون کرو۔“ میں نے زہیرہ سے کہا۔ اسی وقت باہر سے دروازہ دروازہ سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

”دروازہ کھولو کیا ہو رہا ہے اندر۔“ وہ محلے ہی کے لوگ تھے اور کوئی بعید نہ تھا کہ ان میں وہ پختہ عمر شخص بھی شامل ہو جس کے گھر میں زبردستی گھس کر میں نے ان کے مکان کی چھت ٹاپی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا انداز درست ثابت ہوا۔

”کیا ہوا ہے بھائی؟ خبریت ہے؟“ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ان سب کی نظر میں تشکیک کے سائے تھے جبکہ مذکورہ شخص شے کی کڑوی کسلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”اندر دیکھ صاحبہ رہتی ہیں، وہ تو تھک ہے ناں؟ آخر ہوا کیا ہے، یہ گولی چلنے اور چیخوں کی آوازیں کیسی تھیں؟“

”بھائیو! کوئی چور گھسا تھا اندر مگر دیکھ صاحبہ نے اپنے پتول سے اسے زخمی کر دیا ہے۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”بھائی! تم خود کون ہو؟ پہلے بھی تو محلے میں نظر نہیں

آئے؟“ ایک نے پوچھا تو وہی پختہ عمر آدمی بولا۔

”یہ بھی چور کا ساتھی ہے۔ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے زبردستی میرے مکان کی چھت پر اور.....“

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے عزیز ہیں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔“ زہیرہ نے کہا۔ باتوں کی آوازیں سن کر وہ بھی دروازے پر آگئی تھی۔ زہیرہ کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔

”ہم نے پولیس کو فون کر دیا ہے، وہ ابھی پہنچنے ہی والی ہے۔“

”میں نے دن فانیو پر اطلاع دے دی ہے۔“ وہی شخص بولا۔

”اچھی بات ہے۔“ زہیرہ نے کہا اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کر دیا۔ ہم دونوں واپس ہوئے۔ زخمی حملہ آور صحن کے فرش پر پڑا کر رہا تھا۔

باہر ابھی تک لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ انہیں تو تماشا چاہیے باتوں کی بھینٹا نہیں سنا کی دے رہی تھیں۔

”اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہمیں کم از کم اسے فرسٹ ایڈ تو دے دینی چاہیے۔“ میں نے خامسے فکڑ سے کہا۔ مخاطب زہیرہ بھی، وہ جواب بولی:

”پولیس کے ساتھ میں نے ایبویلنس کو بھی فون کیا ہے۔“

”مددگار“ تھانہ قریب ہی تھا۔ پولیس آن پہنچی، ایبویلنس بھی ساتھ تھی۔ تھانہ انچارج ایک نو جوان سائیں آئی تھا۔ سینے پر اختر کے نام کا کاج لگا تھا۔ اس نے ہم دونوں سے بیان لیا۔ زہیرہ نے اپنا تعارف جب ہائی کورٹ کی وکیل کی حیثیت سے کر دیا تو وہ خاصا مرغوب نظر آنے لگا۔

زہیرہ اور میں نے اسے صرف متعلقہ حالات کے بارے میں مختصر آیتا یا اس کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایڈووکیٹ زہیرہ پر یہ دوسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ پہلے والے حملے کے کیس سے متعلق تھانہ پلیر شرقی میں تفتیش جاری ہے۔ یہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ ہمارے ذہن کون ہیں یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور باحسن خوبی ہم ان تک قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے پہنچنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ خود کو کسی آزمائش میں ڈالنے بغیر ہماری گزارش کے ساتھ اس کیس کو انسپکٹر کا مرامن کے سپرد کر دیں گے، جو آل ریڈی اس کیس پر کام کر رہے ہیں۔“

سب انسپکٹر مجھدار ثابت ہوا، وہ میری بات کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اس نے وہی کیا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد مضابطے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ حملہ آور کو پولیس کھڑی میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں سے خبر آئی کہ انسپٹر کا مہران نے تین پولیس اہلکاروں کو شہید کر دیا ہے۔

”دشمنوں کے جتنے گماشتے پکڑے جائیں گے اتنا ہی ان کے گرد گھیرا تنگ ہو جائے گا۔“ زہیرہ نے مجھ سے کہا۔ موجودہ حالات نے اسے کافی غرینہ دیا تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ایک اور قاتلانہ حملے سے بال بال بچی گئی، البتہ خالہ نجوا بھی تنگ فکر مند اور ہراساں نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے چائے کا انتظام کر دیا تھا اور ضروری دودھ و دھوپ کے بعد ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”ہاں!“ میں نے جواب میں خالی کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں ہر وقت انسپکٹر کا مہران کے ساتھ رابطے میں رہتا ہوں۔“ عزیز خان بھی پولیس کی گرفت میں ہے۔ ٹوپیہ کے قتل کا اس پر پکس لگا ہے۔ مہران خان اپنے لاڈلے بیٹے کی ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے، سیٹھ ستار کا قاتب نامی آدمی قابو میں آ گیا ہے۔ اسے ڈرا دھمکا کر اور کچھ اس کا خمیر جگا کے اس کی مدد حاصل کی جانے کی اُمید تو ہے مگر یہ قول کالیا قاتب پر اتنی جلدی بھروسہ کرنا خطرناک ہوگا جبکہ روز کی شکل میں بھی سیٹھ ستار کے گٹھ کی رسی پہلے ہی تیار ہے۔“

”اؤٹس کر یٹ۔“ زہیرہ متاثر کن انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”ایک دم فاسٹ جارہے ہو نوی تم! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ”تمہارے بھائی، فہیم کی کوئی خبر؟“

بھائی کے ذکر پر میرا چہرہ اداسی کی تصویر بن گیا۔ میں نے فہیم سے متعلق تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تو بل کے بل اس کے چہرے سے تھوڑی دیر پہلے والی متوجع کامیابی کی خوش اُمیدی عطا ہونے لگی اور اس کی جگہ فکر و تشویش نے لے لی، پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”نوی! یہ اچھا نہیں ہوا۔ دشمن ہمارے کامیابی کی طرف بڑے سفر کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہونا میری بات؟“

ایڈووکیٹ زہیرہ کے دل میں بھی وہی خدشہ ابھرنا عین امر تھا جو میرے اندر بھی بل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”اسی بات کی تو مجھے فکر ہے لیکن ایسا تب ہوگا جب فہیم سیٹھ ستار یا مہران خان کی قید میں ہو۔“

”کیا مطلب؟“ زہیرہ نے قدرے چونک کر الجھے

ہوئے انداز میں کہا۔ ”ان کے علاوہ بھلا اور ایسا کون سا نیا دشمن پیدا ہو گیا؟“

”دشمن تو وہ بھی پرانا ہی ہے میرا۔“ میں نے اسرار بھرے انداز میں کہا۔

”کون؟“ زہیرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”پردہ نشین۔“

”پردہ نشین؟“

”ہاں۔“

”کیون ذات شریف ہیں؟“

”میرا اصل دشمن جس کی مجھے تلاش ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہی لوگ جنہوں نے تمہارے

والد کو بے گناہ پھانسی کے پھندے پر چڑھایا؟“

”ہاں!“

”کیا تمہارا اس سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟“

”تم شاید بھول رہی ہو یا میں تمہیں بتانا بھول گیا۔

ایک شخص کا کچھ روز پہلے فون آیا تھا۔ میں اس وقت اپنی مہران میں تھا اور کالیا بھی میرے ساتھ تھا، پولیس اسٹیشن جارہے تھے کہ راستے میں اس کی میرے موبائل پر کال آئی تھی۔ وہ مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ ”جو ہو گیا اسے جانے دو اور جو ہو رہا ہے اسے مت روکو ورنہ تمہارا انجام بھی تمہارے باپ سے مختلف نہ ہوگا۔“

”اوہ۔“ زہیرہ کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

”میں اسی لیے اسے پردہ نشین کہتا ہوں کیونکہ پردے کے پیچھے رہتے ہوئے وہ میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میں اسے نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔“

”لیکن اتنے عرصے بعد اس کا تم سے رابطہ کرنا۔ بتا رہا ہے کہ وہ تمہاری ہم جوئیوں سے پریشان ہو گیا ہے جس کا ثبوت اس کی فون کال ہے۔“ زہیرہ نے کہا۔

”درحقیقت وہ پردے کے پیچھے نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اس نے ایک ڈری سہی جی کی طرح خود کو خفیہ میں بند رکھا ہوا ہے۔ میری کوششیں اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں گی۔“

زہیرہ میری بات پر بُرے خیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگی۔

”میں آج شام رانا بشیر کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتا

منگلو اگرچہ مختصر تھی اور میرا خیال ہے یہی زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔“

”کسی لیے اہمیت کی حامل تھی؟“
 ”اس شخص نے رانا بشیر کو کل ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمر نمبر 57 میں بلایا ہے، شاید کوئی اہم منگلو کرنی ہے۔“
 ”کتنے بجے بلایا ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔
 ”نو بجے۔“

”کچھ سا تھلا لے کر کوہا تارانا بشیر سے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔
 ”جی جناب! کوئی اہم نوعیت کا کاغذ تھا وہ۔ یا پھر شاید کسی معاہدے کا پتھر یا خط وغیرہ۔“
 ”سدا!“

”جی جناب!“
 ”اس ہوٹل تک ساتھ رہ سکتے ہو؟“
 ”بالکل سر! مگر میں دوسرے عہد میں ہوں گا۔“
 ”چلے گا۔ ایک بات اور۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی ایسا طریقہ سوچ کر رکھو جس سے ہم مذکور ہوٹل میں داخل ہو کر آرام سے ان دونوں کی گفتگو کر سکیں۔“

”جناب! آپ اس کے لیے کل ٹھیک آٹھ بجے میرے پاس پہنچ جائیں۔“
 ”مگڑ! میں آ جاؤں گا۔“

”میں منتظر ہوں اور کوئی طریقہ بھی تیار کیے رکھوں گا۔“ سدا بھائی نے جواب دیا اور میں نے ایک بار پھر اس کے لیے تو صلی انداز میں اختتامی جملہ ادا کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے اپنی رسد و راج میں وقت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

”کس کی کال تھی؟“ زبیر نے پوچھا۔
 ”میرے ایک منجری۔“
 ”کوئی خاص بات بتا رہا تھا تمہیں۔“ اس نے کہا۔
 ”ہاں! باقی کل۔“ میں اب چلوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔“
 ”تھینک یو نو!“ وہ آخر میں کھڑے ہو کر مجھے رخصت کرتے ہوئے بولی۔

”کس بات کا؟“ میں نے حیران مگر مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”تم میری مدد کو پہنچ گئے تھے۔“

”یہ اتفاق ہی تھا کہ مجھے اچانک ان دونوں افراد پر شبہ

ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس معاملے کو جتنی تیزی سے آگے بڑھاؤں گا اتنا ہی وہ پردہ نشیں بے چین ہو کر پردے سے باہر آنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سیل کی بیل منگنائی۔ ”سدا بھائی کی کال تھی۔“
 ”ہاں! کو کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل مگر گہیر لہجے میں پوچھا۔

”جناب! اس لڑکے کا میں نے پتا لگا لیا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور میری ساری حیات جیسے سٹ کر کانوں کے پردوں سے چپک گئیں۔ ”اس لڑکے کا نام فیر ہے۔ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ باپ کا نام شاہ میر ہے جو ایک عجیب ریاست کی بڑی آکس کمپنی کا چیئر مین ہے۔ وہ عموماً ملک سے باہر اور عجیب ریاستوں کے دورے پر ہوتا ہے۔ رہائش ڈینٹس فیئر فائیو میں ہے۔ ایک عالی شان کوٹھی ہے۔ جہاں صرف تین افراد مستقل طور پر رہتے ہیں۔ شاہ میر کی بیوی سلی صماد جو ایک عربی خاتون ہے۔ اس کا جوان بیٹا فیر شاہ اور اس سے ایک سال چھوٹی بیٹی کلاخہ۔ شاہ میر مہینے دو مہینے بعد اپنے پرائیویٹ طیارے میں آتا جاتا رہتا ہے۔“

میں نے غور سے سدا بھائی کی ان معلومات کو ذہن نشین کیا اور تو صلی لہجے میں بولا۔ ”مگڑ! اب مجھے ذرا رانا بشیر کے بارے میں بتاؤ کہ اس سے متعلق تم نے اب تک کوئی غیر معمولی بات محسوس کی؟“

”جی جناب!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔
 ”بوتلے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔“

”جناب! رانا بشیر ایپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ شاہراہ فیصل میں اس کا دفتر ہے۔ اس کے پاس کاروباری افراد آتے جاتے رہتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے صرف ایک ہی غیر معمولی بات کا پتا لگا سکا ہوں جناب! وہ بتانے لگا اور لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکا۔ میں پورے دھیان اور دھڑکتے دل سے اس کی سنتا رہا۔ اگلے لمحے وہ مزید بتانے لگا۔ ”وہ کسی ایسے شخص کی وجہ سے پریشان ہے جو اسے دفتر کے نمبر پر فون کرتا ہے، میرا خیال ہے وہ رانا بشیر کو کسی وجہ سے بلیک میل کر رہا ہے اور اس سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہ رہا ہے۔“

”وہ اس سے کیا باتیں کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تین بار اس آدمی کی کال آئی تھی۔ پہلی بار کی گفتگو میں نہیں سن سکا تھا، دوسری بار ادھوری سی گئی البتہ تیسری بار کی

ہو گیا تھا، افسوس کہ اس کا دوسرا ساتھی جو باہر ٹیکسی میں بیٹھا تھا، فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

”جہیں نوی! یہ اتفاق نہ تھا بلکہ میرے لیے تمہاری غیر معمولی احتیاط کا زیادہ دخل تھا اس میں۔“ وہ بولی۔
”اب میں چلوں گا۔ بہنا اکیلی ہے گھر میں۔ کل بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔“ میں نے ایک دبے دبے جوش تلے کہا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

میں زنیہ کے گھر سے نکلا تو چند لوگوں کو باہر کھڑے پایا۔ وہ میری جانب عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر اپنی کار میں بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ طبر جانے کے لیے میں جیسے ہی شاہراہ فیصل پر آیا تو یہاں ٹریفک کا سیلاب اٹھا پڑا تھا۔ ٹریفک کا یہ سیلاب شام چھ بجے کے بعد سے ہی قلو پکڑنے لگتا اور رات بارہ بجے تک عروج پر رہتا۔

گراچی میں کل گرمی زوروں پر تھی جس کی کیفیت سوا تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کر اسے آن کر لیا تھا کیونکہ ٹریفک سست روی کا شکار تھی بلکہ کہیں برقی پمپ ٹو پمپ چل رہی تھی، بالکل چوٹی کی رفتار سے۔ باوجود اس کے میرا ذہن ان گنت سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مافیائی چیفس و شمنوں (سینٹھ ستار اور حاجی مہران خان وغیرہ) کو چھوڑ کر اب میرا سارا دھیان اپنے اصل دکن، اس پردہ نشین کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی ایک باری کال آئی تھی اور مجھے اس کالب دلچسپہ آواز سب اچھی طرح سے ذہن نشین ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں ہی مجھ سے بات کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میں جیسے جیسے رفعت خانم مرڈر کیس پر چھائی ہوئی گرد و تہہ در تہہ صاف کرنے میں مصروف تھا، اس نے ”پردہ نشین“ کو گھبراہٹ میں جتلا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھٹا وہ پردے کے پیچھے خاموش بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا مگر جب اسے میرے کامیابی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا اندازہ ہوا تو وہ بلبلاتا ہوا اور گم نام کال کے ذریعے مجھے دھمکانے پر اتر آیا۔ یہ کامیابی اپنی جگہ مگر مجھے محض اسی خوش فہمی میں جتلا رہے ہوئے احتیاط کا دامن بھی نہیں چھوڑتا تھا کہ جو شخص بڑی صفائی سے نہ صرف رفعت خانم کا قتل کر سکتا ہے بلکہ خود کو بچا کر کسی بے گناہ کو تختہ دار پر بھی چڑھا سکتا ہے تو وہ کتنا چالاک اور خطرناک مجرم ہوگا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل منگلتائی۔ میں نے اسکرین میں دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ ثاقب کی کال تھی۔

”ہاں! جیو کوئی خاص بات؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”جی! نعمان بات کر رہے ہو؟“ دوسری جانب سے ثاقب کی آواز ابھری، اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، کچھ گھٹا گھٹا سا، جیسے آواز دھیمی رکسنے کی کوشش میں ہو۔
”ہاں! نعمان ہی بات کر رہا ہوں۔ آگے بولو۔“ میں نے فوراً کہا۔

”آپ کہاں ہیں اس وقت؟“
”میں شاہراہ فیصل پر ہوں۔ اصل بات کرو جلدی۔ ہوا کیا ہے آخر؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔
”یاسر آیا ہوا ہے۔ سینٹھ صاحب کے پاس۔“ اس نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔
”کیسا؟ اس وقت؟ کہاں؟ آفس میں؟“ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”جی ہاں، بوٹ بیسن کے بلیومون ہائینس آفس میں۔“ اس نے بتایا۔ ”بڑی مشکلوں سے باہر نکل کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔“

میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا اور پھر یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ ”میں ابھی پہنچتا ہوں۔“
کہیں پہنچنے کی جلدی ہو تو ٹریفک کا رش اور زیادہ جھنجھلاہٹ میں جتلا کر دیتا ہے۔ شکر تھا کہ سڑک پر موجود، چوٹی کی رفتار سے رشتی ہوئی گاڑیوں کے اوڈ ہام میں، میری کار بائیں جانب کے ایک ”کٹ“ سے گزر رہی تھی۔ یہ ایک ذیلی راستہ تھا جو لال قلعہ ہوٹل اور دیگر راستوں کو ”منج“ کرتا تھا۔ میں نے فوراً اسٹیرنگ بائیں جانب گھمایا اور رفتار بڑھا دی۔ میں تیزی کے ساتھ آگے سے ایک چکر کاٹ کر دوسری شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم رش تھا۔ تاہم میں ”فاسٹ لائن“ میں کار دوڑاتا ہوا ڈیفنس اور وہاں سے بوٹ بیسن جا پہنچا۔

میں نے ثاقب کو منج کر دیا کہ میں آچکا ہوں اور بلیو مون آفس کے سامنے اپنی کار میں موجود ہوں۔ یاسر جیسے ہی باہر نکلے مجھے اس کے حلیے سمیت اس کی ڈریننگ کے بارے میں بھی آگاہ کر دے۔

جلد ہی اس کا رپائی آ گیا۔ یعنی ”او کے۔“
میں نے اپنی کار بلیو مون ہائینس کی عمارت کے سامنے زرا دور دو بیسیوں کے قریب کھڑی کر دی۔ روڈ لائٹس روشن تھیں، گاڑیوں کی گزرتی ہوئی تیز ہیڈ لائٹس نے بھی اس

شاہراہ پر روشنیوں کا سیلاب سا انداز رکھا تھا۔ اچانک منہج کی ہلکی ٹون بجی۔ میں نے جھپٹ کر برابری سیٹ پر رکھا موبائل اٹھالیا۔

”وہ باہر نکل رہا ہے۔ درمیانی جسامت کا ہی آدمی ہے۔ عمر پینتیس چالیس کے درمیان ہے۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار ٹیس پہن رکھی ہے۔“

میں نے فوراً کار اشارت کی اور عقلمانی نظروں سے بلیومون کے شیشے والے دروازوں کی طرف دیکھنے لگا، چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے ایک درمیانی جسامت کا شخص جس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار ٹیس پہن رکھی تھی، دروازے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ میرے اعصاب یکھت تن گئے۔

میں نے اسے ایک بار بردار سوزو کی ”مٹی ٹرک“ میں سوار ہوتے دیکھا جو خالی تھی، میں نے سب سے پہلے نہایت ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ اپنے کمرے کے ذریعے اس کی دو تین تصاویر لے لیں۔ جب وہ بلیومون کے دفتر کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

وہ بار بار اپنی ٹیس کی پہلو والی جیب کو تھپتھپاتا تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے سوزو کی اشارت کر کے آگے بڑھائی۔ میں نے فوراً اپنی کار اس کے تعاقب میں لگالی۔ میرا چہرہ جوش سے تھم رہا تھا۔ سیٹھ ستار کے خلاف ایک اور اہم کیو میرے ہاتھ لگے والا تھا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر۔ کالیا کے سیل پر رابطہ کیا مگر اگلے ہی لمحے مجھے چونکنا پڑا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، کیونکہ وہ بھی اپنا سیل فون آف نہیں کرتا تھا۔ ممکن تھا اس کی بیٹری ختم ہوگئی ہو مگر جلد ہی میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ وہ چار جنگ پر لگا کر بھی بات کر لیتا تھا۔

بہر طور۔ میرے پاس اس وقت زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا، اس وقت میری اینٹنشن اسی سوزو کی مٹی ٹرک پر مرکوز تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ گزری کے علاقے کی طرف مڑ گئی تھی جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یا سرائی یہ گماشتہ۔ اسی علاقے کا رہنما تھی۔ ایک اور ہیڈ برچ جو آگے زم زم اور ڈینس کی طرف جاتا تھا اس کے پیچھے ”گزری“ کی آبادی تھی۔

سوزو کی مٹی ٹرک میں مڑ گئی۔ سوزو کی مٹی ٹرک زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ میں نے بھی اپنی مہر ان کارنگی میں داخل کر دی۔ سوزو کی کچھ آگے جا چکی تھی۔ یہاں زیادہ تر متوسط اور مزدور طبقہ آباد تھا۔ گلی میں عام سے چھوٹے بڑے مکانات نظر آ رہے

شہر

ایک دفعہ ایک خاصی عمر کے آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے احتیاط اور پرہیز بتایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ نماز میں جھکنے سے گریز کریں اور اشاروں میں نماز پڑھ لیں۔ گھر آ جانے کے بعد بزرگ نے کھانا پیتا کم کر دیا۔ اس کے گھروالوں کو پریشانی ہوئے لگی تو انہوں نے ڈاکٹر سے دوبارہ رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ہو سکتا ہے روٹی چبانے یا کھانے سے آنکھوں میں درد ہوتا ہو، اس لیے اسے کھانے کو نرم غذا دیں۔ تین دن گھر والے نرم چیزیں دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن بزرگ نے وہ بھی نہ کھائیں۔ کچھ دنوں بعد پریشان ہونے کے بعد گھروالوں نے بزرگ سے پوچھا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟ ڈاکٹر نے توجہ دہ کرنے سے منہ کھینچا۔ کھانا کھانے سے تو نہیں روکنا تھا۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ جس کا رزق ہے اس کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا دیا ہوا رزق کھانے سے شرم آتی ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لندن و ہاڑی

عشق کے درجات

حضرت خواجہ بندہ نواز فرماتے ہیں، عشق کے پانچ درجے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ شریعت ہے، جمال محبوب کی مفت سنا تا کہ شوق پیدا ہو، دوسرا درجہ طریقت ہے یعنی محبوب کی تڑپ کرنا اور اس کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنا، تیسرا درجہ حقیقت ہے یعنی ہمیشہ محبوب کے خیال میں گم رہنا اور اس کو خیالوں میں پالینا، چوتھا درجہ معرفت ہے جس سے مراد محبوب کی مراد میں ہر وقت گم رہنا ہے اور پانچواں درجہ وحدت ہے اس میں وہ اپنے فانی وجود کو ظاہر اور باطن میں فنا کر دیتا ہے اور صرف محبوب ہی کو موجود مطلق سمجھتا ہے۔ یہ پانچ مراتب پورے ہونے کے بعد کام ختم ہو جاتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی موج بہر عشق میں غرق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ وجود اور عشق کے درمیان اول بھی عشق ہے اور آخر بھی عشق ہے کیونکہ ہر وجود موجود ہے وہ عشق سے خالی نہیں ہوتا اور نہ عشق کے بغیر قائم یا باقی رہ سکتا ہے۔ بس ظاہر و باطن جو کچھ بھی ہے عشق ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لندن و ہاڑی

تھے۔ سوزو کی گلی کے چار پانچ مکان چھوڑ کے ایک کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بڑے دھیان اور چابک دستی کے ساتھ اس کی یہاں بھی تصویر اتاری جب وہ سوزو کی سے اتر کر گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا دستک دے رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر میری کار کی طرف دیکھا بھی تھا۔ میں اس سے دور تھا اور کار میں نے بالکل ہی آہستہ کر دی تھی تاکہ یہ اندر چلا جائے۔ قریب سے گزرنے پر وہ میری صورت آشنا ہو سکتا تھا۔

گلی کی زمین ناہموار اور گڑھوں سے اٹی پڑی تھی، میں نے جان بوجھ کر ایک ایسے ہی گڑھے میں کار کا ایک ٹائر پھنسا دیا اور کار کو یو پی ریس دینے لگا۔ مقصد ٹھوڑا وقت لگانا تھا۔ پھر جب میں نے ونڈ اسکرین سے پار وژ دیدہ نظروں سے سامنے دیکھا تو وہ اندر چا چکا تھا۔ میں نے کار کو فوراً آگے بڑھا دیا۔ مکان اور سوزو کی کانبر میں نے فوراً نوٹ کر لیا تھا۔ گلی کی دوسری سمت سے نکل کر میں دوبارہ مین شاہراہ پر آ گیا اور ایک بار پھر کالیا کے نمبر پر اس سے رابطہ کرنا چاہا مگر جواب نہ ارد۔ اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا، مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ جب ہی میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ استاد بھا بھا کے اڑے پر جا کے اس سے مل لوں؟ پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر لیا اور گھر کی راہ لی۔ گھر میں عاصمہ بہنا بھی اکیلی تھی۔ میں گھر پہنچا تو میری ہی بے چینی سے منتظر تھی۔

”خیریت تو ہے بہنا! تم پریشان کیوں ہو؟“
”بہت دیر ہو گئی تھی آپ کو آنے میں اسی لیے پریشان ہو گئی تھی ذرا۔“ عاصمہ نے جواب دیا اور میں نے مسکرا کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے محبت سے بولا۔
”بہنا! تیری دعائیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ تم گھبرایا نہ کرو، مجھے آج کل گھر آنے میں دیر ہو جایا کرے گی۔“
”نہیم بھیا کا کچھ پتا چلا۔ بھائی جان؟“ عاصمہ نے پوچھا۔

”ابھی تو نہیں مگر امید ہے جلد اسے بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا جبکہ خود ابھی تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ جیم کہاں اور میرے کس دشمن کے زہن میں تھا۔
”بھائی جان! کیا کالیا بھائی بھی اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“

”وہی ہے چارہ تو اب تک ہماری مدد کر رہا ہے ورنہ اس کے بغیر میں کیا ہوں۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو

عاصمہ بولی۔

”نہیں بھائی جان! آپ بھی جیسے رستم ہیں، میں جانتی ہوں کالیا بھائی کے ہر عمل اور منصوبے کے پیچھے آپ ہی کی جامع حکمت عملی کار فرماں ہوتی ہے۔ وہ ہاتھوں کا استعمال کرتا ہے اور آپ دماغ کا۔“ کہتے ہوئے وہ ہلے سے مسکرائی اور میں بھی ہنس دیا۔

”کھانا لگاؤ؟“

”نہیں بہنا! بھوک نہیں ہے مجھے میں نے ایڈوکیٹ زئیرہ کے ہاں ٹھوڑا بہت کھالیا تھا۔“

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور کالیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا ارادہ کالیا کو یا سر سے متعلق آگاہ کر کے ان پکڑ کا مران کو اس کے خلاف فوری کارروائی کے لیے تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا کہ اچانک میرا سیل فون تنگنا بنا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کالیا کا فون ہو گا مگر اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میری پیشانی پر ابھرن آئینہ سلسلے میں نمودار ہو گئیں۔

”بیل، کون؟“

”ہاں! نعمان بات کر رہے ہو۔“ دوسری جانب سے ایک شامسا اور استفسار طلب آواز ابھری۔ یہ استاد بھا بھا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور کالیا سے متعلق میرا دل جانے کیوں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”جی جی۔ میں نعمان ہی بات کر رہا ہوں بھا بھا صاحب!“

”کالیا تمہارے ساتھ ہے؟“ بھا بھانے پوچھا۔
”نہیں تو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کا فون بھی آف تھا، کئی بار میں نے اسے کال کی تھی مگر۔“

”کب سے تمہارے ساتھ نہیں ہے؟“ استاد بھا بھا نے پوچھا۔
”کل صبح سے۔“

”وہ مسلسل غائب ہے۔ اس کا نمبر واقعی بند جا رہا ہے، لگتا ہے وہ بے چارہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ بھا بھانے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔

اب تو مجھے کالیا کی طرف سے واقعی تشویش ہونے لگی تھی۔ میں نے اسی وقت اس کے دوست جشید عرف جی کو فون کیا، کافی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے اس سے کالیا کے متعلق پوچھا تو وہ خود پریشانی سے بولا۔
”میں تو خود کالیا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ آج صبح سے ہی

عاقب ہے اور اس کا فون بھی آف چارہ ہے۔“ اس نے جواب دیا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔
 ”کالیا بھائی تو آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیا آپ بھی۔“
 ”مجھ سے بھی آج صبح کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور کسی خیال کے تحت پوچھا۔
 ”سنو! تمہارے پاس جینکو کا نمبر ہے؟“

”تھا۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کالیا کے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 میں نے اپنے ذہن میں آنے والے پہلے خدشے کو رد کرنے کی غرض سے کہا۔
 ”مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ اسے کہیں جین ڈاڈا کے آدمیوں نے نہ اٹھوایا ہو؟“

”اس شبہ کی کوئی شواہد؟“ جینکو گھاگ لہجے میں مستفسر ہوا۔
 ”جنہوں نے میری بہن کو اغوا کیا تھا، کیا خبر ان لوگوں نے جین ڈاڈا کو حقیقت بتادی ہو؟“
 ”مگر وہ تم دونوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔“ جینکو بولا، تاہم میں نے اس کے لہجے کی لڑکھاہٹ کو صاف محسوس کر لیا تھا۔

”ہاں! وہ مطمئن ہو گیا تھا مگر شاید وہ لوگ مطمئن نہیں ہوئے ہوں گے جنہوں نے میری بہن کو اس کے آدمیوں کے ذریعے اغوا کر دیا۔“ جینکو نے کہا۔

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ چند ثانیوں کی مرسوج خاموشی کے بعد جینکو نے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہوئی تو ہم سب متاثر ہو سکتے ہیں۔ ویسے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ میں اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا تو اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں بھر بھی پتا کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جب وہ رابطہ منقطع کرنے لگا تو میں اندر سے کلکا اور بولا۔
 ”جینکو بھائی! تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟“

میری بات پر دوسری جانب سے اس کے گہرے سانس لینے کی آواز ابھری اور بولا۔

”میں یہی کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی جین ڈاڈا کا ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔“
 ”پھر؟“ میرا دل اندیشہ کے دوسوں تلے تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”میں جاؤں گا لیکن میرا نہیں خیال کہ وہی بات ہو۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔“
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا اور کسی خیال کے تحت مشورہ طلب اعجاز میں اس سے دوبارہ بولا۔
 ”جینکو بھائی! ایک بات کی شاید ہم غلطی کر بیٹھے ہیں۔“

”نہیں!“
 ”فورا مجھے سینڈ کرو۔“ میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈوں بعد جی جی نے مجھے ایس ایم ایس کے ذریعے جینکو کا نمبر بھیج دیا، میں نے اسی وقت جینکو سے رابطہ کیا مگر دوسری طرف بیل چائی رہی۔ فون ریسپونڈ نہ ہوا تو میں نے دوبارہ جی جی سے رابطہ کر کے اس سے کہا۔
 ”کیا تم جینکو سے جا کر اس وقت مل سکتے ہو؟“
 ”مل تو سکتا ہوں فون بھی بھائی! لیکن لیاری جیسے علاقے میں اس وقت جانا۔“ وہ کھڑا نہ لگا۔
 ”میرے پاس آ جاؤ۔ دونوں چلتے ہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔

”ابھی اس علاقے میں جانا مناسب نہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے لیاری جانے سے پہلے جینکو سے فون پر رابطہ کرنا ضروری ہوگا۔ اسی وقت کال کے دوران مجھے ہلکی ہلکی آواز آواز سنائی دی۔
 ”میرا خیال ہے کسی کا فون آ رہا ہے، ایک منٹ ہولڈ کرنا۔“

میں نے اسے ہولڈ کرانے کے بعد کال ریسپونڈ کی جینکو کی کال تھی۔
 ”کون؟“ دوسری جانب سے اس کی گھمبیر آواز ابھری۔

”جینکو بھائی! یہ میں ہوں نعمان نومی۔ کالیا کا دوست۔ یاد آیا؟“
 ”اوہ ہاں! پہچان گیا۔ خیریت تو ہے؟ تمہاری کال آرہی تھی میں ذرا باہر دروازے پر کسی کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔“
 میں نے اسے کالیا کے پراسرار غیاب کے بارے میں بتادیا۔

”استاد بھابھا سے رابطہ نہیں کیا؟“
 ”کیا تھا۔ وہ خود مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا

”کون سی؟“

”بقول آپ کے جن ڈاڈا آپ کا دوست تھا تو ہمیں خود کارروائی کی بجائے، اس سے ڈائریکٹ مذاکرات کر لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔“

”میں نے کب کہا کہ میرا دوست ہے؟“ جینکو بولا۔ ”میں نے اس کے لیے حلیف کا لفظ استعمال کیا تھا اور حلیف تب ہی بنتے ہیں جب ان کے مفادات یکساں ہوں جبکہ دوستی بے غرض ہوتی ہے، جیسی میری کالیا کے ساتھ ہے اور کالیا کی تمہارے ساتھ۔ بہر حال تم اس کی فکر نہ کرو اور کالیا کی تلاش جاری رکھو۔“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

نیہہ میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آخر جن ڈاڈا ان لوگوں کو جواب دہ ہوگا جنہوں نے عاصم کو اغوا کیا تھا۔ ان کی طرف سے مجھے اور کالیا کو دھڑکا تو پہلے ہی لگا ہوا تھا کہ اگر اصل اغوا کنندگان نے جن ڈاڈا سے، یا جن ڈاڈا نے خود انہیں بتا دیا ہو کہ یہ ”مہم جوئی“ کن لوگوں کی ہو سکتی تھی اور ہمارے بارے میں یہ بھی وہ ہماری (میری اور کالیا کی) ”پیشی“ اپنے اڈے پر کراؤ چکا ہے تو سیٹھ ستار نے اسے ہمارے بارے میں بتا دیا ہوگا لیکن اب بھی بات وہی تھی۔ ناکامی کے بعد میں نہیں سمجھتا تھا کہ سیٹھ ستار نے اس معاملے کو پھیلائے کی کوشش کی ہوگی۔ لاڈلہ سائیں کی مدد سے بھی سیٹھ ستار نے یہ کام کروایا بھی ہوگا تو۔ معاملہ اس نے دیں ختم کر دیا ہوگا۔ اسے گینگ دار کو ہمارے پیچھے لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں جینکو نے مجھے فون کر کے بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اگر ایسا ہوتا تو کالیا سے پہلے جن ڈاڈا مجھے (جینکو کو) سے رابطہ کر کے باز پرس کرتا۔

مجھے بھی تسلی ہو گئی۔ میں لیاری گینگ وار سے دور ہی رہنا چاہتا تھا، جس کا مشورہ کالیا نے ہی نہیں بلکہ خود جینکو نے بھی مجھے دیا تھا۔

اب میرے ذہن میں سیٹھ ستار کے سوا اور کسی فرد کا نام نہیں آرہا تھا۔ یہ تصور کرتے ہی اچانک میرا دل ہولنے لگا تھا کہ اگر کالیا سیٹھ ستار کے قبضے میں ہوا تو۔ وہ مردود کالیا کے ہاتھوں اپنی ایک آنکھ ضائع کرنے کا اس سے انتقام نہ لے بیٹھے؟“

میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے ہوا گئی۔ کالیا خطرے میں تھا اور میں کالیا کے بغیر خود کو اکیلا محسوس

کرتا تھا۔ کالیا سے میرا خون سے بھی بڑھ کر رشتہ تھا۔ اس نے کئی مشکل ترین مراحل میں اپنی جان جو گھم میں ڈال کر میری مدد کی تھی اور کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ میری خاطر اس کی کئی بار اپنے استاد بھابھا سے بھی بدعزگی ہوتی رہی تھی۔ وہ میرے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

بڑا ہی عجیب رشتہ تھا میرا اور کالیا کا۔ آج اسی کی وجہ سے ہی میرے بار سوخ اور طاقت ور دشمن، اپنی ہی ذات اور اپنے ہی وجود کو اپنی ناک کا دم بنائے بیٹھے تھے۔ مجھے کالیا کی طرف سے اب سخت قسم کی تشویش دے پھینکی لائق ہو گئی۔ میں نے اس کے سارے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں پوچھا تھا، جن جن کے تیل نمبر میرے پاس تھے۔

مجی بے چارہ میری طرح زیادہ پریشان تھا۔ اس کا دوبارہ فون آگیا اور مجھ سے تازہ حالات جاننے کے بعد پُر جوش سے لہجے میں بولا۔

”نعمان بھائی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو جہاں بھی شہدہ ہو کہ کالیا وہاں مل سکتا ہے، میں آپ کے ساتھ اسی وقت جئے کے لیے تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بھی جوش سے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں۔ تم وہاں پہنچو، میں بھی اھر ہی پہنچتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر میں نے اسے سیٹھ ستار کی کوشی کا پتا بتا دیا۔ وہ اسی وقت نکل گیا۔ میں بھی بستر سے اٹھنے لگا اور چاہتا تھا کہ عاصم کو مطلع کر کے گھر سے نکلوں کہ فون آگیا۔

”ہیلو۔“ میں نے تیل فون کی اسکرین پر نمبر پچانے کی کوشش کرتے ہوئے کان سے لگا کر کہا۔ یہ کوئی لینڈ لائن نمبر تھا۔

”ہیلو۔ نعمان احمد بات کر رہے ہیں؟“ کسی نے استفسار یہ کہا۔

”جی ہاں! آپ کون؟“ میں نے دھک کھٹ کرتے دل سے جواب دیا۔

”یہ فہیم نامی ایک نوجوان شخص آپ ہی کا بھائی ہے؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا اور میرا حیرتی سے دھڑکتا دل جیسے رک گیا۔

”ہاں۔ ہاں۔ فہیم میرا ہی بھائی ہے، وہ خیریت سے تو ہے ناں۔ آپ کون ہو بھائی؟“

”میں سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے بات کر رہا ہوں۔ آپ فوراً چلے آئیے۔“ یہ کہتے ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس اطلاع پر میں دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار میرے لیوں سے اپنے جموٹے بھائی، فہیم کے لیے دعائیہ جملے برآمد ہوئے اور میرا ذہن سنسنانے لگا۔ مجھے اطلاع دینے والے پر بے حد غصہ آیا کہ اس نے مزید کچھ نہیں بتایا تھا نہ ہی مجھے کچھ پوچھنے دیا تھا کہ کچھ سلی ہوئی۔ میں عاصمہ کو ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا ورنہ وہ بے چاری پریشان ہو جاتی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے جی کو فون کر کے اسے واپس گھر چلے جانے کا کہا اور اپنی مجبوری بتائی۔

میں نے عاصمہ سے کوئی اور بہانہ کیا اور کار میں بیٹھ کر آرمی طوفان کی طرح اسے دوڑاتا ہوا سول اسپتال کے ایمرجنسی یونٹ میں پہنچا۔ استقبالیہ پر پہنچا، ایک وارڈ بوائے مجھے ایمرجنسی کے جنرل وارڈ میں لے گیا جہاں اور بھی مریض لوہے کے پائپوں والے بیڈ پر لیٹے پڑے کراہ رہے تھے، کچھ بے ہوش تھے۔ مجھے ایک بیڈ کے قریب چھوڑ کر وارڈ بوائے واپس پلٹ گیا۔ میری جھپٹلی ہوئی آنکھیں بستر پر دراز، فہیم پر جم کر رہ گئی تھیں۔ شکر تھا کہ وہ زندہ تھا۔ شاید نیم بے ہوشی طاری تھی اس پر۔ مجھے وہ بہت کمزور اور نحیف نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

اسپتال کے عملے سے میں نے پہلے ہی دریافت کر لیا تھا کہ فہیم انہیں کہاں سے ملتا تھا۔ انہوں نے یہی بتایا تھا کہ فہیم ڈھکی حالت میں پولیس کی ایک پیڑول پارٹی کو ایک ویران اور اندھیری سڑک پر ڈالنا تھا۔

”نف..... فہیم! میرے بھائی!“ میں نے کپکپاتی آواز میں اسے پکارا اور دیر سے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو وہ تھوڑا سا کراہتے ہوئے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

”فہیم! میں ہوں۔ تمہارا بھائی جان نعمان۔“
”بھسھ۔ بھائی جان!“ اس نے کراہتی سی آواز میں مجھے پکارا اور میں نے بے اختیار بھائیوں والے محبت بھرے ہذب سے سرشار ہو کے اس پر جھک کر لیٹے لیٹے سینے سے لگایا، اس کا وجود بھی فرط جذبات سے لرزاں تھا۔

”یار! تم اتنے مجھ سے ناراض ہوئے کہ گھر ہی چھوڑ کر چلے گئے، باتیں بہت سی ہیں۔ گھر چل کر ہی کریں گے۔“

”بھائی جان! ام۔ مجھے معاف کر دینا۔“ وہ کپکپاتے لہجے میں بولا۔ ”مم۔ میں نے آپ کو تھپڑ مارا تھا۔ کاش! وہ ظالم میری ناگوں کی بجائے یہ ہاتھ کاٹ لیتے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میں اس کی بات سن کر جیسے

ایک دم سکے میں آ گیا۔

”کک۔ کیا۔ ٹٹ۔ ٹانگیں؟“ میرے منہ سے نکلا اور میں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ اس کے چادر سے ڈھکے بدن اور پیٹ سے نیچے پھیرا تو وہاں مجھے ٹانگوں کی جگہ خلا کا احساس ہوا اور میں جیسے سرتاپا لرز گیا، پھر میں نے جنونیوں کے سے انداز میں اس کی چادر ٹانگوں کی طرف سے اٹھادی اور وہ منظر میرے لیے روح فرسا ثابت ہوا۔ مجھے چکر سا آ گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں۔ ٹخنوں سے تھوڑی اوپر، رانوں کے قریب سے کٹی ہوئی تھیں۔

”نہیں۔“ میں جسم و جاں بلکہ روح کی پوری طاقت سے چلا اٹھا۔ جموٹے بھائی کی یہ قابل رحم حالت دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ فہیم میرا بھائی ہی نہیں بیٹا اور دوست بھی تھا۔ ماں باپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اب میں ہی ان کی ماں بھی تھا اور باپ بھی۔ صدے کے بارے میرا جگر کٹنے لگا تھا۔ دل جیسے ٹمٹی میں کسی نے کر کے پیچھے ڈالا تھا میرا۔ درود کرب کی لہر کسی تیر کو تار کی طرح میرے وجود میں اترتی چلی گئی اور دور تک اس نے مجھے جیسے کاٹ ڈالا تھا۔ فہیم میرے سامنے زندہ حالت میں پڑا تھا مگر آدمی لاش کی صورت۔

”محب۔ بھائی جان! یہ مجھے سزا ملی ہے۔ آ۔ آپ سے بدتمیزی کرنے کی۔ آ۔ آپ کے منہ پر میں نے تھپڑ مارا تھا نا۔“

”میں اسے دشمن کے لیے بڑی سزا بنا دوں گا۔ مجھے بتاؤ۔ کک۔ کس نے تمہارے ساتھ یہ بے رحمانہ سلوک کیا ہے؟“ میں جیسے اجنبی سے لہجے میں بولا۔ جوش غیظ ایک کھولنے لاوے کی صورت میرے لب و لہجے سے مترشح تھا اور انتقام کی چنگاریاں آنکھوں سے پھوٹتی نمایاں تھیں۔

فہیم کی آنکھوں کے گوشے جھپکے ہوئے تھے۔ اس نے اب اپنے سینے اور پیٹ سے بھی تھوڑی سی چادر سر کا دی، وہ ذرا پہلو کے بل ہوا، میں آنکھیں سکیڑے اس کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر اسپتال کے لاوارث مریضوں جیسی قیغیں تھیں۔ سفید رنگ کی۔ جس کے پہلو میں ایک جیب تھی۔ فہیم نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا اور میں نے فوراً اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کی جیب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ اندر کچھ نہ تھا۔ ماسوائے ایک کاغذ کے ٹکڑے کے۔ وہی میں نے نکال لیا۔ وہ تہہ کیا ہوا تھا، میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ چند سطریں تحریر تھیں اس پر۔ جسے میں نے ایک ہی نظر گھا کر پڑھ ڈالا تھا

مکروہ بار بار پڑھتا تھا مجھے۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا ایک ٹکڑا نہیں تھا، بلکہ تیلی تھا اور جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا۔
 ”ہاں، مسٹر لیمن! ادھر سے بھائی کا تھکا کھیا گیا کہ نہیں، بہت تلاش کی تھی تاں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی تم بھینا میرے احسان مند ہو گئے کہ میں نے تمہارے بھائی کی جان نہیں لی۔“

خط پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ یہ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی۔ ٹائپ شدہ تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کاغذ کی وجہ سے اڑاڑا لوں اور سہیل سے بولا۔
 ”میرے بھائی! میں قسم کھاتا ہوں جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے، میں اس کا عبرت ناک حشر کروں گا۔ فقط مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے ساتھ کن لوگوں نے یہ ظلم ڈھایا ہے؟ اور کیا تم انہیں پہچان لو گے؟“

میری بات ادھروری رہ گئی کیونکہ اسی وقت ایک ڈاکٹر جس نے سفید گاؤں پہن کر رکھا تھا اور گلے میں اسٹیتھو اسکوپ تھا، وہاں آگیا، اس کے ہمراہ ایک سفید یونیفارم میں نرس بھی تھی جس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ وہ جیم کے واسطے لینے میں مصروف ہو گئی۔ میں نے ڈاکٹر کو سلام کیا اور اس سے جیم کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ایک نگاہ جلتے سکتے چہرے پر ڈالی اور اٹنا سوال داغ ڈالا۔

”آپ کا نام؟“

”نعمان۔“

”پھٹ کیا لگتے ہیں آپ کے؟“

”میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔“

”ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے، اُمید ہے

آپ تعاون کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔“

”جی ہاں، ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے کہا۔

”دراصل ہمارے لیے یہ تیز کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہ

ایم ایل سی (میڈیکولاجی کس) کا کیس ہے یا پھر کچھ اور۔“

کہہ کر وہ استفسار طلب نظروں سے میری جانب تنکے لگا۔ میں

نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ میڈیکولاجی کا ہی کیس ہے،

میرے بھائی کے ساتھ کچھ نامعلوم لوگوں نے ایسا بھیا تک ظلم

کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ پہلے جا کر متعلقہ تھانے میں این سی

یا ایف آئی آر کنٹرول لے آئیں اور اس کی ایک کاپی مجھے دیں

تاکہ میں سرٹیفکیٹ جاری کر سکوں جو آپ کو کورٹ میں کام

آسکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جیم کا معائنہ کرنے لگا۔

میں نے اسی وقت متعلقہ تھانے جا کر نامعلوم ملزموں

کے خلاف ایف آئی آر کنٹرول اور ایک ٹیم، بغرض نقیض کے

لیے اسپتال بھی آئی، انہوں نے جیم سے بیان لیا جسے میں بھی

غور سے سن رہا تھا۔

جیم مجھ سے ناراض ہو کے جب گھر سے نکلا تھا تو وہ

اپنے ایک دوست کے ہاں رہنے لگا تھا جو اس کا آفس کو لیگ

تو نہ تھا البتہ اس کا کوئی پرانا دوست تھا۔ اس کا نام اس نے خرم

بتایا تھا وہ عظیم پورہ میں رہتا تھا مگر جیم اس کے پاس صرف دو

دن ہی ٹھہرا تھا اور پھر اس نے اپنی الگ رہائش کا بندوبست

ایک اسٹوڈیو فلیٹ کرائے پر لے کر کر لیا تھا۔ وہیں اسے کچھ

نامعلوم لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں پٹی

باندھ کر لے گئے تھے۔ نجابہ وہ کون سی جگہ تھی اور کس کی

جہاں مجھے چند روز قید میں رکھا گیا، کھانے پینے کو کبھی پوری

طرح نہیں دیا کرتے تھے۔

وہاں میں نے چار افراد کو بھی دیکھا تھا۔ وہ مجھ پر وقتے

وقتے سے تشدد بھی کیا کرتے تھے۔ ابتداء میں یہی سمجھا تھا میں

کہ یہ مجھے کسی خاص مقصد کے لیے ہراساں کرنا چاہ رہے

ہیں۔ پھر ایک روز ان میں سے ایک نے جو فون پر اپنے کی

”چیف باس“ سے رابطے میں رہا کرتا تھا۔ اس نے فون

میرے کان سے لگا کر میری اپنے چیف باس سے بات

کروائی۔ بہت ہی سنگ دل اور بھیڑیے جیسی آواز تھی وہ۔ مجھ

سے یہی کہا گیا کہ تمہارے بھائی نعمان عرف نومی کو ہم نے ہر

طرح سے باز رکھنے کی کوشش چاہی مگر اس نے ہماری نہیں

سنی۔ اب مجبوراً اسے (مجھے) سبق سکھانے کے لیے ایسا کرنا پڑ

رہا ہے۔ نجابہ وہ میرے اوپر اب کون سا عذاب توڑنا چاہتے

تھے۔ تاہم میں خوش اور مطمئن تو تھا کہ یہ لوگ مجھے آزاد کرنے

والے تھے مگر کیا پتا تھا مجھے کہ اس ”آزادی“ کی مجھے کیا قیمت

چکانی پڑنی۔

ایک عجیب سی خود کار مشین جس کا وہ عجیب سا ہی نام

لے رہے تھے۔ شاید ”گلوٹین“ اس میں میری دونوں ٹانگیں

گھٹنوں سے اوپر رانوں تک پھنسا دیں اور پھر ایک بھرا کر

کر کاٹ دیں، میں درد و اذیت کے مارے بے ہوش ہو گیا اور

شاید کئی دن اسی طرح غڑغلا حالت میں رہا، کئی ہوئی جگہ پر

ٹانگے لگادئے گئے تھے اور کوئی دوا وغیرہ بھی پینے کو دیتے رہے

تھے، اس کے بعد وہ مجھے رات کے اس پہر کسی سڑک پر

بھکاریوں کی طرح پھینک کر چلے گئے۔“

نبیم نے اپنا دردناک بیان قلم بند کر دیا۔ تفتیشی افسر نے مجھ سے بھی سوالات کیے، میں نے بھی اسے صاف صاف بتا دیا کہ معاملہ کیا تھا۔ تفتیشی افسر جس کا نام انسپٹر شہزاد تھا، بھلا مانس آدی تھا۔ اس نے مجھے اپنے ایک مشورے سے بھی نوازا کہ میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ سے اس کیس (رفع ت خانم مرڈر کیس) کو ری اوپن کرنے کے لیے ”سوموٹو ایکشن“ لینے کی درخواست کروں، وغیرہ۔

جب صبح کی سفیدی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی تو میں نبیم کو اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر گھر لے آیا۔ میں نے کسی طرح ایک خود کار وہیل چیئر کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی حالت زار مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عاصم بے چاری پر کیا بیتے گی جب وہ نبیم کو اس حالت زار میں دیکھے گی۔

میں گھر پہنچا۔ وہیل چیئر نیچے اتاری اس کے بعد نبیم کو سہارا دے کر اس پر بٹھایا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ دل تھا کہ جیسے ابھی تک کسی نے مجھی میں لے رکھا تھا۔ خود نبیم کی آنکھیں ستورم ہو رہی تھیں۔ صبح کا ذب کا ہی وقت تھا اسی لیے لوگ باگ وہاں کم ہی موجود تھے، جو تھے وہ دور قریب میں تھے۔ کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا ورنہ خیر خیریت پوچھنے کو ضرور لپکتے۔ میں نے دروازے کی کال تیل بجا دی۔ عاصم نے ہی دروازہ کھولا اور میں اس کے چہرے پر حیرت اور سکتے کی سی کیفیات کو اٹھاتے ہوئے دیکھا، وہیل چیئر کو دھکیلتا اندر لے آیا۔

”بھیا۔ ی۔ ی۔ یہ کیا۔ ہوا، آپ کو“ عاصم جیسے جی جان سے چلا اٹھی۔ نبیم کی معنوم سی نظریں عاصم پر جمی ہوئی تھیں جبکہ عاصم نے جیسے اپنا گلجہ تھامے رکھا تھا۔

”بھم۔ بھائی جان! آپ ہی بتائیے۔ ی۔ ی۔ نبیم بھیا کو کیا ہوا ہے آخر؟ یہ وہیل چیئر پر کیوں ہیں؟“

”حوصلہ رکھو بھنا! خدا کے لیے خود کو سنبھالے رکھو۔“

میں نے کہا اور پلٹ کر عقب میں اپنے دروازہ بند کر دیا۔ عاصم نے اپنا سر تھام لیا تھا، شاید ابھی تک اس پر یہ کریہہ انگیز حقیقت آشکارا نہ ہوئی تھی۔ نبیم کو عالم درد مندوں نے ہمیشہ کے لیے ناکس کاٹ کر معذور کر دیا ہے۔

”بھائی جان! بھنا کو سنبھالیے پلزز۔“ اچانک نبیم نے مجھے رزنی آواز میں پکارا۔ میں نے عاصم کی طرف دیکھا، وہ ہنوز پٹی پٹی آنکھوں سے کبھی نبیم کو اور کبھی سوالیہ لگا ہوں سے میری جانب دیکھتے گئے۔

میں کیا بتاتا اسے؟ میرا اپنا آپ اندر سے تہہ وہلا ہو رہا تھا، تب ہی شاید عاصم نے میری پچھنی پچھنی خاموشی اور لرزے ہونٹوں کا مفہوم اپنے تئیں کچھ یوں لیا کہ بے اختیار وہ آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل نبیم کے ساتھ آگئی۔ وہ اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر رونا چاہتی شاید کہ اچانک ہی وہ چونگی، اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر نبیم کی ٹانگوں والی جگہ کو چھوتے ہوئے اندر کی جانب خلاء میں دھنس گئے اور اگلے ہی لمحے عاصم نے ایک چیخ مار کر نبیم کی گود میں دھری چادر کھینچی لی اور وہ اودھ کٹی ”ٹھڈی“ رانیں گوشت کے ٹکڑوں کی طرح جھول رہی تھیں۔ وہ ایک دم دہشت زدہ سی ہو گئی۔ چہرے پر دکھ اور کرب کے ساتھ ہر اس بھی پھیل گیا۔

”نن۔ نن۔ نہیں، نہیں، ی۔ ی۔ ی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ م۔ میرے بھائی نا نہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ پانی تھی کہ بارے صدے کے غش کھا کر وہیں صحن کے فرش پر لڑھک گئی۔ تب ہی مجھے ہوش آیا اور میں نے عاصم کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ اسے پکارنے لگا۔ ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اسے پانی پلاؤ بھائی جان!“ نبیم نے دکھ و کرب سے آتش لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں عاصم کو سنبھالے ہوئے صحن میں ہی ایک چمچی چار پانی کے پاس لے آیا اور لٹا دیا، پھر بھاک بھاگ اندر سے پانی کا گلاس بھرا لیا، ٹھنڈے پانی کے چند چمچینے اس کے چہرے پر مارے، اس کے گال زور زور سے تھپتھپاتے اسے پکارا اس کے بعد گلاس اس کے لرزے لیوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ سے زیادہ باہر کو بہ گیا۔ اس نے بہر حال آنکھیں کھول دیں۔

”حوصلہ کرو۔ عاصم! کیا ہو گیا تھا نہیں؟ کہا تھا میں نے کہ خدا کے لیے خود کو سنبھالنا۔“ میں نے صدے سے چور لہجے میں اس سے کہا۔ ایک غبار سا تھا جو بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔

”نبیم بھیا کو کیا ہو گیا۔ بھائی جان؟“ وہ پچھنی پچھنی آواز میں بولی اور رو پڑی۔ اس میں دوبارہ ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ پلٹ کر چار پانی سے اٹھ کر دوبارہ نبیم کی طرف دیکھتی۔

میں اس کے قریب ہی چار پانی پر بیٹھ گیا۔ دو لمحہ بعد نبیم بھی اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا چار پانی کے قریب آ گیا۔ ہم تینوں بہن بھائی، دکھ سکھ کے سماجی ایک دوسرے کے ساتھ لگے روتے چلے گئے۔ ایسی دردناک گھڑیوں میں مجھے وہ

وحشت ناک منظر یاد آگیا تھا جب اما کو بے گناہ بھائی لگی تھی اور صبح ان کی لاش بھائی گھاٹ سے گھرا لائی گئی تھی جبکہ ایک لاش اماں جان کی صورت میں پہلے ہی گھر پر رکھی تھی۔ اس وقت بھی ہم تینوں نصیبیوں جملے بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر روئے تھے۔ غم و اندوہ کے منظر کیوں تازہ ہونے لگتے ہیں؟ یہ ختم کیوں نہیں ہو جاتے ہمیشہ کے لیے؟ کیا تقدیر کو ان کا اعادہ کرنا ضروری ہوتا ہے؟ تو پھر۔ تو پھر خوشیوں کا منظر دوبارہ کیوں نہیں لوٹتا؟ اور تب ہی بے اختیار مجھے اپنے اس خیال پر زنجی سی ہنسی آگئی۔ بھلا ہم کم نصیبوں کی زندگیوں میں خوشیاں آئی ہی کب تھیں؟

کچھ دیر بعد غم و اندوہ کا غبار چھٹا تو فہیم کو ہم اندر کمرے میں لے آئے۔ عاصمہ اور میں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

”بھائی جان! آپ لوگ باتیں کریں۔ میں تب تک ناشتا بنا لیتی ہوں۔“ عاصمہ نے کہا تو میں فوراً بولا۔

”نہیں بہنا! آج تم ناشتا نہیں بناؤ گی۔ آج فہیم کی اتنے دنوں بعد واپسی کی خوشی میں باہر سے ناشتا لے آتا ہوں۔ آج حلو اپوری کا ناشتا کریں گے۔“

ایسا میں نے محض غم کی فضاء کو کم کرنے کے لیے ہی کہا تھا ورنہ کچھ کھانے پینے کو کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تقدیر نے ہمیں خوشی دی تھی تو اعداد کر کے۔ چھوٹے بھائی کی یہ قاپلی رحم حالت نے مجھ سے دیکھی جاتی تھی نہ ہی عاصمہ سے۔

میں نے دیکھا عاصمہ ایک دم سر ہٹ جاتا کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں نے بستر پر دروازہ فہیم کی طرف لڑتی مسکراہٹ سے دیکھا اور وہاں سے دوسرے کمرے میں آگیا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہاں عاصمہ ایک طرف کونے میں کھڑی دوپٹا چہرے پر کیے سک رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور بولا۔

”بہنا! میں جانتا ہوں، اس وقت کھانے کی ہر شے ہمیں زہر لگنے کی لگن۔“

”میں سمجھ گئی ہوں بھائی جان!“ عاصمہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ حلو اپوری لے آئیں۔ میں تب تک چائے بنا لیتی ہوں۔“

”نہیں، چائے بھی میں باہر سے ہی پارسل کروا کے لے آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم بس فہیم کے پاس جا کے بیٹھو، اس سے باتیں کرو، دیکھو، اس کے سامنے اب رونا بالکل مت، جو ہو چکا وہ تو ہو چکا، سمجھ رہی ہوتاں۔ پیاری بہنا!“

”جی جی بھائی جان! سمجھ گئی۔“ اس نے اپنا انکب آلودہ چہرہ دوپٹے سے پونچھا اور ہولے سے مسکرائی۔

”شباباش! میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور گھر سے باہر آگیا۔ میرا دل و دماغ بری طرح سنسنار تھا۔ اس ”پردہ نشین“ نے اپنی درندگی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ جانتا تھا میں یہ کہ ایسا میرا ”زفت خانہ مرڈر کیس“ میں کامیاب پیش رفت سے ہوا ہے اور تب ہی میرے سوچتے ذہن میں۔ اس روز رانا بشیر کے ساتھ میری ہونے والی تلخ کلامی اور بد مزگی یاد آنے لگی۔ اس نے مجھے وہ دونوں ڈائریاں دینے سے صاف انکار کر دیا تھا جبکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم اصل قاتل تک پہنچنے والے تھے اصولاً تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا اور مجھ پر اور ایڈووکیٹ زنیہ پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ دونوں ڈائریاں ہمارے حوالے کر دینی چاہیے تھیں لیکن اس کے برعکس وہ ایک دم پھڑک اٹھا تھا۔

میں حلو اپوری کی کان پر پہنچا۔ اس کے بعد پیسے دے کر واپس لوٹا تو گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکا ہی تھا کہ میرے کانوں سے موز سائیکل کی آواز گھرائی جو بہت قریب سے ابھری تھی، میں پلٹا اور دیکھا، دو دبلے پٹکے اور سیاہ رنگت کے اشخاص الگ الگ بانیکس پر سوار تھے۔ وہ میری طرف ہی گھور رہے تھے۔ مجھے ایسا ایسی کئی خطرے کا احساس ہوا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اجاگت ہی میں چونکا، میں ان میں سے ایک کو پہچان چکا تھا۔ مجھے فوراً یاد آگیا تھا کہ میں اس لڑکے کو کچھ دن پہلے ججن ڈاڈا کے اڈے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرا ابھی میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

بانیکس کو سائینڈ اسٹینڈ میں کھڑا کر کے وہ دونوں میری طرف بڑھے اور اسی نے ہی پہلے مجھ سے سر دلچے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا، جسے میں پہچان رہا تھا۔

”تم نعمان احمد ہی ہوتاں۔ اس روز ججن ڈاڈا لے تمہیں اور تمہارے ساتھی شیراز کو بلوایا تھا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ خیریت؟“ میں نے اپنے دل کی عزت دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ججن ڈاڈا نے دوبارہ بلوایا ہے۔“ اس ماہ دوسرے نے میری جانب گھورنے کے انداز میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے بھی جواب میں اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ وہی چل کر بتائیں گے۔“ پہلے والے نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے

معاملہ نہیں سے کہا۔ ”میں اپنے دوست شیراز (کالیا) کے ساتھ کسی وقت آ جاؤں گا۔“

شیراز نے اس وقت جن دن ڈاکو اپنا یہی نام بتایا تھا۔
”شیراز کو چھوڑ دو، تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“
پہلے والے نے کہا تو میں رکھائی سے بولا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔ میں یہ ناشتا اندر دے کر آتا ہوں۔
پھر تم لوگوں سے بات کرتا ہوں۔“ دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

جن دن ڈاکو کے آدمیوں کی اچانک اس طرح اور وہ بھی میرے گھر آمد نے مجھے ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔
لہانے کیا بات ہوئی تھی جو اس طرح مجھے دوڑ کے بیچ کر جن دن ڈاکو نے بلوایا تھا؟ خدشہ تو تھا کہ کہیں ہمارا اس روز کی مہم جوئی والا بھارت نہ چھوٹ جائے، جب میں عاصمہ کو بجو کے ٹھکانے سے بازیا ب کروا کے لایا تھا۔

”بہنا! تم فہیم کے ساتھ جا کر ناشتا کرو، میرے باہر کچھ دوست آئے ہیں، میں ان سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔“
میں نے عاصمہ کو چیزیں تھماتے ہوئے کہا اور دوبارہ باہر آیا۔
عقب میں گھر کا دروازہ بند کیا اور ان سے حتیٰ لچھے میں بولا۔
”دیکھو۔ میں پہلے بھی اکیلا نہیں آیا تھا۔ شیراز میرا دوست میرے ساتھ تھا، میں اب بھی اس کے ساتھ ہی آؤں۔“

میرے مسکت جواب پر وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ ملنے لگے۔ پھر پہلے والے نے مجھ سے کہا۔ ”شیراز وہاں موجود ہے۔ اب تم چلو۔“

میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔ کالیا تو تقریباً چلے چوٹیں کھٹنے سے غائب تھا۔ تو کیا ان لوگوں نے اسے اٹھایا ہوا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر۔ یہ مجھے یوں ”شریفانہ“ انداز میں کس طرح لینے کے لیے گھر پر پہنچ گئے تھے؟ یہ بات اچھنبے کی گئی۔ تاہم میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز لیا تھا۔

”شیراز تمہارے پاس ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ میرے بغیر وہاں کیسے جا پہنچا؟“

”وہ وہاں پہنچا نہیں تھا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اسے وہاں سے پر پہنچایا گیا ہے اور اب تمہیں بھی اسی طرح وہاں پہنچا ہوگا۔“ یہ کہتے ہی دونوں نے اپنے نیفوں میں ہاتھ ڈال رکھے۔
”کالا تو میرے پورے وجود میں لاتعداد چوہنیاں سی گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے پتول

نظر آ رہے تھے۔

”اب زیادہ اڑی بازی کی تو ادھر ہی گولی مار دی جائے گی۔ چلو۔“ پہلے والے نے خنخار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور میری پیشانی پر سٹلوں میں ٹکرائیں۔ وجود سنسانے لگا۔
جانا بھی مصیبت تھا اور نہ جانا بھی۔

”اب ہم گولی چلا دیں گے اور کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پاسکے گا۔ ادھر تمہارے ساتھی کا بھی یہی حشر ہوگا۔ بہتری اسی میں ہے کہ ساتھ چلے چلو ہمارے؟“ پہلے والے نے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کالیا ان کے نرے میں تھا کیوں؟ اس کا جواب آسان بھی تھا اور آسان سمجھنا بھی۔ اگر جن دن ڈاکو ہم پر کسی بات کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ اب تک شبہ ہی ہوگا، کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہو سکتا تھا۔ مناسب تھا کہ ان کے ساتھ جا کر حالات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی مگر بات وہی تھی کہ جانیں ہم دونوں کی خطرے میں تھیں۔

میں ایک کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے اپنی بائیک ہمارے پیچھے لگا رکھی تھی اور دروائی کے وقت مجھے یہ دھمکی بھی دے دی گئی تھی کہ اگر میں نے راستے میں کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو وہ مجھے بے دریغ گولی مار دیں گے۔

آدھے پونے کھٹے بعد ہم لیاری پہنچ گئے۔ وہاں سے سیدھا ہمیں جن دن ڈاکو کے اڈے پر پہنچا دیا گیا۔ سچی بات تھی کہ میں اندر سے بری طرح ڈرا ہوا تھا مگر دل میں تسلی بھی تھی کہ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ہمارے ساتھ اسی وقت ہو جاتا جب کالیا بھی میرے ساتھ تھا اور ہم جن دن ڈاکو کے درویش ہوئے تھے لیکن ان کا جارحانہ انداز مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو جن دن ڈاکو میری ہی منتظر تھا مگر میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں جینکو بھی موجود تھا اور کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی میری طرح زبردستی وہاں لایا گیا ہو۔ تاہم مجھے یاد تھا کہ رات کے کسی پہر جب کالیا کی تلاش کے سلسلے میں میری جینکو سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جن دن ڈاکو نے اسے بلوایا تھا۔

وہ دونوں کرسیوں پر براجمان تھے۔ یاد رہے کہ جینکو وہی آدمی تھا جس نے ہماری عاصمہ کی بازیابی کے سلسلے میں مدد کی تھی۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا مگر دل اب بھی ایک تشویش آمیز سی بے چینی کا شکار تھا۔ حسب سابق وہاں چند مسکراتے افراد بھی موجود تھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے ہاری ہاری ہاتھ ملایا۔ مصافحہ کرنے کے دوران میں نے جن دن ڈاکو کے

چہرے کے تاثرات بھی بھاڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بشرے پر کھیرتا طاری تھی۔ اس نے مجھے سامنے دلی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ایک گال پھولا ہوا تھا اور وہ گنگا چار ہا تھا۔

”تم نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟“ میرے کرسی پر بیٹھے ہی جن ڈاڈا نے اسی کھیرتا سے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ میں اس کی بات پر تھوڑا چونکا تھا۔ اس کے سوال پوچھنے کا انداز اور لہجے کا دبہہ بتاتا تھا کہ اسے بالآخر اپنے بادوق ذرائع سے حقیقت کا علم ہو چکا تھا جبکہ جینکو وہاں موجودگی بھی یہی بتاتی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کی طرف دیکھ کر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”کیسا جھوٹ سائیں؟ میں سمجھا نہیں؟“

”نعمان! مسئلہ یہاں کچھ اور ہو گیا ہے۔“ اس ہارجن ڈاڈا کی بجائے جینکو نے میری طرف دیکھ کر غیجیگی سے کہا اور میں ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”نیا مسئلہ کیا ہو سکتا تھا؟“ میرے ڈولیدہ ذہن میں ابھرا۔ وہ آگے بولنے لگا۔

”میں نے جن ڈاڈا کو ساری حقیقت خود ہی بتادی ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے جو پوچھا جائے اس کا جواب دیجے جاؤ۔“

”شیر اذکھر ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”پہلے میرے سوالات کا جواب دو نعمان!“ جن ڈاڈا نے میری طرف دیکھ کر تیز سے لہجے میں کہا۔

”پوچھو۔“ میں نے بھی اسی کی طرف دیکھا۔

”حقیقت حال اپنے منہ سے بتا دو تا کہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ تم کتنے سچے ہو۔“ جن ڈاڈا میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ڈاڈا! سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر سن لو کہ میں ایک شریف اور عزت دار گھرانے کا فرد ہوں، میں نے آپ سے

مصلحت جھوٹ بولا تھا کہ ہم عورتوں کے پیلاڑز ہیں۔ درحقیقت میری جوان بہن عاصمہ کو میرے ایک دشمن سینٹھ ستار نے کسی جوتائی آدمی کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ لیاری میں ہی جو کے مکان میں ریغمال بنا کر رکھی ہے۔ میرے دوست شیراز عرف کالیا نے میری مدد کی تھی اور ہماری جینکو بھائی نے۔“ آخری جملہ میں نے جن ڈاڈا کے قریب بیٹھے جینکو کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا جینکو کے چہرے پر اب ایک عجیب طرح کا اطمینان عود کر آیا تھا، جسے میرے سب کچھ بتا دینے پر اس نے بھی سکھ کا سانس لیا ہو کر

کیوں؟ میرے اٹھے ہوئے ذہن میں سوال ابھرا تھا۔ میری بات پر جن ڈاڈا نے ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینکو پر ڈالی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جہاں تم لوگوں نے کارروائی کی تھی، وہ میرا پاڑہ تھا اور جو میرا خاص آدمی۔ اس کارروائی میں ہمارا ایک پرویز نامی آدمی تم میں سے کسی ایک کی گولی کا نشانہ بھی بنا تھا۔“ وہ اتنا بتا کر ٹھہرا اور مجھے یاد تھا کہ وہ میری ہی گولی کا نشانہ بنا تھا جب میں مطلوبہ مکان کے قریب جینکو کے ایک ساتھی کے ساتھ گھات لگائے بیٹھا تھا تو جو کے ایک ساتھی نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور میں نے اسی کے پتھوں سے اس پر گولی چلا دی تھی، بعد میں جو بھی میری چلائی ہوئی گولی سے گھائل ہوا تھا جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

میں خاموشی سے جن ڈاڈا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے کسی خاص ”کر مارگری“ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جس پر اندر سے میں خود بھی تھیرتا تھا۔ یہ میری خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ میں بہر حال جن ڈاڈا کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

”تمہارے اسی آدمی کی چلائی ہوئی گولی سے بعد میں جو بھی زخمی ہوا تھا، اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن جس کے پہلو میں گولی لگی تھی، وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ تم لوگوں نے مجھ سے کسی قسم کا مشورہ کیے بغیر میرے پاڑے میں۔ اتنی بڑی کارروائی کس طرح کر ڈالی تھی؟ کیا سمجھتے تھے کہ مجھے حقیقت کا پتا نہیں چلا گا؟“

میں نے دیکھا جن ڈاڈا کا لہجہ لہجہ بہ لہجہ گرم ہوتا جا رہا تھا مگر اب بھی اس میں اہل کی وہ کیفیات نہیں تھیں، جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ معاملہ ہنوز درمیان کا کچھ اور ہی تھا۔ لہذا میں نے بھی ماحول اور حالات کو محسوس کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا اور کہا۔

”ڈاڈا! سائیں! ایک شریف اور غیرت مند بھائی جس کی جوان اور کنواری بہن اغوا کر لی گئی ہو اس کے دماغ میں ایک ہی دھن سوار ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح سے اپنی بہن کو اغوا کاروں سے چھڑا کر ہی دم لے لو اس کا دماغ اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔ میری اس بات کا احساس وہی کر سکتا ہے جس کی اپنی بھی بہن ہو لیکن جن ڈاڈا! آپ کی بات بھی غلط نہیں ہے۔ آپ سے اپنے دل کی بات کہوں گا ڈاڈا! سائیں! ابھی تو تھوڑی دیر پہلے آپ نے یہ کہا کہ ہمیں اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا تو اس وقت بھی میرے دل میں یہ بات آئی تھی جب

ہمیں یہ پتا چلا تھا کہ مجھ نے یہ حرکت کی ہے اور وہ آپ کا آدمی ہے تو یقیناً آپ ایک بہن کے لیے ایک بھائی کے جذبات کا احساس ضرور کرتے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا مجھ نے یہ گھٹیا حرکت میرے دشمن کے کہنے پر کی ہوگی آپ کے کہنے پر نہیں۔“

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور اپنی معاملہ بندی اور زیرک و دماغی کی نفسیاتی چوٹ کا اثر جن ڈاڈا کے چہرے سے مترشح ہوتے دیکھتا رہا۔

درحقیقت درمیان کے حالات اور جینکو کا وہاں دوستانہ انداز میں موجود ہونا، اشارہ کر رہا تھا کہ کم از کم جن ڈاڈا کے علم میں لائے بغیر یہ مردود مجھ سے سیٹھ ستار کے کہنے پر میری بہن کو اغوا کرنے کی گری ہوئی حرکت کی تھی۔

جن ڈاڈا کے چہرے کا بڑھتے ہوئے تناؤ کا گراف تیزی سے گرنے لگا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے اپنے منہ سے لٹکا تھوکا اور پھر سانسے نرمی ٹیڈی پاپوں والی چھوٹی سی میز پر سے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی، کلی کی اس کے بعد اپنے کرتے کی سائٹھ پاٹ سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ساتھ ہی ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ چھاکا اور جن ڈاڈا نے اس کے کان میں کچھ کہا، پھر خود پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبا لی۔

”بچے ہو؟“ اس نے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا نہیں میں نے شکریہ کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ لائٹ سے سگریٹ سلگانے لگا اور ایک گہرا کش لے کر کچھ سوچنے لگا۔ میں نے جینکو کی طرف ذریعہ سی نظروں سے دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہی آدمی میرے لیے ایک چائے کا ایک بڑا سا گم اٹھالایا اور میرے سامنے ٹیڈی ٹانگوں والی میز پر رکھ کے اپنی سابقہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

”چائے پیو۔“ جن ڈاڈا نے سگریٹ والے ہاتھ سے ٹیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی ایک ٹانگ نیچے تھی اور ایک میز کے کونے پر تکی ہوئی تھی۔ میں نے بھی آج اس کا بخور جائزہ لیا تھا جیسا کہ میں پہلے سرسری طور پر اس کے چلے کے بارے میں بتا چکا ہوں، جن ڈاڈا میری ہی طرح کا ایک لمبا تر ٹانگا مگر چھریے جسم کا نو جوان سا لڑکا تھا رنگت گندی تھی۔ ہونٹوں پر کھٹی مونچھیں تھیں۔ چہرہ البتہ کچھ لیوٹا اور آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ سر کے بال چھوٹے اور ”سیج کرٹ“ تھے۔

میں گم اٹھا کے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”مجھے تمہارے بارے میں سب علم ہو چکا ہے۔“ اس نے گولڈلیف کے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے باپ کو یہ لگنا چاہی کہ چڑھا دیا گیا تھا۔ سیٹھ ستار سے تمہاری دشمنی اور مجھی بہت کچھ۔ لیکن تم مجھے نہیں جانتے شاید کہ میں ایسے لوگوں کو کبھی معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں، ہمارے اپنے جھگڑے اپنی جگہ ہیں لیکن باہر کا کوئی آدمی ہمارے علاقے یا پاڑے میں آکر اس طرح کی کارروائی کرے اور وہ بھی ہمارے ہی حلیف کی مدد سے یہ تو بالکل بھی ہم کو ارا نہیں کرتے مگر تمہاری جی داری بھی ہمیں پسند آئی کہ جب بھی ہم نے تمہیں بلا یا تم بلا خوف چلے آئے اور آج والی ملاقات میں بچ بول کر ہمارا بھی دل جیت لیا۔ اصل میں یہاں معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رکھا۔ سگریٹ کا کش لیا۔

میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بولا۔

”میرے اپنے بھی علم میں یہ بات نہ تھی کہ ہمارے آدمی مجھ نے اپنے دوستوں پر ویز اور لالی کی مدد سے کسی شریف لڑکی کو اغوا کر کے ہمارے ہی پاڑے میں یرغمال بنا رکھا ہے کیونکہ میں ایسی حرکت کو خود بھی سخت ناپسند کرتا ہوں۔ بات کھلی تو مجھے پتا چلا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ افسوس کہ مجھ سے ہمارا رشتہ صرف ساہمی کانٹیں ہے ورنہ میں خود اسے اس حرکت پر گولی مار دیتا۔ وہ میرا قریبی رشتہ دار بھی ہے اور ہمارا لاڈلہ بچہ۔“

سیٹھ ستار نے اس سے ہماری معاذے کے عوض تمہاری بہن کو اغوا کرنے کا کام لیا تھا، جس کی پوری محنت وہ مجھ کو کر چکا تھا۔ جب شکار ہاتھ سے نکل گیا تو جو اس بات کا پابند تھا کہ اب وہ سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹا دے مگر یہ مجھ کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ سیٹھ ستار بھی چھوٹے والا نہیں تھا۔ ایسا آدمی جو کام سے پہلے پیسے دینا جانتا ہے تو ناکامی کی صورت میں اپنے پورے پیسے واپس لینا بھی جانتا ہے۔ مجھ نے سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹانے سے صاف انکار کر دیا، جس کے جواب میں سیٹھ ستار نے مجھ کی ایک دھمکی رگ پر پاؤں رکھ دیا، جس کا تعلق ہم سے بھی بنتا تھا لیکن مجھ نے ابھی تک مجھ سے یہ سب چھپا رکھا تھا۔ جو سیٹھ ستار کے سامنے جھک گیا اور یہ بھی کھڑا لکڑا کہ وہ روئے تو خرچ کر بیٹھا ہے اگر وہ کوئی اور اس سے کام لینا چاہے تو وہ گر سکتا ہے، سیٹھ ستار جیسوں کو روپوں کی نہیں اپنے کام اور اپنی تسکین کی فکر ہوتی ہے، لہذا مجھ کے جھک جانے سے۔ سیٹھ ستار نے اسے بتایا کہ وہ کالیا کو اغوا کر کے اس کے پاس پہنچا

دے تو حساب برابر ہو جائے گا۔ کیونکہ سینہ ستار کو پتا تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ مجھ نے اس کام کی حامی تو بھری لیکن کالیا کو وہ جس طرح تر نوالہ سمجھا تھا ویسا وہ نہیں نکلا۔ نتیجے میں مجھ، کالیا کے ہاتھوں مارا گیا۔

جن ڈاڈا اتنا بتا کر خاموش ہوا اور اس کے آخری انکشاف پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک بار پھر پریشانی اور تشویش کے سائے مجھ پر حاوی ہونے لگے تھے اور کالیا کی طرف سے فکرو پریشانی سواہونے لگی۔ نجانے اب یہ گینگ وار لیڈر اس پاداش میں کالیا کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا کیونکہ مجھے یہاں لانے والوں نے اشارہ دیا تھا کہ کالیا اسی کی گرفت میں تھا۔

”مجھ کو مرنے کے بعد لالی اور پرویز نے مجھے اصل بات سے آگاہ کر ڈالا۔ مجھ کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں خود اطمیناناً کالیا سے مجھ کو قتل کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں اتر ا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی مشکلوں سے اسے قابو کر کے ہم اڈے پر پہنچے۔ اس سارے معاملے میں چوں کہ مجھے جینکو سے بھی شکایت تھی لہذا اسے یہاں بلایا، کیونکہ کالیا اس کا بھی بار ہے۔ میں پریشان تھا اور انتقام کی آگ میں جل بھی رہا تھا لیکن بعد میں جینکو کے ساتھ بیٹھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ معاملے کی تہہ نیک پہنچا تو مجھے اس میں سارا قصور اپنے ہی ساتھی مجھ کا محسوس ہوا کیونکہ پرویز اور لالی نے ڈر کے مارے مجھے اصل معاملے سے ہٹ کر حقیقت بتائی تھی جس سے میں آگ بگولا ہو گیا تھا۔“

”تو کالیا تمہاری قید میں ہے۔ ڈاڈا سائیں؟“ مجھ سے مبر نہ ہو سکا اور فوراً جن ڈاڈا سے پوچھ لیا۔

”ہاں۔“ اس کی بات پر میں نے اندر ہی اندر سکون کی ایک گہری سانس لی تھی۔ پھر بھی مزید تسلی کی خاطر اس سے دوبار متسفن ہوا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہے وہ۔“ اس نے جواب دیا۔

جن ڈاڈا ایک بڑے گینگ وار کالیڈر ہونے کے باوجود مجھے سمجھدار اور سلجھا ہوا آدمی محسوس ہوا تھا ورنہ جیسی شہرت میں نے اس طرح کے لیڈری گینگ وار لیڈر ان کے بارے میں سنی تھی کہ ان کی خطرناکی کے لیے اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ عام لوگ باگ ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ کوئی ان سے زبردستی جھڑمی جاتا تھا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ لوگ صرف اپنے

دشمنوں کے لیے ہی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ عام لوگوں سے ان کی کوئی لڑائی یا جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ دو، دو، ٹھن تین گروہ آپس میں دوست بن کر بھی اپنے مخالف گروہ پر ہلہ بولتے تھے اور اکثر ایک دوسرے کے بھی جانی دشمن بن جاتے تھے جس سے انتقام لینا ہوتا تھا تو اس کا قریب پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ پھر چاہے خود ہی کیوں نہ مر جائیں، پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ یہی ساری حقیقتیں کالیا کو بھی معلوم تھیں۔ غرضیکہ یہ مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے تھے مگر مجھے جن ڈاڈا ان میں کچھ مختلف لگا تھا۔

بہر کیف وہ ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینکو کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بولا۔

”میں نے کالیا کو اڑا دیا میں دے دے کر ہلاک کرنا تھا۔ اپنے دشمنوں کا ہم ایسا ہی حشر کرتے ہیں لیکن ساری حقیقت جان لینے اور جینکو سے ملنے کے بعد ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا لیکن مجھ کو لواتھن نے مجھ سے قصاص (خون بہا) کا تقاضا کیا تو میں نے یہی بات جینکو کے سامنے رکھ دی۔ جینکو نے مجھ سے یہی کہا کہ تمہیں ہلا کر بات کی جائے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور جینکو کی طرف دوبارہ ایک نظر ڈالی تو جینکو نے اس بار شاید اس کا کوئی اشارہ بھانپ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”دیکھو نعمان! میں تمہیں صرف اپنے یا کالیا کے حوالے سے جانتا تھا۔ میرا براہ راست تم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ شکر کرو کہ جن ڈاڈا ایک سمجھدار آدمی ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد یہ اس کی مہربانی اور کم احسان ہے کہ اس نے مجھ سمیت تمہیں اور کالیا کو بھی معاف کر دیا ہے مگر کالیا کے سلسلے میں معاملہ اس کے ہاتھ میں نہیں رہا ہے۔ اب میری بات ذرا غور سے سنو کیونکہ فیصلہ تمہارے ہی ہاتھ میں ہو گا اب۔“

وہ اتنا کہہ کر رکا اور پھر کہنا شروع ہوا۔ میری بہ غور نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”دیکھو نعمان! قصداً وہ ہی ختم ہو رہا ہے۔ مجھ کی حیثیت جن ڈاڈا کے گروہ میں ایک وفادار ساتھی سے بھی بڑھ کر کچھ اور تھی۔ وہ اس کا قریبی رشتہ دار بھی لگتا تھا۔ اسی خاندان کے چند لوگ دوسرے گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں جن کا شمار نہ دوستوں میں ہوتا ہے نہ ہی دشمنوں میں۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟“

”ہاں ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔ کہتے رہو۔“ میں نے اس کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ لوگ بدلے کے طور پر کالیا کو ہلاک کرنے کے

آریوں کی آمد

تاریخ انسانی میں ”آریہ“ سے مراد کاشت کاروں کی وہ قوم ہے جو حضرت یحییٰ کی ولادت سے ڈھائی ہزار سال پہلے وسط ایشیا کی چراگاہوں سے نکلی اور یورپ، ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان میں وارد ہوئی۔ ان کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک نے یورپ کا رخ کیا اور دوسری ایران کی طرف آئی۔ یورپ کی طرف جانے والے آریہ قبائل کو ہند یورپی اور ایران کی طرف آنے والوں کو ہند آریہ کہا گیا۔

آریہ کی جو شاخ ایران میں آکر آباد ہوئی، وہ تاریخ میں میڈی کہلاتے ہیں۔ ان کے جانشینوں نے مشہور ہخامنشی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سائرس اعظم کی تخت نشینی (559 ق م) سے لے کر اسکندر اعظم (331 ق م) کی لائی ہوئی تباہی تک قائم رہی۔ ان آریوں میں سے کچھ کی اولادیں جو پارسی کہلاتی ہیں، آٹھویں صدی عیسوی میں جنوب مغربی ہندوستان میں آکر آباد ہو گئیں۔ ایران میں اچھی طرح اپنا تسلط جمانے کے بعد ان لوگوں نے افغانستان کی طرف رخ کیا اور تقریباً 2500 ق م میں کابل کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ارض پاکستان میں داخل ہونے والے آریہ آبادکار حضرت نوح کے طوفان کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ تاہم آریہ کو ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے دروں کو عبور کر کے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ کی تیز رفتاری کو دیکھ کر انہوں نے اسے سندھو کا نام دیا۔ یہاں پر پہلے سے آباد درواز قوم کو مار بھگایا اور پانچ دریاؤں کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مفتوحہ علاقوں کو ”آریہ درت“ کہا جانے لگا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اترائی، کراچی

ہے تھے۔ جن ڈاڈا نے میری دوستی کی خاطر اور کچھ حقائق کا ہاتھ لینے کے بعد مقتول جو کے لواحقین کو بڑی مشکلوں سے خاص ودیت لینے پر رضامند کر لیا ہے ورنہ یہی نہیں کالیا بھی ہاتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک ہیں۔ اچھے بھلے مجرم بھی اسے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔“

میں ان دونوں کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں تو سمجھا تھا پریشانی ملنے لگی تھی مگر یہاں ایک اور مصیبت گلے کو آ پڑی تھی۔ پتا نہیں کتنا زرتاوان ودیت دینا پڑتا؟ مجھے بھلا ان پکروں کا کیا پتا تھا؟ اور پھر کون دیتا؟

”لگ۔ کتنا ودیت دینا پڑے گا؟“ بالآخر میں نے ہنسی بھنی آواز میں پوچھا۔

”چالیس لاکھ۔“ جینکو کی بجائے جن ڈاڈا نے جواب دیا۔ چالیس لاکھ کی رقم معمولی نہ تھی۔ اتنی بڑی رقم کا سن کر میرے حلق میں کچھ چھٹنے لگا اور میں نے اسے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جی۔ چالیس لاکھ! یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟“

”ایک انسان کی زندگی سے بڑھ کر تو کروڑوں روپے بھی کچھ نہیں ہیں۔ یہ تو معاملے کو رخنہ دینے کی نیت سے دیت رکھی جاتی ہے تاکہ دونوں طرف کے فریقین اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جائیں۔“ جن ڈاڈا بولا۔ ”اس پر بھی ہنجر کرو کہ مقتول کے لواحقین نے کسی طرح کالیا کی جان بخشی کر لائی۔ وہ پولیس میں بھی تم دونوں کے خلاف رپورٹ کر سکتے تھے۔ دیت تو تمہیں پھر بھی دینا پڑتی مگر پھر پولیس کو بھی دینا دانا لگ پڑتا۔“

”میں کالیا سے مل سکتا ہوں۔ کیونکہ رقم کا بندوبست اسی نے ہی کرنا ہے۔“

”نہیں۔“ جن ڈاڈا نے اپنا سر فنی میں ہلایا۔ ”اول تو کالیا کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے جا چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اہمیت کے سببے لیے بغیر وہ کالیا کو نہیں چھوڑیں گے۔“

اس کی بات سن کر مجھے مزید پریشانی نے گھیر لیا اور بے اختیار میں اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کالیا کے بغیر میں لوہو کو ادھورا سمجھتا تھا۔ اس کا دنیا میں میرے سوا اور تھا بھی کون؟ اعتماد بھرا بھی اسے بچانے کے لیے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا تھا، تاہم ایک اُمید کے سہارے میں اس سے بات کر کے کالیا کو بچا تھا۔ رہا جینکو تو اس نے پہلے ہی اپنی طرف سے اس معاملے کو صاف کر دیا تھا، یہی اس کا بڑا احسان تھا اپنی دشمنی کا رسک لیا تھا اس نے۔

مجھے مہلت کے طور پر پندرہ دن دے دیئے گئے تھے۔ کالیا کہاں قید تھا؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا، کن کی قید میں تھا، وہ بھی صرف اسی حد تک جانتا تھا کہ جن ڈاڈا کو ہی اس کا علم تھا۔ شکر تھا کہ وہ زندہ تو تھا۔

بہر طور میں جن ڈاڈا اور آخر میں جینکو کا شکریہ ادا کر کے واپس لوٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک دو آدمی احاطے کے پھانک سے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے جوش غیظ سے تھمتارہے تھے۔ ان میں تو گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا، جس کے چہرے سے خوف ناک کی چمک رہی تھی۔ ہاتھ میں اس کے ٹی ٹی میل تھا۔ اس نے ٹائٹ قسم کی بنیان دھاری دھاری شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے شلوار قمیض اور وہ ذرا مضبوط جسم کا لباس تو لگا آدمی نظر آتا تھا۔ رنگت سیاہی مائل تھی۔ اس کی آنکھوں سے کچھ زیادہ ہی طیش ناک اور چہرے سے خونخواری مترشح ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر خالی ہاتھ نظر آتا تھا جن ڈاڈا سے غصے میں وہی مخاطب ہوا تھا، جس سے مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا کیونکہ جن ڈاڈا جیسے ٹینگ وار لیڈر کو میں نے اس کے سامنے کچھ دہنے دیکھا تھا جبکہ جینکو کی حالت تو زیادہ ہی پتلی نظر آنے لگی تھی۔ میں کچھ گھبرا گیا کہ نہ جانے اچانک کیا ہو گیا تھا۔

”ڈاڈا! وہ مردود خون خنیا گیا ہے اور ہمارے مزید دو آدمیوں کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے اس نے۔ اب تو دیت ویت گئی بھاڑ میں۔ اب اس کے ساتھی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہاں، ڈاڈا سائیں! اب خون کا بدل خون ہوگا بس!“
ٹی شرٹ والے نے بھی اسی طرح کے غصے اور برہمی کا اظہار کیا۔

جن ڈاڈا اور جینکو کو تو خیر اعزازہ ہو ہی چکا تھا کہ یہ دونوں کس ”مردود خون“ کی بات کر رہے تھے لیکن خود مجھے بھی ادراک ہو چلا تھا کہ یہ دونوں کس کی باتیں کر رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اچانک ہی میری رینڈہ کی ہڈی میں تشویش و خدشات کی سنسنی کسی پر بھیگی کی طرح اترتی چلی گئی۔ کیونکہ ان کا ایک شکار میری صورت میں تو ان کے سامنے ہی موجود تھا، یہ الگ بات تھی کہ ابھی انہیں معلوم نہ تھا۔ جن ڈاڈا کا پتا نہیں تھا کہ وہ اسی وقت کھڑے کھڑے مجھے ان کے حوالے کر دیتا۔ میں کھڑا ہاگمرا اندر سے میرا وجود مرقش سا ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے میرا دادا؟ خیریت تو ہے؟“ جن ڈاڈا نے

بالآخر اس سے پوچھا۔ ہم کھڑے تھے۔ میرا دادا یہی قہقہہ اور کسرتی بدن والا شخص تھا جو اپنے ساتھی کے مقابلے میں زیادہ بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ہاں، جن ڈاڈا! بہت ہو گیا۔ اب حساب صاف ہوگا۔ کالیا اور اس کے ساتھی نعمان کا ہمیں اسی وقت پتا دے دو۔ ہم جائیں ہمارا کام جانے۔“ اس کے منہ سے اپنا نام بھی سن کر میری رگ دپے میں پھیری سی دوڑ گئی۔ فگر و تشویش کی ایک سنسناتی ہوئی لہر تھی جو پورے وجود میں برقی کی طرما سراپت کر گئی۔ میں ان کے دوسرے شکار کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا اور یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اگر جن ڈاڈا جینکو میری طرف ایک ذرا اشارہ بھی کر دیتے تو میرا دادا تباہ ہو چکا ہوتا۔ اس کا ساتھی اسی وقت مجھے گولیوں سے چھٹو کر ڈالتے۔

جن ڈاڈا اور جینکو نے میری جانب ایک نظر ڈالی مگر تھی، دکھ اور تاسف کے ساتھ میں نے جن ڈاڈا کے چہرے، بھی برہمی اور جوش کے تاثرات کی جھلک اٹھاتے ہوئے دیکھی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ بھی مجو کی ہلاکت پر طیش و انتقام تلے انہیں میرے بارے میں بھی بتا دے مگر شکر تھا کہ میرے بارے میں بولے کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے حیرت آمیز تشویش اس بات سے ہو رہی تھی کہ بھلا یہ میرے دشمن کیوں کر بن گئے تھے؟ جن ڈاڈا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی تھی لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ کالیا کے ہاتھ جو کاکام بگڑا تھا اور کالیا کے ساتھ میرا بھی تھا۔ جن ڈاڈا نے جب کالیا کو ان کے حوالے کیا ہوگا ساری تفصیل بھی بتائی ہوگی اور اب یہ لوگ مجو کی ہلاکت ابتدائی واقعات سے جوڑ رہے تھے۔

”تم بیٹھو تو بابا! مجو کے ہلاک ہونے کی اس خبر نے مجھے بھی دھلا کر رکھ دیا ہے۔“ جن ڈاڈا نے ان سے کہا۔ جین پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ معاملہ اس کے لیے بھی خراب ہو لگا تھا۔ میرا تو بی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت بھاگ کر احاطے پھانک پار کر لوں اور اپنی کار میں جا بیٹھوں، پھر گھر ہی جا دوں۔ سائنس لوں گھر میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ وہاں دونوں نے مجو کی موت اور کالیا کے فرار پر وہاں تھر تھرا لہجہ تھا۔ ابھی شاید انہیں ایک اور حقیقت کا پتا نہیں چلا تھا کہ اگر ڈاڈا کے ساتھ موجود جینکو بھی اس میں برابر کا قصور دار تھا۔

”کیا بیٹھ کر کروں میں ڈاڈا!“ میرا دادا چراغ پا ہو کر بولا۔ ”اب تو میں سب سے مجو کی موت کا بدلہ لوں گا، اگر لوگوں سے بھی جنہوں نے باہر کے ان دونوں دشمنوں کو یہاں

میں نے جلدی سے کار کا پونٹ اٹھا کر دیکھا مگر کوئی خرابی نظر نہ آسکی۔ میں دوبارہ اسٹیرنگ پر آیا اور انٹینشن میں لگی چابی کھائی۔ اللہ سے دعا بھی مانگتے لگا کہ اس پار اشارت ہو جائے اور وہی ہوا شکر تھا کہ وہ اشارت ہوگئی۔ میں نے جلدی سے گیمز ڈالا اور کار دوڑانے نکل گیا۔

میں گاڑی کو چیل چوک سے نکال کر میرانا کہ چوک پر لے آیا اور سیدھا دوڑاتا لے گیا۔ لیاری کے علاقے سے نکلنے کے بعد میں نے سکھ کی سانس تو لی تھی مگر آئندہ کے متوقع حالات کا اندازہ کر کے مجھے تشویش کھائے جا رہی تھی۔ جانتا تھا میں کہ آج لیاری کے حالات ہماری ہی وجہ سے خراب ہوئے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر ہی میرا دل ہول رہا تھا کہ اب آگے کیا ہونے والا تھا! اور جو ہونے والا تھا وہ۔ کچھ اچھا نہ ہوتا۔ یہ شکر تھا کہ کالیا ان خطرناک لوگوں کی قید سے راہ فرار اختیار کر چکا تھا، اس بات سے قطع نظر کہ اس نے ان کی قید سے فرار ہو کے غلطی کی تھی یا عقل مند۔ تاہم میرا خیال تھا کہ اسے بھی اس حقیقت کا علم ہو چکا ہوگا کہ بجو کی اس کے ہاتھوں ہلاکت پر اس کے وارثین دیتے کے طور پر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ممکن تھا کالیا کو پہلے ہی سے یہ احساس ہونے لگا ہو کہ اس کی تلاش میں مجھے بھی اس حقیقت کا علم ہو چکا ہو اور میں اب اس کے لیے اتنی بڑی رقم کے بندوبست کرنے کے امتحان میں نہ پڑ جاؤں اور اس نے میری یہ آزمائش آسان کر ڈالی ہو مگر یہ سب آسان کہاں ہوا تھا؟ وہ ان کے دو بندے اور بھی مار کے نکل بھاگا تھا ان کی قید سے کوئی بعید نہ تھا کہ میرا دادا اور اس کے ساتھی میرے پیچھے لگی ہو سکتے تھے۔ مصیبت نئی تو نہیں تھی لیکن اس کا سلسلہ تعلق میرے پیش آمدہ حالات سے ہی تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل منگنا کی اور میرا دل اندیشاک و سوسوں تلے آپوں آپ ہی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جب انسان سنگین تر حالات سے دوچار ہوتا ہے اسے سیل فون کی بیل بھی چونکا دیتی ہے اور دل کی انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا۔ تب ہی یہ ایسا پریشان اور ڈولیدہ انسان کلیں کر رہے سوچتا ہے کہ ”کم بخت یہ موبائل فون ایجاد ہی کیوں ہوا۔“

میں نے کال انڈیکس کی اور پہلو کہا۔

”جگر! تو کہاں ہے۔“ دوسری جانب سے کالیا کی مخصوص لب و لہجہ کی آواز پر میں چوک پڑا۔

”میں راستے میں ہوں اور گھر جا رہا تھا، پرتو بتا تو کدھر

کی راہ دکھلائی تھی۔ تم تو مجھے نہیں بتاؤ گے مگر میں اس کا بھی پتا چلا ہی لوں گا۔“

اس کی بات پر میں نے کن آنکھوں سے جینکو کی طرف دیکھا تھا، جو میرا دل کی اس خوں ناک دھمکی سے پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

”تم جاؤ بعد میں بات ہوگی تم سے۔“ دفعتاً ہی جن ڈاڈا نے مجھ سے کہا اور میں جیسے اسی بات کا ہی منتظر تھا۔ ساتھ دل ہی دل میں جن ڈاڈا کا شکر یہ بھی ادا کیا اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹا تو میرا دانا ای اس جلتے جلتے شخص کو اپنی جانب ایک نظر ٹھہرتے ہی پایا۔ میں ابھی پھانک تک پہنچا ہی تھا کہ آٹھ دس کھلے افراد کا مشتعل کردہ ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ اندر داخل ہونے لگا، میں نے جلدی سے گھبرا کر انہیں اندر آنے کی جگہ دی۔ یہ بھی میرا دل کے ہی ٹینگ کے آدی لگتے تھے۔

ان سب کے پھانک سے گزر جانے کے بعد میں جلدی سے آکر کار میں سوار ہو گیا اور اسے اشارت کیا، شاید گھبراہٹ تھی یا بولکھاہٹ کہ گاڑی کو صحیح انٹینشن نہیں لگ پارہا تھا۔ یہاں کے حالات خراب ہونے کے واضح امکانات نظر آ رہے تھے۔ پورا لیاری ان کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ اس لیے میں جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن بچانے کیا ہوا کہ گاڑی اشارت ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اس بار صبر و تحمل کے ساتھ دوبارہ سیلف دیا مگر اندازاً ابھی میں کار سے اتر کر پونٹ اٹھانے ہی لگا تھا کہ جن ڈاڈا کے احاطے کے اندر سے گولیاں چلنے کی سمع خراش ترتر اہٹ ابھری۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ باہر موجود دو دشمن افراد اندر کو بھاگے، ایک نے مجھ سے غصے میں کہا۔

”اڑے بابا! جاؤ بھاگو ناں اھر سے۔ ہنگامہ ہو گیا ہے، ابھی تمہاری گاڑی کو آگ لگا دیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اندر بھاگا۔ پریشانی اور خوف سے میرا پورا وجود سنسانے لگا۔ میرے خیال میں کالیا نے جلد بازی کا مظاہرہ کر کے سنبھلنے ہوئے حالات کو پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ڈالا تھا جبکہ خود میں بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا، خیال تو آیا ہی میں کہ گاڑی پھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں مگر میرے جیسے متوسط آدمی کے لیے گاڑی جیسی سواری کسی نعمت سے کم نہ تھی اور میں اس کے نقصان کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دوبارہ خرید سکتا تھا۔ تاہم ہاں پر بنتی تو اور بات تھی۔ اندر فائرنگ ہو رہی تھی اور دوشرا بے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو فریقوں کے درمیان دو بدبوا قاعدہ خطرناک فائرنگ شروع ہو چکی ہو۔

ہے یار؟“ میں نے پریشان زدہ لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

”صغورا گوشت والی جگہ دیکھی ہے ناں۔ وہی جہاں، عارف مجھندر سے تیری ملاقات کروائی تھی؟“

مجھے یاد آگیا، ترنت بولا۔ ”ہاں۔ آگے بول۔“
”وہیں آجا، باقی کی تفصیل وہیں آرام سے بیٹھ کر کرتے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں نے کاری رفتار مزید بڑھا دی۔

روڈ پر ٹریفک کا رش کم ہونے کی وجہ سے میں آدھے گھنٹے میں ہی صغورا گوشت پہنچ گیا اور کار سیدھی لے جا کر وہیں اس کے دروازے کے سامنے روک دی۔ میں نے ایک ہارن دے کر انٹیشن چوک سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا، جب تک دروازے کے قریب پہنچا، کسی نے میرے دستک دینے سے پہلے ہی کھول دیا۔ سامنے مچی کھڑا تھا۔

”آجائیں جلدی۔“ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں اندر داخل ہوا اور مختصر سامعین پار کرتا ہوا جی کے ساتھ ایک کمرے میں آگیا۔ کالیا وہاں پہلے ہی سے کھڑا تھا۔ میں اس سے اوروہ مجھ سے لپٹ گیا۔

آج پہلی بار میں اسے بہت زیادہ پریشان اور تشویش زدہ دیکھ رہا تھا تو وہ کہاں وہ مجھے تسلیاں دیا کرتا تھا لیکن آج اس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے ڈھارسوں اور تسلیوں کی ضرورت تھی مگر یہ دیتا کون؟ میں تو خود مضطرب الحال کیفیات سے دوچار تھا۔

”یار جگری! یہ سب برا ہو گیا۔ اتنا پریشان تو میں کبھی پولیس کے پیچھے لگنے سے نہیں ہوا ہوں جتنا کہ ان گینگ وار دشمنوں سے ہو کے رہ گیا ہوں۔“ وہ مجھ سے الگ ہو کے بولا۔ مجھے اس کا چہرہ مترشش اور لہجہ لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کی تشویش اور پریشانی میرے لیے تھی۔

”جگری! مجھے اس کالیا کی فکر نہیں۔ کیونکہ جب میں نے شرافت اور ”شیراز“ کا لابارہ اتار کر کالیا کا لباس اوڑھا تھا تو یہ جان لیا تھا کہ یہ جان۔ اب موت کے حوالے ہوئی لیکن یار جگری! مجھے تیری فکر ہو گئی ہے کیونکہ تو ابھی کالیا نہیں بنا۔ نہ ہی میں تجھے بننے دوں گا۔ لیکن۔“ وہ چپ ہو رہا۔

ایسا ہوتا ہے، جب کوئی مرد یار۔ ڈھنسنے لگے تو دوسرے کا ہمت و حوصلہ سوا ہونے لگتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کالیا کو اپنے لیے اس قدر محمل اور ولیدہ خاطر پاکر میرے

اپنے اندر ایک نئی ہمت اور جوشِ حوصلگی کا جذبہ اچانک ہی بیدار ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”کالیا! میرے یار! آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ فقط اتنا یاد رکھا کر۔ ایک سب سے بڑی ہستی ہے جو اوپر آسمان پر بیٹھی ہے اور سب کی جان اسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ جب اللہ کا نام دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگتا ہے تو ساری پریشانیوں اور فکرات ہوا ہونے لگتے ہیں، کیونکہ وہی سب کا پائلن بار اور مددگار ہے۔“

کمرے میں ایک ہی بڑا سا پرانا صوفہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو کرسیاں بے ترتیب پڑی تھیں۔ کالیا نے تو کرسی سنبھال لی جبکہ میں صوفے پر گر گیا۔ جی اس اثناء میں پانی اور چائے لے آیا تھا۔ ہم نے پانی پیا اور چائے کا کپ سنبھال لیا۔ جی بھی کالیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”پہلے تو اپنی ستائے گایا میں ستاؤں؟“ میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”اے لے جگری! تیرے پاس بھی کوئی خبر ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ میں ہی اپنی ستا رہا ہوں گا۔“

”تجھے ستانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے یار!“ میں نے پھسکی پھسکی مسکراہٹ سے کہا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو پریشانی اور ولیدگی کا تکرر نہ کچھ کم ہوا۔
”مجھے تیرے بارے میں سب معلوم ہے، اسی لیے بہتر ہے کہ میں ہی ستا ہوں۔“

وہ اب حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اب تک کی ساری حالات و دگرگوں کی صراحت سے آگاہ کر دیا اور آخر میں یہ نمکسار خبر بھی دی کہ فہیم بھائی کے ساتھ اس ”پردہ نشین“ ظالم درندے نے کب حشر کیا تھا۔

”اف! میرے خدا یا!“ کالیا یہ سب سن کر کرب انگیز لہجے میں بولا اور چائے کا خالی کپ قریب دھری تپائی پر رکھ کے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ گینگ وار کرپ سے دشمنی کی پریشانی اپنی جگہ مگر فہیم کے بارے میں سن کر وہ لرزا اٹھ تھا۔

”یار جگری! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی فہیم بھائی کے ساتھ ایسا ظلم ہو چکا ہے؟ بہت برا ہوا یہ۔ بہت برا ہوا یہ۔“ وہ دکھ سے خود کلامیہ بڑبڑانے لگا۔

”اپنے جوان کبر و بھائی کو اس بھری جوانی میں ناگوار سے معذور دیکھ کر میں ابھی تک اس صدمے سے سنبھل ہی نہیں

پایا ہوں یا رکالیا!“ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
 ”یار! شریفوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ اپنی ہی بے بسی پر
 بس آنسو ہی بہا کے رہ جاتے ہیں اور دنیا تماشا دیکھتی ہے تجھے
 لگاتی ہے کاش کالیا! کاش تو نے مجھے بھی کالیا بننے دیا ہوتا۔
 ایک شریف آدمی جب بد معاش بننا ہے تو پھر اس سے بڑا
 بد معاش اور کوئی نہیں ہوتا۔ دیکھ کالیا! میری بات سن۔ اب
 میں جو کرنے لگا ہوں تو مجھے اس سے نہیں روکے گا۔ تیرے
 ساتھ رہتے ہوئے مجھے، چاہے دفاع کی حد تک ہی سہی مار
 کناٹی کرنا آئی گئی۔ اسلحہ بھی چلا لیتا ہوں۔ بلکہ دیکھا جائے
 تو فی زمانہ جس کے پاس اسلحہ اور طاقت ہے، وہی سب کچھ
 ہے۔ مجھے بھی ایک عدد لائسنس یافتہ پستول رکھنا چاہیے۔“
 میری باتیں سن کر کالیا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور
 میرے قریب آ کر بولا۔

”اے لے جگری! بڑی بات کردی۔ تجھے نعمان ہی
 رہتا ہے اور بس! میں ہوں، یہ کافی ہے۔“
 ”میرا خیال ہے ہم اصل موضوع پر گفتگو کر لیں جس
 کے لیے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، تو زیادہ بہتر رہے گا۔“
 جی جو ایک طرف کرسی میں اب تک خاموش بیٹھا تھا، ہماری
 طرف دیکھ کر بولا اور کالیا سر ہلاتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر جا
 بیٹھا۔

”نوی جگری! سب سے پہلا کام تم نے یہ کرنا ہے کہ
 رانا بشیر والے معاملے کو جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔“
 بالآخر کالیا نے کہا شروع کیا۔ ”کیونکہ اس معاملے کو جتنا طویل
 دو گئے، پردہ نشین گل کھلاتا رہے گا۔ فہم بھائی کو دونوں ٹانگوں
 سے محروم کرنے کا بدلہ تو اس پردہ نشین سے ایسا لیں گے کہ اس
 کی تسلیں تک یاد نہیں کی۔ باقی رہا مسئلہ لیاری والا تو اس کے
 لیے نہیں پہلے استاد بھابھا کے پاس جانا پڑے گا، یہ بڑا نمبر
 مسئلہ ہے اور وہی کوئی بہتری کی صورت نکال سکتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا لیکن۔“ کہتے ہوئے میں ذرا
 مچسور انداز میں رکا پھر بولا۔

”رانا بشیر والا معاملہ پہلے سے زیادہ تیز تر ہو چکا ہے،
 اسی لیے تو پردہ نشین نے یو کلا کر اتنی بڑی بڑولی کا مظاہرہ کیا
 ہے کہ میرے نیچے اور شریف، معصوم بھائی کو محذور کر ڈالا مگر
 یار کالیا! یہ لیاری والا مسئلہ زیادہ حل طلب ہے، اس سنگین مسئلے
 کی وجہ سے ہم سر چھپاتے رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تو باقی
 معاملات کیسے دیکھیں گے؟“
 ”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ جی نے پھر مد اعلت کی۔

”یہ بدروحوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے اور کسی
 کا نہ چھوڑیں گے ہمیں۔ اسے معمولی بات سمجھا، مستقبل قریب
 میں بھیا تک نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ
 وقت استاد بھابھا کے اڈے پر چلنا چاہیے۔“

کالیا اور میں نے جی کی بات پر صاف کرتے ہوئے اہلی
 جگہ چھوڑ دی اور کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ مکان کو تالا لگا کر جی اہلی
 کچھلی سیٹ پر ان بیٹھا۔
 تھوڑی ہی دیر بعد میری مہران کار ایک بار پھر سوک
 پر دوڑ رہی تھی۔

استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچ کر ہم نے لیاری والی گھر
 صورت حال اس کے سامنے رکھ دی، جسے سن کر چند لمحوں
 استاد بھابھا جیسا آدمی بھی سکتے میں آ گیا۔ پھر ہم سے کئی
 بات کئے بغیر اس نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر
 کرنے کے بعد کان سے لگا لیا۔

”ہاں! بھائی کیا حال ہے؟ اللہ کا شکر ہے میں بھی ٹھیک
 ہوں، پر یار! تیرے سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہاں
 کچھ ایسا ہی ہے، یار! تھوڑی تکلف کر سکتا ہے؟ میرے پاس
 ذرا آجا۔ ایک بڑے نازک اور خطرناک مسئلے پر تیرے سے
 تفصیلی بات کرنی ہے۔“ اتنا کہہ کر استاد بھابھا دوسری طرف
 سے اس کی ستنار بار پھر نمون ہمرے لہجے میں بولا۔

”یار فحاش! بھائی! بڑی مہربانی تیری۔ بس! چلا آ۔
 جلدی، سمجھ لے کہ میں تیرا ہی بے جیسی سے انتظار کر رہا
 ہوں۔“

اس کے بعد استاد بھابھا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ لیاری
 والے مسئلے کی ساری گفتگو بھابھا نے بڑی پر غور خاموشی سے
 سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہماری طرح وہ بھی پریشان ہو جائے گا
 لیکن اس کی فراغ پیشانی پر ماسوائے چند اچ کی سلوٹوں کے
 نمودار ہونے اور ایک گہری مچسور ہکاری کے۔ کچھ بھی ایسا
 خاص اظہار نہیں ہوا تھا، جس سے چاہتا ہو کہ مسئلے کی نزاکت
 نے اسے بھی ایک بڑی فکر میں مبتلا کر دیا ہو۔ اس کے برعکس
 وہ ایک مسکراتی ہوئی نظر جی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد کالیا سے
 مخاطب ہو کر بولا۔

”اوئے کالیے! آج پہلی بار تجھے اس قدر پریشان
 دیکھ رہا ہوں۔ تو تو بڑا جی دار آدمی تھا میرے گردہ کا۔ لگتا ہے
 نوی کے ساتھ رہ کر تو بھی شریف بن گیا ہے۔“

کالیا کے لیے استاد بھابھا کا یہ تبصرہ بلاشبہ عموماً
 نہ تھا جبکہ خود میں بھی کالیا کے متعلق ایسا سوچ چکا تھا اور مجھ

چکے تھے۔ وہ ایک موٹی سی موٹر بائیک میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا تھا شاید۔ بائیک یہی لایا تھا چلا کر۔ وہ پہلے استاد بھابھا سے بڑی گرجوٹی کے ساتھ بغل گیر ہوا اس کے بعد ہم سے بھی باری باری دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملایا۔ اس کے بعد بھابھانے اسے اپنے سامنے دینر قالین پر بیٹھنے کا کہا۔ یاد رہے استاد بھابھا کے اڈے پر کرکی اور بیڈ نہیں ہوتے تھے، ماسوائے فرش نشست کے۔ جو ایک موٹے دبیز اور قیمتی قالین پر مشتمل تھی۔ محل کے کڑاہی والے خوب صورت گاؤں کے بڑے ہوتے تھے، باقی ایسے وغیرہ سمیت ضرورت و آسائش کی ہر شے وہاں موجود ہوتی تھی۔

فیاض جمالی بھی ایک ایسے ہی گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ اور لائٹر تھا۔ موبائل بھی تھا، گنگنے کا ایک پڑا بھی تھا۔ یہ سب چیزیں اس نے اپنے سامنے رکھ دیں۔

”پہلے یہ بتاؤ کیا منگواؤں تمہارے لیے؟ پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔“ استاد بھابھانے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ جس کی ضرورت ہے وہ سب میرے سامنے رکھا ہے۔“ فیاض جمالی نے بھی اسی دوستانہ مسکراہٹ سے اپنے سامنے بڑی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو استاد بھابھا ہنس پڑا۔

”یہ بھی تم نے خوب کہی جمالی سائیں!“ اس کے بعد اس نے وہاں موجود اپنے ایک ساتھی کو چائے وغیرہ لانے کے لیے بھیج دیا۔

”یار جمالی! تم سے ایک بڑا ضروری کام پڑ گیا ہے۔“

بھابھا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں! تو بول ناں میرے یار! میں اتنی دور سے یہی جاننے کے لیے تو آیا ہوں تیرے پاس؟“

”تیری مہربانی ہے یار!“

”کوئی مہربانی نہیں۔ یہ دوستی کا فرض ہے کہ اسے تکلیف میں دیکھو تو فوراً پہنچ جاؤ، تو نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا بھابھا!“ فیاض جمالی بولا۔ اس کے لہجے سے بھابھا کے لیے منونیت کے جذبات نمایاں ہوتے تھے۔

استاد بھابھانے ایک گہرا سانس لیا پھر کالیا اور میری طرف ایک نظر ڈال کر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے بولا۔

”یار جمالی! ایک نازک اور سنگین مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے،

ہات استاد بھابھانے بھی محسوس کی تھی لیکن کالیا لیاری والے مسئلے سے کس وجہ سے زیادہ پریشان اور تشکر تھا یہ میں ہی جانتا تھا، آفرین تھا کہ کالیا نے مجھے تو اپنی تشویش کی اصل وجہ (جو میں ہی تھا) لیکن وہ استاد بھابھا کے سامنے چپ رہا، مگر بھابھا بھی کانیاں نکلا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

”جانتا ہوں تجھے۔ کالیا! تو تو یاروں کا یار ہے اور تیری پریشانی کبھی تیری ذات کے لیے آج تک نہیں دیکھی میں نے۔“ بالآخر استاد بھابھا کے اس اعتراف پر کالیا محض اپنا سر جھٹک کر رہ گیا پھر شاید موضوع بدلنے کی غرض سے بھابھا سے بولا۔

”استاد! یہ فیاض جمالی بھی لیاری کا کوئی گینگ لیڈر ہے کیا؟“

”ہاں! مگر کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس کا گروپ جیسا کہ جرن ڈاڈا اور بھورل سندھی کا ہے لیکن وہاں اس کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی کا حلیف ہے۔ اس کا اپنا خشیات کا ڈاڈا ہے۔ تاہم اس کی جرن ڈاڈا اور بھورل سندھی سے بیٹھک اچھی ہے۔ یہ آٹھ دس گروپ ہیں، قابل ذکر جرن ڈاڈا اور بھورل سندھی کے دونوں گروپ ہیں اور دونوں ماضی میں ایک دوسرے کے جانی اور خون کی دشمنی بھی رہ چکے ہیں پھر بعد میں ایک ایم این اے کی مداخلت سے ان کی خول پر جنگ مسلح کروا کے جنگ بندی کرادی گئی، اب کوئی بھی ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ اب تازہ صورت حال کیا رنگ لائی ہے یہ تو آگے چل کر ہی بتا سکتے ہیں۔ اگر بڑے گروپ آپس میں جھڑ جاتے ہیں تو چھوٹے گروپ ایک دوسرے کے حریف بن کر اس جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ یہی لیاری گینگ وار کو ختم دیتی ہے۔“

استاد بھابھانے تفصیل بیان کی اور آگے بولا۔ ”میری بھی ان سے سلام دعا ہے مگر ایک حد تک۔ میں ان کے کام بھی آیا ہوا ہوں۔ فیاض جمالی تو میرے نام کی مالا جپتا ہے۔ مجھے امید ہے وہ کوئی بہتری کی صورت نکال لے گا۔“

استاد بھابھا کی باتوں سے کالیا کو ڈھارس ہوئی نہ ہوئی ہو مگر مجھے ضرور پہنچی تھی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کا شفا ہے۔ استاد بھابھا بھی مجھے ان جفاکاری لیڈروں میں سے ایک محسوس ہو رہا تھا۔

فیاض جمالی ایک یہ مشکل گھنٹے کے اندر ہی آگیا۔ وہ ایک پختہ عمر اور فریبی ہائل شخص تھا۔ سر کے آدھے بال اڑ

میرا خیال ہے تو ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں! بول میرے یار! کیا مسئلہ ہوا ہے؟“ جمالی بھی ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالتے ہوئے استاد بھابھا سے بولا تو بھابھا اسے ساری رام کھاسانے لگا، تقریباً نصف گھنٹے تک ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ فیاض جمالی کو بتادی، جسے سن کر جمالی کا منہ حیرت و تشویش کے طے جلے تاثرات تلے کھل کر رہ گیا اور وہ انہی نظروں کے ساتھ گردن ڈراموڑے کالیا اور میری جانب ہنسنے لگا، پھر بھابھا کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں سمجھا تو اسی لیے آج لیاری کے حالات اتنے خراب ہوئے اور بڑی عجیب سی بات ہو گئی۔“

”اس سے زیادہ غصین بھی جمالی بھائی! اب مجھے یہ بتاؤ۔ اس کے حل کی کیا صورت حال نظر آتی ہے تمہارے ذہن میں؟“ بھابھانے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اتنے میں چائے اور سکٹ وغیرہ درمیان میں رکھ دیئے گئے۔ بھابھانے جمالی کو چائے لینے کا کہا۔ جمالی نے چائے کے کپ میں ایک سکٹ ڈبو کر کھایا اور پھر ایک کو اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا، پھر بولا۔

”معاذ واقعی خطرناک اور الجھا ہوا ہے بھابھا! میں تجھے کسی اندھیرے میں رکنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ یہ مسئلہ اتھ سے اب نکلنا ہوا نظر آتا ہے۔“

”اڑے یار جمالی! تیرے لیے کیا مسئلہ ہے، تو وہیں کا آدی ہے۔ ان کی بولی جانتا ہے، ان کے درمیان اٹھنا بیٹھنا ہے، پتا ہے مجھے کہ تیری ان سے اچھی دعا سلام بھی ہے۔ مجھے امید ہے تو اس مسئلے کو کھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔“ بھابھانے بڑے رساں آمیز لہجے میں اس سے کہا تو فیاض جمالی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تلے بولا۔

”یار بھابھا! تو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے۔ لیاری میں میری حیثیت ایسے ہی گروپ لیڈر کی سی ہے جو کسی سے چنگاہ لینے سے بھی کتراتا ہے۔ ہاں! کام میں سب کے ہی آتا ہوں اور اسی لیے میری تقریباً سبھی سے نفرت بھی ہے۔“

”یار! اسی لیے تو تجھے چتا ہے کہ تو ایک شخصہ مزاج کا آدی اور درمیانی راہ پر چلنے والا آدی ہے۔“ بھابھانے کہا۔

”ورنہ! اگر مجھے جنگ کرنا ہوتی تو میں۔ شانو کو جاسے بھی یہ کام لے سکتا تھا، جانتے ہونا کھوجا کو۔ اچھے بھلے بنگ گینگ وار لیڈر اس کے آگے پانی بھرے ہیں حالانکہ وہ کیا چیز ہے! نشیات اور غیر قانونی اسلحے کا اسلحہ ہے مگر اپنی جیب میں سب کی ”پڑیا“ رکھتا ہے۔“

”اس کے سائے سے بھی دور رہتا بھابھا! استاد! جمالی نے کان پکڑنے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شانو کھوجا۔ یار مار۔ قسم کا آدی ہے۔ تیرا کوئی کام کرے گا اور اس کا محاذ مضبوط مانگا تو لے گا ہی مگر بدلے میں تجھ سے بھی کوئی کام پڑا تو۔ وہ تجھے تیری ہی کسی کمزوری پر بلیک میل کر کے اپنا کام بغیر پیسوں کے نکلوا لے گا۔ یہی بلیک میلنگ اس کی وہ پڑیا ہے جو وہ سب کی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔“ فیاض جمالی نے مختصر مگر جامع لفظوں میں۔ شانو کھوجا کی اصلیت، استاد بھابھا کے سامنے نکوادی۔“

”کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی اس کے متعلق سن رکھی ہیں مگر تو نے اس کی وضاحت کے ساتھ تصدیق بھی کر ڈالی۔“ بھابھابولا۔ ”اب یہ مجھے بتا کہ تو اس معاملے کے سچ کیا کر سکتا ہے؟“

”کیا نام ہے ان دونوں کا؟“ جمالی نے پھر ڈراموڑا کر دیا۔

”کھرا کر ہماری طرف دیکھا تھا۔“

”کالیا اور نوی۔“ بھابھانے بتایا۔

”دونوں کو کچھ دنوں کے لیے انڈر گراؤنڈ کر دو۔ بلکہ آج سے اور اسی وقت یہ دونوں زیر زمین چلے جائیں۔“ جمالی نے پہلا مشورہ دیا۔ بھابھا تو خاموشی سے مستفسرانہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا تاہم میں اور کالیا اس کی بات پر پریشان سے ہو گئے۔ ہماری بے چینی اور ”کسمپاٹ“ کو بھانپتے ہوئے بھابھانے بالآخر جمالی سے کہا۔

”یار! کیا یہ ضروری ہے؟“

”ضروری؟“ جمالی اپنی بات پر زور دینے کے انداز میں بولا۔ ”بہت زیادہ ضروری ہے، نہیں جانتا تو اس وقت۔ میرا دادا اور مجھ کے رشتے داروں کا بچہ بچہ نینے میں نہیں، بلکہ بغل میں ٹی ٹی دبائے ان دونوں کو تلاش کر رہے ہوں گے۔“

تب ہی پہلی بار میں نے خود فیاض جمالی سے مخاطب ہو کے کہا۔

”جمالی سائیں! ہم دونوں تو انڈر گراؤنڈ چلے جائیں مگر میرا گھر بھی ہے، جہاں میرا ایک معذور بھائی اور جوان بہن رہتی ہے، ان کا واحد کفیل اور دیکھ بھال کرنے والا۔۔۔ صرف میں ہوں۔“

”ان دونوں کو۔ کسی دوسرے شہر رشتے داروں کے ہاں بھیج دو۔ یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ جب تک ان سے میری بات چیت چلتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ان دونوں کو گولی ہی نہ ٹھوک دے۔“

جہانی نے مجھ سے کہا اور پھر بھابھائی کی طرف دیکھنے لگا۔
”تمہیں اُمید ہے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے ختم
ہوگا؟“ میرا مطلب ہے کتنے دن لگ جائیں گے۔“

”ابھی میں واپس جاؤں گا اور آج ہی حالات کا جائزہ
لے گا۔“ جتن ڈاڈا سے تو ابھی نہیں ملوں گا ہاں بھول سندھی
ملنے کے بعد ہی اس کے مشورے سے کچھ کروں گا۔ تم فکر
و فکر میں تمہیں آج رات تک کچھ نہ کچھ جواب دے دوں گا۔“
”یار! بڑی مہربانی تیری۔ یہ کام تو نے کر لیا تو سمجھ لے
بھابھائی کو خرید لیا۔“ استاد بھابھائی یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں
اٹھوں کا بھرپور مصافحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں آنسو
مانے اور قریب ہی بیٹھے تھے۔ جہانی نے بھی اسی گرجوشی کا
ظاہر کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”خرید تو تم نے ہمیں رکھا ہے اپنی بے لوث دوستی سے
بھابھائی استاد! اب مجھے اجازت دے تاکہ میں اپنا آج ہی سے
کام شروع کر دوں۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے
ہاتھ آیا ہوا چھوڑا بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے بولا۔
”نہل بابا! گاڑی اشارت کر۔ ماں اچان تو۔ (گاڑی)
بانیک (اشارت کر دیا تو اس نے۔

اس کے جانے کے بعد۔ استاد بھابھائی ہم سے کہا۔
”پہلی فرصت میں۔ اپنے بھائی اور بہن کو وہاں سے
لال کر دو۔ یہ شہر بھجوا دو۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور
میری طرح مشغول بھی، تم دونوں کو نہ پا کر وہ جوش انتقام میں
سب سے پہلے گھر پر وار کریں گے۔“

کالیایا دینے سے خاصا پریشان تھا جبکہ مجھے تو اس وقت
سے ہی فکر لاق ہوئی تھی جب فیاض جہانی نے مشورہ دیا تھا۔
”مگر میں ان دونوں کو کہاں اور کس شہر بھجوں؟ ہمارا ایسا
کوئی دور کا بھی رشتہ دار نہیں رہتا؟“ میں نے کہا۔

”ایڈووکیٹ زبیرہ کے ہاں بھیج دو!“ کالیانے مجھ سے
کہا۔

”نہیں یار!“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صرف بہن
عاصمہ کی بات ہوتی تو میں یہی کرتا مگر ایک بھائی اور وہ بھی
مطہر۔ نہیں یار! اتنی بڑی ذمہ داری میں زبیرہ کو نہیں دے
سکتا۔“

کالیایا سوچ میں پڑ گیا۔ بھابھائی بولا۔ ”میرے اڈے
میں کسی عورت ذات کا وجود نہیں ہے ورنہ عاصمہ بھی کوئی رکھ
لی۔“

”اس کا ایک حل میرے ذہن میں آتا ہے

استاد!“ کالیایا چمک بولا۔

”ایسا کرتے ہیں عاصمہ بہن کو اس دکیلہ صاحبہ کے
پاس چھوڑ آتے ہیں اور نیم کو ادھر لے آتے ہیں۔“
کالیانے تجویز معقول تھی۔ ہم اسی وقت نکلنے لگے تو
بھابھائی روک لیا اور بولا۔

”بھول گئے فیاض جہانی کی بات؟ لیاری کا بچہ بچہ بغل
میں لٹی دبائے تم دونوں کے خون کی یوسو گھٹا پھر رہا ہوگا۔ اوپر
جاؤ۔ میک اپ کرو اور حلیہ بدل کے باہر نکلو۔ پھر بھی محتاط
رہنا۔“ میں اور کالیایا یوں ایک دوسرے کا منہ ہنسنے لگے جیسے
پریشانی نے ہماری عقل بھی ماذف کر ڈالی ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں اور کالیایا ایک بوڑھے اور بڑھیا کا
حلیہ بنائے استاد بھابھائی کے اڈے سے نکل رہے تھے۔ کار میں
نے اڈے پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ہم دونوں بانیک پر تھے۔
بانیک میں چلا رہا تھا اور کالیایا بڑھیا کے روپ میں میرے پیچھے
عورتوں کی طرح دونوں ٹانگیں ایک طرف ڈالے بیٹھا تھا۔
کالیانے احتیاطاً ایک بھرا ہوا پٹل رکھ لیا تھا۔ میں بانیک
دوڑاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں میں روڈ پر بانیک دوڑا رہا تھا اور میرا رخ گھر کی
جانب تھا، فیاض جہانی کی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش
کر رہی تھیں۔ اپنے گھر کی طرف آتے وقت استاد بھابھائی
کہ ”نوی! بہت محتاط ہو کر اپنے گھر کی راہ لیا۔“

یہی وجہ تھی کہ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرا دل
انجانے دوسروں کی زد میں رہا۔ میں اب اپنے گھر کی
خیر خیریت کی دعا میں ہی مانگے جا رہا تھا۔ ان انڈیشوں تلے
میرا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ ابھی تو بھائی کے معذور ہونے
والے زخم بھی نہیں بھرے تھے کہ یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

محلے میں داخل ہوا تو پریشان دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ اگر
خدا خواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوتی تو محلے میں کھرام بچا
ہوتا۔ دل میں دعائیں پڑھتا ہوا میں اپنے گھر کے قریب پہنچا
تو کالیانے مشورے کے مطابق میں نے فوراً سے اپنے گھر کا
رخ نہیں کیا تھا بلکہ پہلے ادھر ادھر بانیک کو مختلف چھوٹی بڑی
گلیوں میں گھماتا رہا تھا اس کے بعد جب گھر کے اطراف میں
دور و نزدیک کوئی ممکنہ خطرہ یا مشکوک افراد کی نقل و حرکت سے
مطمئن ہوا تو سیدھا جا کر بانیک دروازے کے بالکل سامنے
روک دی اور نیچے اترا آیا۔

میرا حلیہ چوں کہ بدلا ہوا تھا اسی لیے محلے کا کوئی بھی
فرد مجھے پہچاننے سے قاصر تھا۔ کالیایا بڑھیا کے ہمیں میں سفید

رنگ کے شٹل کاک برقعہ اوڑھے ہوئے تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نامعلوم کیوں میں اندر سے ایک کٹک آمیز بے چینی کا بھی شکار ہو رہا تھا۔
تھوڑی دیر گزری۔ اندر سے آواز ابھری۔

”کک۔ کون ہے؟“

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجادیا۔ وہ آواز عاصمہ ہی کی تھی لیکن اس کا لہجہ مجھے بدلا ہوا لگا۔ یوں جیسے وہ کسی دے دے خوف اور سرایتگی کی زد میں ہو۔ تب ہی پل کے پل ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری اور متوقع خدشے تلے میرے دماغ نے چال چلی۔

”بٹیا! کیا یہ نعمان میاں کا بھی گھر ہے؟“

مکدہ نگراننا سا خطرہ بھانپتے ہی میں نے اپنی اصل آواز کی بجائے بوڑھے ضعیف اور انتہائی کی آواز میں کہا۔

”جی ہاں! پر آپ کون؟“ اندر سے عاصمہ نے پوچھا۔ اب اس کا لڑکھاتا ہوا لہجہ کچھ سنبھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لہجے کی اسی لڑکھاہٹ نے مجھے شے میں ڈالا تھا، جس سے سراپتگی بھی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے پتی آواز میں اپنے بالکل ساتھ کھڑے کالیا سے کہا۔

”مجھے اندر گڑبگڑ لگتی ہے۔ لگتا ہے دونوں کو اندر کسی کن پوائنٹ پہ لے رکھا ہے۔“

کالیا کے برقعہ پوش وجود میں ڈرا سی بھی کوئی غیر ارادی حرکت نہ ہوئی کہ وہ اس بات سے چونکا ہو۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح اندر سے ضرور بدک گیا ہوگا۔

”مکالمہ جاری رکھو۔ ٹھیک جا رہے ہو۔ بروقت عقل مندی دکھائی تم نے بھگوری! کہ عاصمہ بہن سے اپنے اصلی لہجے میں مخاطب نہیں ہوئے تم۔“

اس نے بھی برقعے کے اندر سے نیچی آواز میں کہا۔

”بٹیا! میں مرزا لکھیل ہوں۔ نارتھ ناظم آباد سے آیا ہوں۔ میری گھر والی بھی ساتھ ہے۔ مجھے نعمان میاں سے بات کرنی تھی۔“

”لیکن میں آپ کو نہیں جانتی اور بھائی جان تو اس وقت گھر پر ہیں بھی نہیں۔ آپ بھر کسی وقت آجانا۔“ اندر سے عاصمہ نے کہا۔

”ہمیں بہر صورت اندر داخل ہونا ہے۔ اسی لیے

میں۔ کوشش جاری رکھو۔“ کالیا نے ہولے سے مجھے کی۔

”اچھی بات ہے، پردیکھو بٹیا! ہم بوڑھے ہیں اس سے آئے ہیں، ہمیں نعمان میاں سے بہت ضروری ملنا۔ وہ ہمیں پہچانتا ہے۔ ہم اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کر سکتے ہیں۔ میرے یہ کہنے کے بعد اندر تھوڑی دیر تک خامواری رہی۔ کسی خیال کے تحت میں تھوڑا اور دروازے قریب سرک آیا اور اندر کان لگا دیئے۔ جبکہ کالیا برقعے اندر سے ارب قریب نظرس ڈالے ہوئے تھا اور سامنے مجھ سے بھی مخاطب رہا۔

اندر کی چند غائبے طاری رہنے والی خاموشی سے صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عاصمہ کو سرکوشیوں اور اشاروں اور ہدایات دے رہا ہو۔ مجھے اندر اب خطرے کا پوری طم احساس ہونے لگا تھا۔

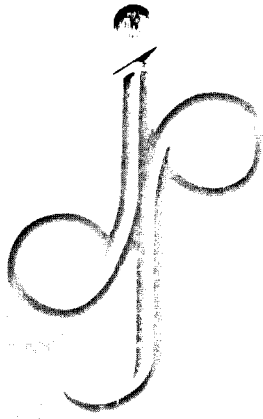
”مرزا صاحب! گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میں بھلا وہ انجان افراد کو کس طرح اندر بیٹھا سکتی ہوں۔ آؤ۔“

”کہو کہ ہم پھر باہر ہی کھڑے ہو کے انتظار کر رہے ہیں۔“ کالیا نے ہلکی سرکوشی میں کہا۔ نیچی بات تھی کہ ایسے مجھ سے زیادہ کالیا کا دماغ چل رہا تھا۔ جس کا فوراً ہی بڑا برآمد ہو گیا جب میں نے عاصمہ سے یہی کہا اور دانستہ اسے سنانے کی خاطر کالیا سے بد آواز بلند کر چکی تھی آواز کا مخاطب ہو کر بولا۔

”چلو، بانو بیگم! ادھر ہی کھڑے ہو کر نعمان میاں انتظار کر لیتے ہیں۔ اب اتنی دور سے آئے ہیں ہم طے بغیر تو نہیں سکتے۔“

میں کالیا کی یہ چالاکی سمجھ گیا تھا، اس طرح اندر متور موجود ”در انداز“ پریشان ہو سکتے تھے کہ انہیں ہمارا پلہ دروازے کے باہر کھڑے ہونا کو ارا نہ ہوتا، وہ یقینی طور پر یہی انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس طرح ان کا وہ کھیل بگڑ سکتا جس کے لیے وہ بجا نہ کس طرح اندر نقب لگا کر داخل ہو چکے تھے۔

”مم۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ مرزا صاحب آپ۔ اندر ہی آجائیں۔ اور اپنی بیگم کو بھی اندر لے آئیں۔“ دفعتاً ہی اندر سے عاصمہ کی آواز ابھری تھی۔ یہ در اندازوں کے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ ہم باہر کھڑے رہیں گے بجائے اندر بلا کر قابو میں رکھتے۔



جاشِ جنگ ڈائجسٹ پریس کیشن
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات



جاشِ جنگ ڈائجسٹ سنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
مالی ادب سے شایعہ نگاروں، افسانوں اور مضامینات کے خوانوں کا انتخاب
جنہیں ہر واقفم کے لاکھوں قارئین ذوقِ عشق سے پڑتے ہیں

جہاں جہاں ادب پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل بہاؤ سبکی سے چلتے ہیں

63-C میز نو ایکسپینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

ہم دونوں محتاط ہو گئے اور سب سے پہلے کالیا آگے بڑھا تھا جب میں نے جواب عاصمہ سے یہ کہا۔
 ”جیتتی رہو بیٹا! ہم بہت تھکے ہوئے تھے ورنہ زحمت نہ دیتے۔“

اسی وقت دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ خطرہ کسی بھی وقت وار کرنے والا تھا۔ ہم بھی محتاط تھے۔ مجھے سامنے کا چہرہ نظر آیا جہاں میری بھانجی ہوئی پہلی ہی نگاہ نے۔ سراسیمگی اور خوف کو تاڑ لیا تھا۔

کالیا بوڑھی عورتوں کی طرح سر جھکائے فوراً اندر داخل ہوا تھا اور اس کے پیچھے میں۔ وہی ہوا۔ خطرے کی بوسو گھٹتے سو گھٹتے۔ ایک بھڑکنے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میرے دائیں جانب سے ابھری تھی۔

”خبردار! آواز نکلی تو گولی مار دوں گا۔“ میں نے چونکے اور خوف زدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی تھی جبکہ کالیا نے تو اداکاری کی انتہا کر دی۔ وہ ایک ہاتھ اپنے متھے پر مار کر فرش کھائے گر پڑا۔ درانداز، جن کی تعداد دو تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ٹی ٹی بیٹلیں نظر آرہی تھیں۔ وہ دائیں بائیں سے اچانک ہی ابھر کر ہمارے سامنے آگئے تھے اور ایک نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میری بھانجی ہوئی چست نظروں نے ٹی کے بل ان دونوں کا جائزہ لیا تو ایک نیٹا ہکی مردالے شخص کو پہچان کر میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ میرا داد تھا، وہی میرا داد جسے آج صبح ہی میں نے ڈاڈا کے اڈے پر آگے گھولا حالت میں دیکھا تھا۔ باقی اس کا ساتھی اور وہ خود اپنے ”ٹھیکر“، ”میلیے اور شکل و صورت سے لیاری کے ہی معلوم ہوتے تھے۔ انداز و اطوار میں چھٹے ہوئے اور سفاکی میں بھڑپے جیسے دیکھتے تھے۔

”اڑے اور خشک! تم اس مصیبت کو سنبھالو۔ میں اس بڑے کو دیکھتا ہوں۔“

میرا داد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”بڑھا“ میں تھا اور ”مصیبت“ کا اشارہ کالیا کی طرف تھا جو صحن کے فرش پر شل کاک والے برتنے سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا، بظاہر وہ آڈا تر تھا ہی بڑا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ ان دونوں پر بیک وقت حملے کی پوزیشنیں بنا چکا ہوگا۔

”کک۔ کک۔ کیا یہاں۔ ڈڈ۔ ڈکیتی کی واردات ہو رہی ہے؟

میں نے ایک عام سے آدمی کے روپ میں ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی پوری ایکٹنگ کی۔

”کیواس بند کرو۔“ پائیں جانب والے نے درشت لہجے میں مجھے جھڑکا جبکہ دائیں جانب والا فوراً ہی آگے بڑھ کر کالیا کو دوپٹے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے ساتھ والے کو مزید باتوں میں مشغول رکھنے کے لیے کہا۔

”ارے بھائی! ہم بے قصور ہیں۔ بڑھے ہیں۔ ہمیں جانے دو۔ تم بے شک یہاں۔“ میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا اور مجھے وہ بازو سے پکڑ کر ایک کمرے میں لے آیا، ساتھ ہی اس نے ڈری بھی کھڑی عاصمہ کو بھی گھورتے ہوئے خوشخوار انداز میں اندر کمرے میں چلے آنے کا کہا تھا۔ لہذا ہمارے پیچھے عاصمہ اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے ایک طرف کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس بے چاری کا چہرہ ڈر و دہشت کے مارے پیلا پڑا جا رہا تھا اور میرا اس نہیں چل رہا تھا کہ بہن کو تسلی دیتا۔

”بہنا! گلگت کر تیرا بھائی آ گیا ہے۔“ مگر میں ابھی فہیم یا اس سے ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ ہمارا بھاڑا پھوٹ جاتا۔

کمرے میں ان کا ایک اور پستول بدست ساتھی بھی پہلے سے موجود تھا۔ وہ فہیم کے بیڈ کے سرہانے ہی اس کی طرف پستول کیے چوک کھڑا تھا۔ بستر پر دراز فہیم بے چارہ۔ خاصا پریشان اور دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ تھاہٹ سے پہلے ہی اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا خوف نے مزید زرد کر ڈالا تھا۔ تاہم ایک انجینی بوڑھے (مجھے) کو دیکھ کر کچھ بھرکواس کے چہرے پر انھن کے آچار مودار ہوئے تھے۔

”اڑے دادل سائیں! یہ کس بڑھے کو اندر لے آئے ہو؟ یہ ہمارا شکار تھوڑی ہے۔“ اسی تیسرے ساتھی نے میرا داد سے کہا۔

”شکار تو نہیں ہے پر یہ بڑھا اور بڑھی ہمارا کام بگاڑ سکتے تھے۔“ میرا داد نے کہا۔ ”اصل شکار کے آنے تک یہ بھی ادھر ہی بند رہیں گے۔“

”لیکن ہم کب تک اور کتنے لوگوں کو... یہاں جمع کرتے رہیں گے؟“ اس کے دوسرے ساتھی نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”بجوری ہے، یہ دونوں ڈھیٹ تھے، اس چھوکری نے بہانہ بھی کیا تھا مگر یہ باہر۔“

اس کی آواز صحن میں ہی انک گئی۔ کیونکہ اسی وقت باہر صحن میں عجیب سی آواز ابھری تھی، جیسے کوئی اٹھا چٹا چٹا گئی ہو۔ مجھ سمیت یہ دونوں بھی چونکے تھے۔

نمکین غزل

سوئی چھہ جائے تو نیزے کی انی کہتے ہیں
اسے محبوب کی نازک بدنی کہتے ہیں
آنکھ میں ان کی جو کنکر بھی کبھی پڑ جائے
اپنے اوپر وہ اسے تنک زنی کہتے ہیں
کوئی کھسپانی ہنسی ہنس کے اگر چپ ہو جائے
ایسی خاموشی کو اب کم سختی کہتے ہیں
کون شوہر ہے جسے خوف نہ ہو بیوی کا؟
سبھی اس شہد کی کمی کو ہنسی کہتے ہیں!
ڈال کر لوگ یہاں اونٹ کے منہ میں زیرہ
فخر سے خود کو غنی ابن غنی کہتے ہیں!
اُن پہ تنقید اگر ہو تو نہ جانے کیا ہو
رائے دینے کو جو ہمت ٹھٹھی کہتے ہیں
لٹنے والے کو کہا جاتا ہے کم عقل یہاں
لوٹنے والے کو قسمت کا دھنی کہتے ہیں!
چھوڑ کر ملک، سیاست کی زباں میں راہی
عیش کرنے کو غریب الوطنی کہتے ہیں!

عظیم راہی

کے سلسلے میں کسی شکش کا شکار رہے ہوں گے۔ میں درحقیقت
کالیا کی ممکنہ مدد کے لیے ہی باہر مچن کی طرف لپکا تھا۔
کیا دیکھتا ہوں، بشکرو اور ہائین نامی دونوں ”دراغراز“
مچن کے فرش پر پڑھیر پڑے تھے جبکہ میرداد سے کالیا زور
آزادی میں مصروف تھا۔ پستول ابھی تک میرداد کے ہاتھ میں
تھا جبکہ کالیانے اس کا وہی ہاتھ مرڈر رکھا تھا۔ دونوں ایک
دوسرے کے ساتھ اچھے ہوئے تھے مگر کالیا کی گرفت مجھے کمزور
پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرداد نے وحشیانہ غراہٹ
کے ساتھ ایک جھکا دی اور کالیا کو کھوٹی پٹے کے انداز کا داؤ
لگا پا، کالیا اچھل کر دو قدم پیچھے کوڑھکڑا گیا اور مزید بدستہی
ہوئی کہ فرش پر اٹنا ٹھیل پڑے اس کے ساتھ ہیوں کے جسم سے
اس کے پاؤں گھرائے تو وہ ٹھیلنے کی کوشش کے باوصف۔ الٹ
کر پٹ کے بل گر پڑا۔

میرداد کے ہاتھ میں ہنوز پستول نظر آ رہا تھا اور یہی وہ
وقت تھا جب وہ مجھ پر یا کالیا پر گولی چلانے کا ارادہ کر رہا تھا
کہ نہجانے میرے اندر کیا یک اتنا جوش کہاں سے عود آیا تھا یا
پھر ”تیار موت“ کو سامنے دیکھ کر ہٹا کا جذبہ ایک اونٹنی طاقت
بن گیا تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور

”اڑے ہائین! کیا معاملہ ہے باہر؟ کہیں شکرود نے اس
بڑھیا سے پتکا تو نہیں لے لیا؟“ میرداد نے سامنے سے کہا اور
وہ ہائین نامی اس کا دوسرا سا بھی پستول لیے کمرے سے نکلتا چلا
گیا۔ میں جان چکا تھا کہ کالیانے بڑھیا کے روپ میں کوئی کل
کھالیا ہے۔ میرداد نے میرا بازو چھوڑ دیا اور حکمانہ درستی سے
بولاً۔

”ادھر بیٹھا چپ کر کے۔ ذرا بھی آواز نکالی یا کوئی گڑبڑ
کی تو۔“ ایک بار پھر اس کا جملہ ادھر راہ گیا مگر مجھے حیرت ہوئی
تھی، کیونکہ پہلے کی طرح اس بار باہر مچن میں کوئی ایسی ذرا بھی
آواز نہیں ابھری تھی جو اسے چونکانے کا سبب بنتی لیکن۔ یہ
کیوں ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

”اڑے کیا ہو رہا ہے وہاں؟ تم دونوں ایک دم خاموش
کیوں ہو گئے ہو؟“ اب میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی
کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا کالیانے دونوں کو ای چالاکی اور
دھوکے سے باری باری گولی چلانے کا ریک لیے بغیر ہی
”انٹا غفل“ کر دیا ہے اور اب میرداد کی باری تھی۔

”اوئے۔ خبردار جو ادھر سے لے بھی اور تم۔“ وہ مجھے
تہدید کرنے کے بعد بیڈ پر نیم دراز نیم کو بھی آخر میں دھمکاتے
ہوئے بولا۔ ”ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا اور تم بھی یہاں
سے مت ہلنا چھو کر!“ اس بد بخت نے آخر میں عاصمہ کو بھی
دھمکایا۔

میرداد کی یہی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ نیم دونوں ناگھوں
سے معذور تھا جبکہ میں تو پہلے ہی ”بوڑھا“ تھا اور بوڑھا تو ہوتا
ہی ”کمزور“ ہے، یہی سوچ کر وہ ہمیں محض دھمکانے سے کام
چلا کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کمرے سے
نکلتا چلا گیا تو کمرے سے نکلتے ہی میں نے عاصمہ بہنا اور
بھائی نیم سے اپنی اصل آواز اور سرگوشی میں ازراہ قتل کہا۔

”بھینا! بھائی! یہ میں ہوں، نوی، باہر بڑھیا کے روپ
میں میرا سا بھی کالیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں انشا اللہ سب
ٹھیک ہو جائے گا۔“ میری بات سن کر اوڑاں پہچانتے ہی ان
دونوں کے چہروں پہ پہلے حیرت اور پھر خوشی کے آثار ابھرے
تھے، ٹھیک اسی وقت ایک بار پھر میری سنسنکتی ہوئی ساعتوں
میں۔ کمزور کی بجائے اس بار کسی کی کراہتی آواز ابھری، یہی
وہ وقت تھا جب میں پھرتی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔
ایک نظر ابرجھکی ہوئی کمر والے ضعیف بڑھے کو اس طرح کی
پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر بھینا نیم پر حیرتوں کے
پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، تاہم وہ دونوں شاید ہنوز مجھے پہچاننے

اچھل کر اس پر جا پڑا، یوں کہ اس کے پتول والے ہاتھ کی کلائی پر میرا مکہ بڑے زور سے پڑا۔ ڈیل ڈول میں ہم برابر ہی تھے۔ البتہ اس کا ہم میرے مقابلے میں ذرا کسرتی تھا۔ مکے کی ضرب سے پتول تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا مگر میں اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس نے غرا کر میرے پیٹ پر لات رسید کر دی جو خاصی زور آور ثابت ہوئی۔ میرے حلق سے چیخ سی خارج ہوئی اور میں الٹ کر پیچھے جا گرا، وہ پتول اٹھانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا مگر میں نے بھی اپنے ہوش و حواس ختم نہیں ہونے دیئے تھے اور اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں کے بیچ لے آیا۔ وہ منہ کے بل مگر نے لگا مگر کمال مہارت و پھرتی کے ساتھ خود کو بچا گیا اور دوبارہ پتول اٹھانے کے لیے جھکا۔ اسی وقت کالیا نے اس پر چلاٹک لگا دی تھی اور وہ اسے رگیدتا ہوا فرش پر میرے بالکل قریب ہی گرا تھا۔ اس طرح کہ میرا دکانچہ بالکل میرے قریب تھا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے سر کی ایک زوردار لکڑی اس کی ناک پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، میں رکنا نہیں اور دوسری لکڑی ماری۔ ایک جوش جنوں جیسی کیفیات طاری ہونے لگی تھیں مجھ میں۔ میرا دانے اپنی ٹانگ کا ایک ٹھٹھا سیڑ کر میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہا تھا مگر میں پہلے ہی اس کی یہ حرکت بھانپ کر فوراً سے پیشتر پیچھے کی جانب لڑھکتی کھا گیا تھا۔ اس کا دار خالی جانے تک کالیا اس پر حاوی ہو چکا تھا کیونکہ وہ میرا داسے دوبارہ دو بدو بھڑنے کی بجائے اس کے پتول پر قبضہ بجا چکا تھا۔

”بس میرا دادا! کھیل ختم۔ شرافت سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے شعلہ لگتی نظروں سے میرا داکو گھورتے ہوئے پُرجن آواز میں کہا اور ساتھ ہی مجھ سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے مگر کی؟“

جواب میں اپنے سر کو ثباتی جنبش دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔
”تم زہم نہیں بچ سکتے کالیا! اور نہ ہی تمہارا یہ سامی۔“
میرا دادا اٹھتے ہوئے خوف و لرزے لہجے میں کالیا سے بولا تو میں نے دیکھا کالیا اس کی دھمکی سے ذرا بھی خائف ہوئے بغیر اسی لہجے میں بولا۔

”کسی محمضہ میں مت رہنا میرا دادا! تم لوگوں نے خود اس خون ریز جنگ کی ابتدا کی ہے اور ہم نے اب تک جو کیا وہ اپنے دفاع کی حد تک کیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، اینٹ کا جواب اب پتھر سے دیا جائے گا۔“
”تم بھی کسی بھول میں مت رہنا کالیا!“ میرا دغرا کر

اس سے بولا۔ ”ہمارے تین آدمیوں کو تم مار چکے ہو، کتوں کو مارو گے تم؟ میرے پیچھے ساتھیوں کی پوری فوج ہے۔“ اس کے لہجے میں غرور تھا، وہ گا ہے بگا ہے میری جانب بھی گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ تب ہی میں نے بھی بلاخلاف اس سے مخاطب ہا کہا۔

”میرا دادا! ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی ہم تم لوگوں کو جانتے ہیں لیکن یاد رکھنا، تمہا ہم بھی نہیں مگر ساتھیوں کی فوج پالنے کی بجائے ہم چند ایسے سامی ضرور رکھتے ہیں جو دس پر ہماری ہوتے ہیں، رہی بات تمہارے پہلے ساتھی جو کی ہلاکت کی تو اس نے ایک شرمناک جرم کیا تھا۔ میری بہن کو اغوا کیا تھا اس نے روپوں کے لالچ میں۔ اور ہم نے اس کی گرفت سے بہن کو چھڑا لیا تھا بغیر کسی جان لے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس کا بدلہ بخوسے لیے مگر ہم نے بات یہیں ختم کر دی۔ لیکن جو پھر بھی باز نہیں آیا اور جس سے اس نے اس کھٹیا کام کے لیے پیسے لیے تھے وہ خود جو کی جان کا دشمن بن گیا تھا اور اس نے اپنے روپوں کی واپسی کا تقاضا کیا تو جو پھنس گیا، آخر اس نے اسی آدمی (سیٹھ ستار) کے کہنے پر میرے سامی کالیا کو فریال بنانا چاہا تو وہ مارا گیا۔ اب تم خود بتاؤ کہ تمہیں اس سارے معاملے میں کسی دشمنی کا رنگ نظر آتا ہے یا لا لچ۔“

میں نے سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں اسے حقائق بتا دیئے اور ذرا توقف کے بعد دوبارہ اس سے بولا۔

”ہم خون خرابہ نہیں چاہتے۔ اگر پھر بھی تم ہم پر جنگ مسلط کرنا چاہتے ہو تو، تمہاری مرضی۔ چوڑیاں ہم نے بھی نہیں پہنی ہوئی ہیں۔“

”مجھے علم ہو چکا ہے ان ساری باتوں کا۔“ میرا دانے کہا۔ ”ایسی بات تھی تو تمہیں ہم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔“ اس کی ڈھٹائی پر مجھے غصہ آ گیا۔ کالیا نے بولنا چاہا تو میں نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس سے بولا۔

”ہمیں کیا معلوم کہ جو کون تھا اور اس کے سر پرست کون تھے؟ نہ ہی ہمارا پہلے کسی اس سے ایسا کوئی واسطہ پڑا تھا۔ صاف اور اصولی بات ہے۔ اس نے ایک جرم کیا اور اس کی اسے سزا مل گئی۔ بس۔ بات سمجھ میں آئی ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ہم بھی میدان میں اترے ہوئے ہیں، ہر چوٹ کا سود کے ساتھ جواب دیں گے ہم بھی۔“ میرے ختم ٹھوک کر کہنے والے الفاظ نے میرا داکو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے کالیا سے کہا۔

رابطہ کر کے اسے بھی مختصر صورت حال بتائی اور عاصمہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اب کچھ روز اسی کے پاس رہے گی۔ زہیرہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر وہ بھی اس نئی پریشانی سے غورمند ہو گئی تھی۔ باقی کی تفصیل بعد میں بتانے کا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور استاد بھابھا کو ساری بات بتادی۔

”میں ابھی فیاض جمالی سے بات کرتا ہوں۔“ وہ اپنے کرتے کی جیب سے فون نکالتے ہوئے بولا۔

”نہیں استاد!“ معافی کا لیلانے منع کرتے ہوئے بھابھا سے کہا۔ ”فیاض جمالی ابھی تو یہاں سے گیا ہے، اسے ابھی اپنا کام کرنے دیں۔ ہمیں پہلے جتن ڈاڈا سے بات کرنا پڑے گی۔ اس سے بھی ہماری اچھی خاصی سوچ ہو چکی ہے لیکن پہلے جینکو سے بات کرنا ہوگی نہیں۔ اس سلسلے میں۔“

کالیانہ کا رائے نامہ مشورہ ہمیں مناسب لگا تو بھابھا کی اجازت سے اس نے اسی وقت جینکو سے رابطہ کیا اور اس سے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں بتا ڈالا۔ جینکو نے گویا چھوٹے ہی کالیانہ کی اس عمل کی تعریف کر دی اور کہا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ میرا دادو وغیرہ کو اس حملے کے باوجود کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ صلح کی طرف۔ یہ بھی تمہارا ایک اچھا اقدام سمجھا جائے گا۔“

”لیکن جینکو! ایسا نہ ہو کہ ہماری صلح کی روش کو وہ لوگ ہماری کوئی کمزوری سمجھ لیں۔“ کالیانہ نے فوراً کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن۔ یہ کر کے دیکھ لو مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت ہمارے ساتھ دوبارہ کی گئی تو میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔“ کالیانہ کالج وائس تھا۔

”تم فکر نہ کرو اور مجھے چند منٹ دو۔“ جینکو نے کہا۔ کالیانہ نے سیل کا وائیڈ اسپیکر آن کر رکھا تھا تاکہ ہم بھی اس کے اور جینکو کے درمیان میں ہونے والی گفتگو کو سن سکیں۔

”ٹھیک ہے جن ڈاڈا سے ابھی بات کرو۔ وہ اب اس سلسلے میں کیا کہتا ہے، پھر مجھے بتاؤ۔“ یہ کہہ کر کالیانہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب اس تازہ واقعے کے بارے میں فیاض جمالی کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔“ استاد بھابھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی کہ اب ہم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر کالیانہ نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو ہاتھی جنبش دی اور بھابھا نے اپنے سیل فون پر بالآخر فیاض جمالی سے رابطہ کر کے آج والے واقعے کے بارے میں اسے بتا دیا۔

”کالیانہ! ان لوگوں کو جانے دے لیکن اگر انہوں نے پھر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ان کے علاقے میں جا کر ان سے بدلہ چکائیں گے۔ جنگ تو جنگ سہی۔ ڈرنے والے ہم بھی نہیں۔“

”ابے لے جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“ کالیانہ میری طرف حیرت سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”انہیں کیسے زندہ چھوڑ دیں۔ انہوں نے ہمارے گھر میں گھس کر ہم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں ان کو.....“

”کالیانہ!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے ہماری ان سے آنے سنانے بات نہیں ہوئی تھی مگر آج ہو چکی ہے۔ لیاری میں ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ ہم انہی کے ذریعے سے ہی میرا دادا اور اس کے دونوں ساتھیوں کو حوالے کریں گے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارے ساتھ کچھ برا ہوا تو یہی آدمی سب سے پہلے ہمارا ٹارگٹ ہوگا۔“ میں نے میرا دادی کی طرف اشارہ کیا۔

حالات معمول پر آتے محسوس کر کے عاصمہ بھی ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر نکل آئی تھی مگر میں نے عاصمہ کو اندر جانے کا کہا تو وہ پلٹ گئی۔

کالیانہ نے سب سے پہلے میرا دادا کو رکن بستہ کیا اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر اس کے دونوں بے سدھ پڑے ساتھیوں کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور پھر تینوں کو کھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور بند کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر کالیانہ اور میں نے پہلے اپنا ریڈی میڈ میک اپ صاف کیا تو فہیم اور عاصمہ ہمیں پوری طرح پہچاننے کے قابل ہوئے مگر وہ اسی صورت حال سے ابھی تک ڈرے ہوئے تھے، ہم نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ وہ دونوں بے چارے مزید خوف زدہ ہو گئے مگر کالیانہ اور میں نے انہیں تسلیاں دیں کہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وغیرہ۔

اس کے بعد ہم نے وہی کیا جس کی ہم پہلے سے حکمت عملی تیار کر کے آئے تھے۔ یعنی عاصمہ اور فہیم بھائی کو کار میں اپنے ساتھ سوار کر کے سب سے پہلے ایڈووکیٹ زہیرہ کے ہاں پہنچے، وہ تو گھر پہنچیں تھی، البتہ خالہ نجو کے پاس ہم نے عاصمہ کو چھوڑ دیا اور وہاں ہی میں فہیم کو لے کر استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے۔ اسی دوران میں نے عاصمہ اور فہیم کو موجودہ صورت حال... کی سبب کی باتیں کی۔ کالیانہ نے اپنے سیل فون پر اڈے پر پہنچتے ہی میں نے ایڈووکیٹ زہیرہ سے فون پر

حسب توقع اس نے بھی اسے اچھی پیش رفت قرار دیا کہ ہم نے ان کے حملے کے باوجود انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اس کے برعکس انہیں آزاد کرنے کا بھی ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم وہیں بیٹھے اسی مسئلے سے متعلق باتیں کرتے رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد کالیا کو جینکو کی کال موصول ہوئی۔

”جین ڈاڈا سے میں نے بات کر لی ہے۔ وہ اپنے آدمی بھیج رہا ہے تمہارے گھر مجھے پتا بتا دو۔“

”اس نے کہا کیا ہے؟ پہلے یہ تو بتاؤ؟“ کالیا نے فوری طور پر اسے کوئی جواب دینے کے بجائے پوچھا تو جینکو بولا۔

”اس نے بھی وہی بات کی ہے کہ یہ ہمارا ایک اچھا فیصلہ ہے مگر ابھی سے اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میرا دادا گروپ ایک دم صبح پر آمادہ ہو جائے گا، ہاں البتہ اس طرح صلح کی جانب اچھی پیش رفت کی امید ضرور کی جاسکتی ہے۔“

”وہ ہم سے صلح کریں یا نہ کریں لیکن ایسا پہلی اور آخری بار ہی ہوگا۔ اس کے بعد ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“ کالیا نے کہا۔

”ہاں! ہاں یا رکالیا! میں نے جین ڈاڈا سے ساری بات کہہ ڈالی ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے، جین ڈاڈا اسے کہہ دو، اپنے آدمی بھیج دے میں پتا بتاتا ہوں لیکن ذرا ہولڈ کرو۔“

کالیا نے بھما بھما اور مجھ سے مشورہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرا دادا اور اس کے دونوں ساتھیوں کو مصغور اوالے مکان میں لے جاتے ہیں اور وہیں کا پتا بھی بتا دیتے ہیں۔

”نہیں۔“ بھما بھما نے کالیا کے مشورے کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ان تینوں کو ادھر ادھر لے جانے کا رسک نہ ہی لو تو اچھا ہے۔ یہ معاملہ جلد سے جلد منٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے، جینکو کو نعان کے گھر کا ہی پتا بتا دو۔“

اس کے بعد کالیا نے میرے گھر کا پتا اسے بتا دیا اور وقت بھی۔

اور پھر۔ استاد بھما بھما کے ہی مشورے سے ہمیں جانے کی بجائے۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو میرے گھر روانہ کر دیا تاکہ میرا دادا وغیرہ کو جین ڈاڈا کے آدمیوں کے حوالے کیا جاسکے۔ میں نے بھما بھما کے ان مذکورہ دو آدمیوں کو اپنے گھر کی چابی دے دی۔ وہ روانہ ہو گئے۔

اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر یہ معاملہ بھی بہ خوبی منشا دیا گیا اور ہم نے قدرے سکون کی سانس لی تھی۔

”کالیا! مان گئے تھے۔ تم نے بروقت یہ اچھا فیصلہ کیا

تھا ورنہ اگر تم انہیں کوئی جانی نقصان پہنچا دیتے تو دشمنی کی یہ آگ مزید بھڑک سکتی تھی، اب کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ اس میں کچھ کمی آجائے گی اور لیاری میں موجود ہمارے یہی خواہ بھی ہمارا اچھا اور خاطر خواہ دفاع کریں گے، ان پر بھی ہمارا اچھا اثر پڑے گا۔“ استاد بھما بھما نے جب تو صلی لہجے میں کالیا سے کہا تو وہ متعین خیر انداز میں میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”استاد! یہ میرا کمال نہیں اپنے اس یار دار۔ نومی کا کمال ہے ورنہ میں تو ان تینوں سالوں کو ادھر پہنچانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ میں دشمنوں کو اسی طرح کا جواب دینے کا قائل ہوں۔ اس طرح کی صلح صفائیوں کو تو میں کمزوری سمجھتا ہوں جس سے دشمن اور اکڑتے ہیں۔“

”اوہ! اچھا!“ بھما بھما نے حیرت اور متاثر کن انداز میں اپنی بھونیں اچکا کر میری طرف دیکھا تھا۔ ”پھر مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ آج ہی ختم نہیں ہوئے گا، اسے ادھر ہی بریک لگ جائے گی۔“

”انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

☆.....☆

ہم اپنا کام کر چکے تھے، مگر کو خالی چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ میں نے گھر پر ہی رہنے کا ارادہ کیا تھا اور کالیا بھی بعد اصرار میرے ساتھ تھا۔ حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ جب میں کام پر نکلوں تو وہ بھی اپنے کام سے نکل جایا کرے گا اور پھر میرے لوٹنے پر وہ بھی آجایا کرے گا۔ میں چپ ہو رہا تھا۔

میری خواہش کے مطابق کالیا نے میرے لیے آرام لائنس بننے کے لیے دے دیا تھا۔ میں خود اس کے ساتھ متعلقہ آفس گیا تھا۔

بہر طور میں اب دوسرے معاملات کی طرف متوجہ ہوا اور اڈے کا رخ کیا۔ وہاں چاچا انور شاہ میری وجہ سے فکر مند ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک چوٹکا دینے والی اطلاع سنائی۔

”برخوردار نومی! حاجی مہران خان آیا تھا تم سے ملنے کے لیے۔“

لینڈ فانی کی جیفس کے ایک ”بڑے“ کی اڈے پر آمد اور مجھ سے ملنے کی حامی کی یہ اطلاع میرے لیے چوٹکا دینے والی تھی اور غیر معمولی بھی پل کے پل مجھے ایک اور جنگ کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

(جاری ہے)

(نزابت اشغال فتح جنگ کا جواب)

گفتہ یاکین.....کراچی

یہ سب دکھاوے کی ہے ٹیپ ٹاپ ورنہ ظریف
کرید کر جسے دیکھو گے کھوکھلا ہوگا

احمد علی.....پشاور

یاد محبوب میں آنکھوں سے ٹپکتا ہوا لبو
دل میں ہو سوزش پیہم تو غزل ہوتی ہے
خوش بخت.....بکھر

یوں تو جیسی بھی پلا سا کی رہے اتنا خیال
دور سے آئے ہیں سن کے ترے بیخانے کا نام

سید احسان.....خانپور

یہ تصویر جہاں بے رنگ ہوگی
ہمارا خون اگر شامل نہ ہوگا
(عبدالکیم شکر کراچی کا جواب)

ناہید سلطانہ.....پشاور

یوں ہی کہا گئے ہیں ہم دم کسی ہم فریب منزل
کبھی ہم نکل گئے ہیں رہ عشق میں سنبھل کر
عطا محمد.....عمان سعودی عرب

یہ بھی ایک کرشمہ ہے ان حسین یادوں کا
داغ دل چپکتے ہیں پھر بھی گھپ اندھیرا ہے
محمد اسلام بھٹو.....لاہور

یہ ہی تو فلسفہ ہے ارتقاء کا
حقیقت بن گئی رنگین فسانہ
(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

راجیل پراچہ.....کراچی

اک ذرا سی بات پہ میں نے سکھ کا دہن توڑ دیا
اب وہ ذرا سی بات نہ پوچھو چھوٹی بات بڑھائے کون
احمد علی.....سوات

آکھ سے گر کر اک آنسو نے
جانے کہاں تک بات بڑھا دی

اعظم الدین.....کراچی

اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
انہیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات
اکبر حیات.....لاہور

اف ری مجبوریاں محبت کی
ہوٹ خنداں ہے آکھ پُر نم ہے
(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

عبدالستار.....ساہیوال

دشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجھوں نظر آتی ہے لیلیا نظر آتا ہے
(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

شبیر حسن.....سرگودھا

اٹھ گئے غمگسار باکین سے
رہ گیا صرف چارہ گر تنہا
اختر علی اختر.....جہلم

اے جرم ہم غزل ہی کے پردے میں کہہ گئے
ناکام زندگی کی کہانی کبھی کبھی
فیروز احمد.....ڈی آئی خان

آہوں کا یہ تقاضا ہے کہ جاگیں کچھ اور
سائے ڈھلتے ہیں تو پھر نیند سی آجاتی ہے
(اقرا ماہر ناگوری کراچی کا جواب)

عندلیپ مظہر.....ملتان

اندھیرا ، قاصطے ، تنہائی ، یادیں
کوئی میری طرح جی کر دکھائے
شہناز فرحت.....لاہور

آنسوؤں کی چھاؤں میں تم جو مسکرا دیے
شبیشی نگاہ میں صبح کچھ ٹکڑ ٹکڑ
ارتضاء ملک.....لاہور

اب تو آسمان رشک کرتا ہے
اتنا کافر بنا گیا کوئی

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

اس فاروقی..... لیہ

آہ اب یہ بھی مجھ کو یاد نہیں
آنکھ کب میری شبی نہ رہی

الیاس حسن..... روپڑی

اس شوق جتو کی ہمیں داد کون دے
آئے ہیں خود کو ڈھونڈنے تیرے دیار میں
اشتیاق احمد..... کراچی

امرت نہیں دیتا جو ہونٹوں سے تو پھر
لا زہر ہی آنکھوں سے پلا دے ساکی
(نامہ تحریر کراچی کا جواب)

زہمت پروین..... کراچی

یہ دن بھی مبارک ہے ملو آکے گلے سے
پھر ہم سے کہو ذرا عید مبارک
احمد یار خان..... پشاور

یہ محفل میں تو نے غزل کیسی کہہ دی
کہ دیوار و در کو بھی وجد آیا
انوار حسین..... سرگودھا

یہ کیوں خنداں لبی کے ساتھ میں نے پی لیے آنسو
لیوں پر آگئی کیوں کر ہنسی کہتے نہیں بنتی
(احمد علی ساگھڑ کا جواب)

شیر شاہ..... کشمور

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آسکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں
(منظر علی لاہور کا جواب)

سعید حسن..... لاہور

گہہ ناز کے الطاف فراواں ٹا
دل کو لیکن گلہ کم تنگی آج بھی ہے
(شہناز فرحت لاہور کا جواب)

عبدالجبار رومی..... قصور

فقط گزارش سے کام نہیں چلنے والا
دل حسن محبت ہے ذرا دیکھنے تو دو
(الیاس حسن روپڑی کا جواب)

زنابت انشاں..... فتح جنگ

چلو اس قدر تو توجہ ہوئی
میرے واسطے زہر لایا گیا

(حکیم سید محمد رضا شاہ مایووالی کا جواب)

اختر شاہ عارب..... جہلم

یوں ہی چپکے چپکے رونا یوں ہی چپکے چپکے باتیں
بڑی کشمکش کے دن ہیں بڑی الجھنوں کی راتیں

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

نوشین عابد..... لاہور

اسی ندی کے کنارے تھا ایک ہار سنگھار
جہاں ہوا تھا مری زندگی کا پہلا پیار
نوازش علی..... لاہور

اک بار اگر پہنچ جائیں جو وہ کسی محفل میں
رنگ اپنا جمالیں گے دزدیدہ نگاہوں سے
انوشہ نوید..... گجرات

آپ سے اک عنایت کی نظر ہو نہ سکی
میں نے تن من بھی لٹایا تو برا مان گئے
شیر شاہ..... کشمور

ان کے عاشق کی دمک کو استعارے بخش کر
پہلے فن تنویر قدیل حرم تک لے گئے
عشنا عباس..... جہلم

آپ ذرا دیکھتے تو آکر
کیا کچھ ہے شاداب کے پاس
عارفہ جہانگیر..... پاک پٹن

آپ جائیں جو سحر کشن کو
رنگ اہل چمن نکھر جائے
رفیق احمد ناز..... ڈی جی خان

الوداع رخصت یار کی گھڑی اب الوداع
پیا ملن کی آس تھی بڑی اب الوداع
(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

انتظار مہدی..... نوشہرہ

یہ دکھ نہیں کہ اندھروں سے صلح کی ہم نے
ملا یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سسٹمز □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا یا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوہن کے مہر لاپے جولایت مودہ 30 نومبر 2017، تک علمی آزمائش 143 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ / ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63/II پکیشن ڈسٹری بیوٹرز اتحادی مین کوآرڈی رور، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

نومبر 2017ء

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **104**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

ماہنامہ سرگزشت

علمی آزمائش۔ 143

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ سسر گزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جامسو سی ڈائجسٹ اور ماہانہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صبحی سرگزشت“ کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح ہر ڈاک کیچے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1952ء سے لے کر 2004ء تک افسانوں کے 9 مجموعے آئے۔ 1953ء سے لے کر 1995ء تک پانچ ناول شائع ہوئے۔ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ میرٹھ سے 1946ء میں ایم اے کر کے پاکستان آئے۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام۔

علمی آزمائش 141 کا جواب

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء میں پیدا ہوئیں۔ اسلامیہ کیمبرج اسکول پھر رانگٹن اسکول سے انساب کیا اور رضویہ گرلز اسکول سے میٹرک۔ سرسید کالج سے جامعہ کراچی پہنچیں۔ سرکاری ملازمت حاصل کی۔ شعر و شاعری میں نام پیدا کیا۔

انعام یافتگان

1۔ عماد حسن (سکھر) 2۔ انیس احمد (مظفر گڑھ) 3۔ حسن علی زیدی (شجاع آباد)

4۔ ارباب محمد (پشاور) 5۔ صبیحہ شاہ (لاہور)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے محمد یونس جمال، وردہ بول، اکبر علی ریسائی، ارشد علی، منیرین اختر، اسرار احمد، مولابخش، تنویر حسین، ہارون محمد، نواب خان، عطیہ نورین، خادم حسین، نسreen عزیز، تبسم عرفان قریشی، پروین بیگم، نواب سلیم کھوکھر، مبوش علی خان، فرحین بشیر، فیروز رحمانی، عبدالغنیہ شمر، ناعمہ تحریم، جلیل احمد جعفری، مہر خورشید، آفتاب احمد نصیر اشرفی، غنیہ مضاہر، باسط فاروقی، صوفی تبسم، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نیل اختر، الیاس محمد خارج، عنایت سحر، عنایت مسیح، الیاس محمد، طفیل احمد، انعام گل، محمد احمد، منظر

حسن، انیس بھنو، نبیم بیٹ، سعید الدین، مروٹ، فرحت عباس نقوی، بختین سید، غلام حسن، نظر حسین، صاحب مرزا، یاسین خان، قیام الدین۔ لاہور سے عباس رضا سید، توصیف باری، یاسین فرحت، نعیم عباس، اقبال اصغر، آل بختین نقوی، مصباح الرحمٰن علی نواز کارگلی، عبدالخالق، اصغر علی اصغر، قاضی حسین رضوی، صابر خان، احمد علی بیٹ، نواز کبیر، نوید احسن، سلمان احمد، تاثیر احسن۔ ملتان سے امام بخش، عرفان احمد شاہ، ڈاکٹر عدیب، عبدالغنی شکیل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، خالق حسن توسیقی، نسیم احمد، نصیر شاہ، نوید اختر، فیروز اختر، وردہ فاطمہ، اکبر علی خان، حیدر آباد سے ماہ رخ ڈنٹ زہرہ، موسیٰ مشہدی، دردانہ حسن، کاشف علی کاشف، صباح مرزا، نعمان صدیقی، اکبر علی رند، نواز علی خان، ابرار مصطفیٰ، نیاز مگسی، آصف علی آصف، بنگرے محمد عارف قریشی۔ راولپنڈی سے رضوان احمد ہاشمی، ظفر اقبال ظفر، توصیف حسین، مسعود اطہر، افتخار حسن، طارق ظفر، معین انور، عتیق الرحمن خان، زکی سید، تقی عباس تقی، نوید مرزا، فرحت حسن۔ اسلام آباد سے انور یوسف زکی، نیلوفر شاہین، بشیر احمد بشیر، مخضر عباس مرزا، احمد ڈیشان، خالد عثمانی، ارشاد بانو، ماہ جبین فاطمہ، عزیز الحسن، نعیم اختر۔ واہ کینٹ سے محمد فیض، انیس الرحمن، مقدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح باب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، نعت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ شاہین اشفاق، سعید اختر، رومناز، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، بندہ یتیا، فیصل آباد سے محمد زاہد، ناصر عبدالعزیز (سندری)۔ جھنگ سے عطا مصطفیٰ۔ گوجرانوالہ سے الف اے کوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان تنک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہان زیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ، انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، نصیر انوار، عظمیٰ اکملی نواز، عتیق الزماں، خضر حیات، شجاع آباد سے حسن علی زیدی، نعیم اللہ، نصیر جونئی، خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابیہام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین بٹول زہرہ۔ میر پور خاص سے محمد علی ایس بنی۔ کھاناں سے سلیم کامریہ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ جھجہ برہ ذئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان اوریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آئمہ ملک، ڈیشان مرزا، نور محمد، عباس علی، ارشد حسن خان۔ کھاناں سے سلیم کامریہ۔ ساکھر سے عاشق حسین منگل۔ لودھراں سے ڈاکٹر سعادت علی خان۔ بورے والا سے رانا محمد شاہد۔ سیالکوٹ سے موسیٰ اقبال۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز۔ قصور سے عبدالجبار روہی۔ فتح جنگ سے نظامت انشال۔ بنیر سے فضل واحد (کیو سیل)۔ پاک پتنگ۔ علی احسن سیال، عزیز الدین، محمد اقبال چشتی، فیضان احمد، جمیل کمال، ابرار مصطفیٰ۔ بہاولپور سے ہمیرا کوکب واسطی، زہمت پروین، ثاقب اقبال، فرحمن ناز، بے بی ڈول۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکرا لوئی، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن۔ خوشاب سے اعجاز حسین سیٹھار۔ جہلم سے اختر شاہ عارف۔ کشور سے شبیر شاہ۔ شجاع آباد سے نصیر چنیوٹی، نعیم اللہ برکانی، زاہد حسین، احمد علی۔ خانیوال سے منور خان، گل محمد سپاہی۔ مظفر آباد سے کے سے ممتاز الدین، اقبال حسن، زاہد توفیق، مصباح الرضا۔ حاصل پور سے ملک احسن۔ ڈی آئی خان سے حیات محمد خان، نوید بشیر۔ چکوال سے ارشاد حسین، نصیر افضل۔ منڈی بہاؤ الدین سے اختر علی انصہانی، مگر یز اختر، نوخیز اختر، شاہد علی سلطانی۔ میانوالی سے عبدالقدوس، زہرہ علی سید، کوئین خان، انیس اقبال، فرین اقبال، نورین اقبال۔ کوئٹہ سے ناصر چنگیزی، حسن عسکری، اقبال خان، محمد افضل، فتح محمد لاشاری۔ رحیم یار خان سے نعیم الدین، بخش حسین، ملک یاسین، حبیب علی، نادر مرزا، حکیم اللہ، قازم علی، نعت اللہ۔ ساہیوال سے عبدالستار۔ کوہاٹ سے فدہ حسین طوری، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ، عقیل احمد، ناصر حسن، فدا محمد، خان اعظم خان، نصیر الحسن۔ پشاور سے مہناز عرفان، نجم شاہ، یام احمد، صغیر اختر، ظہیر الدین، انجم شاہ، نیاز احسن، اکبر علی، شاہد حسن، بلکھوم اقبال، شاہ اورنگ زیب خان۔ بہاول نگر سے انتخاب احسن، زکی امتیاز، نورین مظفر از خان۔ مظفر نگر سے نعمان ملک، ساجد علی، فاروق نیازی۔ جیکب آباد سے فہاد فتح عرفان احسن۔ میر پور خاص سے طارق حبیب، سلطان جوگیو، ذوالفقار خان، کائنات یاسین۔

ممالک غیر سے اشتیاق قرہ، انیس (یو اے ای)۔ زرغون خان، صاحب جان، اسلم قریشی (دبی)۔ نعیم احمد (نورتنو)، زیارت فاطمہ (جرمنی)، سبیل احمد (ماچسٹر)، علی ناز (بیٹنورڈ)، کاشف اقبال کاشف (ٹوکیو، جاپان)۔

زندگی میں پہلی بار کہانی، وہ بھی خود اپنی لکھی ہے۔ اس سے قبل میں صرف پڑھتی رہی ہوں۔ سرگزشت میں چھپنے والی سچ بیانیوں مجھے بہت پسند ہیں گزشتہ مہینے کی ایک سچ بیانی نے مجھے اکسایا کہ میں بھی اپنی روداد حیات لکھوں، سولہ لکھ لی اب پتا نہیں کہانی کے انداز میں لکھ سکی ہوں یا نہیں۔ اپنی حالات زندگی صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جو کسی بھی لڑکے کی مسکراہٹ کو اپنے لیے اس کی پسند سمجھنے لگتی ہیں اور اپنی آنکھوں میں خواب سجانے لگتی ہیں۔ میں نے بھی یہی غلطی کی تھی جو کچھ مجھ پر بیٹی وہ بیان کر رہی ہوں۔

نعیمہ سلیم

(اکراچی)

گیا۔ اس کے جانے کے بعد ابا کو کام کی تلاش میں مشکل پیش آنے لگی۔ انہوں نے ایک تھلے والے سے بات کی جہاں سینٹ کے بلاک وغیرہ بنتے تھے۔ اس کے پاس پہلے ہی چار متری تھے، جب وہ چاروں کام میں مصروف ہوتے تو ابا کا نمبر آتا۔ اس طرح ان کی آمدنی خطرناک حد تک کم ہو گئی۔ مجبوراً ماں کو گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ ان کے پاس تعلیم بھی دیکھنی تھی۔ لے دے کے ایک ہی صورت تھی کہ وہ کسی بڑے گھر میں ماسی کا کام شروع کر دیں۔ ہمارے محلے کی کئی عورتیں اس پیشے سے شگم تھیں۔ ماں نے ان سے ذکر کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد انہیں ایک گھر میں کام مل گیا۔

اب وہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتیں اور ان کی واپسی بارہ ایک بجے تک ہوتی۔ ان کے ذمہ کئی کام تھے۔ جن میں گھر کی صفائی جھاڑ پونچھ، آٹا گوندھنا، برتن اور کپڑے دھونا سب کچھ شامل تھا۔ ان تمام کاموں کے عوض انہیں صرف تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور کبھی بھی مالکین رات کا بچا ہوا کھانا بھی دے دیا کرتی۔ وہ مقدار میں اتنا زیادہ ہوتا کہ ہم اسے دو وقت کھاتے اس طرح ابا کا بوجھ کچھ کم ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا ہم چاروں بہن بھائی مسجد اور مدرسہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ ابا نے بہت چاہا کہ کم از کم دونوں بھائیوں کو ہائی اسکول میں داخل کروادیں لیکن وہ ان کی فیس کا بندوبست نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائی سارا

ماں باپ نے میرا نام نیرہ رکھا لیکن بچپن سے ہی سب لوگ مجھے نمونہ کہتے آ رہے ہیں اور اب یہی نام میری پہچان بن گیا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں غربت دیکھی۔ ابا کسی ٹھیکے دار کے پاس دہاڑی پر راج متری کا کام کرتے تھے۔ یہ ہوائی روزی تھی۔ کام مل گیا تو گھر میں چولہا جل جاتا اور نہ بھی، بجی فائدہ بھی کرتا نہ تھا۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا کہ پندرہ پندرہ دن تک ابا کو کوئی کام نہیں ملا۔ نہ جانے اماں کہاں سے مانگ مانگ کر ہم چھ آدمیوں کے پیٹ کا دوزخ بھرتیں۔ میرے دو بڑے بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ہم سب بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائیں لیکن ہمارے علاقے میں لڑکے یا لڑکیوں کے لیے کوئی سرکاری اسکول نہیں تھا۔ ابا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ پرائیویٹ اسکول کی فیس اور دیگر اخراجات برداشت کر سکیں چنانچہ انہوں نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو محلے کی مسجد میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے لیے بھیجا شروع کر دیا۔ اسی مسجد میں ایک مدرسہ بھی تھا جہاں بچوں کو پانچویں تک مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ صبح کی شفٹ میں لڑکوں اور دو چہر میں لڑکیوں کی کلاس ہوا کرتی تھی۔ اس طرح ہماری پرائمری تعلیم کا بندوبست ہو گیا۔ ابا کا خیال تھا کہ حالات بہتر ہونے پر وہ ہمیں کسی پرائیویٹ اسکول میں داخل کروادیں گے لیکن ان کا یہ خواب بھی پورا نہیں ہوا۔ گھر کے حالات بہتر ہونے کی بجائے بگڑتے چلے گئے۔ ابا جس ٹھیکے دار کے پاس کام کرتے تھے وہ دینی چلا



سارا دن گلیوں میں آوارہ گردی کرتے۔ کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اماں اور ابا دونوں ہی گھر سے باہر ہوتے۔ وہ دونوں دیر تک سوتے رہتے پھر ناشتا کر کے گھر سے باہر نکل جاتے۔ امجد نے محلے کے آوارہ لڑکوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گلی ڈنڈا، کچے اور تاش کھیلتا اور اماں کے آنے سے پہلے گھر آ جاتا۔ شام کو پھر وہ کھیلنے کے یہاں گھر سے چلا جاتا اور اس کی واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ رات کے کھانے کے بعد اس کا کوئی دوست بلانے آ جاتا اور پھر وہ دو تین گھنٹے بعد گھر کا راستہ دیکھتا۔

بڑی محبت کا نتیجہ بہت جلد سامنے آ گیا۔ امجد کے بارے میں نئی نئی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اس نے آوارہ لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنا لیا تھا اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگا تھا۔ پہلے اس نے ٹیلیوں اور دوکانوں سے چیزیں چرانے شروع کر دیں پھر لوٹ مار اور ہتہ خوری شروع کر دی۔ وہ سنان راستوں پر راہ چلتے لوگوں سے نقد رقم اور موٹر بائیک چھین لیتا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک پرانی موٹر سائیکل خرید لی تھی۔

ابا کو جب ان حرکتوں کا علم ہوا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ پہلے پیار سے سمجھا یا پھر سختی کرنا چاہی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کسی نے انہیں غلط خبر دی ہے۔ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا لیکن جب ابا نے اس کے دو تین کارنامے گنوانے تو وہ ڈھٹائی پر اتر آیا اور بولا۔ ”آپ ہی بتائیں پھر میں کیا کروں۔ آخر مجھے بھی تو گزارہ کرنا ہے۔“ ”تم کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے؟“ ابا نے کہا۔ ”کیا کام کروں۔ مجھے آتا ہی کیا ہے۔ اگر میرے پاس تعلیم ہوتی تو کوئی ملازمت ہی کر لیتا۔ جاہل آدمی کو تو کوئی نہیں پوچھتا۔“

”ہم بھی پڑھ لکھے نہیں ہیں لیکن محنت مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کمار ہے ہیں۔“

”اس محنت مزدوری کے عوض آپ کو کیا ملا۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”پھر اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لو۔“ ابا نے غصے سے کہا۔ ”میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں چلا جاؤں گا۔ میں خود بھی یہاں نہیں رہنا

چاہتا۔ اس گھر میں ہے کیا سوائے غربت اور محرومی کے۔“ اس موقع پر اماں نے مداخلت کی اور ابا سے کہنے لگیں۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں، جوان اولاد سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“

ابا منہ میں ہنسی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اماں نے امجد کو آڑے ہاتھوں لیا اور خوب سنائیں۔ وہ ڈھیٹ بنا ستار ہا جب اماں سانس لینے کے لیے رکیں تو بولا۔ ”تم اور ابا کچھ بھی کہو لیکن میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے اپنا مستقبل عزیز ہے۔ تھوڑے سے پیسے جمع ہو جائیں تو کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دوں گا۔ پھر تم لوگوں کو کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ امجد اتنا آگے جا چکا ہے کہ اب اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ انہوں نے چھوٹے بیٹے ارشد سے ساری امیدیں وابستہ کر لیں لیکن اس نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ بچپن سے ہی اس کا رجحان مذہب کی جانب بہت زیادہ تھا، اس نے مسجد سے اپنا تعلق برقرار رکھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے باجماعت ادا کرتا۔ رمضان میں پورے روزے رکھتا اور شرعی لباس پہنتا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی اور ہمہ وقت دینی کتب کا مطالعہ کرتا۔ اس نے تبلیغی اجتماعات میں بھی جانا شروع کر دیا تھا لیکن اسے گھر کی ذمہ داریوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ابا نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ کام کرے یا جایا کرے یا خود اپنے طور پر کوئی کام دھندا شروع کر دے لیکن اسے اپنے کاموں سے ہی فرصت نہ تھی۔ آئے دن وہ سہ روزہ اور چالیس روزہ اجتماعات میں چلا جاتا۔ اب وہ ایک سال کے لیے تبلیغی دورہ پر ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اس نے اپنا نام لکھوا دیا تھا اور شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ اس کا نمبر کب آتا ہے۔

وہ بظاہر بیچ وقتہ نمازی اور پرہیز گار تھا لیکن دنیاوی معاملات میں انتہائی متعصب اور تنگ نظر واقع ہوا تھا خصوصاً عورتوں کے معاملے میں اس کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ اس کی باتیں اور خیالات سن کر ایسا لگتا کہ سارا اسلام عورتوں پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ پہلے پہل اس نے بہنوں پر روک ٹوک کی پھر اماں کو بھی بولنے لگا۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ گھر میں کسی کو بھی نماز پڑھنے یا اسلامی شعائر اختیار کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو کی تان عورتوں پر آ کر ٹوٹتی۔ مثلاً یہ کہ

سے گھرواری میں لگ گئیں؟“
 ”بس پانچویں تک پڑھا ہے۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کوئی سرکاری اسکول جو نہیں ہے۔“
 ”اوہ۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا جیسے وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں پھر وہ بولیں۔
 ”تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ تم دونوں بیٹیں شام کو میرے پاس آ جایا کرو۔“

میں نے کہا۔ ”آپ اماں سے بات کر لیں۔“
 اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں۔ اماں آ گئیں۔ سسلی باجی نے ان سے بات کی تو وہ بے بسی سے بولیں۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے باپ اور بھائیوں سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں کل سے ہی ان دونوں کو تمہارے پاس بھیجنا شروع کر دوں گی۔“

میں جانتی تھی کہ اگر اماں نے اجازت دے دی جب بھی ارشد بھائی کبھی نہیں مائیں گے اور وہی ہوا۔ جب اماں نے ابا سے یہ بات کہی تو وہ خاموش ہو گئے۔ یہ گویا ایک طرح سے نیم رضا مندی تھی لیکن ارشد بھائی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور بولے۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے ان لڑکیوں کو سسلی کے پاس بھیجنے کی۔ وہ کون ہوتی ہے ہمارے معاملات میں دخل دینے والی۔ خود تو بے پروہ ساری دنیا میں پھرتی ہے اور ہماری بہنوں کو بھی بگاڑ دے گی اور انہیں ضرورت کیا ہے آگے پڑھنے کی؟ کون سا ہم نے ان سے نوکری کروانی ہے۔ ویسے بھی پڑھ لکھ کر لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ ہمیں ایسی تعلیم نہیں چاہیے۔ اسے منع کر دیں۔ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔“

اس کی تقریر سن کر ابا کو بھی غصہ آ گیا اور وہ بولے۔
 ”یہ جو ہزاروں لاکھوں لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ ڈگریاں حاصل کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں تو کیا یہ سب بگڑ چکی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتا۔ اب قدرت نے ایک موقع دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”ابا، سسلی باجی نے کہا ہے کہ وہ ہماری اتنی تیاری کروا دیں گی کہ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دے سکیں۔“ میں نے ارشد بھائی کو سلگانے کے لیے کہا۔

”میٹرک کر کے تم کون سی افرنگ جاؤ گی۔“ ارشد

عورتوں کو گھر سے باہر نہیں نکلتا چاہیے۔ شرعی پروہ کرنا چاہیے۔ نا محرموں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کے بھی سخت خلاف تھا لیکن مجھے اس بات پر اعتراض نہیں کیا اس لیے کہ اس نے کبھی اماں کے کام کرنے پر اعتراض نہیں کیا اس کے علاوہ اگر وہ کہیں باہر جانے کا نام لیتیں تو چیخ چیخ کر آسان سر پر اٹھا لیتا لیکن اماں اس کی باتوں کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ ان پر بس نہ چلتا تو وہ بہنوں کے پیچھے لگ جاتا۔ دوپٹا سر پر رکھو، نظریں نیچی رکھو، کسی مرد سے بات کرنے یا اس کے سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے گھر کون آتا تھا لیکن اگر کبھی بھولے سے کوئی کزن آ گیا تو ہمیں اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

زندگی اسی کٹھن زدہ ماحول میں گزر رہی تھی کہ ایک دن سسلی باجی ہمارے گھر آئیں۔ وہ اسی لائن میں دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور قریب ہی کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ویسے تو ہمارا کسی سے ملنا جلتا نہیں تھا لیکن سسلی باجی میں ایک خوبی تھی کہ وہ محلے کے تمام گھروں کی خبر گیری کرتی تھیں گو کہ ان کے مالی حالات بھی بہت اچھے نہیں تھے لیکن وہ اپنی کنجائش کے مطابق لوگوں کی مدد کرتیں اور ویسے بھی ان کے کام آیا کرتیں۔ کسی کو اسکول میں داخلہ کروانا ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ چل پڑتیں۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے محلے کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتیں۔

سسلی باجی جب ہمارے گھر آئیں تو اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں نے سبزی کاٹ کر رکھ دی تھی تاکہ اماں آئیں تو انہیں کھانا بنانے میں دیر نہ لگے۔ ابھی مجھے ہانڈی پکانا نہیں آئی تھی لیکن اوپر کے چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھی۔ مجھے چائے بنانا بھی آتی تھی۔ اس لیے سسلی باجی کو دیکھتے ہی چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ وہ میری مستحی اور سلیقہ سے بہت متاثر ہوئیں اور جب میں چائے لے کر آئی تو خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”ارے تم نے اتنی جلدی چائے بھی بنا لی۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔“

انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھی چائے بنائی ہے تم نے۔ کچھ پڑھتی دھرتی بھی ہو یا ابھی

بھائی ہاتھ نچاتے ہوئے بولے۔ ”آج کل تو ایم اے پاس جوتیاں چٹھاتے پھرتے ہیں۔ تم یہ پڑھائی کا خیال دل سے نکال دو اور گھر کے کاموں پر توجہ دو۔“

اپانے ارشد بھائی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے بیٹی تم دونوں بہنیں کل سے سسلی کے یہاں پڑھنے جاؤ گی۔ اچھا ہے کچھ پڑھ لکھ لو۔ تمہی تمہارے کام آئے گا۔“

اس طرح ہم دونوں بہنوں نے سسلی باجی کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ مجھ سے چھوٹی نسیہ کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ میری دیکھا دیکھی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ سسلی باجی کا خیال تھا کہ وہ ہمیں ایک سال میں دو جماعتیں پڑھائیں گی تاکہ ہمارا جو وقت ضائع ہو گیا ہے وہ پورا ہو جائے اگر ہمارا تعلیمی سلسلہ بیچ میں نہ ٹوٹتا تو میں آٹھویں اور نیسہ چھٹی میں ہوتی۔ سسلی باجی ہر جماعت کا کورس ختم ہونے کے بعد ہمارا امتحان لیتیں اور اگر پاس ہو جاتی تو ہمیں اگلے درجے میں ترقی مل جاتی۔

اس طرح خدا خدا کر کے میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن ہمارے گھر میں تو اس کا تذکرہ کرنا ہی بے کار تھا۔ ایک تو اپا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ میرے کالج کے اخراجات برداشت کرتے۔ دوسرے ارشد بھائی یہ کیسے گوارا کرتے کہ میں کالج میں پڑھوں۔ سسلی باجی کے گھر جانے اور کالج کی پڑھائی میں بہت فرق تھا چنانچہ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ سسلی باجی کی بھی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر دوسرے شہر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے سختی سے تاکید کی کہ میں ہر صورت میں نسیہ کو میٹرک کی تیاری کرواؤں تاکہ اس کی تعلیم ادھوری نہ رہ جائے۔

ایک دن اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن کام پر جانا بھی ضروری تھا کیونکہ مالکن کے یہاں کوئی دعوت تھی اور اس کا سارا انتظام اماں کو ہی کرنا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی مدد کے لیے ساتھ لیا اور کوشی چلی گئیں جو ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اماں مجھے اپنے ساتھ کام پر لے کر گئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے صرف کوشی کا نام اور وہاں کے قصبے سن رکھے تھے کبھی وہاں جانے یا ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کوشی کو

دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پٹی کی پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عالیشان گھر نہیں دیکھا تھا۔ خوب صورت سرسبز و شاداب لان جس میں کئی سایہ دار درخت اور رنگ برنگ پھولوں سے لدے ہوئے پودے لہلہا رہے تھے۔ بڑے بڑے کمرے، شاندار وسیع و عریض ڈرائنگ و ڈائننگ روم، جدید طرز کا کچن، قیمتی فرنیچر، قالین اور پردے۔ دنیا کی ہر نعمت اس گھر میں موجود تھی۔

اماں مجھے لے کر گھر میں داخل ہوئی تو مالکن نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام مسز نفقی تھا لیکن اماں ہمیشہ انہیں مالکن ہی کہا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک نوجوان شخص سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا وہ اتنا خوب صورت اور اسرارٹ بندہ تھا کہ اس پر کسی ناول کے ہیرو کا گمان ہوتا۔ اس نے سفید قمیص، سیاہ پینٹ اور بھروسے میں چپل پہن رکھے تھے۔ اس کے گورے رنگ پر کھنگریالے بال خوب بچ رہے تھے۔ اس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھا اور فوراً ہی میرے چہرے پر سے نظریں ہٹائیں۔

”یہ میری بیٹی ہے نمو“ اماں نے کہا۔ ”آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ کام میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔“

”اچھا کیا۔“ مسز نفقی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”آج کام بھی زیادہ ہے تم واپسی کی فکر مت کرنا۔ اگر دیر ہو گئی تو ڈرائیوئر تم دونوں کو گھر چھوڑ آئے گا۔“

اماں مجھے لے کر کچن میں آ گئیں۔ پہلے انہوں نے چائے بنائی پھر ڈبل روٹی پر مکھن اور جام لگا کر مجھے دیتے ہوئے بولیں۔ ”تو جلدی سے ناشتا کر پھر کمرہ کی صفائی بھی کر دینی ہے۔ میں جب تک کچن کا کام دیکھ لوں۔“

”مگر اماں میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔“

”تو کیا ہوا۔ یہ ناشتا بھی کر کے دیکھ۔ تجھے بھی پتا چل جائے گا کہ اللہ میاں نے دنیا میں کسی کیسے نعمتیں اتاری ہیں۔ کہے تو آلیٹ بھی پتا دوں۔“

میں کہتا چاہ رہی تھی کہ یہ نعمتیں ہمارے لیے نہیں ہیں لیکن اماں کے سامنے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ خوش ہو رہی تھیں تو مجھے اعتراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ایک تھوس پر مکھن لگایا اور چائے کے ساتھ کھا گئی۔ پھر میں نے جھاڑن اٹھایا اور گھر کی

مضائق کرنے چل دی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام بھی برائے نام تھا۔ پہلے ہی پورا گھر صاف ستر تھا۔ تمام چیزیں سیلتے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے گھر کے برعکس یہاں بالکل بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے بہت زیادہ کام نہیں کرنا پڑا۔ میں نے پہلے تینوں بندروں صاف کیے پھر ڈرائنگ روم ڈرائنگ میں نے ہلکا سا ہاتھ مارا۔ اب ایک کمر بابت رہ گیا تھا۔ وہاں گئی تو اس کا دروازہ بند تھا یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ بقیہ سب کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک تھکی۔ اسی اسرار فحش نے دروازہ کھولا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”صاحب جی اس کمرے کی مضائقہ کرنی ہے۔“
 ”تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کمرے کی مضائقہ میں خود کرتا ہوں۔“
 ”کی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔“
 ”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے دروازہ کی چوکت پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے آپ مضائقہ کریں۔“
 ”تم نہیں سمجھو گی۔“ وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ”دراصل اس کمرے میں انتہائی قیمتی اور نادر و نایاب کتابیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان پہنچے۔“

وہ اتنی مشکل زبان بول رہا تھا کہ اس کی آدمی بات میری سمجھ میں آئی اور آدمی نہیں۔ میں نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ چاروں دیواروں پر الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک درمیانہ سائز کی میز تھی جس پر کمپیوٹر، ٹیبل لیپ اور کچھ فائلیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک جانب کاؤچ رکھی ہوئی تھی۔ مجھے تو ویسے بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ دل چاہا کہ میز پر رکھے ہوئے رسالوں پر ایک نظر ڈال لوں لیکن وہ تو مجھے کمرے میں ہی نہیں آنے دے رہا تھا۔ بھلا رسالوں کو ہاتھ لگانے کیوں دیتا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے پاکی سے بولی۔ ”اگر یہ کتابیں اتنی ہی قیمتی ہیں تو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ان پر توجہ نہیں دے رہے اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں بعد ان میں دیمک لگنا شروع ہو جائے گی۔“
 ”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ جہیں اس بارے میں پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 ”واہ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ خود بھی مضائقہ نہیں کرنے دیتے اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت نہیں۔ اس طرح تو آپ خود اپنی چیزوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔“
 اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہا ہو۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں بری طرح شرمائی۔ آج تک کسی مرد نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ اول تو میرا واسطہ ہی بہت کم مردوں سے پڑا۔ گھر میں صرف ابا اور بھائی تھے۔ اس کے علاوہ میرا سامنا دودھ والے، سبزی والے، دھونی اور محلے کے دکان داروں سے ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا۔ جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خواب اٹھنا یا اس لیے لگیں یا دل میں اربابان محفلے لگیں۔ لے دے کر ایک میرا خالہ زاد بھائی سلیم تھا جو کبھی مجھ پر ہنس دیتے تھا۔ آج تک اس کا آنا بھی سب کو ناگوار گزرتا اور اسی کے علاوہ کوئی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ خاص طور پر ارشد کو تو اس سے خدا واسطے کا بھر تھا۔ اگر اس کی موجودگی میں سلیم آجاتا تو ہم دونوں بہنوں کو اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی اگر غلطی سے اسی سلیم کے لیے چائے بنانے کا کہہ دیتیں تو اس کے جانے کے بعد ارشد خوب ہنگامہ کرتا۔ ”جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ جیسے ہم نے کوئی ہوش کھول رکھا ہے۔ گھر میں تو کچھ نصیب ہوتا نہیں۔ یہاں آکر گل چمرے اڑائے جاتے ہیں۔“

حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ سلیم تو محبت میں خالہ سے ملنے چلا آتا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی نگاہوں کا محور میں تھی۔ ان کے گھر میں کسی چیز کی نہیں تھی اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ خالو کا اپنا کاروبار تھا اور مکان کا کرایہ بھی آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ ہم سے اچھی طرح ملتے تھے، جب کہ ابا کے بہن بھائیوں نے تقریباً ان سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ صرف بڑے تایا اور دونوں چھوٹیاں عید بقرعید پر ملنے چلی آتیں لیکن ان کی اولادوں کو کبھی ہمارے گھر آنے کی توہین نہیں ہوئی۔ شاید وہ سب لوگ ہمیں اپنے سے کم تر سمجھتے تھے یا پھر انہیں یہ ڈر ہو گا کہ ابا کہیں ان سے کچھ مانگ نہ لیں لیکن میرے خیال میں ارشد کا رویہ انہیں ہمارے گھر آنے سے روکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمارے گھر آئے اور ہم دونوں بہنوں کا تو خاص طور پر کہیں جانے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔

اب میں بھی نہیں تھی کہ ان نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھتی۔ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور اگر جسم کو پوری طرح چادر میں لپیٹ کر نہ رکھتی تو لوگوں کی نگاہوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ مجھ پر ٹوٹ کر جوانی آئی تھی اور آئینہ کو ابی دیتا تھا کہ بنانے والے نے مجھے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ گورا رنگ، لمبے سیاہ بال، نشی آنکھیں، ستواں ناک، ریلے ہونٹ اور بھرا بھرا جسم۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں اسے صاحب جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت مجھے خود بھی اپنا خیال نہیں رہا تھا۔ دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا۔ میں نے جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا اور اس کی نگاہوں کی تپش سے بچتے ہوئے بولی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں صاحب جی۔“

”دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔ ”قدرت کی صناعی کالا جواب شاہکار۔“

ان کا یہ جملہ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ یہ تو جان مٹی تھی کہ وہ میری خوب صورتی کی تعریف کر رہے تھے اور میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے بھی کسی مرد نے میری تعریف نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اب تک میرا واسطہ صرف سلیم سے ہی پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی میرے حسن کی شان میں قصیدہ پڑھنا چاہ رہا ہو لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی یا موقع نہیں مل سکا۔

صاحب جی کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں گھبرا گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولے۔ ”اگر آپ اس کمرے کی صفائی نہیں کروانا چاہتے تو میں کوئی دوسرا کام کر لیتی ہوں۔“ ”نہیں اب تم آگئی ہو تو صفائی کر کے ہی جاؤ لیکن خیال رکھنا کہ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں، جہاں سے جو چیز اٹھاؤں گی اسے صاف کرنے کے بعد اسی جگہ رکھ دوں گی۔“ ”مگڑ کرل۔“ انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا کر کے گرد باندھا اور پوری لگن سے کام میں مصروف ہو گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے گھر کا کام کر رہی ہوں۔

سب سے پہلے میں نے میز کی صفائی کی۔ تمام فائلوں اور کاغذات کو ایک طرف رکھا اور بڑی احتیاط سے پوری میز صاف کر دی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ اور مائینس پر گرج رہی تھی۔ اس پر ہلکا سا کپڑا لگایا تو دونوں چیزیں چمک اٹھیں۔ سب سے زیادہ مشکل الماریوں میں پیش آئیں۔ میں نے ایک ایک کتاب اٹھا کر اسے صاف کرنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایک دن میں یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے ایک ہی الماری صاف کی تھی کہ وہ بھی آگئے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم ابھی تک یہیں ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ کام ختم ہو گیا ہوگا۔“

”اتنی جلدی کام کیسے ختم ہو سکتا ہے۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”آپ نے تو کمرے کا حشر نشر کر رکھا ہے۔“

”اچھا اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ باقی کام حل کر لیتا۔“

کسی کام کو ادھورا چھوڑنا میری عادت کے خلاف تھا لیکن جب وہ خود کہہ رہے تھے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ دھو کر پلن میں آگئی۔ اماں نے میرے سامنے کھانا رکھا اور بولی۔ ”کیا بات ہے تو نے صفائی میں اتنی دیر لگا دی۔ ابھی اور بھی بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں۔“

”باقی کروں کی صفائی تو جلدی ہو گئی لیکن چھوٹے صاحب کا کتابوں والا کرا بہت گندا ہے۔ وہاں دیر لگ گئی۔“

”حیرت ہے۔ وہ تو کسی کو اس کمرے میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ تجھے اجازت کیسے مل گئی؟“

”پہلے تو انہوں نے مجھے بھی منع کر دیا تھا لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ صرف اوپر اوپر سے کپڑا مار دینا کافی نہیں جب تک ایک ایک کتاب کو باہر نکال کر اسے چاروں طرف سے صاف نہ کیا جائے تب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی۔“

”اچھا! ٹھیک ہے تو جلدی سے کھانا کھا لے پھر کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔“

جب اماں کھانے کے برتن سینے لگیں تو میں نے ان سے پوچھا۔ ”اماں یہ چھوٹے صاحب کوئی کام نہیں کرتے جو اس وقت گھر میں نظر آرہے ہیں؟“

”ارے بیٹا! ان لوگوں کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک فیکٹری ہے۔ جایداد سے کرایہ آ جاتا ہے۔ بڑے

صاحب فیکٹری سنبھالتے ہیں۔ یہ آرام سے گھر میں بیٹھ کر ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔“

میں دل ہی دل میں ان پر رشک کرنے لگی۔ واہ اللہ میاں کیا قسمت بنائی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ صبح سے شام تک کولہو کے تیل کی طرح کام میں جے رہتے ہیں اور پھر بھی پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے دل میں بڑی شدت سے خیال آیا کہ کاش میری شادی بھی صاحب جی جیسے کسی بندے سے ہو جائے۔ پھر صاحب جی ہی مجھے پسند کر لیں۔ جس طرح وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ میں انہیں بھانگتی ہوں۔ کاش اماں کی طبیعت چند روز مزید خراب رہے اور وہ اسی طرح مجھے اپنے ساتھ کام پر لاتی رہیں۔ یوں مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

میری دعا قبول ہوئی اور اماں کی طبیعت گھرانے کے بعد مزید خراب ہو گئی۔ اگلے روز انہیں بہت تیز بخار تھا۔ اس کے باوجود وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ وہ مجھے اکیلا نہیں بھیجتا چاہے وہی تھیں۔ مالکن نے جوان کی حالت دیکھی تو گھبرا گئیں۔ فوراً ڈرائیور کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ اس دن میں نے اکیلے ہی سارے کام نمٹائے۔ صاحب جی سے بھی سامنا ہوا۔ ان کی نگاہوں میں وہی وارفتگی تھی۔ اس روز میں نے پھول دار چست قمیض پہن رکھی تھی جس میں میرا بھرا بھرا بدن اور نمایاں ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک بھر پور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ میں اپنا کام کر سکوں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا اتار کر کرسی پر رکھا اور جھاڑ پونچھ میں مشغول ہو گئی۔ کام کے دوران میرا دھیان صاحب جی کی جانب لگا رہا۔ دل میں ایک خواہش ابھری کہ کاش وہ آج آج میں اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ خدا جانے انہوں نے ایک ہی دن میں مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں مسلسل انہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر میرے خیالات کی رو بہک گئی اور میں نے کسی اور انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ اگر صاحب جی مجھ سے شادی کر لیں تو کتنا حزمہ آئے۔ میں ہمیشہ کے لیے غربت کے ماحول سے نکل آؤں گی۔ میرے پاس بہت سا پیسہ ہوگا۔ خوب عیش کروں گی۔ بڑے صاحب اور مالکن کا کیا ہے۔ وہ دونوں کتنا عرصہ زندہ رہیں گے۔ ان کے بعد تو سب کچھ میرا

ہی ہوگا۔

لیکن صاحب جی مجھ سے کیوں شادی کریں گے۔

انہیں ایک سے ایک امیر اور خوب صورت لڑکی مل سکتی ہے اور کیا پتا ان کی معافی ہوگی ہو یا کسی کے ساتھ انفر چل رہا ہو خیر یہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر وہ ابھی تک سنبھلے ہیں تو انہیں اپنی طرف مائل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ لاکھوں سے بہتر ہوں اور مجھے یقین تھا کہ صاحب جی پہلی نظر میں گھائل ہو چکے ہیں۔ ورنہ امیر گھروں کے لڑکے نوکرانیوں کو کہاں منہ لگاتے ہیں اور اگر انہوں نے ابھی تک میرا نوٹس نہیں لیا تو انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مجھے کچھ مخصوص حربے استعمال کرنا ہوں گے۔ ایک دو کوششوں میں ہی پتا چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ سب سے اوپر والے خانے تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ میں اسٹول پر کھڑے ہو کر کتاہیں صاف کرنے لگی۔ اچانک میرے کانوں میں ٹپ ٹپ کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بارش ہو رہی تھی۔ میں نے بے اختیار منگناٹا شروع کر دیا۔ آئے موسم رنگیلے سہانے۔ جیا نہیں مانے۔ تو پچھلی لے کے آجا یا مالما۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹول پر کھڑے کھڑے رقص کے انداز میں ہاتھ ہلاتا شروع کر دیے حالانکہ میں نے کبھی زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی مجھے اس گانے کی پجوشن کا پتا تھا لیکن جب دل بے ایمان ہو رہا ہو تو انسان سے ایسی ہی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک بے خودی کے عالم میں اسٹول پر کھڑے ہو کر رقص کرتی رہی پھر اچانک ہی میرا توازن بگڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں نیچے گرتی۔ دو مضبوط بازوؤں نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔

وہ صاحب جی تھے جو نہ جانے کب سے میرے پیچھے کھڑے ہوئے یہ شوق دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میری بہت ہی عجیب پوزیشن تھی۔ میں دوپٹے کے بغیر ایک اجنبی کی ہانپوں میں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور ہمارے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ میں اس پجوشن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک ہی وہ سنبھل گئے اور انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں کی قید سے آزاد کر دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی قلم کے دوامانی سین پر سرنے کی پجوشن چلا دی ہو۔

”کیا کر رہی تھیں تم؟“ وہ پیچھے ہٹے ہوئے بولے۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے کرسی پر سے دوپٹا اٹھا لیا اور

گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اچانک ہی بارش ہوگئی تو میں نے بے اختیار ہو کر ٹنگنا شروع کر دیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بدلے۔ ”اگر تم اسٹول سے گر جاؤ تو کولہ کی ہڈی میں فریکچر ہو سکتا تھا۔ اُمید ہے کہ آئندہ تم احتیاط کرو گی۔“

”جی بالکل۔“ میں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے لیے چائے بناؤں۔“

”رہنے دو۔ میں خاناماں سے کہہ دوں گا۔“

”خاناماں آج چھٹی پر ہے۔ چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ میں ابھی لے کر آئی۔“

بارہچی خانے میں آکر میں نے چائے کا پانی چوبلے پر رکھا اور اس کے ساتھ ہی پکڑیوں کے لیے تین کھولنے والی بیٹھ گئی۔ میں بہت تیزی سے کام کرتی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی میں نے پکڑیاں تل کر ٹرے میں رکھیں۔ ساتھ ہی کیچپ کی بوتل لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ گرم گرم پکڑے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ”واہ تم نے تو برسات کا حرحہ دوبالا کر دیا۔“

میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے سنائیں کہ دل تک پہنچنے کا راستہ محد سے ہو کر گزرتا ہے۔“

”واہ۔“ وہ ایک پکڑی منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”باتیں تو تم پڑھے لکھوں جیسی کرتی ہو۔ کتنی تعلیم ہے تمہاری؟“

”مشکل سے دسویں پاس کر سکی ہوں۔“ میں آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔ ”ہمارے یہاں آگے پڑھنے کا رواج نہیں ہے۔“

”کیوں؟ تعلیم تو ہر شخص کا بنیادی حق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔“

”شوق سے کیا ہوتا ہے جی۔“ میں نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔ ”میرے والدین کہتے ہیں کہ لڑکیوں نے پڑھ لکھ کر کیا کرتا ہے انہیں تو ساری عمر ہانڈی رونی ہی کرنا ہوتی ہے۔“

”بہت ہی دقیانوسی سوچ ہے۔“ وہ تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولے۔ ”خیر اگر تم آگے پڑھنا چاہتی ہو تو میں تمہیں پڑھاؤں گا۔“

”آپ مجھے پڑھائیں گے؟“ میں خوش ہوتے

ہوئے بولی۔

”ہاں اس میں مجھے کون سا ہمتی بل جوتا ہے۔ اگر تم ایک گھنٹا بھی باقاعدگی سے میرے پاس بیٹھ کر پڑھ لو تو آسانی سے پرائیویٹ امتحان دے سکتی ہو۔“

میں نے فوراً ہائی بھری۔ صاحب جی سے قریب ہونے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ بلکہ مجھے یوں لگا کہ شاید وہ بھی میری قربت کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ورنہ کون کسی نوکرانی کے لیے اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں خوشی سے سرشار ہو گئی اور شرماتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے آپ اماں سے بات کر لیں۔ اگر وہ اجازت دیتی ہیں تو میں کل سے ہی پڑھائی شروع کر دوں گی۔“

اس دن میں شام کو کام سے واپس آئی تو سلیم کو اپنا منتظر پایا۔ ارشد بھائی سر روزہ اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اس نے موقع غنیمت جانا اور ہمارے گھر چلا آیا۔ اماں کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ میرے دیدار کی آس لے کر آیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی لیکن اس روز نہ جانے کیوں مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میں سو نہ نہیں کہوں گی کہ اسے دیکھ کر میں اپنے کمرے میں چلی گئی کیونکہ ہمارے گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں ابا دونوں بھائیوں کے ساتھ سوتے اور دوسرا کمر اماں اور ہم دونوں بہنوں کے لیے وقف تھا۔ لہذا میں اسی کمرے میں اماں کی پابندی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ مجھ خاموش دیکھ کر اماں نے خود ہی موضوع چھیڑ دیا۔

”سلیم کی نوکری لگ گئی ہے۔ منٹائی لے کر آیا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو جاؤں گی آپ کی مبارک دہنے۔“

مجھے معلوم تھا کہ سلیم نے چند ماہ قبل ہی انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا تھا اور بڑی شدت سے جاب کی تلاش میں تھا۔ میں نے بے رخی سے کہا۔ ”مبارک ہو، بخواہشتی ملے گی؟“

اسے شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہا ہو گا کہ میں اس کی جاب کی خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑوں گی اور فوراً اس کے لیے جائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کروں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تب وہ سنپٹتے ہوئے بولا۔

”نی الحال پندرہ ہزار ملیں گے لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ بعد میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں گے۔“

”اونہہ! کس نے دیکھے ہیں چھ مہینے۔ شروع میں

بھی تھکے میں دلچسپی لے رہا ہے۔“
 ”اماں! تالی دونوں ہاتھوں سے بجاتی ہے۔ یہ پکے
 طرف ڈرائنگ مجھے قبول نہیں۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے
 تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں بھی اس رشتے کے لیے
 تیار ہو جاؤں۔“

”کیا مطلب ہے تیرا؟“ یہ آج تو کیسی بیکسی بیکسی
 باتیں کر رہی ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں۔ میں اس جہال پرورہ میں
 جا کر اپنی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ گھر دیکھا ہے ان کا۔
 دو کمروں کا کابک ہے جس میں چھ افراد پہلے ہی رہ رہے
 ہیں۔ ساتویں کی جگہ کہاں سے نکالیں گے۔“

”پھر کیا تیرے لیے کوہ قاف سے کوئی شہزادہ آئے
 گا؟“

”کیا پتا آئی جائے۔ آدمی کو ہمیشہ اچھی اُمید رکھنی
 چاہیے۔ ویسے کوہ قاف جانے کی ضرورت نہیں۔ اس شہر میں
 بھی بہت سے شہزادے ہیں۔ بس دیکھنے والی نظر ہونی
 چاہیے۔“

اماں ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔ ”چار
 جماعتیں پڑھ کر تیرا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔ ارشد
 اسی لیے عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے۔“
 ”وہ تو پاگل ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کی
 طرح پاگل ہو جائے۔“

اگلے دن کام پر گئی تو صاحب جی میرے لیے فرسٹ
 ایئر کی کتابوں کا کورس لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے
 انروومنٹ فارم بھی پھرایا اور بولے۔ ”بس اب تم سنجیدگی
 سے پڑھائی شروع کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر
 کوئی کمی رہ جائے۔“

ان کی یہ بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔
 اس کا مطلب ہے کہ انہیں میری غربت کی نہیں بلکہ تعلیم کی
 فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان کے
 شانہ بشانہ چل سکوں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ ان کی
 خواہش ضرور پوری کروں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دہا
 بھری مخالفت مول لینا پڑے۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے
 ارشد کی طرف سے تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں فرسٹ
 ایئر کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں تو وہ میرا جینا حرام
 کر دیتا لیکن صاحب جی کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت آگئی
 تھی کہ میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں کسی کو یاد بھی نہیں
 رہتا۔ بہت ہوا تو سالانہ انکریسنٹ کے نام پر ہزار پانچ سو کا
 اضافہ ہو جائے گا۔ میری مانو تو سال دو سال بعد باہر چلے
 جاؤ۔ یہاں تو تم یونہی تھکیت تھکیت کر آگے بڑھتے رہو
 گے۔“

”جب وقت آئے گا تو اس بارے میں ضرور سوچوں
 گا۔ فی الحال تو مجھے یہیں رہ کر کچھ تجربہ حاصل کرنا ہے۔“ وہ
 اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اب تم جلدی سے اچھی سی
 چائے پلو اور پھر میں چلتا ہوں۔“

”ارے تم اتنی دیر سے آئے بیٹھے ہو اور تمہیں کسی نے
 چائے کو بھی نہیں پوچھا۔“

”خالق تو کہہ رہی تھیں لیکن میں نے ہی منع کر دیا۔
 سوچا کہ تم آ جاؤ پھر چائے پیئیں گے۔ میں مٹھائی کے ساتھ
 سمو سے اور جلیبیاں بھی لایا ہوں۔“

میں چائے بنانے لگی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا
 اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ ”گلتا ہے کہ تمہیں جاب
 ملنے کی خبر سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“

”اگر تم مطمئن ہو تو۔“ میرے خوش ہونے یا نہ ہونے
 سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے رکھائی سے جواب دیا۔
 ”تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو تم نے بھی ایسا رویہ
 اختیار نہیں کیا۔“ وہ بایاؤں ہوتے ہوئے بولا۔

”پہلے نہ سمجھ تھی۔ اب آہستہ آہستہ بہت سی باتوں کی
 سمجھ آ رہی ہے۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”تم اماں کے پاس
 بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

میری بے رخی سے اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے جیب
 سے چوڑیوں کا پیکٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں
 تمہارے لیے لایا تھا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ میں چوڑیاں نہیں پہنتی لیکن خیر
 تمہارا دل رکھنے کے لیے پہن لوں گی۔“

”شکریہ۔“ وہ خوش ہوتا ہوا چلا گیا اور مجھے اس کی
 حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ بے چارہ مدلل کلاسیا۔ میرے لیے
 کاٹچ کی چوڑیاں ہی لاسکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ کچھ عرصہ
 بعد میں سونے کی پہاڑ پر بیٹھنے والی ہوں۔

اس کے جانے کے بعد اماں نے بڑے رازدارانہ
 انداز میں کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ تیری خالہ بہت جلد سلیم کے
 لیے تیرا رشتہ مانگنے والی ہیں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اشارتاً یہ
 بات کہہ چکی ہیں لیکن آج سلیم کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ

وقت مسجد اور تبلیغی جماعت کے ساتھ گزارتا۔ حالانکہ وہ سب نیک اور پڑھے لکھے لوگ تھے اور دین کے ساتھ دنیا کے کام بھی کرتے تھے جب کہ ارشد لوگوں کی عیب جوئی اور تنقید کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اسے کسی کی نیکی نظر نہیں آتی تھی البتہ ان کی برائیوں پر اس کی نظر خود آ جاتی۔ عورتوں کا تو وہ سخت دہشت و ڈر تھا۔ اس کے خیال میں ساری برائیوں کی جڑ عورت ہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ لڑکیوں کی پیدائش پر ہی باندی لگا دیتا لیکن اسے ماں اور بہن کی کمائی کھاتے

قارئین متوجہ ہوں

پرجا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے رشکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچہ پانے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور درجہ کرے۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر -

راہے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی دائرہ جست و یابی کیلئے

سپنس، حاسوی، یا کیروز، سرگزشت

63-C فیۃ السینس باؤنسٹ اتھارٹی بین کونسل

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: ldpgroup@hotmail.com

اس طرح پڑھائی کے بہانے مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع ملا گیا۔ اماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور انہوں نے کام پر جانا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مالکن کے گھر کی پوری ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ اب مجھے کیلے کام پر جاتے ہوئے ڈرنہیں لگتا تھا۔ البتہ شام کو اگر ویر ہو جاتی تو بینک صاحب اپنے ڈرائیور کے ساتھ مجھے گھر بھجوا دیتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے دونوں بھائیوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بڑے بھائی امجد نے اب ایک نیا وھندا شروع کیا تھا۔ اس نے چوری چکاری اور بہت خوری چھوڑ دی تھی اور کرارے کا سیاسی کارکن بن گیا تھا۔ اس کی وفاداریاں کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں تھیں بلکہ وہ معاوضہ لے کر کبھی سیاسی پارٹیوں کے لیے کام کیا کرتا۔ جلے جلوسوں کے لیے پچاس ساٹھ آدمی اکٹھے کرنا نعرے لگانا اور مخالف پارٹی کے جلے خراب کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی مقامی سطح کے عہدیداروں اور پولیس میں اچھی خاصی جان بچان ہو گئی تھی اور وہ ان تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کروا دیتا۔ مثلاً کسی کا مکان یا دکان خالی کروانی ہے، کسی کے بچے کو کالج میں داخلہ کروانا ہے، کسی کا بجلی کا بل زیادہ آگیا ہے تو اس کی قسطیں کروانی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے عوض اسے مٹھائی کے نام پر اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ اس کی جیب ہمیشہ نوٹوں سے بھری رہتی لیکن ابا کے نزدیک اس کی یہ کمائی بھی ناجائز تھی۔ اس لیے وہ اس سے کچھ نہیں لیتے تھے اور نہ ہی اسے گھر میں کچھ خرچ کرنے کی اجازت تھی۔

چھوٹے بھائی ارشد کی وہی بے ڈھنگی چال تھی۔ اس نے شاید کوئی کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ اپنا بیشتر

ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی۔

ہونا چاہیے تھا۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ مجھے بڑے گھری بھونٹائیں پھر میری ذہانت اور سلیقہ مندی دیکھیں لیکن میں اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس انتظار کرتی رہی کہ وہ کب پہل کرے جس لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”چلو بھئی بہت دیر ہو گئی۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔“

مجھے ان کی سرد مہری پر بڑا غصہ آیا۔ اتنا احمق موقع ملا تھا اظہارِ محبت کا جسے انہوں نے گنوا دیا خیر میں بھی دیکھتی ہوں کہ کب تک بچتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کے جال میں پھاس کر ہی دم لوں گی۔ اس دن کے بعد میں ان سے مزید فریب ہونے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ پڑھائی کے لیے تو دو گھنٹے مخصوص تھے ہی اس کے علاوہ دن میں دس چکر ان کے کمرے کے لگاتی۔ کبھی چائے کبھی پانی کبھی شربت کے بہانے۔ بعض اوقات وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا لیتے۔ اس دوران میں مستقل ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ بڑی بیگم صاحبہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ میں کیا کل کھلا رہی ہوں۔

صاحب جی کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ میرا دل چاہتا کہ بس ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہوں اور وہ بھی مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ انہوں نے گھر میں اکثر کام لگوا لیا تھا۔ جب میں چکن میں ہوتی تو وہ اس کے ذریعے مجھے بلا لیتے۔ انہیں سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ بات بات پر شعر پڑھتے۔ ان میں عشقِ اشعار زیادہ ہوتے۔ بات بات پر میرے حسن کی تعریف کرتے جسے سن کر میں جھوم اٹھتی۔ میں نے بھی انہیں بھانے اور رہ جانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فنک والی قمیص پہننا شروع کر دیں۔ جن سے میرا لگ اگ نمایاں ہو جاتا۔ اکثر بغیر دوپٹے کے ہی ان کے سامنے چلی جاتی اور ان کی پرشوق نگاہیں برے کی طرح میرے جسم کے آر پار ہوتی رہتیں۔ اب مجھے صرف اس دن کا انتظار تھا جب وہ اپنی زبان سے اقرارِ محبت کر لیں۔

ایک دن سلیم، ارشد بھائی کی غیر موجودگی میں ہمارے گھر آیا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ مالکوں نے حسب وعدہ اس کی خواہ میں پانچ ہزار کا اضافہ کر دیا ہے۔ مجھے یہ

ایک دن مالکن کی طبیعت خراب تھی لیکن انہیں مہینے کا سودا خریدنے کے لیے سپر اسٹور جانا تھا کیونکہ گھر میں سب چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ انہوں نے صاحب جی کو سامان کی فہرست پکڑائی اور کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں کیونکہ میں ہی چکن کا سارا کام کرتی تھی اور مجھے چیزوں کی پہچان تھی۔ اس لیے میں دیکھ بھال کر خریداری کر سکوں گی۔ میں خوش خوشی صاحب جی کے ساتھ چلی گئی۔ اس سپر اسٹور کو دیکھ کر میری آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ وہاں دنیا بھر کی چیزیں تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو سب خرید لیتی۔ خیر میری فہرست بھی خاصی طویل تھی۔ ان چیزوں کی خریداری میں دو تین گھنٹے لگ گئے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو صاحب جی نے چاکلیٹ کے کئی پیکٹ خریدے اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولے۔ ”یہ تمہارے لیے ہیں۔“

وہ بہت قیمتی چاکلیٹ تھے اور میں انہیں لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ ان کی عادی ہو گئی تو دوبارہ کہاں سے خریدوں گی۔ صاحب جی نے شاید میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ لی اور بولے۔ ”فکرت کرو ختم ہو گئے تو اور لا دوں گا۔“

واپسی میں صاحب جی نے ایک ریسٹوران کے سامنے گاڑی روکی اور بولے۔ ”بہت تھکن ہو گئی ہے کچھ دیر بیٹھ کر سنا لیں۔“

ریسٹوران کا ماحول بہت رویان پرور اور خوبانہ تھا۔ زیادہ تر میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں کچھ جوڑے بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک الگ تھلک گوشے میں میز منتخب کی اور ویٹر کو اشارہ کرنے سے پہلے بولے۔ ”کیا لوگی؟“

میں پہلی بار اتنے بڑے ریسٹوران میں آئی تھی۔ اس لیے میرے حواس قابو میں نہ تھے۔ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ ”آپ جو چاہیں منگوا لیں۔“

انہوں نے چائے اور سینڈویچز کا آرڈر دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم خوب صورت اور حسین ہونے کے ساتھ سلیقہ مند بھی ہو۔ آج تم نے جس مہارت اور ہوشیاری سے شاپنگ کی ہے۔ اسے دیکھ کر میں بھی تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا۔ تمہیں تو کسی بڑے گھر میں پیدا

ان کی شادیاں کرتے کرتے ہی بوڑھے ہو جاؤ گے میرا بوجھ کس طرح بانٹ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ جب اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ تو بتا دینا، میں برأت لے کر آ جاؤں گا۔“

میں جانتی تھی کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ خالہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گی اور جلد یا بدیر اس کا رشتہ ہمیں ہو جائے گا۔ خیر مجھے کیا۔ میں نے تو اپنے خیالوں میں صاحب جی کو بسا رکھا تھا اور شدت سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب وہ مجھ سے اپنے دل کی بات کہیں۔ اشاروں اشاروں میں تو وہ بہت کچھ کہہ چکے تھے لیکن ان کی زبان ابھی تک خاموش تھی۔ ممکن ہے کہ وہ میری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔

ایک دن ڈرائیور جھمنی پر تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے صاحب جی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ میں یہ سنتے ہی خوشی سے جموم اٹھی۔ مجھے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا بہت ارمان تھا لیکن اس کا موقع ایک آدھ دفعہ ہی ملا۔ اس کے علاوہ یہ بھی امید تھی کہ ہو سکتا ہے۔ صاحب جی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے گاڑی ایک آگس کریم پارلر کے سامنے روک لی اور بولے۔ ”آگس کریم کھاؤ گی؟“

میں تو ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے فوراً ہی اثاثات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے آگس کریم منگوائی اور بولے۔ ”اسٹار کا امتحان دینے کے بعد کیا ارادہ ہے۔“

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور مجھے یقین ہونے لگا کہ جس لمحے کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ وہ بس آیا ہی چاہتا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو گر بچویشن کرنا چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں آگے چل کر کیا حالات ہوں۔“

”تمہاری کہیں بات تو طے نہیں ہوئی؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے تو میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور میں نے نئی میں سر ہلا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ یہی کہیں گے اگر میں انہیں پر پوز کروں۔

اس کے بجائے انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم آگے پڑھنا ہی چاہتی ہو تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ مجھے ایسی

اعتنا نہ کرنی آئی۔ اتنے پیسوں کی شاہجگ تو صاحب جی ایک دفعہ میں کر لیتے تھے۔ پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اس ملازمت پر قناعت نہ کرے اور باہر جانے کے لیے کوشش کرتا رہے۔ آج کل مل بیزار میں کیا ہوتا ہے۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ ”اماں کو کب لکھوں؟“

”وہ کس لیے؟“ میں نے جان بوجھ کر انجان بننے دئے کہا۔

”اپنے اور تمہارے رشتے کی بات پکی کرنے کے لیے۔“

”لیکن میرا تو ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے

”ٹھیک کہہ رہی ہوں سلیم۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے دئے کہا۔ ”تم ہمارے گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے دوسروں کے گھروں میں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ میری کوشش ہے کہ ریکرویشن کر لوں تاکہ مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔“

”لیکن تم نے تو میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ریکرویشن کیسے کرو گی؟“

اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اسے بھی اس ازم میں شریک کر لوں۔ میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ”جس گھر میں کام کرتی ہوں وہ لوگ مجھے پڑھا رہے ہیں۔ دو مہینے بعد اسٹار کا امتحان دوں گی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنا تو گر بچویشن بھی ہو جائے گا لیکن یہ بات صرف اماں کو ظہم ہے اگر ارشد بھائی کو پتا چل گیا تو وہ میرا گھر سے لکنا نہ کر دیں گے۔“

”لیکن تم کب تک یہ بوجھ اٹھاؤ گی۔ یہ ذمہ داری تمہارے بھائیوں کی ہے۔“

”اگر وہ اس قابل ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔“

میرا حال تم میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنے ماں باپ ارچھوئی بہن کو بیچ بیچہ دار میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”تم ایسی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم مل کر یہ بوجھ بانٹ لیں گے۔“

”جذباتی باتیں مت کرو۔ چار بہنیں ہیں تمہاری۔“

لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی لگن ہو۔“

بولیں۔ ”تم بھی اپنے لیے دو جوڑے بنوا لو۔ ورنہ شادی میں کیا پہنوں گی۔“

”کس کی شادی ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”سعدہ اور راشد کی۔ تمہیں نہیں معلوم۔ میں تو کبھی تھی کہ راشد نے تمہیں بتا دیا ہو گا۔ بس سعدہ کے ماں باپ آجائیں تو تاریخ طے کرے کہ ان کا نکاح پڑھوادیتی ہوں۔“
اس کے آگے مجھ سے کچھ نہیں سنا گیا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ میں سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوں۔ جیسے تیسرے کے شاپنگ کی اور طبعیت کی خرابی کا بھانہ کر کے گھر چلی آئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ خوب دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن اس گھر میں تو رونے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔ رات بھر بستر پر لیٹی اپنی قسمت کا ماتم کر لی رہی۔ مجھے ورہ کر راشد پر غصہ آ رہا تھا وہ بھی عام مردوں کی طرح ہر جانی نکلا لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا۔ اس نے تو مجھ سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں نہیں کھائیں۔ کبھی اقرار عبت نہیں کیا، پھر میں اسے کیوں کوس رہی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے میرا خیال رکھا۔ میری محرومیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ میری پڑھائی میں مدد کی۔ میری شخصیت کو نکھارنا چاہتا تھا۔ اس نے تو کبھی تنہائی میں مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ میں ہی تھی جو پہلی نظر میں اس پر رعبھ گئی۔ اسے اپنا بتانے کے لیے خود کو نمایاں کیا۔ اسے اپنی اداؤں سے رجحانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں بڑے گھر کی بہو بننے کا خواب دیکھ رہی تھی جس کی تعبیر اتنی بھیانک تھی۔

ساری صورت حال کا تجربہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس میں راشد کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ یہ سب میرا اپنا کیا دھرا تھا۔ میں نے اپنی محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ادنیٰ چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور منہ کے بل آن گری۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ زمین، رینگنے والے کیڑے سمی آسمان تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں زمین ہی پناہ دیتی ہے اور میری پناہ گاہ بھی سلیم کا گھر تھا چنانچہ میں نے صبح اٹھتے ہی اماں سے کہہ دیا کہ وہ خالو رشتے طے کرنے کے لیے بلا لیں کیونکہ صاحب جی نے مجھ میری اوقات یاد دلادی تھی۔

مجھے ان پر شدید غصہ آیا۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی بات کہنے کا موقع نہ دیا تھا۔ نہ جانے انہیں یہ اندازہ کیوں نہیں تھا کہ میں ان کی زبان سے کیا سنتا جا رہی ہوں۔ وہ کون سی مصلحت تھی جس نے انہیں روک رکھا تھا۔ شاید انہیں جلدی نہیں تھی۔ وہ غصہ کر کے کھانے کے عادی تھے لیکن مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے منہ نہ کھولا تو میں ہی بے شرم بن کر حرف دے جا زبان پر لے آؤں گی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ دنوں بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میرے سارے خواب اور امان بکھر کر رہ گئے۔ ہوا یوں کہ بڑی بیگم کی بھانجی سعدہ امریکا سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آئی تو اس نے بیہوش قیام کیا۔ چند روز بعد اس کے والدین بھی آنے والے تھے لیکن بیٹی کو انہوں نے پہلے ہی بھیج دیا تاکہ اس کی چھٹیاں ضائع نہ ہوں اور وہ اچھی طرح محکوم پھر لے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ دیکھنے میں ہی انتہائی مغرور، تک چڑھی اور بد مزاج معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بھی انتہائی تمکنا نہ انداز میں بات کرتی تھی لیکن میں یہ سوچ کر برداشت کرتی رہی کہ چلو وہ بیٹے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد یہ واپس چلی جائے گی تو میرا ہی اس گھر راج ہو گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایسا خواب دیکھ رہی ہوں جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

اس کے آنے کے بعد صاحب جی نے مجھے منہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اب نہ تو وہ مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے اور نہ ہی مجھے پڑھاتے۔ ان کا سارا وقت سعدہ کے ساتھ ہی گزرتا۔ وہ دونوں دن بھر گھومتے اور رات گئے ان کی واپسی ہوتی۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں سعدہ کو اپنا رقیب سمجھنے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد واپس چلی جائے لیکن اس وقت تو اس کے والدین بھی نہیں آئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اس کی واپسی کا پروگرام بننا۔

ان دنوں بیگم صاحبہ بہت معروف رہنے لگیں۔ وہ

اکثر شاپنگ کے لیے چلی جاتیں اور پھر ان کی واپسی دیر سے ہوتی۔ ایک دن وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں اور



کہنیش

مدیر اعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔
رفعت اور نزہت کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جب سے
سنا ہے اسے قلمبند کرنے کو دل مچل رہا ہے۔ مختصر انداز
میں ان کے واقعات کو سچ بیانی کے انداز میں لکھ دیا ہے۔
یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

مزمّل سلیم

(تاندلیانوالہ فیصل آباد)

ہمارا جو تمہارے ساتھ رہے گا۔“ آخری بات کرتے ہوئے
نزہت افسردہ ہو گئی۔

”اچھا بانی یہ کیا ہے؟“

”یہ لپ ٹاپ ہے۔“

”ہائیں وہ کیا ہوتا ہے؟“ رفعت نے عادت کے

مطابق ”ہائیں“ کو لہا کیا۔

”کمپیوٹر کا ہوتا ہے نا؟“

”ہاں وہ چاچے غفور کے بیٹے کے پاس تھا وہاں ہم

گائے سنتے تھے۔“

”اتنا بڑا گھر؟“ رفعت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آؤ اندر آ جاؤ رفعت۔“ نزہت نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا۔

”یہ دیکھو یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ نزہت اسے ایک خوب

صورت کمرے میں لے آئی۔

”ہائیں اتنا بڑا کمرہ؟ بانی اس میں اور کون کون رہے

گا؟“

رفعت کا معصوم سوال سن کر نزہت مسکرا دی۔ ”میری

جان صرف تمہیں رہتا ہے، یہ صرف تمہارا کمرہ ہے اور کون ہے

”بس یہ کپیڈر کی جدید قسم ہے۔“ نزہت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”اچھا تو کیا اس پر بھی میں گانے سنوں گی۔“
 ”ہاں سننا گانے مگر پہلے اسے استعمال کرنا سیکھ لیتا۔“
 ”کون سکھائے گا؟“

”میں سکھاؤں گا جی، غلام حاضر ہے۔“ بشر کی انٹری ٹھیک وقت پر ہوئی تھی۔ رفعت نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے دوپٹا ڈال کر دوسری طرف منہ کر لیا۔
 ”جہیں کیا ہوا۔ شرمایا کیوں رہی ہو؟“ نزہت نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ماما ابھی جین غیر مردوں سے پردہ کرتے ہیں۔“
 ”بشر غیر نہیں ہیں۔“ نزہت نے کہا۔ ”یہ بشر رضا ہیں ہمارے جو چارو لندن میں رہتے ہیں ان کے اکلوتے سپوت یعنی ہمارے کزن محترم۔“
 ”اچھا تو پہلے بتانا تھا۔“ رفعت نے جلدی سے دوپٹا ہٹا کر سلام کیا۔

بشر نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور غور سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ سفید رنگت، گہری سیاہ آنکھیں اور سب سے بڑھ کر چہرے کی جذبیت وہ معصومیت بھرے حسن کی تصویر تھی۔

☆.....☆

نزہت اور رفعت احسان احمد کی بیٹیاں تھیں۔ نزہت آٹھ سال کی تھی جب رفعت پیدا ہوئی۔ رفعت کی پیدائش کے تیسرے دن ہی رضیہ کا انتقال ہو گیا۔ احسان کے لیے یہ غم بہت بڑا تھا۔ رفعت نومولود تھی اسے سنبھالنے کے لیے کسی عورت کی ضرورت تھی اس لیے اسے ماموں ممانی اپنے ساتھ گاؤں لے کر چلے گئے مگر نزہت شہر میں باپ ہی گئے پاس رہی۔ احسان احمد کو بزنس سے کبھی مہینوں بعد ناظم ملتا تو رفعت کو دیکھنے چلے جاتے۔ نزہت چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتی تھی مگر ماموں ممانی نے ضد کر کے اسے اپنے پاس رکھا۔ نزہت اٹھائیس سال کی تھی اور ایم بی اے کر کے باپ کا بزنس سنبھال رہی تھی۔ جب احسان صاحب کو ہارٹ ایک ہوا اور وہ چل بے تو نزہت نے کمال حوصلے سے یہ غم جھلا اور باپ کی ہدایت کے مطابق رفعت کو گاؤں سے شہر لے آئی۔ رفعت نے پرائیویٹ میٹرک کیا تھا۔ وہ ساری عمر گاؤں میں رہی تھی اس لیے اسے شہر کی زندگی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بے حد سادہ طبیعت کی معصوم لڑکی تھی۔ جب کہ نزہت شہر کی پروردہ ہی نہیں بلکہ اپنا

بزنس بھی سنبھالتی تھی۔ وہ پوری بزنس میں دلچسپی لیتی بھی اس لیے کہ اس کے چاچو چاہتے تھے کہ اب وہ شادی کر لے مگر وہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابھی نہیں۔ ذرا حالات سنبھل جائیں تب سوچوں گی۔ اب جب حالات معمول پر آگئے تھے تو وہ شادی کی بجائے بہن کو گاؤں سے لے آئی۔

رفعت گاؤں سے آتے ہی ہر چیز کے بارے میں سوال کر رہی تھی اور نزہت اس کی حرکتوں اور باتوں پر بھی ہنس پڑتی کبھی سمجھانے کی کوشش کرتی۔ اس نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی۔ آج وہ رفعت کے ساتھ شاپنگ مال میں آئی تھی۔ رفعت نے اتنی بڑی عمارت دیکھ کر ”ہائیں“ کی صدا بلند کی۔

نزہت بار بار اس کا دوپٹا منہ سے ہٹاتی مگر وہ جیسے ہی کسی لڑکے کو دیکھتی تو دوپٹا منہ پر ڈال لیتی۔ نزہت نے ایک مہنگا اور خوب صورت ڈریس اس کے لیے پسند کیا۔ رفعت نے پر اس ٹیگ پر جب قیمت دیکھی تو فوراً بولی۔ ”ہائی نہیں لیتا یہ، اتنا مہنگا۔ اتنی قیمت میں تو میرے تین چار اچھے سوٹ آجائے ہیں۔“

”مگر یہ بہت خوب صورت ہے تم پر بہت بچے گا۔“
 ”ہاں مگر یہ جو دکا کنارے اس کی شکل ماموں کے مرنے جیسی ہے، وہ میری مرغیوں کو مارنا تھا مجھے نہیں لینا اس سے۔“
 نزہت اس کی بات پر ہنس پڑی اس نے قیمت ادا کر کے ڈریس خرید لیا۔

”باجی اتنی فضول خرچی نہ کریں مجھ پر۔“
 ”ان پیسوں پر تمہارا بھی حق ہے آئندہ ایسی بات کی تو میں تم سے ناراض ہوجاؤں گی۔“
 ”اچھا باجی اب نہیں کہوں گی مگر ناراض نہ ہونا، لوکان پکڑ لیے۔“ رفعت نے جلدی سے کان پکڑے۔

نزہت کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آٹھ گھنٹوں میں آئی ٹی صاف کی۔ شاپنگ کے بعد وہ ہوٹل میں آئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ بار بار رفعت کو سمجھاتی رہی۔ واپسی پر کار میں بیٹھے ہوئے رفعت نے اچانک کہا۔ ”باجی پانچ سو روپے دیتا۔“

نزہت نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور جلدی سے نوٹ نکال کر دے دیے۔ رفعت نے سو سو کے پانچ نوٹ پکڑے اور گاڑی سے اتر کر تھوڑی دور بیٹھے ایک فقیر کو وہ پیسے دیے جب وہ پیسے دے رہی تھی تو اس نے نزہت کی طرف اشارہ کر کے فقیر کو کچھ کہا بھی تھا۔

”ابھی تو مجھے فضول خرچی سے روک رہی تھی اور خود فقیر کو اتنے پیسے دے دیے؟“ نزہت نے پوچھا۔

”میں نے اسے پیسے دے کر کہا دعا کرو میری باقی
 خوش رہے۔“ رفعت نے خوش ہو کر اسے بتایا۔
 زہت حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتی
 رہی۔ مگر واپس آ کر اس نے رفعت کو اپنے پاس صوفے پر
 اٹھایا اور پوچھا۔ ”تم ساری زندگی مجھ سے دور رہی ہو پھر بھی
 اتنا پیار کیوں ہے؟“

”پتا ہے باجی جب آپ گاؤں آتی تھیں اور میں چھوٹی
 سی تھی آپ میرے لیے ڈمپروں چیزیں لاتی تھیں۔ گاؤں کی
 دوست پوچھتی تھی، کون لایا ہے تو میں فخر سے بتاتی میری
 باجی۔ آپ بچپن سے میرا مان ہیں، وہاں ساری بہنیں ایک
 دوسرے سے لڑتی ہیں پر آپ مجھے بہت پیار کرتی ہیں اس لیے
 اتنے سالوں کے فاصلے کے باوجود میری محبت آپ سے کم
 نہیں ہوئی مجھے پتا ہے آپ نے ابوکا بہت ساتھ دیا ہے اور ابو
 ای کی موت کا صدمہ مجھ سے زیادہ برداشت کیا ہے۔“ بات
 کرتے ہوئے رفعت کے آنسو بہنے لگے اور وہ زہت سے
 لپٹ گئی۔ زہت خود بھی رونے لگی تھی۔

”اوہو یہاں تو بڑا اجنبی سین چل رہا ہے۔“ مبشر
 نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مانچسٹر میں رہتا تھا
 اور سال میں ایک بار پاکستان آتا تھا۔
 ”کزن آگئے تھے میں ان کے لیے چائے لاتی ہوں۔“
 رفعت جلدی سے اٹھی۔

”کزن کچن ادھر ہے جہاں آپ جہاں جا رہی ہیں
 وہاں واش روم ہے۔“ مبشر نے کہا تو زہت ہنس پڑی اور
 رفعت غصے سے مبشر کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب مجھے میرے گھر کا راستہ سمجھائیں گے۔ اللہ
 کرے مالی بابا کا کتا آپ کو کاٹ لے جس نے مجھے کاٹا تھا اور
 چوہ! انجکشن لگے تھے۔“ رفعت کو پرانا دکھ یاد آگیا۔
 ”اچھا چائے پلاؤ پھر بات کرتے ہیں مالی بابا کے کتے
 سے۔“ مبشر ہنسنے لگا۔

”بہت معصوم ہے یہ۔ پتا نہیں کیسے ایڈجسٹ ہوگی یہ
 اس ماحول میں۔“ زہت نے اس کے جانے کے بعد کہا۔
 ”ریلیکس وقت لگے گا مگر ہو جائے گی۔ ابھی تو اس کی
 بہن صاحبہ کا مسئلہ ہے جو ہمارے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پا
 رہی ہیں اگر ہو جائیں تو کیا بات ہے۔“ مبشر نے شرارتی
 نظروں سے دیکھا۔

”سوچنا بھی مت۔ جب تک رفعت کا مستقبل محفوظ
 نہیں ہو جاتا میں شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”مگر زہت تمہاری عمر اب اٹھائیس سال ہے میری
 بھی اتنی ہی ہے تو کیا ہم بوڑھے ہو کے شادی کریں گے۔“
 مبشر برسوں سے اُمید لگائے بیٹھا تھا۔
 زہت جانتی تھی بچپن میں احسان صاحب اور اس کے
 چاچو نے ان کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اسی دوران رفعت چائے
 لے کر آگئی۔

”باجی یہ کزن مجھے کمپیوٹر چلانا کب سکھائے گا؟“
 ”آج سے ہی شروع کرتا ہوں مگر فیس کے طور پر
 چائے پلائی پڑے گی۔“ مبشر نے ہنس کر کہا۔
 ”تو بہت تکتے مطلبی انسان ہیں، اپنی اس معصوم کزن سے
 بھی چائے بخوائے گا۔“
 ”زہت دیکھ اب یہ زبان پکڑ رہی ہے۔“ مبشر نے
 مصنوعی غصے سے کہا۔

رفعت جلدی سے بولی۔ ”میں زیادہ نہیں بولتی آپ کی
 طرح کوئی تین چار کزن لمبی زبان نہیں میری۔ پتا نہیں منہ میں
 پوری کیسے آگئی۔“

”اللہ زہت کیا جادو کیا ہے ایک ہفتے میں اتنا اعتماد۔“
 مبشر حیران ہوا۔ زہت ان دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو رہی
 تھی۔ وہ دونوں ہنسنے بولنے لپٹ لپٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 زہت غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک
 خیال جڑ پکڑنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرا دی۔
 ”میں قربانی دوں گی اپنی بہن کی خاطر۔“ اس کے
 ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا۔

☆.....☆

”زہت تم باگل ہو یہ کیسے ممکن ہے۔“ مبشر اس کی
 بات سن کر ہنسنے سے اکھڑ گیا۔

”کیوں..... کیوں ممکن نہیں۔“ زہت نے پوچھا۔
 ”میری اور تمہاری بات بچپن سے چکی ہو چکی ہے پھر
 رفعت اور میری عمر اور طبیعت میں بہت فرق ہے۔ میں اسے
 چھوٹی بہن سمجھتا ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔“

”اچھ کا کوئی مسئلہ نہیں پھر تم میچور ہو اس کے ساتھ
 ایڈجسٹ کر سکتے ہو، میں جانتی ہوں تم اسے سنبھال سکتے ہو۔“
 ”مگر زہت میں تم سے پیار کرتا ہوں تمہارے علاوہ
 کبھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔“ مبشر اس کی آنکھوں
 میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”لحہ بھر کے لیے زہت کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ
 جانتی تھی مبشر اس سے پیار کرتا ہے مگر اس طرح اس نے بھی

اقرار نہیں کیا تھا مگر یہ لمحے گزر گئے نہت کی جگہ ایک بڑی بہن کھڑی ہوئی۔

”اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو تمہیں رفعت کو اپنانا ہوگا ورنہ میں سمجھوں گی تمہارا پیار خود غرض تھا۔“ نہت بمشکو امتحان میں ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

☆.....☆

آج کافی دنوں بعد بشران کے گھر آیا تھا۔
”تو جناب کزن صاحب اس کپیوٹر کو صرف آن کرنا ہی سکھانا تھا آگے کے سبق کون دے گا؟“ رفعت نے اس کا استقبال کیا۔
”مصرف تھا رفعت۔“ وہ پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”بائی دیکھیں ان کے کام۔“
”رفعت تم چائے لاؤ۔“ مبشر نے شیدگی سے کہا۔
”کیا سوچا تم نے؟“ اس کے جاتے ہی نہت نے پوچھا۔
”جو تم نے کہا مجھے منظور ہے۔ میرا پیار خود غرض نہیں اگر تم اس طرح خوش ہو تو ٹھیک ڈیڑی اور مہینوں میں ملنا لوں گا۔“ وہ روکے لہجے میں بولا۔

”ٹھیک یو سوچے مبشر تم نے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔“ نہت کی آواز میں خوشی تھی۔ مبشر اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔

”عجیب بندہ ہے یہ بھی۔ میری چائے کیا اتنی خراب ہے جو آرڈر کر کے نہیں پئی۔“ چائے لے کر آئی رفعت نے اسے باہر جاتا دیکھ کر تیرہ کیا لیکن مبشر کا نہیں۔

☆.....☆

”کیا بات ہے رفعت تم نے مجھے اور مبشر کو کیوں بلایا ہے۔“ نہت حیران تھی کہ آخر اسے کیا کام ہے جو مبشر اور اسے ایمر جنسی میں بلایا ہے۔ وہ دفتر سے بھاگ بھاگ آئی تھی۔
”مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا؟“ دونوں ایک ساتھ بولے۔
”آپ دونوں شادی کب کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ نہت گڑبڑا کر بولی۔
”لو باجی اب میری تو ہوئی نہیں ورنہ شادی کا مطلب بتاتی۔“ وہ مصوہیت سے بولی۔

مبشر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
”پاگل میں شادی کیسے کروں گی جب تک تمہاری نہیں

ہوگی۔“ نہت ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”ہو جائے گی باجی ابھی میری کون سی عمر ہے ابھی تو آگے پڑھنا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ پہلے چھوٹی کی شادی ہوگی پھر بڑی کی، آپ کر لیں کہیں اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“ رفعت نے مبشر کے منہ کی طرف دیکھا۔

”تم پاگل ہو۔“ نہت یہ کہہ کر کمرے کی طرف چل دی۔
”تو اس دن جناب نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔“ مبشر اس کا کان پکڑتے ہوئے بولا۔

”میرا کان چھوڑیں ذرا باجی کو منا کر آئی مجھے ان کی کمزوری کا پتا ہے۔“ وہ کان چھڑا کر نہت کے کمرے کی طرف بھاگی۔ نہت بیڈ پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔
”باجی!“ رفعت نے پکارا۔

”کیا مسئلہ ہے رفعت یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں۔“
”پر باجی مبشر آپ کو پسند کرتے ہیں اور میں بھی یہ چاہتی ہوں۔“
”مگر رفعت!.....!“

”اگر مگر کچھ نہیں آپ کو ہاں کرنی ہوگی۔ میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آپ نے جو مجھ میں دی ہیں خود دی ہیں پہلی اور آخری بار کچھ مانگا ہے، مبشر کون کی محبت لوٹا دیں۔“
نہت چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ”اتنی بڑی کب سے ہو گئیں تم؟“

”جب سے آپ کے پاس آئی ہوں۔“ رفعت اس کے ساتھ لٹ گئی۔

”ٹھیک ہے رفعت اگر تم ایسے خوش ہو تو مجھے منظور ہے۔“
”یا ہوا!“ رفعت نے جلدی سے نہت کے ہاتھ کو چوما۔ ”آپ بہت اچھی ہیں باجی۔ میں ذرا کزن کو بلا لوں۔“ وہ باہر سے مبشر کو بلا لاتی۔

نہت کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ اب وہ نہت احسان سے نہت مبشر ہو چکی تھی۔
”میں چائے لاتی ہوں۔“

”اوھر وائس روم سے آلو!“ مبشر نے اسے پکارا۔
”مجھے بے وقوف مت بتائیں۔“ رفعت نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیسے دیکھتی کبھی کبھی آنسو چھپا کر مسکراتا پڑتا ہے۔ کبھی عمر کا روگ تھا۔ وقت کے ساتھ یہ دغ بھرے گا۔ ”ہمیشہ نہت باجی ہی کیوں قربانی دیں ان کا بھی حق ہے خوشیوں پر۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

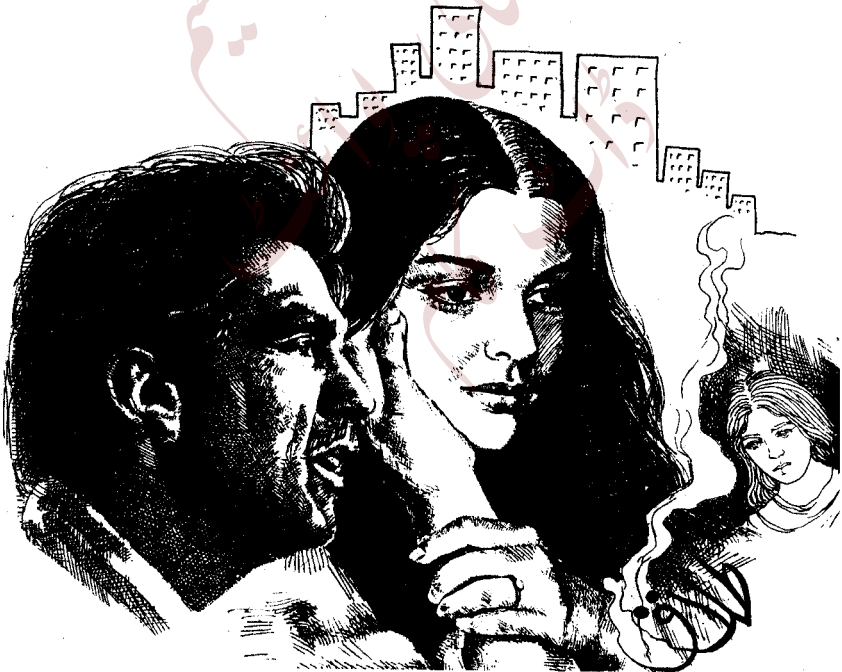
سال بعد ایک نئی دہن گھرا نا۔ اس وجہ سے کچھ لوگ میرے
راستے میں آنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، عین وقت پر جا کر
پھڑا بھی ڈال دیتے ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں ہر دو
سال بعد ایک شادی ضرور کرتا ہوں۔ اب آپ یہ نہ سمجھیں

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، میرا مذاق اڑاتے ہیں،
ہنسیاں کستے ہیں۔ میرے جاننے والوں نے میرا عجیب
لہجہ نام بھی رکھ چھوڑا ہے، کوئی مجھے آوارہ بڑھا کہتا ہے تو
لوکی رنگیلے شاہ کیونکہ میرا ایک ہی شوق ہے۔ ہر ایک دو

خوش بخت

محترم مدیر
السلام علیکم

لوگ کچھ بھی کہیں مگر میں باز آنے والا نہیں۔ کیوں کہ ہر
ایک دو سال بعد ایک نئی لڑکی سے شادی کرنا میری مجبوری
ہے۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں یہ آپ کو میری آپ بیٹی بتا دے
گی اور آپ بھی میری مجبوری جان کر مجھ سے ہمدردی
کریں گے۔
ابرار احمد
(کراچی)



کہ میں بہت امیر کبیر فخری ہوں۔ میرے دو چار تیل کے کنوئیں ہیں۔ میں ٹونوں پر سوتا ہوں۔ ابھی جناب میں تو بہت غریب اور مفلوک الحال شخص ہوں۔ اتنا غریب ہوں کہ وہاں کا جوڑا بنوانے کے لیے مجھے ادھر ادھر سے مانگنا پڑتا ہے۔ قرض کی مدد سے کام چلانا پڑتا ہے۔ قرض دینے والے بھی بغیر بتائے جان جاتے ہیں کہ میں شادی کرنے والا ہوں اور وہ مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ طرح، طرح کے جملے کہنے لگتے ہیں، کبھی کوئی سرکشی میں پوچھ بھی لیتا ہے۔ ”امیر صاحب آپ کون سا کشتہ استعمال کرتے ہیں۔ کس حکیم سے بخواتے ہیں؟ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دن ہوا ہوئے جب علیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب تو علیل خاں کے ہاتھ بھی خالی ہو چکے ہیں اور وہ آسمان کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں اور پچھانی فاختہ نہیں لٹی اڑاتی گزر جاتی ہیں۔ خیر میں بتا رہا تھا کہ میں شادی کرنے کے شوق میں جلتا ہوں۔ اور یہ شادی کا بندھن جو دو درختوں، دو جسموں کو جوڑنے کا سبب ہے، ہمیشہ ڈھیلا ثابت ہوتا ہے۔ اتنا ڈھیلا کہ کبھی ماہ دو ماہ تو کبھی چھ سات ماہ میں کھل جاتا ہے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ آنے والی مجھے لات مار جانے والیوں کی فہرست میں نام لکھوا لیتی ہے۔ تو سن لیں کہ یہ غلط اطلاع ہے۔ انہیں میں خود چلا کر دیتا ہوں۔ مگر کیوں یہ آج سن لیں۔ اس قسم کا آغاز آج سے تقریباً دس سال پہلے ہوا تھا۔ ان دنوں میں پلاسٹک پنٹ بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ گزارہ اچھے انداز میں ہو جاتا تھا۔ گھر میں صرف دو افراد تھے ایک ماں اور ایک میں۔ بھائی، بہن کوئی تھا نہیں۔ والد کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں صرف بارہ سال کا تھا۔ ماں نے ہی میری پرورش کی تھی۔ وہ بڑی لکھی تو تھی نہیں۔ اس لیے مزدوری کرتی رہی اور مجھے پڑھانی رہی۔ ماں کی پریشانیوں کو میں نے محسوس کر لیا تھا اس لیے دل لگا کر پڑھانی کرتا تھا۔ لیکن میٹرک سے آگے پڑھ نہیں سکا اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ اتفاق سے ایک فیکٹری میں جاب خالی تھی۔ مجھے رکھ لیا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اس لیے بعد میں ماں کو گھر بٹھالیا۔ اب ماں کا ایک ہی کام تھا۔ آس پڑس میں نہیں لگانا اور ایک، ایک سے تقاضا کرنا کہ وہ کسی چاندی لڑکی کو ڈھونڈیں۔ انہوں نے کئی نام پیش بھی کیے۔ میرا محلہ انتہائی غریب لوگوں کا تھا۔ وہاں صرف پٹنے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرے کی جو میں دیکھنے والیاں ہی

نظر آتی تھیں اور ایسی لڑکیاں مجھے کب پسند آتیں۔ میں ایک قلم موقوف رو کر تا رہا۔ پھر بتا نہیں کیسے ماں کو رضیہ لکھی۔ ساٹھ گز کے چمکی نما کوارٹر میں رہتے ہوئے انہوں نے اتنی گز والے گھر کی لڑکی تلاش کی تھی۔ گوکہ صورت صل بس واجبی سی تھی مگر سینے اوڑھنے کا اسے سلیقہ آتا تھا۔ اور سلیقہ مشین بھی چلا لیتی تھی۔ اچھے، اچھے کپڑے بھی سی لیتی تھی۔ یہی خوبی ماں کو سب سے زیادہ پسند آتی تھی اور ماں نے ضد باعدہ لی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سہرا باعدہ، اسلم کو چوان کے گھوڑے پر بیٹھا اور اسے بیاہ کر گھر لے آؤ۔ دن رات کی ایک ہی تکرار سے عاجز آ کر میں نے سپر ڈال دی اور رضیہ کو وہاں بیٹا کر گھر لے آیا۔ اس نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گھر کا راج پاٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اماں کو ریٹائر کر کے نماز کی چوکی پر بٹھادیا۔ یہ کام اس نے سن سلوک کے ہتھیار سے کیا تھا۔ اس لیے ماں نے بھی خوشی، خوشی اکلوتے ٹوٹے ٹریک کی چابی بھی اسے دے دی تھی اور خود سبکدوشی لے لی۔ ریٹائر آؤی زیادہ نہیں چلتا۔ مشین کے فاضل پرزے زیادہ نہیں چلتے۔ وقت سے پہلے رنگ خوردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اماں بھی ایک دن نماز پڑھتے، پڑھتے چوکی سے لڑھک گئیں۔ منچے گریں تو آواز بھی ہوئی ہوگی مگر رضیہ نے تکلیف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنے کاموں میں لگی رہی۔ جب روٹی سینگ کر ڈر رہے نا مچن سے باہر آئی تو اسے ماں فرش پر بخواب نظر آئیں۔ اس نے کہا۔ ”اماں ابھی تک آپ ابھی نہیں، چلیے اٹھ کر ہاتھ منہ دھولیں۔ مگر ماں روٹی لاتی ہوں۔“

دو تین بار آواز دینے پر بھی جب وہ نہیں اٹھی تو مجبوراً رضیہ کو اٹھانے کی زحمت کرنا پڑی۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ لگا ان کا جسم لڑھک گیا۔ اس نے چھو کر دیکھا تو ان کا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ بس اس نے اتنی زور کی چیخ ماری کہ کئی گھر بعد کی عورتیں بھی دوڑ پڑیں۔ اور پھر بین کرنے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ کسی نے میری فیکٹری میں فن کر دیا اور میں بھی بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔ پھر محلے والوں کی دینداری سے اشتراک کیا اور کفن و دفن کا انتظام ہو گیا، ورنہ میری حالت ان دنوں ایسی نہیں تھی کہ میں قبرستان کی فیس، جنازہ گاڑی کا کرایہ، کفن کی قیمت دے سکتا۔

گھر کا نظام پہلے بھی رضیہ کے پاس تھا اماں کے بعد بھی اسی کے پاس رہا۔ سر موقوف فرق محسوس نہیں ہوا۔ اور وقت گزرتا چلا گیا کہ ایک دن وہ دل گئی۔

یہ بات اماں کے انتقال کے پورے ایک سال بعد کی ہے۔ اس روز قیصری میں کچھ زیادہ کام تھا اس لیے میں کچھ دیر سے نکلا تھا۔ سڑک ویران نظر آرہی تھی انڈسٹریل زون کی سڑکیں تو صرف ڈیوٹی آؤر میں ہی تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتی ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا کی چہل چل ہوتی ہے۔ یعنی جب لوگ ڈیوٹی دینے آرہے ہوں یا جارہے ہوں۔ باقی وقت تو یہاں کی سڑکیں کسی عاصف کے دل کی طرح خالی رہتی ہیں۔ ابھی میں بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک ذیلی سڑک سے بھاگتی ہوئی لڑکی نکلی اور مجھ سے ٹکرائی۔ یہ ٹکرائیدہ قسم کی تھی۔ میں لڑکھڑکایا۔ وہ ایسے بھاگتے ہوئے آئی تھی جیسے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔ میں نے اسے غصیل نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور مصومیت نے میرے غصے کی آگ کو خنڈا کر دیا اور میں ہمدردی کے جذبات سے بھر اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بی بی کیا بات ہے تم اس طرح بھاگ کیوں رہی ہو؟ کیا کتے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

دوڑنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی جو سینے کے زردوم سے ہو رہا تھا۔ نگاہیں ٹپکنے لگی تھیں اور میں ٹھہرا ایک شریف انٹنس شخص اس لیے نظر چرانے لگا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کی اداکاری کرنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ ہر نی کی طرح بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں مڑ، مڑ کر دیکھنا خطرے کا اشارہ تھا۔ ان دونوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ اور نہ ہر ایرے غیرے کے پاس بی بی ہو کر تھی مگر غنڈے بد معاش ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جاتو بھی ہوا کرتا تھا۔ جو بڑی آسانی سے مقابل کے پیٹ میں اتر جاتا تھا۔ اس کے انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی غنڈے کے چنگل سے نکل کر بھاگ رہی ہے۔ تبھی کافی دور دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی کو پکڑنے آرہے ہیں۔ وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ بس میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ بے تکلفی اضطرابی طور پر سرزد ہوئی تھی مگر ضروری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے سامنے والی گلی میں آ گئے۔

یہ بات اماں کے انتقال کے پورے ایک سال بعد کی ہے۔ اس روز قیصری میں کچھ زیادہ کام تھا اس لیے میں کچھ دیر سے نکلا تھا۔ سڑک ویران نظر آرہی تھی انڈسٹریل زون کی سڑکیں تو صرف ڈیوٹی آؤر میں ہی تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتی ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا کی چہل چل ہوتی ہے۔ یعنی جب لوگ ڈیوٹی دینے آرہے ہوں یا جارہے ہوں۔ باقی وقت تو یہاں کی سڑکیں کسی عاصف کے دل کی طرح خالی رہتی ہیں۔ ابھی میں بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک ذیلی سڑک سے بھاگتی ہوئی لڑکی نکلی اور مجھ سے ٹکرائی۔ یہ ٹکرائیدہ قسم کی تھی۔ میں لڑکھڑکایا۔ وہ ایسے بھاگتے ہوئے آئی تھی جیسے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔ میں نے اسے غصیل نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور مصومیت نے میرے غصے کی آگ کو خنڈا کر دیا اور میں ہمدردی کے جذبات سے بھر اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بی بی کیا بات ہے تم اس طرح بھاگ کیوں رہی ہو؟ کیا کتے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

دوڑنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی جو سینے کے زردوم سے ہو رہا تھا۔ نگاہیں ٹپکنے لگی تھیں اور میں ٹھہرا ایک شریف انٹنس شخص اس لیے نظر چرانے لگا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کی اداکاری کرنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ ہر نی کی طرح بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں مڑ، مڑ کر دیکھنا خطرے کا اشارہ تھا۔ ان دونوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ اور نہ ہر ایرے غیرے کے پاس بی بی ہو کر تھی مگر غنڈے بد معاش ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جاتو بھی ہوا کرتا تھا۔ جو بڑی آسانی سے مقابل کے پیٹ میں اتر جاتا تھا۔ اس کے انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی غنڈے کے چنگل سے نکل کر بھاگ رہی ہے۔ تبھی کافی دور دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی کو پکڑنے آرہے ہیں۔ وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ بس میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ بے تکلفی اضطرابی طور پر سرزد ہوئی تھی مگر ضروری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے سامنے والی گلی میں آ گئے۔

وہ ایک ذیلی سڑک تھی۔ اس سڑک پر قطار میں کئی بچکے بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں پوری قوت سے۔۔۔ بھاگ رہے تھے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ وہ مرد ہیں دیکھنے میں

”میرا خیال ہے کسی بچکے میں گھس گئی ہے۔“

”ایک، ایک، بچکے میں گھس کر دیکھنا تو نامکنی بات لگتی ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں جس بچکے کا گیٹ کھلا ہوا نظر آئے اس میں دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اندر ڈرائیوگ روم میں تو جانے سے رہی۔ باہر ہی چھپی کھڑی ہوگی۔“

اتنا سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں جھانک سکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور برآمدے کے برابر میں بنی گلی کی طرف بڑھ گیا۔ چھپنے کے لیے وہ گلی بہت مناسب تھی اس گلی میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ باہر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

”اے کون ہو کہاں گھسے چلے آ رہے ہو؟“

ہم نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ آواز گیٹ کی طرف سے آرہی تھی۔ ہم ساکت کھڑے ہو گئے تھے کہ دوبارہ آواز آئی۔ یہ آواز کسی دوسرے کی تھی۔ ”ادھر ایک لڑکی اور ایک لڑکا تو نہیں آیا۔ ہم ان دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ادھر کوئی نہیں آیا۔ بھاگو رن نہ کتا کھوتا ہوں۔“

کتے کا نام سن کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کتا تو ہماری یونیورسٹی کا سونگھ لیتا اور شور مچانے لگتا۔ یہ بات

بھی سمجھ میں آچکی تھی کہ لڑکی کا چچا کرنے والے دونوں غنڈے اندر آنا چاہ رہے تھے جسے جنگلے والے نے روک دیا ہے۔

”فورا بھاگو ورنہ پولیس بلا لوں گا۔“ اس دھمکی پر شاید وہ لوگ واپس ہو گئے تھے۔ کیونکہ خاموشی کی چادر تنی تھی۔ ہم بھی مطمئن ہو گئے تھے اور باہر نکلے پر غور کر رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”اب باہر جاؤ۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، ایک عجیب شیم بندہ ہاتھ میں ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ وہ حلیہ سے مالک تو لگ نہیں رہا تھا یقیناً چوکیدار ہوگا۔ اسے دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ رنگ بالکل فق ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارے چچے کچھ غنڈے لگ گئے تھے۔“

”یہ سب بعد میں بتانا۔ جلدی ادھر آؤ۔“ ہم لوگ صرف پناہ کے لیے آئے ہیں، ہماری نیت بری نہیں ہے۔“ میں نے حفظاً مقدم کے تحت کہا۔

”مجھے پتا ہے، میں نے تم دونوں کو سڑک پر ہی دیکھ لیا تھا۔ جب تم اندر آ رہے تھے اس وقت بھی میں کھڑکی پر کھڑا تھا۔“ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اس لیے ہم دونوں آگے بڑھ آئے۔ لڑکی کی نظر اس کے ڈنڈے پر جمی ہوئی تھی۔ شاید اس کے اندر اب بھی خوف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری آڑ لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔

”قرب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔ ”تم لوگ رہتے کہاں ہو؟“ میں نے اپنے علاقے کا نام بتایا۔

”اچھا چلو گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے روش پر کھڑی سوزو کی کیری کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر کافی سارا سامان لدا ہوا تھا۔

”مگر کیوں؟“ میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”وہ لوگ آس پاس ہی ہوں گے۔ اکیلے لگے لوگ تو اس لڑکی کے حق میں بہت برا ہوگا۔“

میں واہموں وسوسوں میں گمراہ ہوا تھا مگر بات اس کی صحیح تھی اس لیے میں اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ میرے برابر میں وہ لڑکی بیٹھ گئی۔ سوزو کی چل پڑی۔ اس سے تیز دماغ دوڑ رہا تھا سوچوں کا ایک گرداب تھا، فکر و پریشانی کا ٹھانڈا مارتا سمندر تھا اور میں تھا۔ سوزو کی میں خاموشی تھی۔ لڑکی خوف سے خاموش تھی اور میں فکر کی وجہ سے۔ ڈرائیور

بھی خاموش تھا۔ تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ دو بائیک پیچھے، پیچھے چل رہی تھیں۔ انڈسٹریل ایریا سے نکل کر ہم مرکزی سڑک پر پہنچ گئے تھے مگر وہ بائیک ساتھ، ساتھ تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ یہ بائیک والے وہی دونوں غنڈے ہیں۔ یہاں رونق عروج پر تھی۔ ٹریفک زیادہ تھی۔ ڈرائیور نے سوزو کی سائڈ میں کر کے روک لی پھر بولا۔ ”چلو اتر جاؤ اور یاد رکھنا، ابھی وہاں علاقے میں لڑکی کے ساتھ نہ جانا۔ عزت اور جان دونوں کا خطرہ ہے۔ اسی لیے تمہیں ساتھ لے آیا کہ وہ لوگ تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں۔“

میں نے بائیک والوں کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، مجھے خوف محسوس ہوا کہ اب یہ لوگ پھر روک کے کی کوشش کریں گے۔

”اب یہاں سے اپنے علاقے کی بس چڑو اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

ہم فوراً اتر گئے۔ اس نے پھر کہا۔ ”ادھر آؤ۔“ میں پھر لگا کر دوسری کھڑکی پر پہنچا مگر میری نظر بائیک والوں پر تھی۔ اطمینان تھا کہ یہاں رونق ہے وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ جب ایک آدمی سے ڈر گئے تو اتنے لوگوں کے سامنے ان کی ہمت نہیں ہوگی۔

”ادھر نہیں ادھر دیکھو۔“ اس نے کہا تو میں ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کسی کو بتانا نہیں کہ تم کس جنگلے میں چپے تھے۔ اب اس جنگلے کو ذہن سے کھرچ دو ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

”جی اچھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”وجہ یہ سن لو۔“ ”کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس کی منگی میں بہت سے مڑے مڑے نوٹ تھے۔ انداز ایسا تھا جیسے گنے بغیر جب میں بھرا گیا ہو۔ وہ کافی سارے تھے مگر بے ترتیب تھے۔ انہیں اس نے میرے اوپر والی جیب میں ٹھونٹے ہوئے کہا۔ ”رکھ لو بعد میں کام آئے گا اور یہ بھی سن لو، ہم چور ہیں۔ یہ جو سامان لدا ہوا ہے یہ چوری کا ہے۔ بگلا خالی کر کے آ رہے ہیں۔ لڑکی ساتھ ہو تو پولیس والے چینگ کے لیے روکتے ہیں اسی لیے تم دونوں کو بیٹھا لیا تھا۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے ایکسلیٹر دبا دیا۔

ایسا زبردست انکشاف اور اتنے سارے نوٹ میں تو سکتے ہیں رہ گیا تھا۔ تبھی مجھے بائیک والوں کا خیال آیا، میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں سوزو کی کے پیچھے، پیچھے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



موسم کی بدلتی گرماہٹ

نمبر کے شمارے

کی یادگار زماہٹ

اولین صفحات

ظلم و زیادتی کی ایک حد ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسا کردار تھا جس نے زندگی و سفاکیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ایچ اقبال کے قلم کی شتر زنی

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب، کے مالک جیپین کا استحسان، محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سردیوں کے رنگ

نفرت... محبت... سادگی و دوارنگی کے رنگوں سے حزن سردیوں کے رنگ

ان کے علاوہ

مظہر امام، تنویر ریاض، سلیمان فور، ارشد بیگ، جمال دوستی، تمکین رضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد ترجمہ کہانیاں

جینے کے چمن

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

جار ہے تھے۔ یقیناً وہ بھی اس کے ساتھی ہوں گے۔
ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔
اس کے چہرے پر اب خوف کا سایہ نہیں تھا، اطمینان سا نظر آ رہا تھا۔ اسے پرسکون دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ”اب یہ بتاؤ جنہیں جانا کہاں ہے؟“
اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

”تمہارا گھر کہاں ہے؟ اکیلی چلی جاؤ گی ناں۔“
میں نے پھر سوال کیا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ جیسے جواب دینے سے گریزاں ہو۔ اسے یوں خاموش دیکھ کر میرا بارہ چڑھنے لگا تھا۔ ”بی بی! میں نے پوچھا ہے کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟ گھر کہاں ہے؟“ مرالہ جھجھکیا تھا۔ پھر جی اس نے جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے میرے بازو کو سختی سے پکڑ لیا تھا جیسے وہ میرا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اس طرح بازو پکڑنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔
”کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس بار میں نے جھنجھلا کر کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”ارے بابا منہ سے یولو۔ ڈھائی من کا سر ہلانے سے بہتر ہے کہ ایک چمٹائک کی زبان ہلادو۔“ میری آواز تیز ہو گئی تھی۔
اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھ کر اپنا منہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے منہ کو دیکھتے ہی میں اندر تک کانپ گیا۔ اس کی آدمی زبان کئی ہوئی تھی جیسے کسی حادثہ میں کٹ گئی ہو۔ وہ سن سکتی تھی۔ اکثر گوشت قوت سماعت سے محروم ہوتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ لڑکی کسی حادثہ میں زبان کھو بیٹھی ہے۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر ایک رکشے والے کو اشارہ کیا اور اسے اپنے محلے کا نام بتا کر اندر بیٹھ گیا۔ لڑکی بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

گھر پہنچا تو بیوی نے مشکوک نظروں سے خیر مقدم کیا۔ جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ کیا میری سوتن لے کر آئے ہو؟ میں نے اس کی نظروں کی تپش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تھکا ہارا آیا ہوں، کم سے کم ایک کپ چائے ہی پلاؤ۔“

”یہ ہے کون؟“ اس نے چچی آواز میں پوچھا۔

”بتاتا ہوں پہلے چھری کے نیچے دم تو لیتے دو۔“

”چائے پلائے میری جوتی، پہلے بتاؤ یہ ہے کون جو اس طرح اپنے باپ کا گھر سمجھ کر آرام سے بیٹھی ہے۔“

”بتاتا ہوں ناں، پہلے چائے تو لے آؤ۔“

”چائے کے لیے چینی پتی کا ہونا ضروری ہے۔ مگر

میں ایک چچی چائے کی پتی نہیں ہے۔ دکان دار نے بھی

ادھار دینے سے منع کر دیا ہے۔“ وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔

”یہ لو اور جا کر اس کے منہ پر مار دو۔“ کہہ کر میں نے

جیب سے نوٹ نکالے، نوٹ دیکھ کر بیوی کی آنکھیں حلقوں

سے اٹھنے لگیں اور میری سانسیں ڈوبنے لگیں کیونکہ میں نے

یہی سمجھا تھا کہ سوز دکی والے نے سو دو سو دیے ہیں مگر اب جو

دیکھا تو وہ ہزار، ہزار کے نوٹ تھے۔ بیوی غصہ بھول کر نوٹ

کی طرف اس طرح جھنجھٹی جیسے خیل گوشت پر چبھتی ہے۔

سب بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں، بیویوں کی دیوانی، نوٹوں

میں بیوی کی دلچسپی لڑکی سے چھپی نہ رہ سکی، بتائیں اس نے

کیا خیال کیا، وہ جو بیوی کے تہہ پر دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی، اس نے

جلدی سے اپنی کمرے سے ایک چھوٹی سی پوٹلی کھولی اور اس میں

سے کچھ زیورات نکالے اور اسے بھی بیوی کی طرف

بڑھا دیا۔ رضیہ پر تو شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی

تھی۔ اتنے سارے نوٹ اور زیورات، وہ تعجب و اطمینان کی

دولت ملنے جیسی کیفیت میں آگئی تھی۔ وہ تمام چیزیں الماری

میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو سامان سے لدی پھندی

تھی۔

اتنے دنوں بعد گھر میں چکن بھی پکا تھا۔ ہم تینوں نے

ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ بیوی کا غصہ، شک، شبہ سب ہوا ہو گیا

تھا۔ جب کمرے میں پہنچا تو لڑکی کے بارے میں ایک فرضی

کہانی سوچ چکا تھا وہی اسے سنا دی کہ اس کو گنگی کے ماں،

باپ مر چکے ہیں، چچا پرورش کر رہا تھا کہ اس کا بھی انتقال

ہو گیا اور چچی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب یہ کہاں جاتی،

کسی بھی غلط ہاتھ میں پڑ سکتی ہے اسی لیے لے آیا کہ کسی

دارالامان میں داخل کرادوں گا۔

کچھ بھی ہو بیویاں ہر چھوٹی بچی بات پر آسانی سے

یقین کر لیتی ہیں اس نے بھی امتنا صدقا یقین کر لیا۔

اگلے روز جب میں کارخانے پہنچا تو منیجر صاحب کو

پریشانی میں پایا۔ میں نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ارے کہاں بھائی کہاں خیریت، صبح سے دوبار

بڑے صاحب کا فون آچکا ہے، گودام میں باہر سے کیمیکل

آ رہا ہے جب کہ گودام کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک انچ کھ

خالی نہیں ہے۔“ دراصل پینٹنگ کے وقت یا بعد میں ڈبے

چپک جاتے ہیں کہیں لیک نہ ہو جائے اس ڈر سے ان ڈبوں کو

مسٹر دکر دیا جاتا ہے۔ کباڑی اسے کوارٹر ریٹ سے بھی کم

میں خرید کر لے جاتے ہیں وہ اسے چھوٹے دکانداروں کو

دیتے ہیں۔

”ایک بندہ آتا تو ہے؟“ میں نے کہا۔

”جو بندہ ریٹیکلڈ مال لے جاتا ہے وہ آ نہیں رہا۔

تین ماہ سے زیادہ ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہے۔

گودام اٹ گیا ہے۔“

”ہاں میں نے دیکھا تو ہے گودام بھر گیا ہے۔“

”تو میاں جا کر تلاش کرو، جو بندہ ملے اسے لے کر

آؤ بڑے صاحب بہت ناراض ہو رہے ہیں۔ گودام خالی

کرنا ضروری ہے، اگر کوئی نیا بندہ ملتا ہے تو اسی کو لے آؤ۔“

”اس میں نفع کا ریت کیا ہے؟“

”مت پوچھو جو مال یہ لوگ دس روپے میں اٹھاتے

ہیں وہ دکانوں پر سو کا پہنچاتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ ایک لاکھ

کر سکتے ہیں۔“

”کتنے کا مال اٹاک میں پڑا ہے؟“

”تقریباً ایک لاکھ کا ہوگا۔“

ان کے جواب نے مجھے ایک نئی راہ بھادی۔ لڑکی

نے جو زیورات دیے ہیں اگر اسے فروخت کیا جائے تو اتنے

ی پیسے ملیں گے۔ کیوں نہ ایک رسک لیا جائے۔ اس خیال

کے آتے ہی میں نے کہا۔ ”سر آپ اگر ساتھ دیں تو میں خود

اس لائن میں آ جاؤں۔“

”ارے میاں اگر اتنی رقم لگا سکتے ہو تو دیر نہ کرو، یہ

بہت اچھا کام ہے۔ اس میں منافع ہی منافع ہے۔“ انہوں

نے خوش ہو کر کہا۔

”کل میں رقم کا انتظام کرتا ہوں۔“ کہہ کر میں گھر

آ گیا۔ لڑکی کے زیورات کو بیچنے کے بعد مجھے تقریباً ایک

لاکھ بیس ہزار ملے۔ میں رقم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

وہاں سے مال اٹھایا اور کئی ڈکانوں تک پہنچا دیا۔ سارا مال

اتنی آسانی سے نکل گیا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ تقریباً چار لاکھ

روپے ہاتھ آئے، اتنا منافع دیکھ کر میں تو پاگل ہوا تھا، اتنی

بڑی رقم بھی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم خواب میں بھی نہیں

دیکھی تھی۔ مگر حقیقت بہار دکھا رہی تھی۔ میں نے بیوی کو

دلچسپ و دلگداز تحریروں سے سجا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ



پاکینہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول

سیمما رضا ردا کا نئی ناول ہم کو عبث بدنام کیا اختتامی مراحل میں

اسما قادری کی ایک نہایت شاندار تحریر..... بد صورت

ہما بیگ، نیلم احمد بشیر اور صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں

نگہت سیمما کا خوب صورت اندازِ بیاں..... پُر لطف ناولٹ صیدِ ضیافت کی صورت

دینی معلومات پر مبنی پر عقیدت مضامین

ماضی کی ادا کارہ دیبا کی

ہونہار فنکارہ صاحبزادی مدیحہ رضوی

سے دل پزیر ملاقات

سحر بساجد کی اچھوتی تحریر..... عنان گیر مکمل ناول کی صورت

ادبی اعلان

عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،

ہاجرہ ریحان و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ محوِ کن شاعری، خوش ذائقہ تراکیب، متحرک تراشے اور بہت کچھ صرف آپ جیسے پُر ذوق پڑھنے والوں کے لیے

بتایا تو وہ خوشی سے جموم اٹھی۔ اس نے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ اس گندے علاقے سے نکل کر کسی اچھے علاقے میں گھر لے لیں۔

میں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد تمہارا یہ خواب بھی پورا کروں گا مگر اس نے تو پیش قدمی کر دی۔ ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس پہنچ گئی کہ کسی اچھے علاقے میں مکان چاہیے۔ اچھے علاقے میں اس وقت پندرہ بیس لاکھ سے کم میں گھر نہیں آتا تھا۔ اتنی رقم میرے پاس تھی نہیں، صرف امیدیں تھیں۔ بیوی کا حوصلہ تھا، اس کا کہنا تھا کہ انہی پیسوں سے کام آگے بڑھاتے رہو۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ریجنیکل مال ہر روز نہیں ملتا۔ اس کے لیے انتظار کرتا پڑتا ہے۔ سال کے سال مال نکلتا ہے۔ جب یہ بات اسے معلوم ہوئی اس نے کہا۔ ”اس شہر میں اور بھی تو کارخانے ہیں وہاں جا کر معلوم کرو۔“

یہ مشورہ معقول تھا، میں نے منبر صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس خیال کو سراہا بلکہ ایک احسان بھی کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہر روز تم ایک ٹھنڈا پہلے آ جاؤ اور دو ٹھنڈا پہلے نکل جاؤ۔ اس وقفے کا فائدہ اٹھاؤ اور دوسرے کارخانوں میں جا کر پتا کرو۔ جہاں سے جو ملے اسے خرید لو۔

اب تک میں بسوں میں سفر کرتا تھا۔ وقت کی بچت کے لیے میں نے بائیک لے لی اور جی جان سے کام میں لگ گیا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی، ایک کے بعد دوسرا کنٹریکٹ ملنے لگا۔ کہیں سے رنگ کے ڈبے اٹھاتا اور کہیں سے ریجنیکل کپڑوں کے تھان، کسی سے سینڈلوں کا اشاک لیتا تو کسی سے کاسٹیک، جہاں سے جواٹھاتا وہ کوڑیوں کے مول اٹھاتا مگر بیکار تو سونے کے بھاؤ بکنا گویا دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ ایسی بارش کے سنبھالے نہیں سنبھال رہی تھی۔ صرف ایک سال میں حالات اتنے بدل گئے کہ اب لوگ مجھے غرو کی بجائے فخر الدین صاحب کہنے لگے۔ میں نے رہائش بدلی، تنیم نے حلیہ بدلا۔ اب وہ زیادہ وقت بناؤ سکھار میں، زیورات کی خریداری میں، ملبوسات کے انتخاب میں صرف کرتی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اسے دوسروں کو خاموش نگاہوں سے دیکھنا ضروری ہے کہ وہ سیٹھ فخر الدین کی بیوی ہے۔ واقعی اس میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر میں خود کو تبدیل نہیں کر پاتا تھا۔ میں اب بھی شلوار سوٹ اور پشاور کی چپل میں نظر آتا تھا۔ تبدیلی اس گویا لڑکی میں بھی نہیں آئی تھی جسے میں خوش بخت کے نام سے پکارتا تھا، اس

کے ماضی سے اب تک لاعلم تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنا نام بتایا نہیں تھا۔ اپنے بارے میں بتا بھی تو نہیں سکتی تھی کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ والدین کہاں ہیں کیا کرتے ہیں، اسے پکارنے کے لیے ایک نام کی اشد ضرورت تھی۔ اسی لیے میں نے خود ہی یہ نام رکھ دیا تھا۔ نام انسان کی پہچان ہے۔ اور وہ واقعی ہی اسم بہ اسم تھی۔ میرے لیے تو خوش قسمتی کی دیوی ثابت ہوئی تھی۔ میرے حالات اس کے آنے کے بعد ہی تو بدلتے تھے۔ اس لیے مجھے محسوس بھی نہیں تھا کہ میں معلوم کروں۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں سے، میرے گھر سے جائے، مگر میری بیوی کو چین نہیں تھا۔ خوش بخت اکیلی نوکرائیوں کا کام نہ بنائی تھی۔ اسی وجہ سے تنیم کو افریقہ میں خود پر صرف کرنے کو وقت مل رہا تھا پھر بھی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر دو چار روز میں وہ گردان ضرور کرتی کہ اس لڑکی کو بچاؤ۔ دراصل اسے اس کی خوب صورتی سے ڈر لگا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت ٹوہ میں رہتی کہ میں اس سے کتنی پار ملتا ہوں۔ کسی اور کیا باتیں کرتا ہوں۔ کئی بار اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا بھی کہ میں اس سے عشق کرنے لگا ہوں۔ اسے میں نے کئی بار سمجھایا بھی کہ اللہ کی بندی، کچھ تو خوف خدا کر۔ وہ ایک بے زبان لڑکی ہے۔ ایسی مخلوق سے بچنا نہ لینا پھر بھی وہ دنگا کرنے پر تیار رہتی تھی۔ کیونکہ جیسے جیسے خوش حالی آ رہی تھی ویسے ویسے اس کے دل میں ڈر بیٹھا جا رہا تھا کہ کہیں میں اسے چلتا نہ کروں۔ خوش بخت کو بیوی بنالوں۔

ایک دن میں وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ نوکری تو کب کا چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے وقت اپنا تھا۔ جب چاہتا گھر سے نکلتا اور جب دل کرتا گھر لوٹ آتا۔ اس دن بھی وقت سے پہلے آ گیا تھا اسی لیے وہ مضمحل کھینچا۔ اس منظر نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا۔ میں نے دروازے سے جھج کر کہا۔ ”اڑی بد بخت یہ تو کیا کر رہی ہے۔ کیوں خوش بخت کو پیٹ رہی ہے۔“

”یہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں ایک لمحے کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

”ایسا کیا کر دیا اس بیجاری نے۔“

”مسز مدنی تیار ہی نہیں کہ ان کے بھائی نے بھی ایک لڑکی کو سہارا دیا تھا اور اب وہ لڑکی ان کی بھائی بن کر راج کر رہی ہے۔ میں اس گھر میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے جھج کر کہا۔

”ایسی بے وقوفی تمہاری سہیلیاں ہی کر سکتی ہیں جو بے بات کی بات پیدا کر رہی ہیں۔ کان کھول کر سن لو، تمہیں اس لڑکی کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ واقعی خوش بخت ہے۔ خوش قسمت کی جیتی جاگتی دیوی ہے۔ اس کے آنے سے ہی ہمارے گھر میں خوش حالی آئی ہے۔ ورنہ کیا تھا یہاں، مہینے کے آخری دنوں میں قرض پر گزارہ ہوتا تھا۔ خود تمہارے پاس ایک دو ہی اچھے جوڑے تھے۔ ایک پتلی سی چین تک نہیں مگر آج..... آج دیکھو اپنے وارڈروپ کو، کپڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ سیف میں زیورات اٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی کے قدموں کی برکت ہے۔“ میں نے بھی چیخ کر جوابا کہا۔

”مائی فٹ۔“ آج کل وہ محفلوں میں آنے جانے کے لیے انگلش سیکر رہی تھی اور رب ڈالنے کے لیے وقت بے وقت انگلش کے بیٹے بولتی تھی۔

”مائی فٹ نہیں کرین فٹ..... بنزیری ہے تو..... کیوں اپنی اوقات دکھا رہی ہے۔ تیرے آنے سے مجھے صرف پریشانی ملی ہیں۔ جب کہ اس معصوم کے آنے سے خوشیاں ہی خوشیاں ملیں۔“

”ہاں ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔ محنت خود کرتے ہیں اور کریڈٹ اس کو دیتے ہیں۔“

”ایسا میں کیوں کرنے لگا۔ کیا میں تم سے ڈرتا ہوں جو جھوٹ بولوں گا۔ تم خود کچھ نہیں رہیں کہ حالات کس تیزی سے بدلے ہیں۔“

”تم مردود کی چال خوب سمجھتی ہوں۔ اس کی صورت شکل اچھی دیکھ لی تو ایک پلان کے تحت کام کرنا شروع کر دیا مگر میں کامیاب نہیں ہوئے دوں گی۔“

یہ جنگ ابھی اور طوالت پکڑتی کہ ڈورنیل بج اٹھی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بیوی سے کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی مگر دروازے پر پہنچ کر رگ گئی۔ پھر بولی۔ ”جا کر دروازہ کھولیں۔ امجد آیا ہوگا۔“

میں نے دروازے پر پہنچ کر لاک کھولا تو سامنے امجد کھڑا تھا۔ وہ رضیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ موصوف پان کا بیکین چلاتے تھے مگر اب اپنی باجی کی مہربانی سے ایک جنرل اسٹور کے مالک بن چکے تھے۔ میں سب کچھ سمجھتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ کیونکہ دسترخوان کا بچا ہوا اگر کسی کے کام آجائے تو برا کیا

تھا۔ پھر وہ میری شریک حیات کا بھائی تھا اگر وہ بہن کی مدد سے اپنی زندگی سنوار رہا تھا تو اس میں برائی کیا تھی۔

موصوف اندر آتے ہی مجھ پر آنکھیں تریرنے لگے۔ انداز خطاب کی گرمی نے میر مزاج گرم کر دیا۔ پہلے بہن دماغ کی وہی بنا چکی تھی۔ اب یہ آگئے تھے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر کہا۔ ”ہاں ذرا بچر کہتا کیا کہہ رہے تھے۔“ موصوف نے شاید میرے جملے کی کاٹ کو سمجھا نہیں فوراً بولے۔ ”میں کہہ دیتا ہوں، میری باجی کو اکیلا مت بھیجے گا۔ ہم چار بھائی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجیے گا۔“

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں جواب گھونٹے سے دیتا۔ ایک ہی گھونٹے سے اس کے دانت اور اس کی باجی کا سر پھوڑ دیتا۔ مگر یہ بے وقوفی ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 307 لگتی اور میں حوالات میں پہنچ جاتا۔ دانا کہتے ہیں کھانا غنڈا کر کے کھانے میں مزہ ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موصوف شیر ہو گئے۔ گلے فرمانے۔ ”اس گونگی کو اسی وقت نکال باہر کریں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا اور اس سے کہا۔ ”ایک کام کرتے ہیں تمہارے ابا کے پاس چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر باقی باتیں کر لیتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں یہی اچھا ہوگا۔ وہاں چل کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ وہ اپنے زعم میں آئین اوپر کرتے ہوئے کہتا چلا گیا اور میں غصے میں بھرتا چلا گیا۔

”ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ایک دوست کو فون کر لوں۔“ کہہ کر میں فون کی طرف بڑھا اور اپنے ایک دوست کا نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملنے ہی اس سے بولا کہ تم ذرا رضیہ کے گھر آ جانا ایک ضروری بات کرنی ہے۔ رضیہ کے علم

میں یہ بات بھی کہ میں نے جسے فون کیا ہے وہ ٹاور کا نا می گرا می شخص ہے۔ کہنے کو اس کی ایک بڑی سی دکان تھی اور وہ کپڑوں کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھ سے رنجیکٹھ تھان خریدتا تھا۔ کل بھی وہ اسی سلسلے میں آچکا تھا مگر یہ سب دکھا دیا تھا۔ وہ

بہت خور تھا۔ بد معاشی کے پیسوں پر اس کا گزارہ تھا۔ فون رکھ کر میں نے الماری سے کچھ کاغذات نکالے اور باہر نکل آیا۔ وہ دونوں بھائی بہن بھی باہر آ گئے۔ میں نے نیکی سی اور ناواری کی طرف چل پڑا کہ وہیں رضیہ کا گھر تھا۔ وہ دونوں خوش تھے کہ اپنے گھر میں مجھے خوب بے عزت کریں گے۔ اپنی شرائط منوائیں گے۔ مگر ان کے گھر پہنچنے ہی

میں نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ میں نے اس کے ابا سے کہا۔ ”آپ سے ایک ضروری بات کہنی تھی اسی لیے آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“ وہ آج کل کچھ زیادہ ہی مہربان تھے ورنہ وہ بھی تھے جو مجھ سے بھاگتے تھے کہیں میں ان سے کوئی سوال نہ کر دوں۔ کچھ مانگ دلوں لیکن جب سے میرے حالات بدلے تھے جس کا اثر ان کے گھر پر بھی پڑا تھا اب وہ میرے لیے مہربان بن گئے تھے۔ مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ گھر کے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے۔

میں نے رضیہ اور اس کے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ابھی نوشاد آتا ہی ہوگا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں اپنی بات ختم کر لینا چاہتا ہوں آپ کو تو معلوم ہی ہے نوشاد کس قماش کا آدمی ہے۔ باقی کی باتیں وہی کرے گا۔ فی الحال تو میں ایک پرانی بات بتا دوں۔ آپ کو بھی یاد ہوگا جس دن میری منگنی ہوئی اسی دن میرا شناختی کارڈ اور پانچ سو روپے گر گئے۔ پھر جب شادی ہوئی تو میری نوکری جاتی رہی مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور تنگ دود میں لگا رہا۔ پھر ایک دن ایک لڑکی ملی میں اسے انسانیت اور خدا ترسی کے تحت کمر لے آیا۔ اس کے آتے ہی قسمت کے دروازے کھل گئے اور مجھے ماننا پڑا کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے۔ وہ عورت واقعی خوش قسمتی کی دیوی ثابت ہوئی مگر آپ کی بیٹی اسے گھر سے نکالنے کی ضد کر رہی ہے۔“

”ہاں، ہاں اسے میں ایک لمحے کے لیے بھی گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ رضیہ نے چیخ کر کہا۔

”صحیح کہا۔ بد قسمتی، خوش قسمتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے یہی کہنا ہے کہ میں خوش قسمتی کے آگے بد قسمتی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے.....“

”ہاں، ہاں تم نے تو یہ سارا گھڑاک ہی اسی لیے پھیلایا ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ اب میں اس گھر میں جب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ کیسی رہے گی۔“

”ہاں، ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم یہیں رہو اور اس کے لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“

میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ میں نے آگے کہا۔ ”باقی کی باتیں نوشاد آکر کرے گا۔ اگر کسی نے چوں بھی کیا تو وہ اس کے ساتھ خودنٹ لے گا۔“ اتنا کہا ہی تھا کہ دروازے پر نوشاد کی پکار آئی۔

میں نے کہا۔ ”لوشاد ابھی آگیا۔ وہ تمہیں حق مہر کی رقم دینے نہیں دے گا پھر بھی میں شرافت کے ساتھ حق مہر کی رقم دے رہا ہوں..... یہ رہے پچاس ہزار روپے.....“ اتنا کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

مجھے پتا تھا کہ اس وقت تو سب نوشاد کے خوف سے خاموش رہ گئے مگر میرے نکلنے ہی جنگ عظیم سوم شروع ہو گئی ہوگی۔ بہن سارا الزام بھائی پر اور بھائی، بہن پر دے رہا ہوگا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا وہ کر آیا تھا۔ صرف امجد کی آنکھیں دکھانے کی وجہ سے۔ اگر وہ مجھے لکارنے کی جرات نہ کرتا تو میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔

نوشاد کے ساتھ دو تین دکانوں کا چکر لگایا اور گھر واپس گھر آگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ خوش بخت گوئی ہے تو کیا ہوا ایک سک سے تو بری نہیں ہے۔ اچھا یہ ہے کہ گوئی ہے۔ کبھی کچھ بولے کی نہیں۔ اس لیے اس کے ساتھ ابھی نکاح پڑھوا لوں گا اور آج ہی یعنی مون ٹریپ پر سوات چل دوں گا۔

دل ہی دل میں پروگرام بناتا ہوا گھر میں داخل ہوا مگر یہ کیا؟ گھر خالی پڑا تھا۔ اکلوتی نوکری ابھی ایک کھنٹے کے لیے برتن دھوئے آتی تھی وہ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ خوش بخت اشاروں میں اسے سمجھا گئی ہے کہ وہ میرا گھر ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اس لیے جا رہی ہے، کہاں یہ خود اسے بھی معلوم نہیں۔

اتنا سنتے ہی میں گھر سے بھاگا اور آس پاس کا تمام علاقہ دیکھ آیا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ کافی عرصہ تک میں اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نہ ملی۔

وہ کیا گئی میری خوش قسمتی بھی ساتھ لے گئی۔ یہ در پہ نقصان ہونا شروع ہو گئے۔ رنگ کے کنٹر خریدے تو سب کے سب لیک والے نکلے جس میں رنگ پوری طرح جم کر خراب ہو چکا تھا۔ کپڑوں کے تھان خریدے تو ایسڈ والے رنگ کی چھپائی والا نکلا۔ جس کی وجہ سے کپڑے گلے ہوئے تھے۔ اسی طرح کئی ایک سودے میں بھاری نقصان ہوا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے فلاش ہو گیا۔ گویا بڑے، بوڑھے صحیح کہتے ہیں کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے اسی لیے میں ایک کے بعد ایک شادی کرتا چلا جا رہا ہوں کہ کوئی تو خوش قسمت نکلے گی۔





محبت گزیدہ

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

امید قوی ہے کہ میری آپ بیتی آپ کو بھی پسند آئے گی۔
گوکہ اس سچ بیانی کی مرکزی کردار نیلم ہے مگر میرا رول
بھی بہت اہم رہا ہے۔ پڑھنے والے خود بھی یہی کہیں گے کہ
مرکزی کردار کے ساتھ میرا کردار بھی اہم ہے۔

مونا

(لاہور)

ایڈیشن لے لیا۔ بی ایس ی کرنے کے بعد مجھے شہر کی ایک
بہت بڑی لیبارٹری میں ملازمت مل گئی۔ یہ کام مجھے پسند آیا
اور میں جی جان سے اس میں لگ گئی۔

☆.....☆

مجھے بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میں نے ڈاکٹر
بننے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن انسان کی ہر خواہش کب پوری
ہوتی ہے۔ صرف چند نمبروں کی کمی سے میڈیکل میں میرا
ایڈیشن نہیں ہوسکا۔ میں نے دلیرانہ ہو کر بی ایس ی میں

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ناصر سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ میری ایک بہت اچھی اور پیاری دوست نیلم کا مگنیر ہے۔“

”اچھا اچھا، آپ کی وہ دوست جو یہاں ایڈمنسٹریشن میں ہوتی ہیں۔“

”ہاں وہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس معصوم اور قلم لڑکی کا دل تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا نورین۔ میں کس طرح اسے بتاؤں کہ.....؟“

”تو کیا نیلم! اپنے مگنیر کو خود یہاں لائی تھی؟“ نورین نے پوچھا۔

”ناصر کو تو وہ ڈاکٹر ابرار کے پاس لائی تھی۔ اسے کئی دن سے بخار آرہا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے محلے ہی کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرتا رہا جب افاقہ نہ ہوا تو نیلم اسے ڈاکٹر ابرار کے پاس لے آئی۔“

ڈاکٹر ابرار نے اس کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے۔ نیلم کے کہنے پر میں نے وہ ٹیسٹ یہاں کر دیئے لیکن اس کی بلڈ ریڈنگ نے تو مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا ہے نورین۔ اللہ کرے وہ کچھ نہ ہو جو میں سمجھ رہی ہوں۔“

نورین خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔

”نورین پلیز تم ذرا باقی کام مٹا دو۔ مجھے تو اس رپورٹس نے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ اب مجھ سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوگا۔“

میں نورین کو ہدایات دے کر دوسرے روم میں جا کر بیٹھ گئی تاکہ کچھ آرام کر سکوں۔

میں کوئی کمزور دل لڑکی نہیں تھی کہ یہ ریڈنگ دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ مجھے اسپتال میں موجود اس لیبارٹری سے منسلک ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا نے اس دوران میں بے شمار تپے سکتے مریض دیکھے تھے۔ بہت سے جلے کے مریضوں کا انتہائی بری حالت میں خون ٹیسٹ کیا تھا۔ میں اس کام میں اتنی ماہر اور ایکونومی کہ ڈاکٹر زسبت تمام عملہ میری عزت کرتا اور مجھے اپنے کام میں قابل تصور کرتا تھا۔ جیسی اتنی بڑی پیچھا لوجیکل لیب کا انچارج بنایا ہوا تھا مگر اس وقت میں تنہا کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اندیشے میں گھری سوچوں کی وادی میں گم تھی۔

نیلم سے میری دوستی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہم کالج کے زمانے سے ایک دوسرے کے دوست، غم خوار اور راز دار تھے، ہم نے ساتھ اٹھ کیا، پھر اس نے میری

میں نے بلڈ سیکل سات کا بلڈ چیکنگ مشین میں بند کیا اور ریڈنگ کے لیے تین دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ریڈنگ اسکرین پر ابھرنے والے بلڈ کمپوزیشن ریڈنگ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ٹیسٹ دوبارہ، پھر تیسری مرتبہ کیا۔ ہر مرتبہ ریڈنگ وہی تھی۔ میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ میں بہ مشکل اپنی کرسی تک پہنچی اور اس پر ڈھسے گئی۔

میری اسسٹنٹ نورین اپنا کام چھوڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے میڈم!“

”پلیز مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔“ میں نے اپنے لرزے جسم پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

نورین نے مجھے پانی دیا۔ میں نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ پھر نورین سے کہا۔ ”نورین! تم ذرا بلڈ سیکل کی ایک مرتبہ پھر ریڈنگ کرو۔“

نورین میری بات پر چوکی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں خود ٹیسٹ کرنے کے بعد نورین سے دوبارہ ٹیسٹ کرنے کو کہوں۔

اس نے اچھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور ریڈنگ لینے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے وہی رپورٹ میرے سامنے رکھ دی جو میں پہلے خود چیک کر چکی تھی۔

”اوو!“ میں نے بے یزدا کر کہا۔ ”یہ ریڈنگ تو خاصی ایب نارمل کنڈیشن ظاہر کر رہی ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔ ”نورین! یہ ناصر ہی کا بلڈ سیکل ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی میڈم!“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ نے خود ہی تو یہ سیکل لیا تھا۔“ نورین نے کہا۔

”شاید..... شاید کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ تم پلیز، اس بلڈ سیکل کو ایک مرتبہ پھر چیک کر لو۔“

نورین نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔

مجھے کچھ کہے بغیر وہ دوبارہ ریڈنگ مشین کی طرف بڑھ گئی اور دوبارہ رزلٹ لے لے کر آئی تو ریڈنگ وہی تھی۔

میں نے سر پکڑ لیا اور کہا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایلیکٹرو میڈم!“ نورین نے کہا۔ ”آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ یہ ناصر صاحب آپ کے کوئی رشتے دار یا عزیز ہیں؟“

طرح بی ایس سی کی بجائے بی اے کو ترجیح دی لیکن ایک ہی کالج میں رہے۔ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ ہماری اتنی اچھی دوستی کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم مزاج تھے، ہمارے مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ نیلم بہت نرم دل، حساس، خواہوں خیالوں میں رہنے والی، حسن پرست، دھنک، خوشبو، برسات کی دلدادہ اور دل میں لوگوں کے لیے محبت بھر دی رکھنے والی بہت سادہ مزاج لڑکی وہ لوگوں پر جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ اس سے کبھی مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن اس کی بے ضرر طبیعت سادگی اور محبت نے مجھے مائل کر رکھا تھا۔

وہ مجھ سے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ میں حیران ہوتی، اسے سمجھاتی کہ دیکھو! میری طرح سب دوسروں کے معمولات چھپانے والے نہیں ہوتے۔ اس لیے آئندہ ایسی باتیں کسی سے نہ کرنا اور چاہو تو مجھ سے بھی چھپانا۔ میرا یہی محبت بھرا انداز اس کے دل میں میرے لیے اور اعتماد بڑھا دیتا۔

میں نے بی ایس سی کے بعد اس اسپتال کی لیب جوآن کر لی اور دو سال ہی میں میری مہارت اور قابلیت دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے مجھے اس لیب کا انچارج مقرر کر دیا۔ میرا مزاج پریکٹیکل تھا۔ نیلم کے مزاج میں آئیڈیل پسندی اور روایات تھا۔ تذبذب تھا، الجھی الجھی بیزار اور افسردہ کی لگتی تو کبھی اس کی شوخی اور شرارت میں بچپن رنگ نظر آتے۔ جانے کیوں مجھے کبھی بھی اس پر بڑا اثر نہ آتا۔ میرا دل چاہتا اس معصوم سی بے ضرر، محبت کرنے والی لڑکی کو اپنی باتوں میں چھپالوں، کہیں اسے زمانے کی عیاریوں اور خود غرضیوں کی ہوائ نہ لگ جائے۔ کہیں اس کا شے سانا ذک دل لوگوں کی فریب کاریوں سے ٹوٹ نہ جائے لیکن جب بھی وہ مجھ سے کسی پریشانی کا اظہار کرتی کسی شخص کی اچھائیوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی۔ میں اس کا تجربہ کرتی جاتی اس کی ایک ایک بات سنی اور اسے زمانے کے سرد و گرم سمجھانے اور لوگوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتی۔ وہ میری ساری باتیں سن تو لیتی مگر دامن چھانڈ کر اٹھتی اور پھر وہی کرتی جو اس کا پاگل دل کہتا۔ جب وہ کسی شخص سے فریب کھاتی تو پھر میرے ہی پاس آ کر ان کا رونا رواتی اور کہتی، ہاں تم نے سچ کہا تھا مگر میں کیوں کسی کو بلا وجہ غلط سمجھوں، کیوں شاکی رہوں؟ اور کچھ دن بعد وہ پھر وہی ہو جاتی۔

نیلم کے گھریلو حالات بھی میری نظر میں تھے۔ وہ لوگ مالی طور پر بھی کمزور تھے۔ اس کے بڑے بھائی اور والد ان کے گھر کا بوجھ اٹھا رہے تھے۔ پھر نیلم سمیت تین بیٹیں اور تھیں۔ ان کے گھر میں وہی متوسط طبقے والے معاشی اور شادی کے مسئلے تھے۔ نیلم سے بڑی بہن بھی گریجویٹ کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ معمولی شغل اور سانولے رنگ کی چیز سے اور کچھ ان کی اپنی اونچی پسند کی وجہ سے رشتہ نہ ہو پاتا تھا اور ان کی عمر پچھتیس۔۔۔ سے اوپر پہنچ چکی تھی۔

نیلم کا رنگ تو صاف تھا مگر اس میں امور بخاندان داری سکھنے کا شوق تھا اور نہ پڑھنے کی لگن۔ انٹر سائنس کر کے بڑی مشکل سے میرے سمجھانے پر اس نے بی اے کیا تھا۔

اسپتال کی لیب جوآن کرتے ہی میں نے نیلم کو بھی ایک نوکرنے کی کوششیں کیں کہ کہیں جاب کرے تاکہ ذہن بے کار نہ رہے اور پھر میں نے کچھ عرصے بعد اسے بھی اپنے اسپتال کے ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ لگوا دیا۔

کالج کے زمانے میں جب میری نیلم سے دوستی ہوئی تو اس وقت وہ اپنے کزن کی محبت میں مبتلا تھی۔ وہ لڑکا ارشد نیلم سے بڑا تھا مگر تین سال میں انٹر مکمل نہ کر پایا اور کسی ٹیکنیکل کورس میں لگ گیا۔ نیلم اس کے اہمیت دینے جانے پر دل و جان سے فدا تھی۔ اس کے محبت بھرے خطوط مجھے لا کر دکھاتی۔ اس سے ملاقات میں اس کی طرف سے اشاروں کنایوں میں کیے جانے والے عہد و پیمان بتاتی۔

مجھے وہ لڑکا کبھی بھی نیلم سے غلط محسوس نہ ہوا، اس لیے میں نیلم کو سمجھاتی کہ شادی اور محبت میں ایسے غیر ذمے دار لوگ کہاں غلط ہو سکتے ہیں۔ یہ سب خواب شادی کے بعد عقل پر پتھر بن کر برستے ہیں لیکن ان معاملات میں کسی کو بھی سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور یہ تو پھر نیلم ہی محض خواہوں کی اہمیت اور محبت کی پیاسی۔

نیلم کو ہوش آیا تو اس وقت جب ارشد اپنے کورس کی بنیاد پر سعودی عرب کی ایک کمپنی میں ٹیکنیشن کی جاب حاصل کر کے اسے نظر انداز کر کے کچھ کہے سے بغیر سعودی عرب چلا گیا۔ نیلم کا نازک شے سادل تو ختم کر رہ گیا۔

نیلم میرے سینے سے لگ کر خوب روئی۔ وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ "ہاں مونا! تم سچ کہتی تھیں۔ وہ تو بہت خراب لکھا چلا جاتا وہ، میں کب روئی اسے مگر مجھے بتاتا تو۔ وہ تو مجھ سے شادی کے لیے بہ ضد تھا۔ میرے بغیر اس کا ایک لمحہ نہ گزرتا تھا، لیکن اب..... اب وہاں کیسے رہے

گا..... چھوٹا دعا باز! میں اس کے لیے یہ اہمیت رکھتی تھی، یہ محبت تھی اسے مجھ سے؟“

میں نیلم کو تسلیاں دیتی رہی۔ جب وہ رورو کر اپنا غبار نکال چکی تو میں نے کہا۔ ”چھوڑ نیلم تم اس کے لیے کیوں اپنا جی جلاتی ہو۔ تم اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، بس اب یہ جذباتیت چھوڑو۔ میں نے تمہارے لیے اسپتال میں اسٹنٹ کی جاب کا بندوبست کروایا ہے۔ اپنے آپ کو قابل اور اہم بناؤ۔ وہ تمہارے قابل نہ تھا اسے بھول جاؤ اور مستقبل کی طرف دیکھو۔“

یوں نیلم میرے ساتھ ہی جاب کرنے لگی صرف ہمارے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال اور نیلم کو ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ ارشد کو بھول چکی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا فیروز اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

میں نے خاموشی سے سنا اور ٹال دیا۔ اب موقع بہ موقع ملاقاتوں میں نیلم کے پاس بات کرنے کا موضوع صرف فیروز ہوتا تھا۔ وہ لوگ بھی کبھار کھانے کے وقفے میں یا کام کر کے میرے پاس لب میں آجاتے۔ یوں فیروز سے میری بھی اچھی شناسائی ہو گئی۔

بسی چوڑی جسامت، فریج کٹ داڑھی اور اس پر چشمہ لگائے فیروز واقعی پروقار اور سنجیدہ شخصیت محسوس ہوتا۔ فیروز ہمارے اسپتال میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کے علاوہ اچھی کتب کے مطالعے اور حالات حاضرہ سے دلچسپی نے اس کی معلومات اور انداز گفتگو کو بڑا مہذب اور عالمانہ بنا دیا تھا۔ نیلم سے اس کا متاثر ہو جانا، میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی لیکن مجھے اس بات سے کوئی خوشی اس لیے نہ ہوئی کہ میں نے فیروز میں کبھی نیلم کے لیے دلچسپی محسوس نہیں کی۔

فیروز سے جب بھی میری ملاقات ہوتی تو گفتگو آفس کے معاملات یا حالات حاضرہ پر بھی ہوتی لیکن نیلم کے ذریعے مجھے اس کی کچھ نئی زندگی کے متعلق بھی پتا چل چکا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو نیلم کی ہمدرد طبیعت تھی اور کچھ فیروز میں دلچسپی لینے سے محسوس کا جذبہ ایک دن وہ بڑے زور و شور سے مجھے بتا رہی تھی۔ ”یار مونا! پتا ہے فیروز بے چارے کی والدہ خست بیمار ہیں۔“

”اچھا تمہیں کس نے بتایا؟“

”وہ جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں وہ کسی سے تذکرہ کر رہے تھے۔“

”اچھا اسی لیے وہ تین دن سے نظر نہیں آیا۔“
”اس کی تین بیٹیاں ہیں اور سنا ہے کہ اس کی کسی بہن کی معنی ٹوٹ گئی ہے۔“
”اچھا، کیوں؟“

”بھئی اس لڑکے کی عادتیں اچھی نہیں تھیں اور وہ نشے کا عادی بھی تھا۔ فیروز کے والد کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کی معنی کی توڑ دی۔“

”اوہ، بہت افسوس ہوا، بھئی آج کل تو کسی پر اعتماد کرنا بھی کتنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں اسی لیے فیروز کی والدہ کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی، آخر ماں سے ہاں، بیٹیوں کے دکھ تو پیدائش کے ساتھ ہی محسوس کر لیتی ہے۔“
”اس واقعے پر غور کر مظلومیت کے سارے دکھ یاد آ گئے۔“
”لڑکیوں کی زندگی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے مونا۔“

نیلم نے معصومانہ انداز سے دکھ میرے لہجے میں پوچھا۔
”ہونہ، پتا نہیں۔“ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔
”فیروز کتنا افسردہ ہوگا۔“ نیلم نے خود کلاہی کی۔
جس دن فیروز آفس آیا، نیلم اسے لے کر میرے پاس آگئی۔ میں نے فیروز سے اس کی والدہ کی خیریت پوچھی تو اس نے بتایا کہ انہیں ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔ اب طبیعت بہتر ہے۔

فیروز بہت پریشان اور غمزہ سا لگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ لڑکوں کے ساتھ بھی کم مشکلات نہیں ہیں۔ روزگار کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں، بڑی مشکل سے کسی جگہ مل جائے تو آفس میں مزدوری سے زیادہ محنت سیاست اور سازشوں میں وقت گزارنا، اپنا مقام بنانا اور گھر لوٹیں تو گھر کی الجھنیں، بیٹیوں بہنوں کی شادی کے مسائل الگ۔ شاید زندگی انہی آزمائشوں کو سہنے کا نام ہے۔

کچھ دن یوں ہی گزر گئے۔ فیروز کے حالات سن کر مجھے بھی اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور نیلم تو تھی ہی اس کی گھائل۔

ایک دفعہ میں بیمار ہو گئی۔ مجھے تین دن لب سے چھٹی کرنی پڑی۔ چھٹی کے تیسرے دن شام کو نیلم میرے گھر آگئی۔ میں بھی میری طبیعت پوچھنے آئی ہے لیکن خیریت پوچھنے کے بعد جو کہانی سنا رہی تھی اسے میں بھٹی بھٹی آنکھوں سے سن رہی تھی۔

”مونا! میں..... میں اب فیروز کے بغیر نہیں رہ سکتی
یار! مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے۔“

”تو تم کب اس کے بغیر رہتی ہو، سارا دن تو ساتھ
ہوتی ہو آفس میں اور اچھا لگتا بھی پرانی اطلاع ہے۔“ میں
سمجھتے ہوئے بھی اس کی بات نہ سمجھ کر شوخی سے اس کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ ”اور تمہیں اتنا پاگل ہونے کی کیا ضرورت
ہے۔ کیا اس طرح الجھا پریشان حلیہ بنا کر تم اسے شادی پر
راضی کر لو گی۔“ میں نے اس کے بے ترتیب بالوں اور
سادے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شادی کا تو پتا نہیں، لیکن..... لیکن مونا! اس نے
مجھ سے کل محبت کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا میں اسے
بہت اچھی لگتی ہوں۔ میں شام کو آفس آف ہونے کے بعد
باہر اسٹاپ پر آئی تو پیچھے وہ بھی آ گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا
چلو اگلے اسٹاپ سے بیٹھیں گے۔ میں اس کی بات مان گئی۔
اس کی رفاقت تو میری بھی خواہش تھی۔ چلتے چلتے اس نے
مجھ سے پوچھا کہ مجھے اس کے ساتھ چلنا کیسا لگ رہا ہے۔
میں کیا جواب دیتی اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں
محبت کے دیپ جل رہے تھے۔ میں نے شرمناک گردن جھکا
لی اور خاموشی سے چلتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے قریبی
ہونٹوں میں چائے پینے کے لیے کہا۔ میں محزونہ تو تھی ہی اس
کے اصرار پر منع نہ کر سکی۔ میں پہلی مرتبہ کسی غیر مرد کے ساتھ
یوں ریسٹوران میں گئی تھی۔ ہماری ٹیبل کا رخ دیوار کی
طرف تھا۔ میں نشست پر بیٹھی تھی فیروز بھی ادھر میرے
قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کھانے پینے کی خواہش کا
پوچھا اور پھر میرے منہ کرنے پر صرف چائے کا آرڈر دے
دیا۔“

پھر اس نے ہوٹل کی تصویر کشی شروع کر دی۔
”کیسا لگ رہا ہے میرا قریب؟“ اس نے مجھے
دو دیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
”آپ..... آپ ادھر بیٹھ جائیں۔“ مجھے اپنا دل بے
قابو ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا لمس میرے وجود میں
نیشن کر اتر رہا تھا۔

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام لیا،
مضبوطی سے پکڑ لیا پھر اچانک اپنے ہونٹ میری ہتھیلی پر رکھ
دیئے۔ وہ میرے استے قریب بیٹھا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا۔
اس نے اپنا ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھایا اور سرگوشی
میں میرے چہرے کے قریب آتے ہوئے ہونٹ سکڑے

جین مت

چھٹی صدی قبل مسیح کو تاریخ انسانیت میں
خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاید پوری دنیا میں
انسانوں پر ویسے ہی نفسیاتی و جسمانی مظالم
ڈھائے جا رہے تھے جو ہندی آریاؤں نے
اقتصادی ترقی و خوشحالی اور تہذیبی جم جماء حاصل
کرنے کے باوجود ذات پات کی تفریق، فلسفہ
تنازع اور انسانی و حیوانی قربانیوں کی صورت میں
ردوار رکھے۔ شاید انہی مظالم کا رد عمل تھا کہ اس
زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر
ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے
بڑے معملے، فلسفی اور مذاہب کے بانی پیدا
ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں گوتم بدھ
اور مہاویر پیدا ہوئے، چین میں کنفیوشس اور
لاؤ زے، ایران میں زرتشت اور یونان میں فیثا
غورث۔ آج تک مورخین یہ معلوم کرنے سے
قاصر ہیں کہ چین مت کی بنیاد کس طرح، کہاں
اور کب رکھی گئی مگر چینی لوگوں کا کہنا ہے کہ چین
مت ابدی اور غیر فانی ہے۔ یہ اس وقت سے
ہے جب کائنات کا ظہور ہوا اور جب تک
کائنات قائم ہے، چین مت بھی قائم رہے گا۔
ان کے خیال کے مطابق چینی پیامبر وقتاً فوقتاً نئی
نوع انسان کی اصلاح کے لیے ظاہر ہوتے
رہے۔ ان کے نزدیک آخری چینی پیامبر
مہاویر (560-468 ق م) ہیں۔ ان کا اصل
نام وردھ مان ہے اور مہاویر لقب ہے یعنی
بہادر اعظم۔ وہ صوبہ بہار کے ایک کھتری حکمران
خاندان کے راج کمار تھے۔ پندرہ کے قریب
ویسالی میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ کے ہم عصر
تھے۔ تیس برس کے تھے کہ ان کے والدین کا
انقلاب ہو گیا اور انہوں نے دنیا اور اس کی
آسائشوں سے تنگ ہو کر تاج و تخت کو خیر باد کہا
اور سچائی کی تلاش میں جنگل کی راہ لی اور تہمت
ریاضت کی۔ بارہ برس کی ریاضت کے بعد آخر
عرفان حاصل ہوا اور وہ مہاویر کہلانے لگے۔
مرسلہ: نوید عثمانی، ملتان

لیکن میں نے فوراً اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر زور سے پیچھے کر دیا۔

”ایک بار، چھوڑا سا۔“ وہ گڑگڑایا لیکن میں نے اسے سختی سے منع کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہماری ملاقات کے اس پہلو کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے لیکن تم..... تم موت! میری دوست میری رازدار ہونا تم سے کیا پردہ۔“

میں حیرانی سے نیلم کے چہرے پر پھیلی عشق کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ نیلم کو سمجھانا تو میرے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، اب تو مشکل ترین ہو گیا تھا کہ اب اس محبت میں لسانیاتی حدت بھی شامل ہو گئی تھی۔

نیلم کی محبت اور سادگی سے مجھے ہمیشہ بہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ فیروز کی عقیدہ شخصیت سے مجھے کسی بڑی غلط بات کی امید تو نہیں تھی مگر جو کہانی نیلم نے مجھے سنائی تھی اس میں غلط بیانی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیلم اپنے باطن سے ظاہر تک مجھ پر اپنی ہر خلوت میں عیاں تھی مگر فیروز کے انداز میں یہ تبدیلی مجھے چونکا گئی۔ میرا ذہن مختلف پہلوؤں پر تیزی سے غور کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اسے سنتی رہی۔ میں نے سوچا کہ اگر فیروز واقعی نیلم سے شادی میں اعتراض ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اگر نہیں تو مجھے فیروز کو نیلم کی سادگی اور محبت سے فائدہ نہیں اٹھانے دینا چاہیے تھا۔ نیلم اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے دو دن کی چھٹی کر لی یوں مجھے فیروز سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

آفس میں کھانے کے وقفے میں فیروز میرے پاس آ گیا۔ کھانے کے دوران میں نے اس سے باتوں باتوں میں کہا۔ ”بھئی فیروز! آپ یہ بتائیں کہ شادی کب کر رہے ہیں۔“

”جب تم کہو۔“ اس نے شوشی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے انداز اور ”تم“ سے مخاطب کرنے پر میں چونکی لیکن میں نے یہ بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا جب میں کہوں جس سے کہوں، آپ اس سے راضی ہو جائیں گے۔“

”بھئی تمہاری آدمی بات صحیح ہے لیکن جس سے کہوں سے کیا مطلب۔“

”بھئی نیلم سے اور کوئی ہوگی اتنی اچھی، اتنی معصوم اور اتنی محبت کرنے والی۔“ میں نے بات چھیڑی۔

”بہت خوب، اچھا لطیفہ ہے بھئی! اچھی، معصوم اور محبت کرنے والی، ہونہ، میرا خیال ہے مس موت! آپ بہت زیادہ ہی کہہ رہی ہیں، مجھے تو آپ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

فیروز نے اس تیزی کے ساتھ تیر پھینکا تھا کہ میں لرز کر رہ گئی۔ یعنی فیروز نے نیلم کو بے وقوف بنایا اور اب شاید میری طرف، میں خاموش نیچے نگاہ کیے رہی وہ شاید سمجھ رہا ہو کہ میں اس کے اس طرح اکتھار پسندیدگی پر شرم سے سر نیچے کیے بیٹھی ہوں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ میں نیلم کو کس طرح فیروز کی نیت کا پتا دوں، کیا وہ محبت میں اندھی میری بات پر یقین کرے گی۔

چند دنوں بعد نیلم نے مجھے بڑی پریشانی اور تشکر سے بتایا کہ اس کے لیے رشتہ آیا ہے۔ گھر والے اسے قبول کرنے کے لیے بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں لیکن میں اب فیروز کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوں۔

میرے لیے ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ شادی کیا فیروز تو اس کی عزت بھی نہیں کرتا پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ میرے لیے نیلم کو سمجھانا آسان نہ تھا اگر میں فیروز کی برائی کرتی، فیروز سے دور رہنے، محبت چھوڑنے کا کہتی تو اس کے مجھ سے بدگمان ہونے کا خطرہ تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ شاید میں فیروز میں اعتراض ہوں اور اسے شادی کے لیے راضی کر کے فیروز سے اپنی لائن کبیر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وہ نازک معاملہ تھا جو دوستی کو شک کے ذریعے کھسکا تھا اور اگر خاموش رہتی کہ نیلم کی ہاں میں ہاں ملائی تو کہیں نیلم کا یوں گھر آئے ہوئے رشتے سے انکار بہت برا ہوتا۔ میں نیلم کے معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

”نیلم کا رشتہ آیا ہے۔“ میں نے فیروز کو اطلاع دی۔

”بہت اچھی بات ہے، اس کی تو جلد از جلد شادی ہو جانی چاہیے۔“

”آدرا آپ؟ آپ کو بھی تو جلد شادی کر لینی چاہیے۔“ میں نے اسے جملہ لٹایا۔

”ہم تو یہی چاہتے ہیں، بس آپ کے تیار ہونے کی دیر ہے۔“ فیروز کی آنکھوں میں خواہشوں کے دیپ جل اٹھے۔

”فیروز! آپ ایک بات مانیں گے۔“ میرے ذہن

میں ایک خیال جنی سے آیا۔

”ہاں ہاں کہو، جان وول سے مانیں گے۔“

”وہ..... دراصل نیلم اپنے گھر آئے ہوئے رشتے پر آپ میں اثر سٹھ ہونے کی وجہ سے راضی نہیں ہو رہی۔ آپ تو راضی نہیں لیکن میں یہ بتا کر اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی میں کسی طرح اسے رشتے پر راضی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں آپ کی فرضی منگنی کا اسے بتا دیتی ہوں، آپ اس کی تصدیق کر کے اپنی مجبور یوں کا بہانہ بنا دیجیے گا۔“

میری بات سن کر فیروز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن شاید نیلم سے چھپا چھڑانے اور مجھ میں اعتراف کی وجہ سے راضی ہو گیا۔

”نیلم! تمہارے سلسلے میں میری فیروز سے بات ہوئی ہے۔“

”اچھا! کیا کہا؟“

”تم اسے اچھی تو لگتی ہو مگر وہ تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ دراصل اس کی نسبت اپنی کزن سے ملے ہے اور اس کے گھر والے تمہارے لیے راضی نہیں ہو سکتے۔ اس نے تم سے درخواست کی ہے کہ تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔“

میرے اندیشے کے مطابق نیلم متحوش اور بے یقینی کے عالم میں تھی جیسے میری بات اسے کچھ نہ آرہی ہو۔ وہ مزید کچھ نہ بولی۔ میں اسے بدگمانی، دکھ اور بے یقینی میں چھوڑ کر گھر آئی۔ میں اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ تھوڑا بہت تو دکھ اٹھانا ہی تھا اس لیے اگر اصل بات پتا چل جاتی تو شاید وہ شرم سے مر ہی جاتی۔

دوسرے دن وہ آفس نہ آئی۔ فیروز کی زبانی معلوم ہوا کہ نیلم نے اسے فون کیا تھا۔ فیروز کو منگنی کی مبارک باد دی تھی۔ میری ہدایت کے مطابق فیروز نے اس کا دل دکھانے پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی منگنی اوہ بے دلے میں ہوئی ہے لہذا وہ منگنی تو ڈر کر اپنی بہن کے گھر کو جا نہیں کر سکتا اس لیے بہت مجبور ہے اور اس نے نیلم سے التماس کیا، اسے سمجھا کیا دیکھو رشتے بار بار نہیں آتے، لہذا شادی کے لیے راضی ہو جائے۔

یوں نیلم فیروز کی خواہش پر بادل خواستہ شادی پر راضی ہوئی۔ یوں میری ترکیب سے نیلم بڑے غم سے ٹوٹے بغیر نکل آئی لیکن اس حادثے نے اسے بدل کر رکھ دیا، اس نے ناصر کے ساتھ شادی کے لیے راضی ہونے کے ساتھ

جواب سے استغنیٰ دے دیا۔

ناصر بینک آفیسر تھا۔ کچھ دنوں بعد نیلم کی بڑی دھوم دھام سے منگنی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا نیلم نے فیروز کی محبت کو اپنے اندر کسی گوشے میں چھپا کر مبرا کر لیا ہے۔

مجھے ناصر، نیلم کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ ناصر سے میرا تعارف ہوا، میں نے اسے مبارک باد دی۔

منگنی کے بعد ایک دن نیلم ناصر کے ساتھ میرے پاس لیب آئی۔ پرنیڈ کاشن کے سوٹ پر بڑا سا گرین دوپٹا سر پر اوڑھے وہ بڑی بروقتار اور ٹھہری ٹھہری لگ رہی تھی۔ ناصر سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ وہ کافی حد تک لڑکیوں کی پسند اور آزادی کا قائل ہے اور نیلم کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند سے زندگی گزارے۔ نیلم بڑی سنجیدگی اور خاموشی سے ہماری باتیں سنتی رہی۔ ابھی ہم لوگ گفتگو کر رہے تھے کہ فیروز آ گیا۔ نیلم کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ نیلم نے بھی اسے دیکھ کر ایک دم چہرہ نیچے کر لیا۔ میں نے فیروز اور ناصر کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ فیروز نے نیلم اور ناصر کو مبارک باد دی۔ نیلم اور ناصر کے جانے کے بعد فیروز بڑی جراتی سے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”واہ بھئی، نیلم کے تو انداز ہی بدل گئے ہیں، اتنی اچھی کیسے ہو گئی۔“

”اچھی تو وہ پہلے بھی تھی فیروز صاحب، بس آپ کو شک کرنے اور ظاہر سا اندازہ لگانے کی عادت ہے۔“ میں نے اس کی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

نیلم کی شادی کی تاریخ تین مہینے بعد کی ٹھہری تھی۔ ایک مہینے بعد ناصر میرے پاس آیا۔ وہ کچھ پیار پیار تھا سا لگ رہا تھا۔ اس نے خیر خیریت کے بعد میری طرف ڈاکٹر کی سیلپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ دنوں سے طبیعت صحیح نہیں ہے۔ بخار ہو جاتا ہے اور بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کر دیے ہیں۔ میں نے سوچا آپ کی لیب سے کراؤں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔“ پھر میں نے خود ناصر کا بلڈ پریشر، اسے سرخ سے ٹیوب میں ڈالا اور لیب نمبر ڈال کر ریک میں ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھ دیا۔

☆.....☆

ناصر کی ٹیسٹ رپورٹس نے مجھے لرزہ کر رکھ دیا تھا۔

تھی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیوں کیا ہوا نیلم کو، خیریت تو ہے ناں۔“

”صبح ہم نے دیکھا کہ وہ دیر تک سو رہی ہیں۔ پھر پتا چلا کہ بے ہوش ہیں۔ کئی کوششوں کے بعد جب وہ ہوش میں نہ آئیں تو ہم فوراً کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر کی تین گھنٹہ کی کوششوں سے ان کی زندگی بچی ہے شاید کوئی غلط چیز پیٹ میں چلی گئی تھی۔ امی نے ابھی آپ کو فون کا کہا۔ آپ آرہی ہے ناں۔“

”ہاں ہاں ابھی چھٹی لے کر آتی ہوں۔“ میں اپنے اسپتال سے کلینک چلی گئی۔

میں وہاں پہنچی تو نیلم کے سارے گھر والے موجود تھے۔ انہوں نے بھی وہی تفصیل بتائی۔ نیلم اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ نیلم کے ڈاکٹر سے ملی تو اس نے بتایا۔ ”نیلم نے آخر شب نیند کے کپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی اس بے ہوشی میں اسے اسپتال پہنچایا گیا اگر ڈر اور دیر ہو جاتی تو نیلم نہ بچ پاتی۔ ان کے والد نے درخواست کی ہے کہ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے آپ کیونکہ اس فیملی کی ہیں۔ دوست ہیں تو نیلم کی امی نے آپ کو بتانے کی اجازت دے دی ہے تاکہ آپ نیلم کو سمجھائیں۔“

میں نیلم کے اس انتہائی اقدام پر حیران رہ گئی۔

”کیوں آئی! ایسی کیا بات ہوئی تھی جو نیلم نے یہ کیا۔“ نیلم کی امی کی حالت افسردگی اور قنات سے قابل رحم ہو رہی تھی۔

”بس بننا کی باتیں زندگی کی آزمائشیں ختم ہی ہونے نہیں پاتیں۔ نیلم کی منگنی سے جو تھوڑی خوشی ملی تھی نامرکی بیماری کا سن کر خاک ہو گئی دوسرے وہ نئے کا بھی عادی ہے بتاؤ بھلا ایسے کیسے ہم اپنی بیٹی کو جانتے ہو جیسے جہنم میں جھوک دیں۔ کل شام ہی نیلم کے والد کو یہ پتا چلا وہ تو صاف لڑکے والوں کو انکار کر آئے جب نیلم کو پتا چلا تو وہ خوب روئی اور ہڈیاں انداز میں جھنجھتی رہی کہ مجھے اب بس میری قسمت پر چھوڑ دیں۔ اسی سے کرویں میری شادی، آپ منگنی کر کے نامر سے میری شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ رات گئے تک گھر میں یہی افراتفری رہی۔ نیلم غالباً ساری رات جاگتی رہی اور صبح کے وقت کپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ بننا! تم تو اس کی اچھی دوست ہو ناں میری بیٹی کو سمجھاؤ اسے سمجھنے سے بچاؤ۔ میں تمہاری ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔“ نیلم کی امی

اسے محض بخار اور کمزوری نہیں تھی اس کی ٹیٹ رپورٹس دیکھ کر میرے ذہن میں کئی اندیشے سر اٹھ رہے تھے۔ میرا تجربہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا کہ میں نے سیکڑوں لوگوں کے بلڈ ٹیسٹ کیے تھے اور بیماریوں اور ان کی علامات کے متعلق میرے اندازے کافی حد تک صحیح ہوتے تھے لیکن میں اس وقت سر جھکا کر پریشان اندازوں کے غلط ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ ہمارے لیب کے پتھالوجسٹ صاحب کے سامنے رپورٹس رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا۔

”ان کے سفید سیلز کی تعداد TLC اور لیور فنکشن (جگر کا افعال) بہت ڈسٹرب ہے۔“

پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑے انتہاک سے نامر کی بلڈ سائیز دیکھیں۔ ”نامر کے بلڈ سیلز مپس کروک کنڈیشن ظاہر کر رہے ہیں میرا خیال ہے ان میں کینسر کی ابتدا ہو گئی ہے۔“

”اوو!“ میرا وجود لرز گیا، جب کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔ پتھالوجسٹ کے جانے کے بعد بھی میں خاموش بیٹھی رہی۔

مجھے نیلم اور نامر کی منگنی کا دن یاد آ رہا تھا۔ کیسے نیلم کو سجا کر نامر کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا۔ لڑکیاں ڈھونک کی تھا پر گیت گا رہی تھیں۔ لوگ مبارک باد دے رہے تھے اور چند ماہ بعد ان کی شادی تھی۔ منگنی کے ایک مہینے بعد نامر کو یہ تکلیف شروع ہو گئی۔ لیور فنکشن کی خرابی کینسر کی ابتدا کا باعث ہو گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ نامر کونشہ آور چیزیں استعمال کرنے کی بہت زیادہ عادت ہے۔

میں اپنے آپ میں صمت نہ پاتی تھی کہ نیلم کے گھر والوں کو نامر کی اس بیماری یا اس کی نشے کی عادت ہونے کی خبر پہنچاؤں ابھی چند دن پہلے تو میں جب نیلم کے گھر گئی تھی تو ان کے گھر میں نیلم کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ شاپنگ ہو رہی تھیں دوپٹوں پر نیکیں لگائی جا رہی تھیں۔ اب میں انہیں یہ بتاؤں۔

میں کب تک یہ خبر چھپانی۔ مجبوراً بتا پڑا۔

میں نے فون کی منگنی پر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف نیلم کی چھوٹی بہن بول رہی تھی۔

”موننا باجی! نیلم باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ ہمارے قریبی کلینک میں داخل ہیں۔“ اس کی آواز روٹھ گئی

میرے ہاتھ تھامے گڑ گڑا رہی تھیں۔ ان کے آنسو میرے ہاتھ اور دامن پر گر رہے تھے۔

میں نے انہیں کھلی دی پھر انہیں آرام کے لیے گھر چھوڑ آئی۔ میں نے اپنے لیب سے نیلم کی تیار داری کے لیے چھٹی کر لی۔ نیلم کا گھر قریب ہی تھا۔ شام کو نیلم کی طبیعت کچھ مستحیل میں رات گزارنے اپنے گھر چلی گئی اور نیلم کے پاس رات بھر ان کی والدہ رہیں۔

دوسرے دن نیلم کے ہوش و حواس کچھ بحال ہوئے لیکن اتنے بڑے حادثے کے بعد وہ کم مہم خلاؤں میں دیکھ رہی تھی کسی سے بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس کو پہلی غذا میں دی جا رہی تھیں۔

لیکن وہ گزری بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ تیسرے دن میں آٹھ مئی کو نیلم کی وجہ سے پریشان اور خاموش تھی اپنا کام نٹا کر الگ روم میں آ بیٹھی۔ دوپہر کے چائے ایک میں میرا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ نورین کھانا کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ میں سر جھکائے بیٹھی۔ میرے ہاتھ میں کیا تھا جو نیلم کی مدد کرتی۔ نیلم کے گھر والے اس صورت میں ناصر کے ساتھ بھلا کیسے نیلم کی شادی کے لیے تیار ہو جاتے۔ میں اپنے اندر تھابت محسوس کر رہی تھی، اپنی ہمت کو جمع کر رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے سرائیا۔

”فیروز؟“ اسے دیکھتے ہی میرے دل میں نفرت بھر گئی۔

”خیریت تو ہے، کہاں غائب تھیں بھی۔“ اس نے بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے اذیت سے پوچھا۔

”کیوں، آپ کو کیا فکر، میں مردوں یا بیویوں۔“ میرا لہجہ اتنی اور بڑے بھرا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو، میں نے تو دو دفعہ تمہارے گھر بھی فون کیا مگر پتا چلا کہ تمہاری کسی دوست کی طبیعت صحیح نہیں ہے تم اسپتال گئی ہو اور اب تم میرے غلوں اور محبت پر شک کر رہی ہو۔“

”ہونہ! غلوں محبت.....! لڑکیوں کی کمزوری سے قائدہ اٹھا کر انہیں بے وقوف بنا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا پھر انہیں خواہشوں کے جنگل میں اکیلا چھوڑ دینا۔ کتنوں سے فطرت کریں گے آپ؟ اور وہ..... وہ بے چاری نیلم! اس کے تو نصیب لڑکی ہونے کی وجہ سے خراب تھے ہی، سادہ دلی اور گداز دل فطرت کے ہاتھوں مار کھا گئی اور اب جب کچھ

اس کے اچھے مستقبل کی آس ہوئی تو شادی سے پہلے اس کے مہنگیت کو مہنگی پٹاری نے آلیا اور نیلم کو دیکھو ای لڑکے سے اہردی میں گھر والوں سے ناصر کے ساتھ ہی شادی کا اصرار کر رہی ہے اور جنہیں پتا ہے اس احمق لڑکی نے غلوں سے ٹوٹ کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔“ یہ کہتے کہتے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی، کچھ دیر بعد پھر بولی۔ ”تم نے فیروز..... تم نے..... اس کا دل دکھایا ہے اس کی تخیل کی ہے۔ وہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی ہوں فیروز! لیکن وہ اپنے اندر کی اہردیوں، محبتوں اور اعلیٰ ظرف بننے کے شوق کو بھی دل سے نہ نکال سکی۔“

فیروز ہکا بکا ستوش سا میری باتیں سن رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ نیلم اس حد تک مجھے حرف بہ حرف اپنے اور اس کے متعلق! اتنی بتا دے گی۔

فیروز نے شرم سے سر نیچے کر لیا۔ ”مونا! پلیز مجھے معاف کر دو، میں نے تمہاری دوست نیلم کو بہت غلط سمجھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم دونوں اتنی اچھی دوست ہو اور اتنا اعتماد کرنی ہو ایک دوسرے پر، میں نے یہ سب کچھ تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔“

”چھوڑیں فیروز صاحب! چائیں اور اب مجھ سے نہ ملیں تو اچھا ہے، جو میری دوست کی تخیل کر سکتا ہے، اسے میں بھی محبت اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھ سکتی۔“ میں نے فیروز کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں اس سے تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے رومال سے منہ صاف کیا، پرس اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ آج میں نے فیروز کو یہ کہہ کر کہ وہ محبت اور اعتبار کے قابل نہیں، نیلم کو دے جانے والے دکھ کا بدلہ لے لیا تھا۔

نیلم کی طبیعت اب کچھ مستحیل تھی لیکن وہ اب تک ذہنی شاک کے اثر سے نہیں نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ نیلم کے پاس دو دفعہ سے زیادہ لوگ نہ ہوں اور اس سے کسی بات کی پوچھ بچھ نہ کی جائے اس کا ہر لمحہ خیال رکھا جائے۔

میں نیلم کی وجہ سے اتنی پریشان اور افسردہ تھی کہ اپنی لیب کے کام کو بھی توجہ سے نہیں کر پا رہی تھی۔ میں بیک وقت صبح اپنے اسپتال جاتی پھر سہ پہر کو نیلم کی تیار داری کرنے اس کے کلینک جاتی۔ میں نے بڑی مشکل سے اگلے ہفتے چار دن کی چھٹی لے لی۔ نیلم کی طبیعت تو بہتر ہو گئی تھی لیکن وہ

بڑی مشکل سے کسی بات کا جواب دیتی۔ بس خالی ذہن بیٹھ رہی تھی چھت کو کھینچ رہی تھی۔ اس وقت نیلم کو نفسیاتی تیار داری کی طبی ضرورت تھی لہذا میرا اس کے پاس ہونا بہت ضروری تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیلم سے گفتگو کی کوشش کرتی لیکن وہ کم کم مجھے سختی رہتی۔

”کچھ تو بولو چندا! تم مجھ سے تو کبھی کوئی بات نہ چھپاتی تھیں دیکھو میں نے چھپی لے لی ہے تاکہ میں خوب تم سے باتیں کروں۔ کتنے دن سے ہم نے باتیں نہیں کیں، ہیں ناں؟“ میں نے نیلم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے سہلائی رہی۔

”موننا!..... موننا!“ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے پکارا۔

”ہاں ہاں میں موننا ہوں! تمہاری دوست غم خوار لیکن تم نے مجھے اب کے کچھ نہ بتا کے بڑی زیادتی کی ہے۔ میں نے تم سے بہادر بننے اور برداشت کرنے کے لیے اس لیے تھوڑی کہا تھا کہ تم مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ کیا میں اس قابل نہیں۔ تم تو مجھ سے مل کر ساری محبتوں کو بھول جاتی تھیں۔ کیا تمہارا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا تھا۔ کیا اب تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں، بتاؤ موننا میں نے ایسی کون سی غلطی کی ہے؟ کون سا گناہ نہیں دکھ دیا ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اتنا غلط فیصلہ، کس نے حق دیا تھا تمہیں کہ تم اپنے گمراہوں سے اور مجھ سے اپنے وجود کو چین لو، کیا صرف کسی مرد کی محبت ملنا ہی زندگی ہے اور نہ ملے تو بے کار ہے، موت ہے۔“ میں نے اسے غصے اور غم کی ملی جلی کیفیات میں جھنجھوڑ ڈالا اور وہ جیسے ہوش کی طرف لوٹنے لگی۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اپنی دوستی، محبت کے احساس اور یوں شکایت کرنے پر وہ میرے کاندر سے سرسرا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بتا نہیں کیوں میں اتنی بد نصیب ہوں، بتاؤ موننا! مجھے زندگی صرف شکر کھانے، فریب کھانے کے لیے ملی ہے، کیا میرے نصیب میں کوئی خوشی نہیں؟ مجھے اپنا وجود بہت ارزاں غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ میں کیا کرتی۔ اور..... اور اب تو میں گمراہوں کے لیے بھی ہماری ہو گئی۔ میں کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ اس لیے موننا..... میں نے..... میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچا۔“ نیلم بول اٹھی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اپنے دکھ بھری جاتی۔ نیلم جیسے لوگ

دل کی بات کے بغیر چین نہیں پاسکتے۔ میں نے اس کی فطرت بدلنے کی کوشش میں اس کو بہادر بننے اور برداشت کرنے کا کہہ کر اس میں ناوانستہ طور سے شاید یہ بات بٹھا دی تھی کہ دنیا میں کسی کو تمہارے دکھ سننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے زیادہ نہ ملے کو وہ خیر انداز کرنا بھی۔ اب اس حادثے کے بعد میں اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔ اس میں زندگی کی امنگ پیدا کرنے کے لیے اس کو محبت اور اہمیت کا احساس دلانا ہی پڑی۔

”نیلم تم تو سراپا محبت ہو، میرے لیے تمہارا یہ خلوص بہ اعتماد بہت بڑی دولت ہے۔ بالکل! زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ایک نارسائی کے پیچھے ختم کر دی جائے۔ میں ہوں ناں تمہارے پاس محبت کے لیے۔“

”اور میں بھی تو ہوں محبت کے لیے، اعتماد کے لیے جیسا بھی ہوں۔“ ہم دونوں اپنا رونا دھونا بھول کر سامنے کھڑے فیروز کو پچھتی پچھتی آنکھوں سے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

”آپ..... آپ کیسے آئے؟“ بالآخر میں بولی۔

”کیوں! نیلم سے میری بھی تو دوستی تھی، میں بھی تو اس کی عبادت کو اٹھاتا ہوں۔“

”مگر اب میں کسی کے نیلم کو قریب آنے سے فریب دینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ میں تلخ لہجے میں فیروز سے مخاطب تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے نظر انداز کر کے نیلم سے مخاطب ہوا۔

”کیسی ہو نیلی! تمہیں میرا نا بڑا تو نہیں لگا؟“

نیلم حیران بھی میری اور بھی فیروز کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں نیلی کہو ناں!“ فیروز نے پھر کہا۔

”ٹھیک ہوں۔“ نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

”میں بہت برا ہوں ہے ناں؟“

”نہیں..... نہیں تو۔“ نیلم نے اس کے پوچھنے پر کہا۔

”اس کا مطلب ہے، اچھا لگتا ہوں، چلو پھر ٹھیک ہے۔“ فیروز نے خوشی سے گردن ہلائی۔

فیروز کے اس انداز اور مکالموں پر میں غصہ بھول کر اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں نیلم کی امی کسی خاتون کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ فیروز اٹھ کھڑا اور اور ان ختی خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیک بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

”ای! یہ نیلم ہیں اور مونا۔ جو میری کولیک بھی ہیں۔“

نیلم اور میں نے فیروز کی امی کو سلام کیا۔ فیروز کی امی نے آگے بڑھ کر نیلم کو پیار کیا اس کی خیریت پوچھی۔

”بھئی، ہمیں آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی اور آپ کی بی نہیں یہ اب ہماری بیٹی بھی تو ہے۔ کیوں نیلم! تمہیں بیٹی کہہ سکتے ہیں نا ہم۔“ فیروز کی امی نے نیلم کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی، کیوں نہیں محبت ہے آپ کی۔“ نیلم بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔

نیلم کی امی بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔ نیلم کی امی مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئیں اور کہا۔

”فیروز کیسا ہے مونا؟ ان کے گھر سے نیلم کے لیے رشتہ آیا ہے۔“

”اچھا، واقعی۔“ خوشی میں میری چیخ نکل گئی۔ فیروز بالآخر نیلم کے پاس واپس آ ہی گیا۔

لبے جوڑے قد و قامت، صاف رنگت، فریج کٹ داڑھی میں فیروز کی شخصیت واقعی متاثر کن تھی۔ آنکھوں پر لگے گلاسز کی وجہ سے وہ سنجیدہ اور پروقار سا بھی لگتا تھا۔ اس کا مطالعہ اس کی گفتگو کا انداز بہت اچھا تھا۔ شریف فیملی سے تعلق تھا۔ اچھی جاب تھی، بس نیلم کو مجھے میں اس نے ایک عام مردوں والا چالانہ انداز اپنایا تھا۔ پھر نیلم کے اس طرح آسانی سے حاصل ہو جانے پر غلط مطلب نکال بیٹھا تھا اور اب جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو میں کیوں اس کی راہ میں آئی۔ میں نے نیلم کی امی سے فیروز کی بڑی تعریف کی۔ ان کی امی نے بتایا کہ فیروز کے گھر والے اور فیروز انہیں بھی اچھے لگے ہیں۔

دو دن بعد نیلم کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک ہفتے بعد میں لیب میں اپنے معمول کے کام میں مصروف تھی کہ فیروز آ گیا۔

”ہیلو دوست! کیسی ہو؟“ اس نے مجھے خوشی سے مخاطب کیا۔

”تم نیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“ میں نے اس کے لیے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا۔ ”آپ اندر کمرے میں تشریف رکھیے، میں ابھی آتی ہوں۔“

میں نے نہایت مہذب انداز میں اسے کہا تو وہ خاموشی سے مڑ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں کام مکمل کر

کے اس سے ملنے اندر کمرے میں چلی گئی اور خاموشی سے بیٹھ کر اس سے بات کرنے کا سوچنے لگی۔

”اب بھی ناراض ہو گیا۔“ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں..... نہیں تو۔“ پھر کچھ توقف کے بعد نرم انداز میں کہا۔

”بہت شکریہ فیروز، دیری سوری، میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔“

”ارے نہیں بار، شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے صحیح راستہ دکھایا۔ پھر مجھ سے ناراضگی کے باوجود میرے بارے میں نیلم یا ان کے گھر والوں سے برائی نہ کی۔ میں بہت خوش ہوں مونا! کہ مجھے تم جیسی بااعتماد اچھی لڑکی کی ہمدردی حاصل ہوئی اور تمہاری دوستی کا تحفہ نیلم ہے جسے میں ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“

”بہت شکریہ فیروز! اگر تم نے نیلم کو اپنی محبت اور اعتماد دیا تو ہمیشہ میں تمہاری عزت کرتی رہوں گی۔“ وہ بہت محبت کرنے والی لڑکی ہے تمہیں بھی اس کی طرف سے دکھ نہیں پہنچے گا، انشاء اللہ۔“ میں نے ملانیت سے کہا۔

”اچھا تو پھر اس خوشی میں کچھ ہونہ جائے۔“ فیروز ماحول بدلنے کو ذرا چکا۔

”یعنی.....!“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یعنی میری طرف سے کل سن شامین ریسٹوران میں کھانے کی دعوت ہے، نیلم اور میری بات کچی ہونے کی خوشی میں، پلیز مونا! اسے کل میرے ساتھ کھانے کی اس دعوت پر راضی کر لو ناں! دیکھو میرا بڑا دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے، باتیں کرنے، اسے دیکھنے کا، پلیز۔“ فیروز بڑے ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے التماس کر رہا تھا۔

”اچھا، واہ بھی کیا کہنے آپ کی بے تابی اور محبت کے اور دعوت کے لیے میں اسے راضی تو کر لوں..... مگر..... ریسٹوران لے جا کر..... کیا ارادے ہیں جناب کے، کہیں.....“ میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر شرارتی انداز میں کہا۔

فیروز ایک دم چونکا پھر ذرا شرمندہ کھسپائی ہنسی کے بعد بولا۔ ”ارادے کیا خاک ہوں گے، کھانے کی دعوت میں آپ بھی تو ہوں گی اور آپ سے دشمنی لے کر مجھے مرنا ہے کیا۔“

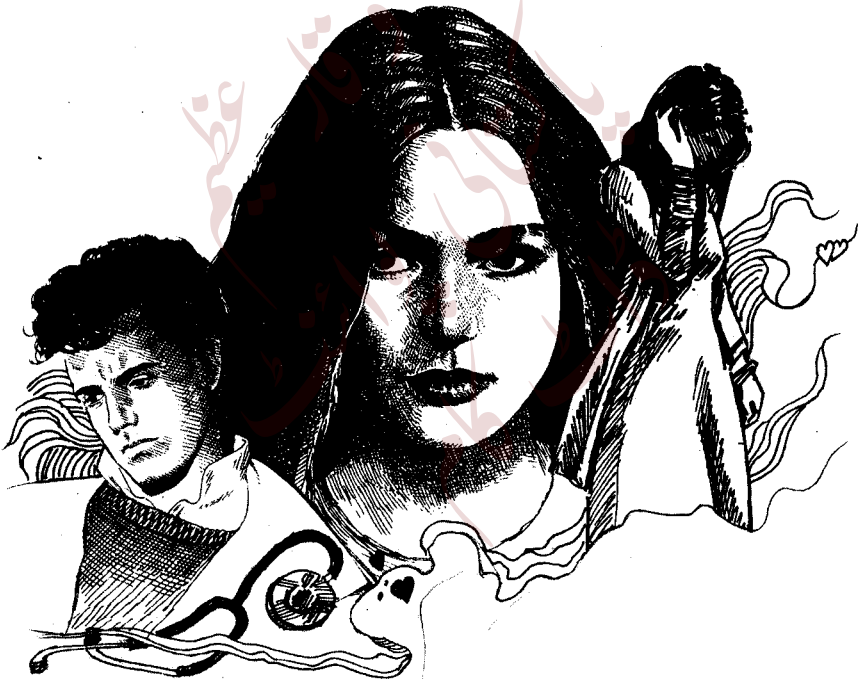
اور پھر ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔

کالی گوری

محترم مدیر
السلام علیکم

آپ تو جانتے ہیں میرے لکھنے کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اپنے
اسی مخصوص انداز میں اس بار تہمینہ اور متین کی سچ
بیانی لکھی ہے۔ عورت کس قدر قربانی دیتی ہے اس کا ادراک
آپ کو یہ سچ بیانی پڑھ کر بخوبی ہو جائے گا۔ اُمید ہے یہ سچ
بیانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

سلمیٰ اعوان
(لاہور)



کو ان کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رکھا ہے۔ کسی نے
میرے پاس آکر آنسو بہائے تو میں نے اس کی انگلی شوئی کی
دلاسہ دیا، حوصلہ بڑھایا اور اگر کوئی خوشی کی خبر سنانے آیا تو میں
نے بھی مسکرائشیں بکھیریں۔ ٹیچرز کے آپس کے جھگڑوں کو

چچی بات ہے Divide and rule کبھی میری
پالیسی نہیں رہی۔ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں گزشتہ پندرہ
سال سے بطور پرنسپل کام کر رہی ہوں۔ کوئی سو کے قریب
اساتذہ میری زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ

پیار اور محبت بھری ڈانٹ سے نمٹا۔ یقیناً یہ میرا طرز عمل ہے کہ میری ٹیچر زبجھ سے اپنے ذکھ مکھ کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔

یہ بڑی گرم دوپہر تھی۔ ٹو کے چھڑوں نے میرا چہرہ ٹھسلا دیا تھا۔ میں آخری راؤنڈ سے فارغ ہو کر ابھی آفس میں آکر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ذرا اس فائل کو کھولوں جس میں انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی مینٹنگ کی رپورٹ تھی کی گئی تھی۔ ابھی میں نے رپورٹ پر ضمنی شروع کی ہی تھی جب مس تھینڈنٹر میں داخل ہوئی۔

تھینڈن کے بارے میں مختصر عرض کیے دینا چاہتی ہوں۔ مخلص، ہمدرد، عام سے نقش و نگار والی لڑکی ہے۔ ایم اے بی ایڈنیک تعلیم ہے۔ خاندانی پس منظر اچھا ہے۔ چھوٹی سی فیملی جس میں دو بہنیں ایک بھائی ماں اور باپ شامل ہیں۔ باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا گھر خریدا تھا۔ معاشی حالات بس نارل سے ہیں۔ زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔ بس اگر پریشانی ہے تو تھینڈن کے لیے موزوں رشتے کی۔ تھینڈن کی عمر تیس کے قریب قریب ہے مگر یک سک سے آراستہ رہنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے اتنی دکھتی نہیں۔

وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ آج صبح سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا اب بغور دیکھا تو کچھ پریشان ہی نظر آئی۔ ”کوئی بات؟ پریشان لگتی ہو۔“ میں نے زنی سے پوچھا۔

”میڈم مجھے کچھ کمپوس کی ضرورت ہے۔“
”کتنے چاہئیں؟“
”میں کوئی پچاس ہزار۔ بس دو تین ماہ میں لوٹا دوں گی۔“

پچاس ہزار معقول رقم تھی۔ میں نے ذرا گہرائی میں اترا تا مناسب خیال کیا۔

”کہاں ضرورت ہے؟“
اور اس کے تفصیلی جائزے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ گولہ گولہ کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

”مکمل کر بات کرو میں تمہاری باس ہی نہیں بہن بھی ہوں۔ ٹھیک مشورہ دوں گی۔“ اور اس نے بتانا شروع کیا۔

”ہمارے دائیں ہاتھ جو لوگ رہتے ہیں وہ شیخ ہیں۔ شیخ اقبال احمد کے دو بیٹے ہیں تو صیغہ اور نجمہ۔ تو صیغہ میڈیکل کے تیسرے سال میں اور نجمہ فائن آرٹس میں ایم اے کر رہی ہے۔ بہت گھلنے ملنے والے اور مخلص لوگ نہیں

ہیں۔ بس کبھی کبھار ہی آتا جانا ہوتا ہے یا آتے جاتے کراؤ ہو جائے تو جیلو ہائے ہو جاتی ہے۔ کوئی تین دن پہلے اماں ہمارے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بھائی ٹیوشن پڑھنے چلا گیا اور میں گھر میں اکیلی تھی۔ کبھی کبھی اکیلا پن بھی کبھی اُداسی پیدا کر دیتا ہے؟ اُدی ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ وقت لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ پر ضائع کیا۔ کچھ وقت گھر میں ہی ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں کاٹا اور بالآخر میں نے نجمہ کے گھر کی طرف قدم اٹھا دیے۔ میں اپنی یوریت کو کچھ کم کرنا چاہ رہی تھی۔

”چلو ٹھیک سے بات وات نہ کریں گے تو بھی خیر۔ تھوڑا سادقت تو کئے گا۔“

میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گیٹ بند تھا اور میرا ہاتھ اٹھائی کھٹی پر جانے ہی والا تھا جب ایک سائیکل سوار لڑکے نے میرے پاس آکر پوچھا۔ ”تو صیغہ احمد شیخ کا گھر یہی ہے۔“

میں نے کھٹی بجانے کے بجائے رخ پھیر کر اسے دیکھا 22, 21 برس کا کمرور سائز کا میرے سامنے کھڑا تھا۔ سائیکل کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ زرد چہرہ، گال چٹکے ہوئے، آنکھیں موٹی موٹی مگر اُداسی میں ڈوبی ہوئیں۔ بے ترتیب سے بال۔ لباس بھی عام سا تھا۔

”یہی گھر ہے۔“ تمہیں تو صیغہ سے ملتا ہے کیا؟“
اور میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کھٹی پر انگلی رکھ دی۔ سائز بجا اور گیٹ کھل گیا۔ دروازے پر ملازمہ تھی۔ میں نے نجمہ اور تو صیغہ کے بارے میں پوچھا۔ دونوں گھر پر تھے۔ میں نے اندر جاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔ ”تو صیغہ کو بتا دو کہ اُس سے کوئی ملنے آیا ہے؟“

نجمہ اپنے کمرے میں تھی میں کچھ سوچ کر وہ ہیں چلی گئی۔ وہ غالباً چائے پینے لگی تھی۔ ٹرائل سامنے رکھی تھی۔ کرا ٹھنڈا تھا اور ماحول بہت خوشگوار سا۔ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ”میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔“

”آئے آئے۔“ نجمہ نے خاصی خوش دلی سے کہا۔

”جس گھر میں یور ہو رہی تھی تھوڑے سے وقت کو خوش گوار بنانے کے لیے آئی ہوں امید ہے محسوس نہیں کر دو گی۔“

اور نجمہ نے جواباً خاصی فراخ دلی سے کہا۔ ”ارے نہیں کسی بات کرتی ہیں آپ۔ کٹھے چائے پیئے ہیں اور تھوڑی سی کپ شپ بھی لگاتے ہیں۔“

چائے پی اور کپ شپ لگی۔ نجمہ نے یونیورسٹی کے لیلے

سالہ بیابانی بیوہ ماں کا اٹکوتا بیٹا ہوں۔ پڑھنے میں بہت لائق ہوں۔ ہمیشہ وظیفہ لیا۔ میڈیکل کرنا میری بہت بڑی تمنا ہے۔ ٹیوشنوں اور وظیفوں کے بل پر ڈاکٹری کی لائن میں تو آگیا مگر اس کے پیشتر اخراجات کو برداشت کرنا اب میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ میں ہزار کی وقفہ کار سے چکرا تھا کتابوں کی ضرورت تھی۔ کچھ دوسرے سال میں میں نے ٹیوشن نہیں کیں۔ پہلے سال وقت بہت ضائع ہو گیا اور اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکا۔ ان پیسوں سے ضروریات پوری کرتا رہا۔ اب اس نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ میرے پیسے واپس کرو۔ میں تو صیف کے پاس آیا تھا مگر اس نے معذرت کر دی ہے۔“

تہینہ نے کہا۔ ”یہ روپے مجھے متین کو دیئے ہیں۔ ایک ہفتہ کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ میرے خیال میں متین جیسے ہونہار نوجوان کی مالی اعانت کرنا نیکی نہیں اس ملک کی بھی خدمت ہے۔“

مجھے تہینہ نے نظر پڑے سے بالکل اتفاق تھا مگر میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اپنی اس خواہش کا اظہار میں نے اس سے بھی کر دیا جس پر وہ بولی۔ ”میں کہہ دوں گی وہ آپ سے مل لے۔“

اگلے دن میں نے رقم بینک سے نکلوا کر اُسے دے دی۔

تہینہ اور متین کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ اسے پیسے دینے کہاں آئے گی؟ یہ مقام اسپتال کا تھا جو میڈیکل کالج کے ساتھ ملحق تھا۔

گیارہ بجے وہ اسکول سے چھٹی لے کر چلی گئی۔ متین اسی جگہ اس کا منتظر تھا وہ اسے دیکھتے ہی محل اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ تہینہ نے پرس سے پیسوں کا لفافہ نکالا اس کی طرف بڑھایا اور آہستگی سے کہا۔ ”اسے قرض مت سمجھتا۔ یہ مدد ہے ایک انسان کی دوسرے انسان کو آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکاں تمہارے لیے کچھ کرتی رہوں گی۔ ٹیوشن کے چکروں کو چھوڑ دو اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔“

معلوم نہیں یہ جذبہ مہینت کی انتہائی یا وہ صورت حال سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ تہینہ کو اس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ بھی پھر پھڑپھڑانے لگے تھے۔ وہ ایک تک تہینہ کی طرف الجھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”کیا ہوا؟“

سنائے اور میں نے بھی اسے اسکول کی باتیں بتائیں اور تھوڑی سی بات چیت فلم وئی پر ہوئی اور ٹھنڈا گزر گیا۔ میں نے وقت دیکھا اور کھڑی ہوئی۔ مجھ نے جینے کے لیے کہا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔ ”گھر میں کوئی نہیں تو کر بھی نہیں ایسے ہی کھلا چھوڑ آئی ہوں، اماں آگئیں تو بولیں گی۔“

جب میں گیٹ سے نکلی اور اپنے گھر کی طرف بڑھی تو وہی لڑکا میرے سامنے آگیا۔ میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہماری لین میں ممر کی ٹیوشن نے ہونے کی وجہ سے اندھیرا وقت سے پہلے ہی چھانے لگتا ہے۔

”میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ سے۔“ میں نے حیرانی بھری آواز میں کہا۔

”جی میں تو صیف کا کلاس فیلو ہوں۔“

گویا وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور میڈیکل کے اسٹوڈنٹ سے بات کرنے میں قطعی حرج نہ تھا۔ میں نے سوچا۔

”بات لمبی ہے تو گھر آ جاؤ۔“

میں نے گھر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے۔ وہ سائیکل کو گیٹ کے پاس کھڑا کرنے لگا تو میں نے کہا۔

”اسے اندر لے آؤ کوئی اٹھا سکتا ہے۔“ سیاہ گیٹ کا

ایک پٹ میں نے کھول دیا۔ اس نے سائیکل دو بار کے ساتھ ٹکائی۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوا میں اس کے پاس کھڑی رہی۔

اس کا حلیہ اُسے کسی بہت غریب گھر سے تعلق کا بتا دیتا تھا۔ ڈرائیونگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر میں نے بغور اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کہو کیا بات ہے؟“

”مجھے میٹرک یا ایف ایس سی کی کوئی ٹیوشن دلانے میں آپ کچھ مدد کر سکتی ہیں۔“

”تو صیف کے پاس تم اسی کام کے لیے آئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں ان کے پاس میں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔“

”کیا کام تھا وہ۔“ میں اس کے بارے میں کچھ جانتا چاہتی تھی۔

لیکن مجھے احساس ہو چکا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے کہ کہے یا نہ کہے۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔

”غریبی بھی خدا کا بہت بڑا عذاب ہے۔ میں اپنی دو

”تین؟“
”مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔
”یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ آخر انسان ہی
ایک دوسرے کا ڈکھ بانٹتے ہیں۔ جانور تو اگر احوال پرسی
کرنے سے رہے۔“

وہ اسے کھین میں لے گیا جہاں اس نے تہینہ کو چائے
پلائی اور یہ پوچھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے کہاں مل سکتی
ہے۔ تہینہ نے اسے اسکول کا پتا بتایا اور مجھ سے ملنے کو بھی کہا۔
یہ اکتوبر کے خوشگوار دن تھے۔ آفس کے سامنے
چھوٹے سے گلاب کے باغچے میں پھول سُکرا رہے
تھے۔ میری نظریں بہت دیر سے ان پر جمی ہوئی تھیں۔ ہوا کے
ہلکے ہلکے جموگوں سے وہ دائیں بائیں لہراتے خوبصورت لگ
رہے تھے۔ میری تحویت ”میں اندر آسکتا ہوں۔“ اس جملے
سے ٹوٹ گئی۔ ایک نوجوان میرے سر کو اثبات میں ہلٹے دیکھ کر
اندرا گیا۔ آتے ہی اس نے سر کو قدرے جھکا دیا اور بولا۔ ”میں
تین احمد ہوں مگر تہینہ نے شاید میرا ذکر آپ سے کیا
ہو۔“ میں نے یکدم خوش ہو کر کہا۔

”چھوٹا تھا تو آپ تین ہیں بیٹھے۔“
وہ کرسی کی پٹائی پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے گہری
تنقید نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں مگر
معلوم نہیں مجھے وہ کچھ عجیب سی لگیں۔ اس کا چہرہ مصومیت بھرا
نہیں تھا۔ میں کچھ پریشان ہی ہوئی۔
یہ حقیقت ہے کہ انسان کے بارے میں اتنی جلدی فیصلے
نہیں ہوتے۔ اس کی اتنی تہیں ہیں کہ بعض اوقات سالوں
ساتھ رہ کر بھی پتا نہیں چلتا مگر پھر بھی میں جو عمر کی درمیانی
منزل میں ہوں۔ چہرے مہروں سے تھوڑا بہت جاننے کا دعویٰ
ضرور رکھتی ہوں۔

اس کے چہرے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات
ہے کہ اس کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ تھیں۔ ان میں غم کی
جھلک تھی اور حوادث سے منہنے کا عزم بھی۔ میں نے چہرہ
سے تہینہ کو بلایا۔ میرا خیال اسے چائے پلانے کا تھا مگر تہینہ کی
موجودگی میں۔
میں نے دیکھا تہینہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی۔
تین کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں اور رخساروں پر جیسے گلاب
سے گل اٹھے اور جس اعجاز میں اس نے تین کو دیکھا تھا وہ
مجھے یہ سمجھانے اور بتانے کو کافی تھا کہ وہ ہمدردی سے آگے
بڑھ چکی ہے۔ میں نے تین کے چہرے پر جو کچھ گمراہ دیکھا تھا

”تین نیوٹن تو وہ ہکول ختم ہو جانے کے بعد پڑھاتی
ہے اور تین چار کے گھروں میں جاتی ہے۔“
اور جیسے میرے دل پر گھونسا پڑا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ
اس مشقت کی چکی میں کس لیے پس رہی ہے؟ میں خاموش تھی
اور مسز رحمان غالباً منتظر تھی کہ وہ میرے کسی بھی حیرت کے

”تین نیوٹن تو وہ ہکول ختم ہو جانے کے بعد پڑھاتی
ہے اور تین چار کے گھروں میں جاتی ہے۔“
اور جیسے میرے دل پر گھونسا پڑا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ
اس مشقت کی چکی میں کس لیے پس رہی ہے؟ میں خاموش تھی
اور مسز رحمان غالباً منتظر تھی کہ وہ میرے کسی بھی حیرت کے

اظہار کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھائے اور میں اپنی ہی سوچ میں گم تھی جب اس نے کہا۔

”کسی ڈاکٹر کے پیچھے لگی ہوئی ہے اُسے پڑھا رہی ہے۔“ اور ساتھ ہی طہرہ سا قہقہہ نفا میں اچھا لایا۔ ”ایک اجب وہ ڈانچ دے جائے گا تو بیٹی قسمت کو روئے گی۔“

میں خاموش رہی تب سے کہنا مجھے قطعی پسند نہیں۔

ایک دن میں نے سکراتے ہوئے ٹوہ لینے کی خاطر کہا۔ ”میرا خیال ہے تم محبت کر بیٹھی ہو۔“ میں نے موضوع کی جتنی کو مسکراہٹ کی آڑ دی۔ اور اس نے شرمانے یا سر جھکانے کے بجائے سکون سے کہا۔

”شاید اسی کا نام محبت ہے مجھے متین اچھا لگنے لگا ہے۔“ ”مگر وہ تم سے شادی کر لے گا۔“

”مسز محسن شادی بیاہ تو مقدر دس کی بات ہے۔ میں نے اگر اسے مالی اعانت دی ہے یادے رہی ہوں تو یہ عوض نہیں مجھے اس کی مدد کر کے خوشی ہوئی ہے۔ اس بار اس نے ٹاپ کیا ہے۔“

”کیسی لڑکی ہے۔ کتنا بڑا دل رکھتی ہے خدا کرے خوش رہے۔“

متین کے ساتھ اس کی دوستی اب کوئی دھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب لوگ جان گئے تھے۔ بیشتر کا نظر یہ میرے جیسا تھا۔

اور جس دن متین ڈاکٹر بنا اس دن اس نے بہت شاعرانہ پارٹی دی۔ سب لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ متین کو بھی بلا لے۔ متین بھی آیا۔ اس نے پنجاب کے میڈیکل کالجوں میں لیاپاں پوزیشن حاصل کی تھی۔

میں نے کافی مدت بعد اُسے دیکھا تھا۔ وہ خاصا صحت مند اور اچھا لگ رہا تھا۔

”مسز رحمان نے پوچھا ”شادی کب کرو گے؟“ ”ابھی تو کوئی پروگرام نہیں جی۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر باہر جانے کے لیے وظیفہ متوقع ہے۔“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تہیہ نہایت سکون سے کپوں میں چائے ڈالنے اور سب لوگوں کو پیش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا یا وہ ہلکون بھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

متین کے جانے کے بعد ایک دو نے کہا بھی۔ ”تہیہ ریت سے مگر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

پانی

پانی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ لہذا زمین کے علاوہ اگر کسی مقام پر زندگی ہو سکتی ہے تو وہاں پانی کا ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔ 2011ء میں نظام شمسی کے باہر ایک سیارہ دریافت ہوا تھا جس کا نام HATP 16B رکھا گیا۔ اس کی نفا میں پائے جانے والے پانی کے ذرات پر سائنسدان تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ سیارہ زمین سے 430 نوری سال کے فاصلے پر ہے اور دو بڑی خلائی دوربینوں جیمبل اور سپر کی مدد سے اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس کی نفا میں ہائیڈروجن اور ہیلیم سے بنی ہے۔ یہ اپنے ایک سورج کے گرد گردش کرتا ہے جو ہمارے سورج سے دو گنا زیادہ بڑھا ہے۔ یہ نظام شمسی کے سیارے نیپچون کے حجم جتنا ہے لیکن یہ اس سے زیادہ گرم ہے کیونکہ اپنے سورج سے زیادہ قریب ہے۔ خلائی تحقیقاتی ادارے ناسا کے مطابق اس میں پانی کی موجودگی کے بعض شواہد ملے ہیں تاہم یہ پانی زیادہ نہیں HATP 16B جس نظام کا حصہ ہے وہ نظام شمسی سے ملتا جلتا ہے۔

مرسلہ: منشی عزیز علی۔ لندن ضلع دہاڑی

☆☆

ابن صفی نے اپنے ایک ناول میں سچا لطیفہ لکھا ہے جو کچھ یوں ہے: ”ایک مدیر صاحب کے پاس شہرہ آفاق مصور پکاسو پر اردو میں لکھا ہوا مقالہ آیا۔ مدیر محترم نے فوراً اگلے شمارے میں اشاعت کے لیے برائے کتابت کا تب صاحب کے حوالے کر دیا۔ مضمون کا عنوان تھا ”پکاسو“ اردو ادب کے ماہر کا تب صاحب جو مشہور مصور پکاسو کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے انہوں نے مضمون کا بغور جائزہ لیا پھر مسکرائے اور زیر لب بولے۔ ”اچھا رنگنا بھول گئے۔“ اب اللہ دے اور بندہ لے، جہاں جہاں پکاسو کا لفظ آیا کا تب صاحب کا اضافہ کرتے چلے گئے۔ یوں ہو گیا ایک زبردست مقالہ ”پکاسو“ پر تیار۔“

مرسلہ: منشی رحمان۔ یو ایس اے

تو میرے خدشات درست تھے۔ انسانوں کے بارے میں میری ریڈنگ بھی غلط نہ تھی۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔ اگلے دن میں نے تہینہ کو نوں کیا۔ ایک ڈکھ بھری جھجک آمیز تشویش میرے لب و لہجے سے ہویدا تھی۔ میں حیران رہ گئی۔

”مزمن! اُس کی آواز میں طمانیت سے بھرا ہوا محبت بھرا چاؤ تھا۔ وہ شمرہ بھی۔ متین کے بچپن کے انتہائی بُرے دنوں کی ساقھی۔ اُس کی محبت، اُس کی پیوی۔“
میں تو سناٹے کی سی کیفیت میں تھی وہ چند لمحوں کے لیے رکھی تھی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔
”شمرہ کے بارے میں تو اُس نے پہلی چند ملاقاتوں کے بعد ہی بتا دیا تھا۔“

مزمن جب تیس سال کی ایک سمجھ دار، پختہ عمر کی، اپنے مستقبل سے ہاپس لڑکی خود سے نو سال چھوٹی عمر کے لڑکے سے اس کی مجبور پوپ اور اپنی تین خواہشوں کے تانے بانوں سے ایک رشتہ بننے لگتی ہے تو سمجھوتے کی لچک کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ متین کی بیوہ ماں شمرہ کے گھر کی ملازمہ تھی۔ اُن کی چھوٹن سے اپنا اور اپنے کا پیٹ بھرتی تھی۔ شمرہ کا گھر اس کی ماں کی وہ پناہ گاہ تھی کہ جہاں اُس نے اپنا وقت عزت و آبرو سے کاٹا۔

دونوں میں کوئی تین چار سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ متین میرے غلوں اور قربانوں سے بھی متاثر تھا۔ میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے کا آرزو مند تھا۔ مگر شمرہ کی محبت کی ڈور یوں میں بندھا ہوا تھا۔ میں سوچتی رہی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

”متین دو کشتیوں میں پیر رکھ بیٹھا تھا۔ میری دانش مندی نے اُسے ڈولنے نہیں دیا۔ اُس کے انگلیڈ جانے سے قبل نکاح اُس کی تعلیم اور گرونگ سب میری نگرانی میں ہوئی۔ پانچ سال وہ میرے ساتھ میرے زیر سایہ رہی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

میں ہونفوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں بھاڑے۔ سب سنی تھی جانے کیوں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔“

وہ کلکلا کر کہی۔ ”ارے مزمن میں تو اُس کے سارے نظام کی گاؤں مدر ہوں۔ میرے غماز کیلئے تو یہی کال ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو گھر بنانے کا سوچا نہیں تم بلاؤ۔ جو سوچیں پیدا کر رہی ہو۔ گھر اوپر والا بناتا ہے۔ چاہے گا تو جو بنیاد میں نے رکھی ہے اس پر بن جائے گا اور اگر نہیں تو میں بجری، سینٹ، چپس لے کر بھی نہیں بنا پاؤں گی۔“

متین ان دنوں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔
پھر بھارہ کی ایک رنگوں سے بھری مچ کو وہ بھارہ کی طرح کلائی اور بازوؤں تک مہندی کے پھول پتیوں سے سجی قیمتی زرتار جوڑا پہنے اور پھولوں کے زیورات سے لدی پھندی اسکول میں آئی اور متین سے اپنے نکاح کی دھماکا خیز خبر سنائی۔ ہم سب کے شکوہ پر اُس کا معذرت بھرا اظہار تھا کہ بس سادگی سے نکاح ہوا ہے۔ باہر سے تو کوئی مدعو ہی نہیں تھا۔

چلو خوشی کی بات تھی۔ اس کی بے کیف سی زندگی میں خوشیوں کے رنگ تو کھلے۔

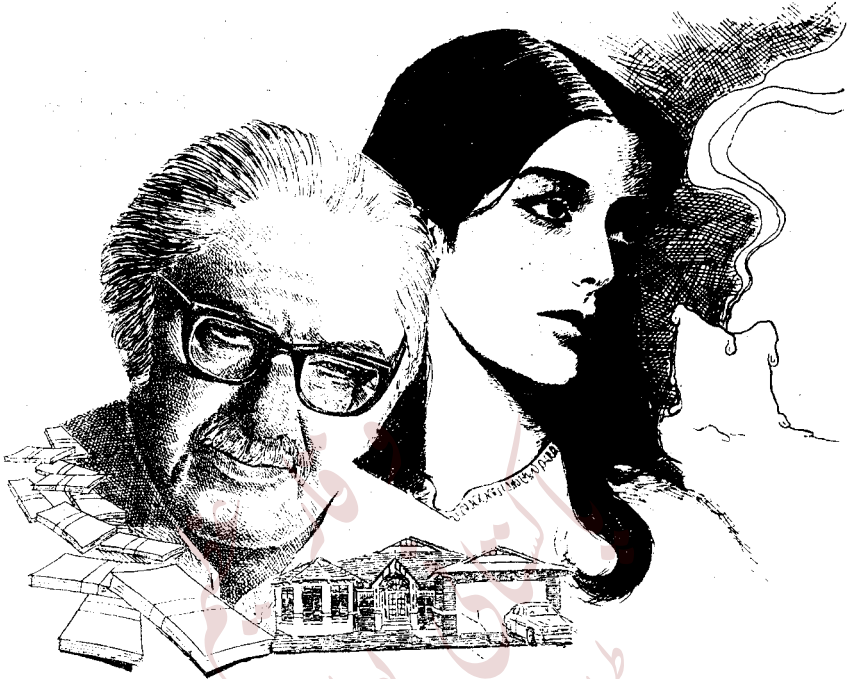
سال بعد بچہ آگیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھی۔ سرور و مطمئن اور سرشاری۔

متین پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ پانچ سال بعد واپس آکر اُس نے گلبرگ میں ایک شاندار اسپتال اور گھر بنایا۔ تہینہ نے نوکری چھوڑ دی اور اسپتال کی منتظم اعلیٰ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

انسانوں کو پرکھنے، پڑھنے اور ان کو جانچنے کے میرے سارے دعوے غلط نکلے تھے۔

ہم سب کا خیال تھا کہ تہینہ بخدا رہے۔ قسمت کی جہنی ہے۔ مقدر نے اُس کا بہت ساتھ دیا ہے۔

یہ جانی سردیوں کے دن تھے۔ میرے بچے چائینز کھانے کے لیے ضد کر رہے تھے میں انہیں لے کر ایک چینی ریسٹوران میں چلی گئی۔ بڑا خوبصورت سا ماحول تھا۔ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب ذرا قافلے پر کونے میں ایک نوجوان چہرے نے مجھے ان الفاظ اپنی طرف کھینچ لیا۔ لڑکی کا حسن نیم اندھیرے میں لٹکارے رہتا تھا۔ بار بار میری نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ مجھے جس سا تھا کہ ساتھ بیٹھا مرد کیسا ہے؟ دونوں جب اٹھے تو میں ششدر رہ گئی۔ وہ متین تھا۔ بہت وجیہ لگ رہا تھا۔ ڈیلا پٹا جسم اب بھر گیا تھا۔ باہر کی تعلیم و تربیت نے زبردست کرونگ کر دی تھی۔ دونوں اپنی تربیت میں میرے قریب سے گزر کر چلے گئے۔



تعبیر خواب

محترم مدیر
السلام علیکم

یہ روداد ہے دو سہیلیوں کی۔ ان دونوں میں کتنی محبت
کیسی چاہت تھی اس کا اندازہ آپ کو روداد پڑھ کر ہی ہو گا۔
مجھے امید ہے کہ سرگزشت کے قارئین کو بھی یہ روداد پسند
آئے گی۔

حبیب الرحمن
(کراچی)

والے تھے اور سال ہا سال سے ایک ساتھ رہ رہے تھے اس لیے
یوں لگتا تھا جیسے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔
سن شعور سے پہلے کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے جس میں کوئی
نہ بڑا کہلاتا ہے نہ ننھا مٹا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب سارے بچے
بہت سارے بچوں اور بڑوں کے درمیان رہ کر اچھی بری ہر قسم
کی باتیں سن بھی رہے ہوتے ہیں اور سیکھ بھی رہے ہوتے ہیں۔

میں اس کو اپنے بچپن سے جانتی تھی کیونکہ وہ میری ہم
مری تھی۔ ایک ہی گلی، ایک ہی محلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ
دوار سے دوار جڑی ہوئی۔

یہ بہتی نہ تو بہت غریبوں کی تھی اور نہ ہی بہت خوشحال
لوگوں کی۔ ایک خوبی نمایاں تھی کہ اس میں رہنے والے سارے
لوگ ہی پڑھے لکھے اور ایک دوسرے کے دکھ کھ میں کام آنے

جوں جوں عمر سن شعور کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے، ہم اچھی اور بری باتوں کا تجزیہ بھی کرنے کے قابل ہوتے جا رہے ہوتے ہیں لیکن اس مقام پر ہمارے ارد گرد کا ماحول، بڑوں کے رویے اور سلوک، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا کردار، حلقہٴ احباب کا طرز سلوک اور سب سے بڑھ کر اساتذہ کا معیار تعلیم و تربیت ہماری کردار سازی میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوتا ہے۔

اس ابتدائی دور سے گزر کر جب میں اور وہ سن شعور کو چھو کر کچھ اور آگے بڑھے تو ہمیں یہ سمجھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ارد گرد کے ماحول کے جتنے بھی مراحل تھے وہ سارے کے سارے بہت ہی اچھے تھے اس لیے ہم پورے یقین سے یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم کسی بھی قسم کا کوئی بگاڑ جو خود ہمارے لیے یا پھر ہمارے کسی بھی بڑے کے لیے وجہ شرمندگی ہو، نہیں آسکتا تھا۔

زندگی میں بعض اوقات ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب ایک لمحہ بھی صدیوں کے برابر لگتا ہے اور وقت کا لے نہیں لگتا اور بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے اور اس کے ساتھ بھی ہوا۔

اسکول میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ابتدائی اسکول سے فارغ ہونے کا پتا ہی نہ چلا اور اب تو میں اور وہ دسویں جماعت میں تھے۔

مجھ میں اور میری سہیلی میں اگر کوئی بہت بڑا فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ ذہن ہونے کے باوجود بھی وہ پڑھائی کے معاملے میں سستی اور کالی کا شکار تھی۔ حسن اتفاق یہ بھی رہا کہ میں اور وہ دسویں جماعت تک جس جس اسکول میں بھی رہے نہ صرف اسکول فیلو رہے بلکہ ہم جماعت بھی رہے۔ میں اپنے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ لائق فائق تھی، ہر چیز اس کو طے کی طرح ازیر ہو جایا کرتی تھی اور ہر سوال کا جواب اس کے پاس موجود ہوتا تھا لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ ہوم ورک ہو یا کسی بھی قسم کے درمیان بدت یا سالانہ امتحانات، وہ اس میں مجھ سے پیچھے رہ رہ جایا کرتی تھی اور اس کی بنیادی وجہ وہ یہی بتاتی تھی کہ نہ جانے ان مواقعوں پر اس میں سستی اور کالی کیوں بڑھ جایا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی امتحانی سوالات کے جوابات مکافہ نہیں دے پاتی تھی۔

کسی حد تک میں بھی گھریلو کاموں میں بہت ساری کوتاہیوں کا شکار رہتی تھی، بھاڑ پونچھ کا کام تو مجھے عذاب ہی لگا کرتا تھا لیکن دیگر گھریلو امور خاص طور سے کھانا پکانا اور

مہمانداری میں میرے والدین اور بہن بھائیوں کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی لیکن میری سہیلی شاید بہت سارے معاملات میں بہت اچھی رہی ہو مگر سالین چولہے پر چڑھانے کے بعد اکثر بھول جانے کی عادی رہی تھی اسی لیے پڑوس سے اس کی والدہ کی چیخنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں کہ ارے نیک بخت دیکھ سالین جلنے کی بو آ رہی ہے۔

ڈیٹ شیٹ اچھی تھی اور ٹھیک بیسویں دن ہمارا پہلا پرچہ تھا اور درمیان درمیان مناسب وقفوں کی وجہ سے اس کا اختتام بائیس دن بعد ہوتا تھا۔ امتحان کسی بھی قسم کا ہو یہ انسان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے، یہی حال میرا بھی تھا اور سارے کاموں سے منہ موڑ کے میں نے اپنا رخ کتابوں کی جانب پھیر لیا تھا لیکن جب جب بھی میں اپنی سہیلی کے گھر گئی اس کی کتابیں تو کھلی اور پھری پائیں لیکن اس کا دھیان نہیں اور ہی پایا، پوچھنے پر یہی جواب ملا کہ میرے ساتھ نامعلوم کیوں ایسا... ہوتا ہے۔

پرچے ختم ہوئے، لگا ایک پہاڑ سا بوجھ سر پر دھرا تھا وہ اتر گیا۔ ہمارے ملک کا یہ المیہ ہے کہ امتحانات کے نتائج بہت ہی تاخیر سے آیا کرتے ہیں اس طرح زندگی کے کئی قیمتی مہینے امتحان کے نتائج کے انتظار میں ہی گزر جاتے ہیں سو یہ بھی ایک امتحان تھا جو گزر ہی گیا لیکن مجھے اس بات کا گہرا صدمہ تھا کہ میری بہت ہی اچھی اور پیاری سہیلی کو ایک پرچے میں حزیمت اٹھانا پڑی اور باقی پرچوں میں بھی بہت حوصلہ افزا نمبر نہیں آسکے تھے۔

کہتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہوتا ہے، اس لیے ماحول کی کدورت بھی قصہ ماضی بننا شروع ہو گئی اور اس نے بھی گمنی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

کچھ فیصلے وہ ہوتے ہیں جو ہم کر رہے ہوتے ہیں اور کچھ فیصلے وہ ہوتے ہیں جو کاجب تقدیر لکھ رہا ہوتا ہے۔ اس نے گمنی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ تھا اور درخواست داخل پورڈ کی تھی کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آن کھڑا ہوا۔ لوگ اچھے تھے لڑکا مناسب تھا اور ان ہی کے مطابق حالات اور ماحول والا تھا اس لیے والدین نے رشتہ طے کرنے میں دم لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اس کو اللہ کا حکم اور رب کی رضا سمجھ ہوئے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ چند مہینوں میں اس کو رخصت بھی کر دیا۔ جس جس نے بھی لڑکے اور لڑکے والوں کو دیکھا، ملاقات کی، سب نے یہی کہا کہ اچھے لوگ ہیں اور دعائیں دیا کہ اللہ تعالیٰ سکھ رکھے۔ اس طرح میری بہن جیسی سہیلی بھ سے میلوں دور بیابا کے اور میری چلوں پر ستارے سہاگے

پیداہیں چلی گئی۔

میں ابھی اس وقوعہ پر حیران و پریشان ہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میری بیکلی کی ابھی عمر ہی کیا تھی جو ان کے والدین نے اس کے نرم و نازک کاندھوں پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی کہ میرے گھر بھئی کوئی آندھی طوفان کی طرح آن پڑا اور میں نہیں نہیں ہی کرتی رہ گئی۔

اس طوفان کو سر سے گزرے بھی پانچ برس بیت چکے ہیں۔ اس پانچ برسوں میں کئی اور حقیقی طوفان بھی گزرے، میری والدہ دنیا سے رخصت ہوئیں، میری بیکلی کے تو دونوں سائے ہی سر سے اٹھ گئے، میرے والد کا سایہ ابھی تک میرے سر پر ہے لیکن میں والد سے کوسوں دور دارالحکومت میں ہوں اور والد اپنے آبائی شہر میں، اپنی بیکلی کی بس اتنی ہی خبر ہے کہ وہ شادی ہو کر حیدرآباد چلی گئی تھی اور کیونکہ میری شادی بھی بہت جلد میں ہوئی تھی اس لیے کسی کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ دور دراز کے لوگوں کو مدعو کیا جاسکے۔

آج کل کے ماحول کے اعتبار سے شاید یہ بات بہت عجیب سی لگے کہ اتنی چھوٹی عمر میں میری شادیاں کیوں کر دی گئیں لیکن میرے زمانے میں یہ عمریں بہت بڑی کہلاتی تھیں اس لیے ایسا ہو جانا اس زمانے کے لحاظ سے درست ہی تھا اور جو کچھ میں نے اپنے محسوسات بیان کیے وہ میرے اپنے اندر کی لڑکی کے تھے کیونکہ مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بھاری بھاری ذمہ داریاں کسی بچی پر ڈال دینا میری اپنی سوچ کے مطابق مناسب نہیں تھا۔

جب تک میری والدہ حیات تھیں اور ان سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ رہتا تھا یا وہ بھی یا میں بھی آیا..... یا..... جایا کرتے تھے، اپنی بیکلی کے متعلق یہی خبر ملتی کہ وہ بحیثیت جمجوی خوش ہی ہے البتہ فطری سستی اور کابلی کی وجہ سے اسے اکثر شدید پریشانی کا سامنا رہتا ہے لیکن والدہ کی وفات کے بعد ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔

کمزوریوں سے پاک اللہ کی ذات ہے، مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ میری اکثر غلامیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا رہتا تھا، کچھ پر تو میں قابو پالیا کرتی تھی لیکن جس طرح ایک گھر والی کو کمر کو چنبرن بنا کر رکھنا چاہیے، اس کمزوری پر میں اب تک قابو نہیں پا سکی تھی۔ یہ بات میری ساس کے لیے کیبیدہ دلی کا سبب بن جایا کرتی تھی لیکن ان کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ بات کو طول دینے کی بجائے ختم کر دیا کرتی تھیں اور یوں بات آگئی ہی ہو جایا کرتی تھی۔

آج مجھے اپنی بیکلی نہ جانے کیوں بہت یاد آ رہی تھی۔ پیدائش سے لے کر جوانی تک اور پھر شادی تک جو بھنوں کی طرح ساتھ رہی ہو اس کو بھول جانا کیسے ممکن ہے لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا اس سے اور اس کا مجھ سے رابطہ نہیں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دو تین ہی ذرائع ہوا کرتے تھے، خط، تار یا پھر لینڈ لائن ٹیلیفون..... ٹیلیفون تو کسی کی کہ پاس ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس یہ سہولت ضرور تھی لیکن کروڑوں اس نعمت سے محروم ہی ہوا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں بھی یہ نہیں سنا تھا کہ میری بیکلی کے گھر یا محلے میں اسکی کوئی سہولت میسر ہے۔ رہی بات خط اور تار کی تو اس کے لیے اولین شرط گھر کے بچے کی ہوتی ہے جو میرے پاس تھا ہی نہیں کیونکہ جو بھی خیر خیریت مجھے معلوم ہوتی رہی وہ میری بیکلی کے والدین سے ہی ہوتی رہی اور اب تو وہ لوگ بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور میرا رابطہ بھی بہت عرصہ ہوا اس کے گھر والوں سے منقطع ہی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی دل کی گھرائیوں سے کوئی آس و اُمید کی آہ بلند ہوتی تو یہی ہوتی کہ اللہ اس سے ملاقات کی کوئی تسکین ضرور نکالے اور زندگی میں وہ اور میں ایک بار ضرور مل سکیں۔

میری ساس اس زمانے کی روایتی ساس بالکل بھی نہیں تھیں، چھوٹی سوئی گھریلو کاجاتوں کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوتی اور جو ہوتی تھی اس میں بھی میری ہی کسی نادانی یا کوتاہی کا دخل رہا۔

میرے شوہر کی ملازمت بہت مناسب تھی اور ہم ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے سر بھی اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ شوہر حسب معمول مع دفتر جاتے اور چار پانچ بجے کے دوران لوٹ آتے تھے۔ سر ہوں یا میرے شوہر، سرکاری ملازمت کے باوجود پابندی اوقات کے بہت ہی پابند تھے اس لیے ہم سب کے سونے اور جاگنے کے اوقات معمول کے مطابق ہی تھے۔

ایک دن جب میرے شوہر گھر لوٹے تو کچھ مضحل مضحل نظر آئے، میں نے یہ تبدیلی محسوس... تو فوری طور پر کر لی لیکن جب وہ نماز کا رخ فارغ ہوئے تو میں نے چائے پیش کرتے ہوئے اس تبدیلی کا ذکر کیا۔ میرے سوال پر پہلے تو انہوں نے اس تبدیلی کے محسوس کئے جانے پر حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ میرا تبادلہ تین سال کے لیے حیدرآباد کر دیا گیا ہے۔

یا اللہ، میرے دل میں بے اختیار یہ صدا گونجی، آج ہی تو میرے دل میں اپنی بچپن کی بیکلی سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی

جو بیاہ کے حیدر آبادی مگنی تھی اور آج ہی میرے شوہر مجھے اپنے تادلے کا سنا رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے میں شوہر کے سامنے نہیں ہوں بلکہ سہیلی کی تلاش میں حیدر آباد کی گلیوں میں گھومتی پھر رہی ہوں۔

”کہاں تم ہو گئیں“ میرے کانوں میں شوہر کی آواز گونجی اور مجھے یوں لگا جیسے بہت دور سے کسی نے آواز دی ہو۔ میں نے گہرا کے کہا۔ ”کہاں تم ہو سکتی ہوں آپ کے پاس ہی تو ہوں۔“ لیکن یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ، آنکھیں اور اعتماد یکہ اور ہی جھٹی لکھا رہا تھا۔ میرے شوہر نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چشم پوشی سے کام لیا۔

اکثر میں اپنے گھر آئے کسی مہمان یا گھر میں ساس یا سر سے کوئی بات کر رہی ہوتی تھی اور میرے شوہر در بیٹھے کسی کام میں مصروف اس بات کو نوٹ بھی کر رہے ہوتے تھے پھر بھی آج تک انھوں نے خود سے یہ جاننے کی کوشش یا خواہش نہیں کی کہ میں کیا باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اکثر اپنے شوہر کو نوکا کہ آپ، کی جانے والی باتوں کو دریافت کیوں نہیں کرتے تو وہ بہت متانت سے صرف اتنا کہا کرتے تھے کہ ظاہر ہے تم کوئی سا میرے خلاف کسی سے کچھ کہہ رہی ہوگی، اگر کوئی بات مجھے بتانے کی ہوگی تو مجھ سے کیوں چھپاؤ گی اور میں ان کی اس سوچ پر شدید ردہ جایا کرتی تھی۔

جبکہ اس وقت بھی ہوا اور وہ مجھے آج بھی حیران کر گئے۔ والدین کے سامنے اپنے مسئلے کو رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے سوچا ہے کہ میں آپ کی بیٹی کو ساتھ لے جانے کی بجائے تمہارا چلا جاؤں اور چینیوں کے دوران آؤں جاؤں تاکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

میں نے یہ جملے بہت مبروضہ کے ساتھ سنے۔ گھر کی فضا میں چند لمحوں کے لیے سکوت سا جمایا گیا۔ میری نگاہیں بے ساختہ اپنے ساس سر کی جانب اٹھ گئیں اور میں منتظر رہی کہ دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔

”نہیں بیٹے، یہ بات ہمیں کبھی گوارہ نہیں ہوگی۔ تین سال کا عرصہ کوئی تھوڑا عرصہ تو نہیں ہوتا اور کیا ہمیں معلوم نہیں کہ نوکری پیشہ افراد کو کتنی چٹھیاں ملتی ہیں۔ تم جاؤ تو ہماری بیٹی کو ہمراہ لے کر جانا۔“

ان کی باتیں سن کر میری پلکیں شبنم آلود ہو گئیں کہ ہم کتنی جلد کسی کی جانب سے کوئی رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔

”ٹھیک ہے۔“ میرے شوہر نے جواب دیا۔ ”میں دو دن بعد روانہ ہو رہا ہوں، جو انک دوں گا، کسی اچھی جگہ مکان

تلاش کروں گا اور پھر انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر آپ کی بیٹی کو بھی لے جاؤں گا۔“

ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر اندر میں اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد شفٹ ہو گئی۔

حیدر آباد کا لطیف آباد اس وقت کے حیدر آباد (اور آج کے بھی) کی ایک اچھی رہائشی اسکیم تھی اور کیونکہ اس کی تعمیر شروع ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے ہر جگہ بہت کھلی کھلی اور صاف ستھری نظر آتی تھی، مگر وہ مجھے یہاں کی رہائش اسلام آباد سے اچھی لگتی نہیں تھی لیکن جہاں شوہر ہو وہ پشیمانی جنگل بھی ہوتا وہاں مشکل سے کم نہیں ہوا کرتا۔

لطیف آباد میں رہتے ہوئے اب دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ گلیوں میں گھومتے، بازاروں میں خرید و فروخت کے دوران، تقریباً گھولوں میں سیر کرتے میں ایک ایک خاتون، خواہ وہ نقاب میں ہو یا بے نقاب، غور سے دیکھا کرتی کہ شاید مجھے میری بیٹی نظر آجائے لیکن اب تک ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ میرے شوہر میری اس بات کو محسوس کر لیتے لیکن سوائے مسکرانے کے کبھی انہوں نے اور کچھ نہیں کیا جس پر اکثر میں جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر پوچھ بیٹھتی کہ آخر آپ میری اس کیفیت پر کوئی تبصرہ کیوں نہیں کرتے، یہ بات سن کر ان کی مسکراہٹ میں اور بھی گہرائی آجایا کرتی تھی مگر تبصرہ پھر بھی نہیں کرتے تھے۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا، میں ان کے ساتھ بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہی تھی ایک نقاب پوش خاتون کو کچھ زیادہ غور سے دیکھنے لگی لیکن بہت جلد مجھے یہ احساس ہوا کہ جو کچھ میں تلاش کرنا چاہ رہی ہوں وہ اس میں ہے ہی نہیں۔ میں نے بے ساختہ مڑ کر شوہر کی جانب دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر پہنچ کر میں ان پر الٹ ہی پڑی۔ ”آخر آپ میری اس کیفیت پر صرف مسکراتے کیوں ہیں پوچھتے کیوں نہیں کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں۔“

آج پہلی مرتبہ مجھے ان کی جانب سے لفظوں میں جواب ملا تو میں حیران رہ گئی۔

کہنے لگے۔ ”جس چیز کا معلوم ہو اس کے متعلق پوچھنے کا کیا فائدہ اور جس کا نہ معلوم ہو تو اس کی کھوج کرید کیوں؟“

میں ان کے جواب پر چونک پڑی، آپ کو کیا معلوم کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟“

کہنے لگے۔ ”تمہیں اپنی سہیلی کی تلاش ہے۔“

یقین اور اعتماد والی بات کہ اللہ کی رحمت سے کسی مایوس نہیں ہوتا چاہیے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت مجھے اپنی ہی چٹلی کھاتی محسوس ہو رہی تھی، مگر میں بزرگ خواتین کا ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے اس کا احساس تو مجھے حیدر آباد آتی ہی ہو گیا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تو اس کی احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے کی تربیت ہی ایسی ہوا کرتی تھی کہ اس قسم کی باتیں شوہر سے بھی براہ راست نہیں کی جاتی تھیں لیکن اب تو کرنا ہی تھی۔ دل و دماغ کو سمجھایا، دل کی دھڑکنوں کو سمجھایا اور آخر کار ان کے سامنے بات رکھ دی۔

یہ وہ وقت تھا جب میرے شوہر دفتر جانے کے لیے مگر سے نکلے ہی والے تھے۔ میری یہ بات سن کر وہ میری مسکراہٹ ان کے لبوں پر رقصیدہ ہوئی جس کو دیکھ کر میرے دل و دماغ میں عجب سے کھلبلی مچ جایا کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ کوئی جواب دیئے بغیر مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر دفتر روانہ ہو گئے۔

حسب معمول شام کو مگر کوٹے تو بس اتنا کہا کہ بس تم تیار ہو جاؤ، لیکن پہلے جانے، آج کہیں چلتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید میرے سلسلے میں ہی جارہے ہوں۔

جانے تیار کی، وہ مسکرا مسکرا کر پینے لگے تو میں ابھی اور تیار ہونے چلی گئی۔ واپسی پر وہ بھی تیار ہی لے اور ہم نامعلوم منزل کی جانب چل دیئے۔ حیدر آباد میرا دیکھا ہوا تو نہیں تھا اس لیے میرے لیے منزل نہ معلوم ہی رہی ہوگی لیکن جہاں میرے شوہر مجھے لے جانا چاہا رہے ہوں گے وہ تو بھلیاں ان کے لیے ”معلوم“ ہی ہوگی۔

ہماری کار کو جہاں پر ایک لگا اس جگہ کو دیکھ کر ایک جھٹکا میرے دماغ کو بھی لگا، نہ تو یہاں اسپتال تھا اور نہ ہی تفریح گاہ، یہی دونوں جگہیں میرے تصور میں گردش کر رہی تھیں یا اللہ ریلوے اسٹیشن؟ یہ بھی کوئی جگہ ہوگی۔

کسی گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، تانگے اور سائیکل رکشاج جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اٹکاؤ کا موڑ کاریں بھی نظر آرہی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب بعد مشکل کسی محلے میں کوئی کارولا ہوتا تھا۔

میں نے اپنے شوہر سے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو بس اتنا جواب ملا۔ ”چند منٹ ٹھہر جاؤ سب معلوم ہو جائے گا۔“ اور چند منٹ بعد ہی ریل گاڑی اسٹیشن سے آگئی اور اس کے حرید چند لمحوں بعد ایک ڈبے سے میرے ساس سر

”کیا مطلب؟“ میں جیسی چیخ سی پڑی۔ یہ بات آپ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں۔

”بات یہ ہے کہ تم جس چھوٹے سے شہر میں رہتی تھیں وہاں تقریباً سارے ہی لوگ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ جب میرے والدین میرے رشتے کی تلاش میں وہاں گئے تو اس بات کا تذکرہ بھی آیا کہ تمہاری ایک سہیلی کی شادی چند ماہ قبل ہو چکی ہے اور وہ رخصت ہو کر حیدر آباد گئی ہے۔ تم اور تمہاری سہیلی کا جو دوستانہ تھا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے میری والدہ سے اس کے تذکرے بالکل اس طرح کئے تھے جیسے کوئی کئی بہنوں کے کرتا ہے۔“

میں.... دل ہی دل میں انہیں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صرف ”ہوں“ کہہ کر رک گئی۔

جب ہی میں کہوں یہ ہر دم مجھے اس طرح دیکھ کر مسکرایا کیوں کرتے ہیں۔ یہ بات بھی میں نے اپنے دل ہی دل میں کہی۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ وہ لطیف آباد میں کہاں ہے۔“ ”تمہیں علم ہے؟“ انہوں نے مجھ سے سوال کر لیا۔ ”نہیں۔“ میرے منہ سے بیجا نکلنا۔

”پھر مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے جبکہ مجھے اس کا یا اس کے شوہر کا نام تک نہیں معلوم۔ جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے وہ ظاہر ہے میں کیسے بھول سکتی تھی لیکن جہاں تک اس کے شوہر کے نام کا تعلق ہے وہ تو میں نے بھی کسی سے پوچھا تک نہیں تھا اور نہ میرے زمانے میں ایسا کوئی رواج تھا البتہ اگر اس کی شادی ہماری بستی ہی میں کسی سے ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اس کے شوہر کا نام کسی نہ کسی سے سننے میں آ ہی جاتا۔

بات آئی گئی ہوگی اور کچھ ہفتے ایسے ہی گزر گئے۔ شادی ہوئے تقریباً سات برس بیت چکے تھے لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اولاد کی نعمت بھی کیا نعمت ہوتی ہے۔ ہماری تو تنہا جتنی بھی ہو کم ہے، بزرگوں کی تنہاؤں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اولاد کی محرومی ایک خاتون خانہ پر بھی ہوئی کموار کی مانند ہوتی ہے۔ یہ سوچ کے جب جب میں نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا ان کو مطمئن ہی پایا اور تذکرہ کرنے پر ایک ہی جواب ملا کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

میرے شوہر بظاہر کوئی مولوی یا مذہبی قسم کے نہیں تھے لیکن ان میں کچھ صفات تعجب خیز ضرور تھیں، جیسے یہی۔ اتنے

برآمد ہوئے جن کو دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

ایک حیرت اس حیرت سے بڑھ کر یہ تھی کہ آخر اپنی بات شوہر کے سامنے رکھتے ہی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا جبکہ اگر ایسا تھا بھی تو تین چار دن تو لگ جانے چاہیں تھے۔

اسٹیشن سے لے کر گھر تک اس خیال کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ اور سوچا ہو۔

گھر آکر جو بچی میرے ساس سر نہانے دھونے میں مصروف ہوئے تو میں شوہر سے الگ تھی جس کا جواب انھوں نے لفظوں میں دینے کی بجائے دیوار سے لگے ہوئے کلینڈر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دیا اور بے ساختہ میری نگاہیں اور گردن حیا سے جھکی کی جھکی رہ گئیں۔

ابو (سر) ریٹائرڈ ہونے ہی والے تھے اور امی (ساس) اس خبر کے بعد کئی طور نہیں رک سکتی تھیں اس لیے ابو نے وہ چھٹیاں جو جمع ہو چکی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا حساب بے باق ہو جانا تھا، ان کو ”حساب“ میں لانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کو تصرف میں لانے کا اس سے اچھا موقع کون سا ہو سکتا تھا۔

میری مشکل دیکھ کر میری امی (ساس) نے میرے شوہر سے کہا کہ کراچی چلو، یہاں جدید سہولتوں کا قندار ہے اور اللہ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہوا ہے تو کیوں نہ کی اچھے نئی، ہسپتال میں چیک اپ کرائیں، میرے شوہر کو اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا جبکہ میرے سر کے بہت سارے رشتے دار کراچی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ کراچی پہلے دار الحکومت ہوا کرتا تھا، جب اسلام آباد کو دار الحکومت بنایا گیا تو میرے ابو (سر) کا بھی اسلام آباد ڈانسفر ہو گیا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی شادی کے بعد ہی معلوم ہوئی تھی۔

کراچی میں ہمارا قیام ابو (سر) کے چھوٹے بھائی کے گھر ہی ہوا۔ ابو اور امی تو اکثر کراچی جاتے آتے رہے تھے لیکن میں پہلی بار ہی کراچی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کے ہر شہری کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کراچی دیکھے۔ بیشک اس وقت کا کراچی ہوا یا اس وقت کا، ایک بہت ہی بڑا اور پُر رونق شہر ہے لیکن لوگوں کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ کہیں دور دراز کا سفر کر سکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب اپنے ملک میں گھومنا تو گھومنا، باہر جانا بھی کوئی بہت انتہائی بات نہیں رہی۔

سب لوگ بہت اچھے لگے اور سب سے ہی پیار ملا۔

اگلے دن ہم ایک بہت اچھا ہسپتال گئے۔ معائنے کے دوران معلوم ہوا کہ اس ہسپتال سے اپنا ہاؤس جاب مکمل کر کے ڈاکٹر قرۃ العین حیدر آباد جا چکی ہیں اور یہاں انھوں نے بہت اچھی شہرت پائی ہے۔ کیونکہ گزشتہ سات آٹھ برس سے حیدر آباد میں ہی مقیم ہیں اس لیے وہاں کے ایک نئی ہسپتال نے ان کی لائق مندی اور اچھی شہرت کی وجہ سے ہاؤس جاب کے دوران ہی اچھی آفر دی ہوئی تھی جس کو انھوں نے اپنی خوش بختی سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ ہسپتال کی انتظامیہ کو جب یہ علم ہوا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ چاہیں تو ان کے پاس اپنی رجسٹریشن کر سکتی ہیں۔

الحمد للہ، میری رپورٹیں سب ہی اچھی آئی تھیں اور کسی بھی قسم کی کوئی تشویش کی بات نہیں بتائی گئی تھی، علاوہ کھانے پینے کی احتیاط کے، اس لیے سب نے یہی کہا کہ مشورہ مناسب ہے اور فیصلہ ہوا کہ اب بانی علاج اور دیکھ بھال حیدر آباد میں ہی ہو تو بہتر ہے۔

قرۃ العین، میں نے رات بھر اس نام پر بہت غور کیا۔ یہی نام تو تھا میری کنبلی کا۔ لیکن ڈاکٹر؟ میٹرک میں سہلنت، پڑھنے میں کامل اور سست۔ سو جانے والی لاابالی..... اونہہ کیا دنیا میں ایک ہی قرۃ العین ہے مگر حیدر آباد۔ سات آٹھ برسوں سے مقیم بس ساری رات کیا۔ جتنے دن کراچی میں گزارے اور کراچی سے آنے کے بعد اپنے گھر میں گزارے یہی کہانی دماغ میں گھومتی رہی۔ اس دوران مجھے یہ تک احساس نہیں ہو سکا کہ میرے شوہر میری اس کیفیت کو بھانپتے بھی رہے ہیں یا نہیں، آج ڈاکٹر کے پاس جاں نظر ہوا تھا، شوہر میرے ہمراہ تھے، ہسپتال حیدر آباد شہر سے ٹھوڑا سا ہی باہر تھا۔ ہسپتال میں ایسا رش بھی نہیں تھا اور میں آخری مریدہ تھی۔ جب میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے میرا سارا وجود پتھر کا ہو گیا ہو، پاؤں من من مگر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں تو اب تک نقاب میں ہی تھی لیکن جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ نقاب سے آزاد تھا اور.....

”کیا ہوا..... کیا ہوا۔“ ڈاکٹر اور اس کی اسٹینڈنٹ گھبرا کے میری جانب بڑھیں۔

”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔“ میں نے عجیب سی آواز کے ساتھ کہا اور اپنا نقاب ہٹا لیا۔

”ہائیں!.....“ ڈاکٹر کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔

اس کے بعد جو ہم دونوں نے آنسو بہائے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ شادی مرگ سے بچی گئی۔ جب

اور..... دیکھ لو میں تمہارے سامنے ایک لیڈی گائینا کا لو جسٹ ڈاکٹر قرۃ العین موجود ہوں۔“

باہرنگی تو میرے شوہر نے بہت غور سے مجھے نیچے سے اور تنک دیکھا لیکن حسب عادت کوئی لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ میں نے بھی اپنی کیفیت کو چھپائے ہی رکھا اور یہی خیال کیا کہ وہ مجھ سے میرے متعلق کوئی سوال کریں گے۔

وہ مجھے گھر پر اتار کر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ میں ابھی آیا اس مرتبہ میں نے بھی عہد کیا ہوا تھا کہ جب تنک وہ خود سے نہیں پوچھیں گے میں بھی ان کو اپنی سبیلی کے مل جانے کا نہیں بتاؤں گی۔ بڑا دعویٰ کرتے ہیں کہ میں ہر بات کیفیت دیکھ کر ہی سمجھ جاتا ہوں البتہ ان کے آنے سے قبل میں اپنی امی (ساس) کو سب کچھ بتا چکی تھی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے بیٹے سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گی۔

آدھے پونے گھنٹے میں ان کی واپسی ہوئی تو وہ مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ ہوئی۔

میں شراب کے کمرے میں جانے والی ہی تھی کہ انھوں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ٹھہرو..... مجھے معلوم ہے تم مجھے ایک سر پرانز دینے والی ہو..... لیکن..... میں آج تم کو بھی ایک سر پرانز دینا چاہتا ہوں۔“

میرے ذہن میں ایک نئی زندگی کے علاوہ اور کوئی تصور ابھری نہیں رہا تھا۔

”کیا سر پرانز؟“ میں نے شرمائے شرمائے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر انھوں نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا..... اس میں مٹھائی تو تھی ہی لیکن کارڈ بھی تھا جس پر درج تھا۔

”تمہیں تمہاری بچپن کی دوست سے ملنا مبارک۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس مرتبہ تو میں جیجی ہی پڑی۔

اندر جانے والی کیفیت کچھ اور تھی اور باہر آنے والا سراپا کچھ اور..... نام کا علم تو ہو ہی چکا تھا، ڈاکٹر قرۃ العین۔

جولفتہ ایک مرتبہ میرے دل میں محن ان ن..... بن کر گونج کر رہ گیا تھا اس مرتبہ بہت بلند آواز کے ساتھ..... گھنے سے سے..... بن کر پھوٹ بھا..... اور..... اس بے تکلفی پر میری گردن اور آنکھیں شرمندگی کے ساتھ گھوم ہوتی چلی گئیں۔

جو لوگ محنت کرتے ہیں کامیابی انہی کا مقدر ہوتی ہے۔

اگر محنت کر لے انسان تو زندگی کا بدن کوئی مشکل نہیں۔

کیفیت معمول پر آئی تو میرا آنسوؤں کے سیلاب میں میرا پہلا جملہ ”تم..... ڈاکٹر قرۃ العین..... تم۔“

آخری جملہ کہنے کے لیے مجھے کوئی تہمید نہیں باوجود چاندی ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ اس کو کون جانتا تھا۔

”خواب۔ ایک خواب کی تعبیر۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہوا یہ کہ میٹرک میں ایک پرپے میں ٹپل ہونے کے بعد اس رات میں بہت روئی۔ روتے روتے نہ جانے کب مجھے نیند آگئی تو میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کی ایک بہت لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔ میں خواب میں بھی سوتے سے ہی بیدار ہوئی تھی۔

خمار آلود آنکھوں اور نیند میں ڈوبی آواز میں میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کیسی قطار ہے، جواب ملا جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے ہیں۔ اعزاء لگایا کہ یہ اتنی لمبی قطار ہے کہ اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں تھکانے سے بہتر ہے کہ سو جاؤ۔ آرام سے آخر میں قطار میں لگ کر ٹکٹ لے لوں گی۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس قطار میں دو تین لڑکیاں ہی دکھائی دیں لیکن جس کھڑکی سے جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے تھے وہ مجھ سے بہت ہی فاصلے پر تھی۔ میں گھبراہٹ میں اٹھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھی۔ اسی دوران آخری لڑکی بھی فارغ ہو چکی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ فاصلہ قربت میں بدل جائے لیکن جونی میں اس کھڑکی کے قریب پہنچی وہ کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ میں یہ جان کر اتنی زور سے جیجی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میری آواز پر سب گھر والے پریشان تو ہوئے لیکن اس کو میرے ٹپل ہو جانے کے مدد سے کاسبب سمجھ کر اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔

میں نے سوچا جو لڑکی جنت کے ٹکٹ کے لیے بھی نہ جاگ سکے وہ دنیا میں کیا کر سکتی ہے۔

خواب کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ اب میں کبھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔

اسی دوران میری شادی ہو گئی لیکن میں کچھ اور ہی شان چکی تھی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سر پریمیں حیدر آباد میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔ میں نے بلا تکلف ان سے پڑھنے اور ڈاکٹر بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید ہی اجازت ملے لیکن وہ یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور میں نے کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی کا آغاز کر دیا۔ گھر میں ساری سہولتیں تھیں،

لو کر چا کر تھے اس لیے کام کاج کا کوئی بوجھ ہی نہ تھا..... اور.....



دل والا

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں۔ اسپتال میں ہر روز مریض آیا کرتے ہیں، ہر مریض کی ایک کہانی ہوتی ہے، ہر کہانی خود میں ایک جذبیت رکھتی ہے لیکن جو کہانی میں سنانے جارہی ہوں یہ رفاقت حیات کی کہانی ہے۔ بہت دلچسپ اور بہت انوکھی، امید ہے پسند آئے گی۔

ڈاکٹر عظمیٰ
(فیصل آباد)

بس ایک آدھ پکر وارڈز کا اور ایک آدھ پکر کوریڈور کا لگا لیا۔

وہ ایک معصوم آدمی تھا۔ اس کی باتیں بہت معصومانہ ہوا کرتیں وہ ابھی مکروفریب اور جھوٹ وغیرہ سے بہت دور

کھٹ..... کھٹ..... کھٹ۔
اسپتال کے وارڈ اور کوریڈور میں اس کی بیساکھی کی آواز گونجا کرتی۔ وہ اب تندرست ہو چکا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اب بیساکھی پر چلا کرتا اور وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں۔

تھاکم از کم بھی ہمیں محسوس ہوتا۔

ایک ایکسٹنٹ کے نتیجے میں اسے اسپتال لایا گیا تھا۔ اس وقت میں ہی ڈیوٹی پر تھی۔ جب مجھے بتایا گیا۔ ”میڈم ایک ایمر جنسی ہے۔ کئی جگہ سے فریجر ہو گیا ہے بے چارے کا، بے ہوش ہے۔“

میں اپنے کمرے سے نکل کر ایڈیٹی میں پہنچی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ کیس میرا نہیں ڈاکٹر باسل کا تھا لیکن چونکہ میں اسپتال کی انچارج تھی اس لیے سارے واقعات ابتدائی طور پر مجھے ہی دیکھنے پڑتے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔

شہر سے اندر ایک ٹریفکا مقام پر یہ اسپتال ایک این جی او چلا رہی تھی اور مجھے فخر ہے کہ یہ ملک کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا۔

ہر طرح کے آلات، ڈاکٹر سب کچھ تھے۔ یہ بہت بڑے احاطے میں تھا۔ احاطے کے ساتھ ایک طرف ڈاکٹر کی رہائش کے لیے کوارٹرز بھی بنادئے گئے تھے۔ کہنے کو تو یہ کوارٹرز تھے لیکن ان میں ہر قسم کی آسائش تھی۔

یہ اسپتال چونکہ شہر سے بہت دور تھا۔ اس لیے اسٹاف کو رہنے کی سہولت بھی فراہم کر دی گئی تھی۔ اسپتال کی اپنی شاندار فارمیسی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علاج سے لے کر دوائیں تک مفت ملتی تھیں۔ اس لیے یہ اسپتال مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔

ایک بہت بڑی این جی او اسے چلا رہی تھی۔ کروڑوں کا بجٹ تھا اس کا اور سارے اخراجات مختیر حضرات کے تعاون سے پورے ہوا کرتے۔

مجھے یہاں بہت اچھی آفر ہوئی تھی۔ اس لیے میں شہر چھوڑ کر یہاں آ گئی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کی سیکورٹی کے انتظامات بھی بہت اچھے ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوا کرتی۔

پندرہ دنوں میں ایک بار میں شہر اپنے گھر آتی تھی جس کا قاصدا اسپتال سے سو کو میٹر کے قریب تھا۔ میرے پاس اپنی گاڑی تھی اس لیے آنے جانے میں آسانی رہتی۔

میں تقریباً دوسرے یا تیسرے دن شام کے وقت قہیے کے بازاروں کی طرف چلی جایا کرتی۔ جہاں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔

اسپتال کے حوالے سے تقریباً ہر شخص مجھے اور اپنا کے پورے عملے کو جانتا تھا۔

ایک بار میں قہیے کے بازار میں آئی تو ایک لڑکا دکھائی دے گئی۔ ویسے تو وہاں دکانوں پر ادھر سرک پر عورتیں اور لڑکیاں دکھائی ہی دیتی تھیں لیکن میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ ذرا مختلف لڑکی تھی۔ قہیے اور گاؤں کا دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف۔

اس کے چلنے کا انداز اور اس کی ڈریسنگ یہ بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق شہر سے ہے، وہ خوب صورت اور اسٹارٹ بم تھی۔

میرا اس کے بارے میں اندازہ اس طرح درست لگا کہ مجھے دیکھ کر خود میرے پاس آگئی تھی۔ ”بیلو۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا اور یہ انداز شہر کی لڑکی کا ہو سکتا تھا۔

”بیلو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں نا؟“ اس نے پوچھا۔ ”تھیں کس نے بتایا؟“

”سب ہی بتا رہے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ویسے میرا نام شازیہ ہے۔ میں ایم بی اے کر رہی ہوں۔ اس لیے میرا یہاں رہنا نہیں ہوتا۔ شہر میں رہتی ہوں۔ اپنے اکل اور آئی کے ساتھ۔ کبھی بھی یہاں بھی آ جاتی ہوں۔“

”اور میں ڈاکٹر تھی ہوں۔“ میں نے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”لوگوں نے آپ کا نام بھی بتا دیا تھا۔“

”میں یہاں ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے آ جاتی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اس

بھانے میری آڈننگ بھی ہو جاتی ہے۔“

”ڈاکٹر اگر یہ شہر ہوتا تو میں آپ کو آفر کرتی کہ چلیں سامنے والے ریسٹوران میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن یہاں چونکہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو میرے

گھر چلنا ہو گا۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔“

”بہت بہت شکریہ شازیہ! لیکن اس وقت نہیں آ سکتی آؤں گی۔“ میں نے معذرت کر لی۔

”او کے کوئی بات نہیں لیکن میں آپ کو تنگ کر لے کے لیے آپ کے اسپتال آتی رہوں گی۔ اجازت تو ہے نا؟“

”کیوں نہیں۔ جب چاہو۔ میں چار بجے کے بعد فری ہو جاتی ہوں۔“

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک طرف چل دی۔ جب کہ میں اپنی گاڑی کی طرف آگئی۔ شازیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

☆.....☆

کھٹ کھٹ کی آواز گونجی اور میں اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا ورنہ جس وقت اسے اسپتال میں لایا گیا تھا اس کی حالت بہت خراب تھی۔

ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹی تھی۔ ڈاکٹر باسط نے بہت ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ اس کا علاج کیا تھا۔ کئی آپریشن کرنے پڑے تھے۔

اگر یہی سب کچھ شہر کے کسی اسپتال میں ہوتا تو لاکھوں خرچ ہو چکے ہوتے لیکن ہمارے اسپتال میں اس کا علاج بالکل مفت ہوا تھا۔

اس کا نام حیات تھا۔ حیات بخش۔ ایک انتہائی سیدھا سادہ معصوم سا انسان۔ اس کو دیکھنے کے لیے اسپتال میں اس کے گمر والے آتے رہتے تھے۔ اس کے ماں باپ اور اس کی دونوں بہنیں۔ وہ سب ہی اس کی طرح سیدھے سادے تھے۔

اس کا ایک ہیڈنٹ قصبے میں ہوا تھا۔ فوری طور پر اسے شہر کے کسی اسپتال میں لے جانے کی بجائے ہمارے ہی اسپتال میں لایا گیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے علاج بھی ہو گیا تھا۔

وہ کبھی کبھی مجھ سے گپ لڑانے کے لیے میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو معلوم ہے کہ میں بھی بہت پڑھا لکھا آدمی ہوں۔“

”اچھا بھائی وہ کیسے!“

”ڈاکٹر صاحبہ میرا علم ذرا الگ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کون سی مٹی کس فصل کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ کون سا پودا پردان چڑھے گا اور کون سا مر جھما جائے گا۔ کون سا بیج اچھا ہے اور کون سا خراب ہے۔ کیا آپ یہ بات جانتی ہیں؟“

”نہیں میں یہ سب نہیں جانتی۔“ میں نے اعتراف

کیا۔

”تو پھر میں اپنے میدان کا پڑھا لکھا ہوا نا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ اپنے میدان کی پڑھی لکھی ہیں۔“

میں چونک گئی۔ اس نے بہت ہی دانش مندانہ بات کی تھی۔ اس نے ایک بڑا فلسفہ ذرا سی دیر میں سمجھا دیا تھا اور سچائی بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی اپنی فیلڈ میں ماہر ہے وہ اپنی فیلڈ کا پڑھا لکھا انسان ہے۔

”واہ حیات بخش۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ ”یہ بتاؤ تم نے یہ بات کہاں سے سیکھی ہے۔“

”میں نے بھی دنیا دیکھ رکھی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔“ وہ فخر سے بولا۔

”اچھا۔“ میری دلچسپی بڑھ چکی تھی۔ ”کون کون سی دنیا دیکھی ہے۔“

”پورا گاؤں دیکھا ہوا ہے۔ ایک ایک گلی، یہی نہیں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں اور سارے قصبے میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چار پانچ بار شہر بھی ہوا ہوں۔“

مجھے اس کی سادگی پر بہت ترس آیا۔ بے چارہ اس کو پوری دنیا سمجھ رہا تھا۔

بہر حال اسپتال میں آنے کے کچھ..... دنوں کے بعد وہ میہاسی کے سہارے آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اب اس نے ایک دوسرا مشغلہ اپنایا تھا۔ وہ ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ کے چکر لگاتا رہتا اور مریضوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا۔

اگر کوئی بیمار بچہ ہے تو اس کے پاس پہنچ کر اسے اپنی سیدھی کہانیاں سنانے لگتا اگر کوئی عورت بوڑھی ہے تو اماں اماں کہہ کر اس کی دل جوئی کرتا رہتا۔ یہ سب اس کی عجیب خوبیاں تھیں۔

ایک بار اسپتال کی ایک نرس نے مجھے بتایا۔ ”میڈم! آپ نے کبھی حیات بخش کو سنا ہے؟“

”سننے سے کیا مراد ہے تمہاری؟“

”میڈم! اس کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ بہت دردمبری آواز ہے اس کی۔ کیا گلا پایا ہے اس نے۔ میں جج کہہ رہی ہوں اگر آپ بھی سن لیں نا تو وہاں دہا کرنے لگیں۔“

”تم نے کہاں سے سن لیا؟“

”کل رات ہی کو سنا ہے میڈم۔ کل میری ڈیوٹی

رات کی تھی۔ میں یوں ہی کوریڈور میں ٹہل رہی تھی کہ میں نے سنا کوئی ہیرا گرا رہا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں میڈم کہ اگر ہیرا کوئی اچھا گانے والا ہو تو کیا اثر ہوتا ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں میں۔“

”تو میں آواز کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیات بخش تھا میڈم، کوریڈور سے نیچے اتر کر جو درخت ہے اس کے پاس جو چبوترہ بنا ہوا ہے وہ اس چبوترے پر بیٹھا ہوا اپنی دھن میں گائے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ آپ بھی ایک بار اگر اس کو سن لیں تو آپ کو مزہ آجائے۔“

”ٹھیک ہے میں اس سے کہوں گی کہ وہ کسی دن مجھے بھی ہیرا بنائے۔“

دو دنوں کے بعد میں نے حیات بخش سے کہا۔ ”حیات بخش! میں نے سنا ہے کہ تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔“

”ارے نہیں میڈم! میں کیا اور میری آواز کیا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو بہلانے کے لیے کچھ گالیتا ہوں۔“

”اور یہ بھی سنا ہے کہ تم ہیرا بہت اچھا گاتے ہو۔“

”ہاں میڈم یہ بات تو ہے۔“ اس نے گردن ہلائی۔

”تو پھر سناؤ کسی دن۔“

”جو حکم میڈم۔“

اس نے ایک شام کوریڈور کے نیچے اس چبوترے پر بیٹھ کر ہمیں ہیرا سنا دیا۔ اس وقت میرے علاوہ اور بھی

نرسیں اور ڈاکٹرز تھے۔ حیات بخش کی آواز نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ اوہ خدا! کیا خوب صورت آواز تھی اس کی، وہ ہیرا کی گانگی اور اس کے بولوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔

وہ ایسی شخصیت تھا کہ دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسپتال چھوڑ کر جائے لیکن جانا تو تھا۔ ایک دن چلا ہی جاتا۔

اس دن میں اپنے کمرے میں کھڑی تھی کہ شاز یہ مجھ سے ملنے آگئی۔ یہ وہی شاز یہ تھی جو قصبے کے بازار میں ملی تھی۔

میں اس وقت تقریباً فارغ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ ”آؤ آؤ کافی دنوں کے بعد آئیں۔“

”بس میڈم۔“ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”کل میں شہر واپس جا رہی ہوں تو میں نے سوچا کہ آپ سے ملتی چلوں۔“

”بہت اچھا کیا، پھر کب آنا ہوگا؟“

”میں مہینے دو مہینے میں گاؤں آتی رہتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہاں میرے والدین ہیں ناں۔“

”اور کون کون ہے؟“

”دو بھائی اور ایک بہن۔“ اس نے بتایا۔ ”ان سبھوں نے تعلیم حاصل کر رکھی ہے لیکن میرے بچتی نہیں کیونکہ مجھے ہمیشہ سے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔“

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”زمیندار ہیں میڈم۔ سکندر علی نام ہے ان کا۔“

”اوہ۔“ میں چونک اٹھی۔ ”میں تو شاید ان کو جانتی ہوں اس اسپتال کی مدد کرنے والوں میں ان کا بھی نام ہے۔“

”جی ہاں یہ وہی سکندر علی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”خوشی ہوئی سن کر، اچھا یہ بتاؤ کہیں کوئی رشتہ وغیرہ۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”نہیں میڈم باقاعدہ تو کوئی رشتہ نہیں ہوا۔“

”تو چلو بے قاعدہ رشتہ بتا دو۔“

”ہے ایک دوست۔“ اس نے بتایا۔ ”شہر میں ہی رہتا ہے۔ ویسے میرے والدین سے ملنے دو تین بار یہاں بھی آچکا ہے۔ گھر والے لگی اسے پسند کرتے ہیں۔“

”چلو پھر تو اچھی بات ہے۔ تو کب تک اچھی نیوز مل رہی ہے؟“

”یہ میرا ایم بی اے کا آخری سال ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر بات آگے جائے گی۔“

اس دوران حیات بخش کمرے میں داخل ہوا، وہ چونکہ دو چار دنوں سے بیساکھی کے بغیر چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔

ویسے بھی وہ فی الحال بہت آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اٹھا کر چلتا تھا۔

وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر آ گیا۔ شاز یہ اسے نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ دروازہ اس کی کرسی کے پیچھے تھا۔

حیات بخش کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شاز یہ کی ایک جھلک دیکھی اور اگلے قدموں واپس چلا گیا۔

میں نے بھی اس وقت اسے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شاز یہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر خدا حافظ کہہ کر چلی

گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اگلے مہینے پھر آرہی ہے۔
اس شام حیات بخش میرے پاس آیا۔ وہ بہت اداس

سادکھائی دے رہا تھا۔ ”میڈم! اب مجھے اجازت دیں مجھے
یہاں سے جانا ہے۔ ویسے بھی آپ لوگوں کی مہربانی اور توجہ
سے تھوڑا تھوڑا چلنے لگا ہوں۔“
”ارے حیات بخش تم تو کہتے تھے کہ تمہیں یہاں
سے بہت دنوں تک نہیں جانا ہے۔“
”بس میڈم اب دل نہیں لگ رہا۔“
”کوئی شادی وادی کا پروگرام تو نہیں ہے؟“

”شادی!“ اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی
مسکراہٹ آگئی۔ ”ارے نہیں میڈم! ابھی ایسی کوئی بات
نہیں ہے اور ویسے بھی دل ٹوٹ چکا ہے۔“

”اوہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”حیات
بخش لگتا ہے کہ تم نے کہیں دکھ اٹھایا ہے۔“
”ہاں میڈم بہت بڑا دکھ۔“ اس نے ایک گہری
سانس لی۔ ”لیکن میں پھر بھی خوش اور مطمئن ہوں۔“

”نہیں تم خوش نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ
کہانی نہیں سناؤ گے؟“
”کیوں نہیں میڈم۔ آپ اتنی مہربان ہیں آپ کو تو
ضرور بتاؤں گا۔“

☆.....☆

”میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں میڈم۔“ اس نے
بولنا شروع کیا۔ ”ایک سیدھے ساوے کسان کا بیٹا۔ مٹی
سے محبت کرتا رہا۔ باپ کے ساتھ ل کر فصلوں کا مزاج سمجھتا
رہا۔ قصبے کا ہر آدمی میرا دوست تھا کیونکہ میں کسی سے لڑتا
بجھڑتا نہیں تھا۔ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ زندگی
اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک تبدیلی آگئی۔ اس تبدیلی نے
میرے اندر پہلے بچادی تھی میڈم۔“

”اوہ اتنی بڑی تبدیلی تھی۔“ میں نے کہا۔
”ہاں میڈم! ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار بہت زور کی
بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں۔
اتنے اچھے موسم میں اسے دیکھوں اور وہ دکھائی دے گئی۔
حالانکہ ایسی بارش میں کون کھرے کھلتا ہے۔ لیکن وہ نکل
آئی۔“

”وہ بھی بے قرار ہوگی۔“ میں نے کہا۔
”ہو سکتا ہے میڈم! لیکن میں تو بھی محل کر اس کے
سانے بھی نہیں آیا۔ بس اس کو دور سے دیکھا کرتا یا اس کے
سانے سے گزر جاتا۔ ویسے ایک بات تو ضرور ہوئی تھی
میڈم۔“

”وہ کیا؟“
”اس کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے آپ پر
دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے میں یوں ہی سے کپڑے
پہنا کرتا تھا پھر بازار سے دوست لے آیا چمکتے ہوئے۔ لٹ
لٹ کرتے ہوئے۔ میں جب اس کو دیکھنے کی امید میں بازار

میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں میڈم۔“ اس نے
بولنا شروع کیا۔ ”ایک سیدھے ساوے کسان کا بیٹا۔ مٹی
سے محبت کرتا رہا۔ باپ کے ساتھ ل کر فصلوں کا مزاج سمجھتا
رہا۔ قصبے کا ہر آدمی میرا دوست تھا کیونکہ میں کسی سے لڑتا
بجھڑتا نہیں تھا۔ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ زندگی
اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک تبدیلی آگئی۔ اس تبدیلی نے
میرے اندر پہلے بچادی تھی میڈم۔“

”اوہ اتنی بڑی تبدیلی تھی۔“ میں نے کہا۔
”ہاں میڈم! ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار بہت زور کی
بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں۔
اتنے اچھے موسم میں اسے دیکھوں اور وہ دکھائی دے گئی۔
حالانکہ ایسی بارش میں کون کھرے کھلتا ہے۔ لیکن وہ نکل
آئی۔“

”وہ بھی بے قرار ہوگی۔“ میں نے کہا۔
”ہو سکتا ہے میڈم! لیکن میں تو بھی محل کر اس کے
سانے بھی نہیں آیا۔ بس اس کو دور سے دیکھا کرتا یا اس کے
سانے سے گزر جاتا۔ ویسے ایک بات تو ضرور ہوئی تھی
میڈم۔“

”وہ کیا؟“
”اس کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے آپ پر
دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے میں یوں ہی سے کپڑے
پہنا کرتا تھا پھر بازار سے دوست لے آیا چمکتے ہوئے۔ لٹ
لٹ کرتے ہوئے۔ میں جب اس کو دیکھنے کی امید میں بازار

میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں میڈم۔“ اس نے
بولنا شروع کیا۔ ”ایک سیدھے ساوے کسان کا بیٹا۔ مٹی
سے محبت کرتا رہا۔ باپ کے ساتھ ل کر فصلوں کا مزاج سمجھتا
رہا۔ قصبے کا ہر آدمی میرا دوست تھا کیونکہ میں کسی سے لڑتا
بجھڑتا نہیں تھا۔ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ زندگی
اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک تبدیلی آگئی۔ اس تبدیلی نے
میرے اندر پہلے بچادی تھی میڈم۔“

”اوہ اتنی بڑی تبدیلی تھی۔“ میں نے کہا۔
”ہاں میڈم! ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار بہت زور کی
بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں۔
اتنے اچھے موسم میں اسے دیکھوں اور وہ دکھائی دے گئی۔
حالانکہ ایسی بارش میں کون کھرے کھلتا ہے۔ لیکن وہ نکل
آئی۔“

کی طرف جاتا تو وہی کپڑے پہن لیتا۔ میری اماں کہیں کہ تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہے ناں میڈم جب میں اماں کو اچھا لگ سکتا تھا تو اس کو کیوں نہیں لگتا۔

میں بے ساختہ مسکرا دی۔ کیسی سچی معصومیت تھی۔ ”حیات بخش! یہ بتاؤ تم نے کیا اس لڑکی سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا؟“

”نہیں میڈم! اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔“ حیات نے کہا۔ ”جب سوچ کر جاتا اور اسے دیکھ لیتا تو ہمت جواب دے جاتی لیکن ایک دن میں نے سوچ لیا کہ آج ہر حال میں اس سے بات کروں گا۔ کم از کم بات ہی کر لوں۔ دل کی بے چینی ذرا کم ہو جائے گی۔ اس دن میں نے وہی نیا جوڑا پہنا۔ بال سلیقے سے بنائے اور بازار پہنچ گیا اور اس دن وہ تبدیلی آگئی۔ جو پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔“

”تم نے اظہار کر دیا؟“

”نہیں میڈم! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بازار تو آئی لیکن اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ بہت خوب صورت سا نوجوان بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے چل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ایسے انداز اور ایسا رشتہ چھپتا تو نہیں ہے نا میڈم؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں یقیناً اس کا اظہار الگ سے ہو جاتا ہے۔“

”تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت خوش تھے اور محبت تو اس جذبے کا نام ہے میڈم کہ آدمی جس سے پیار کرتا ہے۔ وہ خوش رہے۔ اسے اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔“

وہ سیدھا سادہ آدمی کتنی بڑی حقیقت بیان کر گیا تھا۔ اچانک میں نے ایک گاڑی دیکھی جو شاید ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی ان دونوں کے پیچھے کی طرف سے آ رہی تھی اور اس نوجوان کو لپکنے والی تھی کہ میں نے اچانک اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس نوجوان کو زور سے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور خود گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا یہ وہی حادثہ ہے میڈم۔“

”اوہ خدا! یہ آدمی اپنی محبت کے لیے کتنی بڑی قربانی دے گیا تھا۔ ایسی مثال کہاں ملتی ہے۔“ ڈھونڈوا جڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی۔ یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں۔“

”بس میڈم! یہ ہے میری کہانی۔“ اس نے کہا۔ ”اچھی لیے میں ہیر گاٹا پھرتا ہوں۔“

”کیسا اس لڑکی کو معلوم ہے کہ تم نے یہ قربانی کس کے لیے دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میڈم! ایسی باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔ صرف برداشت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔“

”ویسے وہ لڑکی اب کہاں ہے؟“

”بیمیں ہے میڈم! آپ کو یاد ہے پرسوں میں آپ کے کمرے میں آیا تھا تو وہی لڑکی آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر واہیں چلا گیا تھا۔“

”اوہ گاڈ! تم شاز یہ کی بات کر رہے ہو؟ سکندر علی کی بیٹی۔“

”جی ہاں میڈم! میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن خدا کے لیے اسے کچھ مت بتائیے گا۔ میں نے آپ کو یہ کہانی سنا دی ہے۔ اس کو اپنے ہی تک رکھیے گا۔“

میں عقیدت بھری نگاہوں سے اس آدمی کو دیکھتی رہی۔ گاڈ کے ایک سیدھے سادے نوجوان نے اس دور میں محبت کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔

دوسرے دن حیات بخش اسپتال سے فارغ ہو کر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دو مہینوں کے بعد شاز یہ میرے پاس آئی۔ وہ اپنی شادی کا کارڈ لے کر آئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے حیات کے بارے میں بتا دوں کہ دیکھو اس دنیا میں ایک ایسا نوجوان بھی ہے جس نے تم سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور اس شخص کو مرنے سے بچا لیا ہے جو تمہارا شوہر بننے جا رہا ہے۔

لیکن میں خاموش رہ گئی۔ جب اپنی محبت کو خود حیات بخش نے چھپا کر رکھا ہوا تھا تو پھر میں کون ہوتی تھی اس کا راز فاش کرنے والی۔

میرا اب اس اسپتال سے ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ میں شہر آگئی ہوں۔ خدا جانے بے چارہ حیات بخش کس حال میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ قصبے کی فضاؤں میں اب تک اس کی آواز میں ہیر گونج رہی ہو۔

خدا کرے

محترم معراج رسول

السلام علیکم

یہ سچ بیانی میری نہیں میرے ایک دوست کی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں لیکن میرے دوست کے ساتھ الٹا ہوا۔ یہ دلچسپ واقعہ آپ کو بھی پسند آئے گا۔

نصیر اشرف

(کراچی)

دو لڑکیاں تھیں۔
دونوں جوان اور خوب صورت۔ دونوں بس
اسٹاپ سے ڈرامٹ کر رکشایا جیسی کے انتظار میں کھڑی
تھیں یا شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔
دونوں نے بہت اچھی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ میرا
ارادہ گزر جانے کا تھا لیکن دونوں نے ہاتھ دے کر میری
گاڑی کو روک لیا۔
انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ کچھ اس قسم کی فطرت



ہوتی ہے اس کی کلاس کے خیر میں شرکی ایک چنگاری جو رکھ دی گئی ہے وہ ہمیشہ بھڑکتی ہی رہتی ہے۔

فرصت کا لمحہ، تقریباً سناٹا اور دو جوان اور خوب صورت لڑکیاں جو شاید لفٹ لینا چاہتی تھیں اور کون کم بخت ہوگا جو لفٹ نہیں دیتا۔

شاید ان کا بھی یہی راستہ ہو۔ جس راستے پر میں جارہا تھا اس لیے میں نے ان کے پاس گاڑی روک دی۔ میرا اندازہ درست نکلا انہیں لفٹ ہی چاہیے تھی۔

ان میں سے ایک لڑکی تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ”سر ہمیں گرومنڈرنک جانا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم بہت دیر سے کھڑے ہیں رکشا یا ٹیکسی نہیں مل رہی۔ کیا آپ ہمیں لفٹ دے سکیں گے؟“ ”کیوں نہیں آئیں بیٹھ جائیں۔“

میرا خیال تھا کہ دونوں پیچھے ہی بیٹھ جائیں گی لیکن ان میں سے ایک میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دوسری والی سے زیادہ خوب صورت اور اسارٹ تھی۔

اس نے پرفوم بھی کوئی مہنگا لگا رکھا تھا۔ میری پوری گاڑی مسطر ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ دونوں مجھے کسی ایسے کمرانے کی دکھائی دے رہی تھیں پھر کوئی اور بات بھی لیکن ابھی تک تو کوئی اور بات سامنے نہیں آئی تھی۔

لیکن سبیل تک آتے آتے دوسری بات سامنے آ ہی گئی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی نے پیچھے مڑ کر دوسری لڑکی سے کہا۔ ”شہلا گرومنڈر اب بہت قریب ہے۔“

”ہاں ہمارا سفر اب ختم ہونے والا ہے۔“ دوسری نے کہا۔

”تو پھر وقت کیسے گزارا جائے۔“

”چلو ان ہی سے پوچھتے ہیں۔ یہ شریف اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری پرائیلم سمجھ جائیں گے۔“

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں لڑکیاں اب آہستہ آہستہ خود کو ظاہر کرنے لگی ہیں لیکن میں انعام بنا گاڑی چلاتا رہا۔ پھر میرے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھ سے کہا۔

”دیکھیں ہمارے ساتھ پرائیلم یہ ہے کہ ہمیں جن سے ملنے کے لیے جانا ہے ان سے ملنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”کچھ باتیں کر لی جائیں۔“

”اب وقت کہاں ہے؟“ ہانے کہا۔

”ان کو اپنا نمبر دے دو بعد میں یہ کال کر لیں گے۔“

عندلیب نے کہا تو ہانے اپنا اور عندلیب کا نمبر دے دیا۔ پھر سٹیل والی مسجد کے پاس اتر گئیں۔ ان دونوں کی بھی مصیبت نے مجھے گرویدہ کر لیا تھا۔ بعد میں انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

”گلفنگ ایک تو سارے مشورے، ساری نصیحتیں ایک طرف رہ جاتی ہیں۔“

ان کے موبائل نمبر زیرے پاس تھے لیکن میں انہیں خود سے فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے دوسری طرف سے کوئی فون اٹھالے۔ وہ کیا سوچے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے خیالات نے روک لیا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اچانک عندلیب کا فون آ گیا۔ اس کا فون سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ ”کیا حال ہے جناب۔“ اس نے شورش لہجے میں پوچھا۔

”یہ مت پوچھو میں تو اب اپنے خواب میں بھی گرومنڈر سے آگے نہیں جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”اور جب جاگ رہا ہوتا ہوں تو سارے راستے گرومنڈر کو چلے جاتے ہیں۔“

”ادھو۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”گرومنڈر تو آپ کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔“

”گرومنڈر نہیں گرومنڈر والیاں۔“ میں نے کہا۔ ”اور خاص کر ان میں سے ایک۔“

”اور ان میں سے ایک اتفاق سے اس وقت بھی گرومنڈر پر کھڑی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور بالکل اکیلی۔“

یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ میں اگر چاہوں تو اس سے جا کر مل سکتا ہوں۔ اس وقت میں فارغ ہی تھا۔ لہذا میں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ اس اسٹاپ پر تہا کھڑی تھی۔ جس اسٹاپ پر میں نے اس دن ڈراپ کیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ وہ پہلے کی طرح بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے برابر بیٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”گلتا ہے کہ اس دن کے بعد سے تم اب تک یہیں کھڑی ہو۔“ میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ایسا ہی سمجھ لیں۔ کسی نہ کسی کا انتظار تو رہتا ہی ہے۔“

”اوہو کس کا انتظار؟“

”میرا مطلب ہے کسی رکشے ٹیکسی کا۔“ وہ ہنس کر

بولی۔

”کیا تمہارے پاس فرصت ہے۔“ میں نے

پوچھا۔

”فرصت ہی تو ہے کہ آپ کو بلا لیا۔“ اس نے کہا۔

”تو چلو چل کر ہمیں لے کر رہتے ہیں۔“

”ٹیکسی اور پوچھ پوچھ۔“

ہم ایک ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس دن

وہ پہلے سے زیادہ دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ ادھر

ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”عندلیب تم رہتی کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے تمہارا

بیک گراؤنڈ وغیرہ۔“

”میرے والد کسی زمانے میں کالج میں پڑھایا

کرتے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ یعنی تم ایک استاد کی بیٹی ہو۔“

”ہاں لیکن ان کا استاد ہونا میرے کسی کام نہیں آ رہا

ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خیر رہنے دیں، کیا کریں گے میرے

بارے میں جان کر۔“

”بس یوں ہی ایک ساتھ مل بیٹھے والوں کو ایک

دوسرے کے بارے میں معلوم بھی ہونا چاہیے۔“

”چلیں جناب تو پھر آپ اپنے بارے میں کچھ

بتائیں۔“

”بہت سادہ سی زندگی ہے میری۔“ میں نے کہا۔

”والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے جو

ملک سے باہر رہتا ہے۔ ایک چھوٹی بیٹی ہے جس کی شادی

ہو چکی ہے۔ بس۔“

”اور آپ کی مہربانی؟“

”ایسی کوئی چیز اب تک میرے حصے میں نہیں آئی

ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم..... تمہارے ساتھ تو ایسا

اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔“

”نہیں جناب! ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی

ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ویسے تلاش جاری ہے۔“

”کوئی تلاش کر رہا ہے۔ تم خود؟ یا کوئی اور؟“

”ارے صاحب مجھ سے ایسی حلقو تلاش نہیں

ہوتی۔ والدہ یہ کارنامہ انجام دے رہی ہیں۔ ماؤں کو تو

اس کے علاوہ اور کچھ بھائی ہی نہیں دیتا۔ بس کسی طرح بیٹی

کو ٹھکانے لگا دو۔“

”ظاہر ہے یہ ان کا فرض ہے۔“ میں نے کہا۔

اس وقت دل میں آیا تھا کہ میں اس سے یہ کیوں نہ کہہ

دوں کہ اپنی والدہ کے سامنے مجھے لے جا کر کھڑا کر دے۔ ہو

سکتا تھا کہ میں ان کو پسند آ جاؤں۔

لیکن یہ دوسری ملاقات تھی اور ایسی باتیں اتنی جلدی

نہیں کی جاتیں۔ بہر حال ہم بہت دیر تک ادھر ادھر کی

باتیں کرتے رہے۔

پھر ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو ایک بھکارن

ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر

عندلیب سے بھیک مانگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں عندلیب کا موڈ ایک دم خراب ہو

گیا۔ ”کیا مصیبت ہے یہ لوگ پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔

لاکھ منگ کرتے رہو لیکن یہ نہیں سننے والے۔“

”ایسی بات کا تو ردنا ہے۔“ میں نے بھی اس کی

تائید کی۔ ”بھئی بھئی میں خود بھی جھلا جاتا ہوں۔“

”چلیں جان چھڑا کر تیزی سے نکل لیتے ہیں۔“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ورنہ یہ ایسی طرح پریشان کرنی

رہے گی۔“

اس کا اس طرح ہاتھ تھام لینا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

اس نے یہ حرکت پوری اپنائیت کے ساتھ کی تھی۔

گاڑی میں آکر ہم بیٹھ گئے۔ ”ہاں اب بتاؤ کہاں

ڈراپ کیا جائے۔“

”وہی گرومنڈر۔“ اس نے کہا۔

”خدا کی پناہ کیا ہے گرومنڈر میں۔“ میں نے

پوچھا۔

”جناب عالی! اب تک آپ کی سمجھ میں اتنا بھی

نہیں آیا کہ میں گرومنڈر کے آس پاس ہی رہتی ہوں۔“

اس نے بتایا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس

لی۔ ”اچھا یہ بتاؤ اب کب ملوگی۔“

”جب جی چاہے میرا نمبر ہے نا آپ کے پاس؟“

اس نے کہا۔ ”ممبریاں ہونے بلا تو جب جی چاہے“

اس کی اس قسم کی باتوں سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ

وہ واقعی کسی استاد ہی کی بیٹی ہوگی۔ بہت سہمی اور دلچسپ

ہاتیں کیا کرتی۔

بہت پہلے کالج کے زمانے میں ایک لڑکی میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بھی عندلیب ہی جیسی تھی۔ اس کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتیں۔ بہت گفتگو اور ذہانت سے بھری ہوئی باتیں۔

خدا جانے اب وہ کہاں ہوگی لیکن میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ مجھے عندلیب مل گئی تھی اور میں اس کو اپنے وجود اور اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا تھا۔

بہن توڑی سی ہمت دکھانے اور پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد تو منزل آسان ہی ہو جاتی۔ جب میں اپنے طور پر خود ہی یہ فیصلہ کر چکا کہ عندلیب کی ماں سے مل کر مجھے اپنے آپ کو عندلیب کے لیے پیش کرنا ہے تو ایک عجیب سی خوشی ہونے لگی۔

ایک اطمینان سا ہونے لگا کہ چلو اب میری بھگتی ہوئی کشتی کو کنارہ ملنے والا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم بھر لے۔

اس دن وہ بہت پریشان اور بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔
”وہ جو میری دوست ہے نا تھا۔“
”ہاں کیا ہوا اس کو؟“

”اس کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اسے آج دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ کس لیے یہ اس نے نہیں بتایا۔ مجھے سے مانگ رہی تھی میرے پاس کہاں ہیں جو میں اس کو دے سکوں۔ بس اس لیے پریشان ہو رہی ہوں۔“
”بس اتنی سی بات۔“

”یہ اتنی سی نہیں، میرے لیے تو بہت بڑی بات ہے۔“ اس نے کہا۔
”ارے کوئی بات نہیں۔ دس ہزار مجھ سے لے لو۔“
”کیا بات کرتے ہیں میں آپ سے کیوں لینے لگی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔“

”اوہو، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ میں آپ سے پیسے لینے لگوں۔“

”اس کا بھی مطلب ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔
”ہمیں اس طرح ایک دوسرے کے کام آنا ہے۔“
”بھلا میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔“

”تمہاری موجودگی مجھے جینے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تمہیں پا کر حوصلہ حاصل کیا ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔“

بہر حال وہ بڑی مشکلوں سے دس ہزار لینے پر راضی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دس ہزار روپے دے دیئے تھے جو اتفاق سے میری سیکری کی صورت میں میرے پاس موجود تھے۔

ہم پھر ملنے کا وعدہ کر کے الگ ہو گئے۔
اب یہ بات تو ہو چکی تھی کہ ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں اور اب صرف اس بات کی دیر ہے کہ مجھے اس کی ماں سے مل کر اپنی درخواست پیش کر دینی تھی۔
میں نے اپنے دوستوں کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بری طرح عشق کے جال میں پھنس چکے ہو۔“ ایک نے کہا۔

”ہاں یار! ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ۔“
”لیکن میری جان یہ محبت وغیرہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔“

”تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم کو اس کا تجربہ نہیں ہوا اور ہر ایک کو ہو بھی نہیں سکتا۔“
”کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا تم آسمان سے اترے ہو؟“

”میری جان۔ محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔“
”لیکن یہ بھی سن لو کہ اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو شادی کے بعد یہ محبت وغیرہ سب ہوا ہو جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ زندگی بھر کے لیے میرے قریب تو آجائے گی نا۔“
دوست خاموش ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ مجھے کیا سمجھا سکتے تھے۔

دو چار دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ ”مجھے مبارکباد نہیں دیں گے۔ آج میری برتھ ڈے ہے۔“
”ارے بہت بہت مبارک ہو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”اس میں بتانے والی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آج یاد آیا تو آپ کو بتا دیا۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقی مدد سے ہر ماہ حاصل کریں اپنی دلچسپی کے لیے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا قصبے کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ تمام ملک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں کہ ہر سال کے لیے ایک سال کے لیے ایک سال کے لیے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: دفتر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹاؤن، پشاور، پاکستان
فون: 021-35895313، 021-35802551

”پھر تو آج تمہارا ڈز میری طرف ڈیو ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ ”تم شام کو مل لیتا۔“

اس شام ہم بہت خوش تھے۔ ڈنر سے پہلے میں نے اسے شاپنگ بھی کرائی تھی۔

وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتی رہی تھی اور میں اس سے یہی کہتا رہا تھا کہ یہ سب تمہارا حق ہے۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والوں کے ساتھ تکلف نہیں کیا کرتے۔

شاپنگ کے بعد ہم ایک اچھے سے ہوٹل میں چلے گئے۔ اس شام میرے لیے زندگی بہت خوب صورت ہوئی تھی۔ عندیاب نے اس شام اپنی ڈریسنگ اور میک اپ پر بھی توجہ دی تھی۔ اس لیے وہ عام دنوں سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

اس شام میں نے اس سے کہہ ہی دیا۔ ”بس عندیاب اب مجھ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے اپنی امی سے ملو اور۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم دو چار دن رک جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے میں بات چیمزنی ہوں۔ اس کے بعد تم سے ملاقات کروا دوں گی۔“

”بس یہ کام اسی بٹے ہو جانا چاہیے۔“

لیکن اس بٹے کے ختم ہونے سے پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے سخت بدل اور مایوس کر دیا تھا۔ مجھے عندیاب کسی کے ساتھ دکھائی دے گئی تھی۔ کسی نوجوان کے ساتھ۔ دونوں شاپنگ کر کے واپس آ رہے تھے۔ دونوں کے پاس شاپر بڑے تھے۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر جلدی سے ایک آڑ میں ہو گیا تھا۔ دونوں میرے برابر سے گزرتے چلے گئے۔ اس وقت میرے دل کا عجیب حال ہو رہا تھا۔

اس قسم کے تجربوں کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی محبت میں رقابت وغیرہ کے مرحلوں سے گزر رہے ہوں کہ اس وقت دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔

میں گھر واپس آ کر جیسے کانٹوں کے بستر پر گر گیا تھا۔ ایسی کوفت ہو رہی تھی کہ جس کا اظہار مشکل ہے۔

اب دور استے تھے۔ یا تو میں خاموش رہ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لوں یا اس سے بات کر لوں۔ بھر میں نے

بات لرینا زیادہ مناسب سمجھا۔

صبح ہوتے ہی اسے فون کیا۔ اس نے بہت حیران ہو کر فون اٹینڈ کیا تھا۔ ”خیریت تو ہے۔ آج صبح کیسے یاد آگئی۔“

”تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن اس وقت تو میں یونیورسٹی جا رہی ہوں۔“

اس نے بتایا۔

”بعد میں چلی جانا۔ یا کل چلی جانا۔ آج مجھ سے مل لو۔“ میں نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے میں ایسا کرتی ہوں۔ ابھی یونیورسٹی جاتی ہوں۔ صرف ایک کلاس اٹینڈ کر کے واپس آ جاؤں گی۔ آپ مجھ سے مارکیٹ کے مین گیٹ پر مل لیں۔ ٹھیک بارہ بجے۔“

”ارے میں آ جاؤں گا۔“

میں شاید دس منٹ دیر سے مارکیٹ پہنچا تھا۔ عندلیب وہاں موجود تھی لیکن وہ اس بھکارن سے ابھی ہوئی تھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جو وہیل چیئر پر بیٹھی رہتی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ بھکارن اس کے پیچھے پڑ گئی ہوگی اور عندلیب اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ میں ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہ۔“ میں نے بھکارن کو ڈانٹا۔ ”کیا کہہ رہی ہو اس سے۔“ عندلیب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

”میں اس کو سمجھا رہی تھی کہ اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔“ بھکارن نے کہا۔ ”ادھر ادھر گھومتی نہ پھرے۔“

”تم کون ہوتی ہو اس کو سمجھانے والی۔“

”اس لیے کہ میں اس کی ماں ہوں۔“ بھکارن نے بتایا۔

”ماں!“ مجھے تو ایسا بھٹکا لگا کہ میں ہل کر رہ گیا۔

”تم عندلیب کی ماں ہو؟“

”ہاں ماں ہوں اس کی۔ اس کے لیے بھیک مانگتی ہوں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے۔ اپنے بچوں پر کھڑی ہو جائے۔ اس کی اپنی اچھی زندگی ہو لیکن یہ ہو گیا رہا ہے۔ اس نے تم جیسے بابوؤں سے دوستی شروع کر دی

ہے۔ اپنی ایک دوست کے بھکاوے میں آ کر اس نے اپنی سیدھی حرکتیں شروع کر دی ہیں۔ گاڑی والوں سے دوستی کرتی ہے۔ ان سے پیسے لیتی ہے اور بھتی ہے کہ اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب کو بے وقوف بنا سکتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس چکر میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بھیک مانگ مانگ کر اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے، اس کو اچھا برا سمجھاتی رہتی ہوں۔ وہ اگر ابھی بھی نہ مانے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

وہ بھکارن پول رہی تھی اور روئے جا رہی تھی اور میں اس کی طرف عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک بھکارن نہیں ایک ماں تھی اور ماں بھی ایسی جس کی مثال نہیں ہو سکتی۔

اس کے کرب کا صرف اندازہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے کس طرح لوگوں کے سامنے ہاتھوں کو پھیلا کر پیسے اکٹھے کیے ہوں گے اور اپنی اولاد کے لیے بہتر زندگی کے خواب دیکھے ہوں گے۔

وہ اپنی کرسی دھکیلتی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف عندلیب گئی تھی۔

اس کے بعد میں نے عندلیب سے ملاقات نہیں کی۔ اس لیے نہیں کی کہ وہ میرے دل سے اتر چکی تھی یا میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں اس سے مل کر اس کی شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں دیکھوں کہ اس کے چہرے پر شرمندگی کے کتنے رنگ ہیں۔

اس کے بعد میں نے اسے کئی بار دیکھا بھی۔ لیکن تنہا خاموشی سے سر جھکا کر آتے جاتے ہوئے۔ لیکن ابھی اسے آواز نہیں دی۔ ابھی اس کے سامنے منہ نہیں کیا۔ اسے فون نہیں کیا۔

خدا کرے..... ماں کے خوابوں کے مطابق اسے اچھی زندگی مل سکے اور جہاں تک اس کی ماں کا تعلق ہے تو وہ آج بھی علاقے میں دکھائی دیتی ہے۔

اور میں ہمیشہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ خدا کرے کہ عندلیب کو زندگی کی وہ خوشیاں مل جائیں جن کے لیے اس کی ماں محنت کر رہی ہے۔



زن زرزین

مکرمی مدیر

السلام علیکم

ایک ایسی سچ بیانی ارسال کر رہی ہوں جو آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ یہ زندگی کے کلیہ کو عیاں کر رہی ہے۔ دنیا میں ہر فساد کی جڑ زن، زر، زمین ہے۔ اسی کے گرد پوری سچ بیانی گھوم رہی ہے۔

ثمینہ طاہر بٹ

میر ہاشم ایک محنتی اور ایماندار نوجوان تھا۔ باپ اور بڑے بھائی روشن کے سوا دنیا میں کوئی اس کا نہ تھا۔ ماں کا سایہ تو بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا اور بہن کوئی بھی نہیں۔ سو یہ تین مردانہ زندگی ویسے ہی گزار رہے تھے، جیسے کہ چمڑے چھانٹوں کی گذر کر رہی ہے۔ روشن نے ابا جی کے مشورے سے حلوائیوں کا کام سیکھنا شروع کیا اور جلد ہی اس میں طاق ہو گیا۔ ہاشم بھی بھائی کے ساتھ ساتھ ہی تھا مگر دکان پر ہولڈر روشن بھائی کا ہی تھا۔ ہاشم نے کبھی اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا تھا، وہ تو بھائی

بٹی تھی رقیہ باجی، اور اس سے آپ کی شادی ہوگئی، اب میں
کس سے شادی کروں گا؟“

بچیس سالہ بھائی کے منہ سے پانچ سالہ بچے جیسے بات
سن کر میر روشن ہکا بکا رہ گیا۔ بھائی کی مصیبت پر پیار بھی آیا
اور اس کی سادی پر ہنسی بھی۔

”ارے بدھو۔ دنیا میں کیا صرف ایک ہی لڑکی تھی، کیا
اس دنیا میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے جو تم اتنے پریشان ہو
رہے ہو؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ہاشم جھینپ گیا۔

”نہیں بھائی، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مگر پھر بھی!“ وہ
شرماتے ہوئے بولا۔

”بلکہ۔ تم پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے لیے رقیہ سے
بھی اچھی دکن لائیں گے۔ جسے دیکھتے ہی تم دیوانے ہو جاؤ
گے۔ سمجھو۔“ میر روشن نے محبت سے کہا۔

☆.....☆

کہتے ہیں کہ مرد کی زندگی میں دولت اس کی بیوی کے
نصیب سے آتی ہے اور اولاد خود اس مرد کی قسمت سے۔ اگر
عورت کا ستارہ مرد کے ستارے سے مل جائے، تو پھر اس مرد کی
زندگی میں شامل ہونے والی یہ پہلا، ”ز“ یعنی زن دوسرے
دونوں ”ز“ یعنی زر و زرین کو خود بخود ہی سمجھ لاتی ہے۔ میر
ہاشم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ناہیدان کی زندگی میں کیا آئی،
زر اور زرین کو اپنے ساتھ سمجھ لائی۔ ہاشم تو پہلے ہی تختی اور
ایماندار جوان تھا۔ اب تو اس کی محنت کا نام ہی جدا تھا۔ قسمت
کی دیوی بھی ان پر مہربان تھی، سو مٹی کو ہاشم لگاتے تو وہ مونا بن
جاتی۔ بھائی کے مشورے پر اس نے دکان جہاں کھولی تھی وہ
خوب چلنے لگی تھی۔ ناہید بھی ہاشم کی طرح بہت تختی اور جفاکش
خاتون تھی۔ اس نے گھر کی ہر ذمہ داری سے ہاشم کو بے فکر کر دیا
تھا۔ ہاشم خوب محنت سے کماتا تو ناہید اسے کفایت شعاری اور
سیلئے مندی سے استعمال کرتی۔ وقت گزرتا گیا اور اس گزدرے
وقت میں کافی کچھ بدل گیا۔ اب وہ دونیں رہے تھے۔ ان کی
فیملی بڑھ رہی تھی۔ روشن بھائی اور رقیہ بھائی کی فیملی بھی بڑھ
چکی تھی۔ اباجی انہیں داغ مفارقت دے کر راہی ملک عدم ہو
چکے تھے۔

اس چار مرد لے کے گھر میں اب دو فیملیاں مقیم تھیں۔
دو دو زنانیاں، اور دونوں ہی اپنے آپ میں بہت کچھ تھیں۔
ان کی آپس میں ٹھن بھی جاتی، اور پھر خود بخود بن بھی جاتی۔
بچوں کا بھی یہی حالی تھا۔ روشن اور رقیہ کے چھ بچے ہو چکے
تھے۔ سب ہی پڑھتے تھے اور موقع ملنے ہی چچا کے بچوں سے

کے امداد کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ روشن بھی
ان کا بہت خیال رکھتا۔ یہ تینوں مرد بڑی پرسکون زندگی گزار
رہے تھے۔ اپنا کماتے، خود پکاتے اور جی بھر کے کھاتے۔ کل
کیا ہو گا کل کے لیے کچھ بچانا ہے یا نہیں، یہ ان تینوں نے کبھی
سوچا ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کو لگتا تھا کہ زندگی بھر یوں سکون سے
گزر جائے گی۔ مگر اباجی کا یہ طمان کچھ اور ہی تھا۔ سو، جیسے ہی
میر روشن کا کام چل لکلا انہوں نے اس کے پیروں میں زنجیر
ڈال دی۔

رقیہ ان کی بھتیجی تھی۔ زبان کی تیز مگر بہت پھرتیلی۔
اباجی کو اپنے آگن کا سونا بن کھلنے لگا تو رقیہ کو بہن بنالائے۔ مگر
میں ایک عورت کیا آئی، مگر کا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ ایک
مخصوص قسم کی دیرانی اور اداسی جو درود یار سے لپٹی رہتی تھی،
اس کی جگہ شوخ ہنسی کی جلتی رنگ نے لے لی۔ رقیہ بھائی کی
چوڑیاں نہیں تو گھر کے درود یار اس جھکار کے ساتھ مل کر
نئے نئے گاتے ہوئے محسوس ہوتے۔ میر روشن تو خوش تھا ہی، میر
ہاشم کی دلی مراد بھی پوری ہوگئی تھی۔ اب نہ تو اسے سب کے
کپڑے دھوئے پڑتے اور نہ ہی کھانا بنانا پڑتا۔ رقیہ بھائی
منہوں میں سب کر ڈالتی، ہاں، البتہ مزاج کی تیزی اور کچھ تپا
پر بان بھی تھا۔ اس لیے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ بول
جاتی۔ میر روشن تو اس کا طنز ایک کان سے سن کر دوسرے سے
نکال دیتے۔ کا عادی تھا، مگر میر ہاشم اکثر غصہ کر جاتا۔ ایسے میں
اباجی اسے پیار سے رام کر لیا کرتے۔ دن اسی طرح گزرتے
گئے اور میر روشن دو بچوں کا باب بن گیا۔

اب رقیہ بیوی سے ماں بن چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں
کے مستقبل کی فکر ہر چیز سے زیادہ تھی، اسی لیے اس نے میر
ہاشم کے کاموں سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ اباجی تو شروع
سے ہی اپنے کام خود کرنے کے عادی تھے، یہ میر ہاشم ہی تھا
جس نے بھائی کا سہارا پا کر خود کو ڈھیلے چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب
بھائی بیگم نے ان کی بھی ملتا میں میچ دیں۔ پہلے پہل تو وہ
بوکھلایا، پھر پشٹا کر بھائی سے گلے کر بیٹھا تو بھائی نے کہا:

”ہاشم! رقیہ اب تھک جاتی ہے۔ اس اکیلی سے
سارے گھر کا کام نہیں سنبھالا جاتا۔ میں اور اباجی سوچ
رہے ہیں کہ تمہاری بھی شادی کر دی جائے۔ تمہاری دہن
آجائے گی تو وہ خود ہی تمہارے سب کام کر دیا کرے گی۔
کیوں ٹھیک ہے ناں؟“ میر روشن نے پیار سے بھائی کی پیٹھ
تھپکتے ہوئے کہا تو وہ منہ کھولے انہیں دیکھنا ہی نہ رہ گیا۔

”میری شادی؟ لیکن کس سے؟ چاچا جی کی تو ایک ہی

لڑ بھی جاتے تھے۔ ہاشم اور ناہید بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ دو ہاتھ آگے ہی۔ رقیہ کے بچوں میں دو دو سال کا وقفہ تھا، مگر ناہید بیچاری ہر سال تخلیق کے عمل سے گزرتی تھی۔ اگر کوئی ٹوک دیتا تو ہاشم اور ناہید کے ساتھ ساتھ روشن اور رقیہ کو بھی آگ لگ جاتی۔

”لو بھلا۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔ ہمارے دس بچے ہوں یا دو۔ اللہ کی دین ہے؟ اللہ کا حکم ہے کہ رزق کی وجہ سے اولاد کو نسل مت کرو۔ اور اللہ تو ہمیں کھلا رزق دے رہا ہے۔ شکر ہے مالک کا۔ پھر ہم ناشکری کیوں کریں۔ وہ دے گا تو ہم خوشی خوشی لیں گے۔ کسی کو کوئی اعتراض ہے تو اپنے گھر بیٹھے، مت ملا کرے ہم سے۔“

”بیٹا کے ابا۔ اب ہمیں یہ جگہ بہت کم پڑنے لگی ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اور دو سکروں میں ہمارا گذارائیں ہو رہا۔ روشن بھائی اور رقیہ بھائی بھی دو سکروں میں بہت تنگی سے گذارا کر رہے ہیں۔ آپ اس بارے میں کچھ سوچتے کیوں نہیں۔“

احد سال بھر کا ہو چکا تھا۔ اس کے بڑے بھائی بینیس سب اسکول چلے جاتے تھے، بس وہ اور اس سے بڑے دو بھائی زید اور شاہد ہی گھر ہوتے تھے۔ جب تک بڑے بچے گھر سے باہر رہتے گھر میں سکون سا رہتا، مگر جیسے ہی سارے بچے اسکول سے واپس آتے، گھر میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا۔ ناہید لاکھ انہیں منع کرتی، ڈانٹتی مگر بچے تو پھر بچے ہی تھے، کہاں سنتے کسی کی۔ پھر رات کو سونے کا بھی بڑا مسئلہ ہوتا، ایک ایک چار پائی پر دو دو بچوں کو ڈالا جاتا، جگہ پھر بھی کم پڑ جاتی۔ ناہید اس صورت حال سے پریشان ہو گئی تو ہاشم سے الجھ پڑی۔

”تم بتاؤ، میں کیا سوچوں۔ میرا تو سارا دھیان کام میں ہی لگا رہتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے، مجھے نہیں پتا۔“ ہاشم نے پریشانی سے کہا تو ناہید بھڑک اٹھی۔

”اچھا۔ اب یہ بھی آپ کو میں ہی بتاؤں؟ آپ کوئی اور جگہ کیوں نہیں لے لیتے۔ دور نہیں جاسکتے تو اسی محلے میں کوئی اور بڑا گھر لے لیں۔ جہاں کم از کم پچھ آرام و سکون سے سو تو سکیں۔ یہاں تو ایک ایک چار پائی پر تین تین پڑے ہوتے ہیں۔ نڈھنک کی نیند نہ چیں اور نہ سکون۔“

”اچھا۔ میں بات کرتا ہوں بھائی سے۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔“ ہاشم نے کروٹ بدلتے ہوئے جیسے بات ختم کی اور اگلے ہی پل اس کے خزانے گونج رہے تھے۔

☆.....☆

میر ہاشم نے اسی محلے میں دس مرلہ کا پلاٹ خریدا اور کنسٹرکشن شروع کرادی۔ انہوں نے بھائی سے اپنا حصہ مانگا تو بھائی نے سر جھکا لیا کیون رقیہ سے خاموش نہ رہا گیا۔

”ہم تمہیں حصہ کہاں سے دیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو دوکان کھانے میں جاری ہے اور اس پر لڑکیوں کی پوری کھپ۔ اب اگر یہ گھر بیچ کر تم دونوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہو تو کسی کے پلے کیا پڑے گا؟ تم تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کر لو گے۔ تمہارا کام بھی اچھا چل رہا ہے اور ناہید نے کافی جوڑ جمع بھی کر رکھا ہے۔ مگر ہم تو سڑک پر آ جائیں گے۔“

”بس بھائی! اس سے زیادہ کچھ مت کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ اس گھر میں آرام سے رہیں۔ میں اپنا حصہ بھی اپنے بھائی پر وار دوں گا، مگر اپنی پھتھیلوں کو روتا نہیں دیکھ سکوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ مجھے بس دو ماہ کا وقت دے دیں۔ میں اپنے بچے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ہاشم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو ان کے ساتھ بیٹھا ان کا بڑا بیٹا حیرت سے باپ کو دیکھنے لگا۔

”ابو جی! ہم تیا جی۔، کر رہے ہیں کیا؟ ان سے اپنا حصہ نہیں لے سکتے، جو آپ نے انہیں دادا کا گھر پورے کا پورا دے دیا۔ امی تو کبھی نہیں باتیں گی۔“ وہ بولا۔ ہاشم کی رگوں میں بھائی کی محبت جوش بڑا کر دوڑ رہی تھی۔

”عالم بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا۔ بھائی بھائیوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ باز ہوتے ہیں۔ ان پر مان کیا جاتا ہے ان سے لڑائیں جاتا اور رسی بات تمہاری ماں کی، تو وہ عورت ہے۔ اسے پیار سے سمجھاؤں گا تو سمجھ جائے گی۔ عالم نے باپ کی باتوں کو غور سے سنا، سمجھا اور پھر دل میں ایسے اتار لیا کہ ایک ایک لفظ نقش ہو کر رہ گیا۔

”امی! ابو نے چوک کے پاس دکانی گلی میں پلاٹ خریدا لیا ہے۔ اس پر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اب ہم جلد ہی اپنے نئے گھر میں چلے جائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا ناں۔“ زید نے ناہید کے شانے سے لٹکتے ہوئے مزے سے کہا تو وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دی۔

”ہاں، اب تم لوگ خوب کھلے ڈلے ہو کر کھیلنا کرنا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔“ ناہید نے بیٹے کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا تو پاس بیٹھی بیٹا جملن کر رہ گئی۔ یہ سب بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ ہاشم کی بہت لاڈلی تھی۔ عالم اور بیٹا دونوں ہی ہاشم کو بہت پیارے تھے۔ عالم کا مزاج باپ جیسا تھا، مگر بیٹا الگ مزاج

پڑھ چلی تھی۔ اس لیے انہیں دلا سادیا اور پٹا کو بھی سمجھایا کہ اپنی تو انائیاں فضول باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے گھر کے کاموں میں دھیان لگائے۔

وہ لوگ اپنے نئے گھر میں شفت ہو گئے۔ میر روشن اور رقیہ بھی سکون سے آبائی گھر میں رہنے لگے۔ وقت کا یہی اپنی مخصوص رفتار سے چلا رہا۔ بچے جوان ہو گئے اور ہاشم و روشن بوڑھے روشن نے اپنی نین بیٹیوں کی شادیاں کر دیں۔ ہاشم اور ناہید نے شادیوں میں بھرپور تعاون کیا تھا۔ انہی دنوں پٹا کا رشتہ بھی اچھی جگہ سے آگیا، ہاشم اور عاصم نے اچھی طرح جھان بین کے بعد اس کو بھی رخصت کر دیا۔ پٹا کی شادی کو اچھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹی کا بھی رشتہ آگیا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا شریف اور نیک تھا، سوا اللہ کا نام لے کر اس کی نیا بھی پار لگا دی گئی۔ اسی طرح انہوں نے ایک ایک کر کے سارے بچے بیچ دیے۔ عاصم کی شادی ہاشم نے اپنے دوست کی بیٹی سے کر دی۔ زید کو تیا کی چھوٹی بیٹی ہما پسند تھی، ناہید خوشی خوشی اسے بہو بنا لائی۔

یوں تو ہاشم نے سب بیٹوں کو اگلا، اگلا دکان دلا دی تھے مگر شاہد کو عاصم اپنے ساتھ فیکٹری لگاے ہوئے تھا کیونکہ وہ غصے کا بے حد تیز اور بدتمیز کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار اور گالیوں میں تو جیسے اس نے P.H.D. کر رکھا تھا۔ ہاشم اور ناہید اسے سمجھا سمجھا کر عاجز آچکے تھے۔ ان کی ساری اولادوں میں یہ واحد بچہ تھا، جو سب سے زیادہ میزا ہوا تھا مگر خود کو سب سے زیادہ سمجھدار اور نیک سمجھتا تھا۔

”پٹا کی ماں، میں تو اس لڑکے کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ محلے میں ہر کسی کو اس سے شکایت ہے۔ بازار میں ہر کسی کی اس سے لڑائی ہے۔ میں جدھر سے گزرتا ہوں، اس کی شکایتیں ملتی ہیں۔ مجھے بتاؤ اس کا کوئی تو حل ہوگا۔ کیا کریں اس لڑکے کا۔“ ہاشم ابھی ابھی گھر آئے تھے، اور راستے میں کوئی دس لوگوں نے انہیں روک کر شاہد نامہ سنایا تھا۔

”ابو جی! اس کی شادی کر دیں۔ دیکھ لیجئے گا۔ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ پٹا حسب معمول میکے آئی ہوئی تھی، سو اپنا قیمتی شورہ لیے فوراً گفتگو میں چھلانگ لگا دی۔

”شادی کروں؟ مگر کس سے؟ اس بدتمیز آوارہ کو کون لڑکی دے گا اپنی؟ حد کرتی ہو تم بھی۔ ہر مسئلے کا حل شادی توڑی ہوتا ہے۔ شادی کر دیں اونہہ۔“ ناہید کو تو پٹا کا بیچ میں

رکھتی تھی۔ اسی لیے باپ کا فیصلہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”ای! ہم تو نئے گھر میں چلے جائیں گے، مگر یہاں کون رہے گا؟ ہمارے کمرے کس کے استعمال میں آئیں گے؟“

”کون رہے گا؟ تمہارے تایا تائی جان رہیں گی۔ ہمیں تو اللہ نے اپنا گھر دے دیا ہے۔ اس سے کہیں بڑا اور کشادہ۔ اب بھائی بھائی جانیں اور ان کا کام۔“ ناہید نے سلائی کشین کی سوئی میں دھکا کا ڈالنے سے زنی سے کہا تو پٹا کا منہ پھول گیا۔

”ای! یہ گھر دادا کا ہے۔ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے اور ہم اپنا حصہ ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اپنے کمروں کو تالا لگا کر جائیں گے۔ جب تک تایا جان ہمیں پیسے نہیں دیں گے، ہم انہیں کمرے نہیں دیں گے۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈالے ماں کو نیا سبق دے رہی تھی۔ ناہید نے حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور پھر اس کی بات پر غور کرنے لگی۔

”ہاں، پٹا کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ ہم کیوں اپنا حصہ چھوڑیں۔ آخر میرے سر کا گھر ہے۔ بھائی رقیہ کون سا جھجر میں لائی ہیں۔ جو انہیں پورے گھر کی مالک بنادیا جائے۔ ہوں، آئیں آج پٹا کے ابا بات کرتی ہوں ان سے۔“ لویہ کوئی بات ہوئی بھلا۔ مجھ سے زیادہ عقل مند تو میری بیٹی ہو گئی ہے۔ کیسے بچے کی بات بتائی اس نے۔“ ناہید کا ذہن اس ٹریک پر چل نکلا تھا۔ وہ سارا دن اسی اوجیز میں میں جانے کیا کیا آکٹیشن بناتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے یہ نہ سوچا کہ اگر رقیہ جارمر لے کی مالک بن رہی ہے تو اللہ نے اسے دس مرلے کی مالک بنادیا ہے، مگر پھر وہی، زر، زن زمین۔

”پٹا کی ماں۔ تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ تم ماں ہو، بجائے بیٹی کو سمجھانے کے، اس کی انہی بات پلے سے باندھ کر بیٹھ کر سناؤ۔ شکر ادا کرو اللہ کا کہ اس نے تمہیں اتنے بڑے گھر کی مالک بنادیا ہے۔ رقیہ بھائی کے پاس کیا ہے، چار مرلے زمین اور چار ہی کمرے، اور تم خود کو دیکھو۔ دس مرلے کا کھلا ڈالا گھر۔ ایک منزل تیار ہو گئی، اب چاہے اوپر دو منزلیں اور ڈلو لیتا۔ تمہارا ہاتھ روکنے والا کون ہے۔“ ناہید نے جیسے بی بی کی تجویز ہاشم کے سامنے رکھی، وہ الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں ناہید کے دل کو لگ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی، کل کی بیٹی کے غلط شورہ کی وجہ سے وہ برسوں پرانے رشتے کھوئے جا رہی تھی۔ ہاشم نے چہرے کی شرمندگی

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کتوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگو لیں۔

المسلم دارالحکمت (جرڈ)

(دھکی پٹی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک لیں

کو دنیا ہی کھلا تھا کہ اس پر اس کا مشورہ نہیں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں ای۔ ہر مسئلے کا حل شادی ہو یا نہ ہو، مگر شاید کے مسئلے کا حل صرف شادی ہی ہے، اور شادی بھی کسی ایسی لڑکی سے جو اسے قابو کر سکے۔“ بیٹا اپنی بات پر قائم تھی۔ ہاشم بھی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

”ارے لڑکی، ہوش کی دوا کر جائے۔ ہم سے تو قابو ہو نہیں رہا تو کس طرح بیوی کے قابو آ جائے گا۔“

”آئے گا امی، آئے گا۔ آپ ایک بار سوچیں تو۔ اور لڑکی کا کیا ہے، چچا کریم کی چھوٹی بیٹی نادیا یہ کیسی رہے گی؟“ آپ چچا سے بات کریں۔ وہ مان جائیں گے۔“ بیٹا نے پرانے محلے میں رہنے والے ہاشم کے عزیز دوست کا حوالہ دیا تو ناہید بھی سوچ میں پڑ گئی۔ کریم انتہائی شریف انفس انسان تھے۔ خود بھی پڑھے لکھے تھے اور بچوں کو بھی پڑھا رہے تھے۔ گھر کا ماحول لمبھا ہوا تھا۔ نادیا ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ان کے دل کو بیٹا کی بات لگی۔ انہوں نے ہاشم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ بس، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال جواب ہوئے اور اگلے چند روز میں یہ معرکہ بھی سر کر لیا گیا۔

شاید اور نادیا کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ شاید بالکل ویسی نہیں تھی، جیسی بیٹا نے اندازہ لگا یا تھا، وہ تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے تھی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جادو چلایا کہ شاید کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ وہ سارے گھر میں سب کے سامنے ناؤ، ناؤ، ناؤ کے نعرے لگاتا، اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا اور ناؤ بی بی اس اڑیل ٹوکو اپنی ابرو کے اشارے پر نیچا کرتی رہتی۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا مگر اب اس نے گھر کے معاملات کو قابو کرنا شروع کیا اور اس میں بیٹا نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ دو دو بڑی بہنوں کے ہوتے ہوئے ساس کی جگہ نادیا بی بی نے لی اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ اس کا طریقہ واردات بڑا انوکھا اور نرالا تھا۔ مکمل جو اینیٹ فمیلی سسٹم تھا۔ بڑی بھابی کے بیٹے بڑے تھے، اسکول جاتے تھے، اس لیے وہ زیادہ وقت کچن گنڈیں دے سکتی تھی مگر پھر بھی اپنی ذمہ داری پوری ایماندار سے نبھانے کی کوشش کرتی۔ ہاشم بھی اپنا کام پورا کرتی تھی مگر نادیا کا انداز جدا تھا۔ وہ صبح کے اوپر ساس کے کمرے میں آ جاتی۔ ساس امی نماز اور تلاوت کے بعد آرام کر رہی ہوتی۔ یہ ان کے پیروں میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے تھی۔ امی کی آنکھ لٹکتی تو ناؤ فوراً ان کے پیروں سے لگتی۔

ان کے لیے چائے بنالاتی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی اور باتوں
عی باتوں میں سارے راز اگلا لیتی۔ امی اس سے بہت خوش
تھیں۔ ہر آئے گئے کے سامنے اس کی خوب تشریفیں کرتیں۔
پہلے یہ تشریفیں بڑی بھائی کا عاشق کی ہوتی تھی کئی سال تک تو وہ
بنی ان کے ساتھ ہر دکھ سکھ کی سامی بنی شانے سے شانے ملائے
کھڑی تھی۔ ہمارا غریب کا کہیں نام و نشان ہی نہیں تھا۔ ایک تو
زید کی پسند تھی، دوسرے تابیازا یعنی کمر کی مرئی وال برابر اور
پھر اس پر وہ عجیب مست مولیٰ طبیعت کی مالک تھی۔ دل کرتا تو
سب کے درمیان آکر بیٹھ جاتی، دل نہ چاہتا تو اپنے کمرے
سے بھی باہر نہ نکلتی۔ نادیدہ اس کا بھی خوب فائدہ اٹھاتی۔ ہمارے
خلاف سب کے کان بھرنی رہتی۔ حتیٰ کہ سب ننہیں ہمارے
متعلق ہو گئیں۔ ناہید بھی ہمارا کہو بنا کر کچھ بتانے لگیں، مگر پھر بیٹے
کو خوش دیکھیں تو نظر انداز کر دیتیں۔

”تو آپ کو کس نے کہا ہے کہ آپ بھی ہماری نقل کریں۔ آپ مت جائیے گا۔ جیسے پہلے..... دن سب کو پیسے دیتے ہیں۔ دے دیجئے گا، مگر ہمیں کیوں روک رہی ہیں آپ۔ ہماری مرضی، ہم جو چاہے کریں۔ اور ویسے بھی ہم کچھ برائیاں کر رہے ہیں۔ اچھا ہی کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے گھر کی عزت بڑھے گی، گھٹنے کی نہیں۔ تمہیں آپ۔“ ہا کی بات کاغص سے مبرا جواب آیا تھا۔ ہا بھی کچھ کہنے کوئی، مگر ناہید نے اشارے سے اسے روک دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ لیکن اگر پہلے سے ہمیں بتا دیتے تو ہم کچھ اور پروگرام بنا لیتے۔“ ناہید نے ہوا کا بدلہ تاریخِ محسوس کرتے ہوئے انہیں اجازت دے دی تھی۔ ”ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ یہ دونوں بیٹھی ہیں ناں آپ کی لاڈلی بیٹیوں، بنا لیں ان کے ساتھ جو بھی پروگرام بنانا ہے۔ ہمارا ٹائم کیوں ویسٹ کر رہی ہیں۔ چلو ناو۔ ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ رہنے دو، خرچ بھی بڑھے گا اور برے بھی، ہم نہیں مگر تمہیں بھی پاجبوں کی محبت کا بخار چڑھا رہتا ہے۔ چلو اب۔ راستے سے ابھی ایک بھی لینے ہیں سب کے لیے۔“ شاید نے ایک سانس میں ماں کو دس باتیں سنائیں اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر ریڑھیاں اتر گیا۔

”ای! آپ پریشان مت ہوں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو ہم بھی کل اپنی طرف سے عید بجاوا دیں گے۔ کوئی بات نہیں سال بعد تو عید آتی ہے۔ نادیہ ٹھیک کہتی ہے۔ بیٹھیں کو کس سال میں میکے کا ہی تو مان ہوتا ہے۔“ عائشہ نے ساس کو پریشان دیکھا تو نرمی سے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دکھ رہی تھی۔“

”میں اس لیے پریشان نہیں ہوں بیٹا کہ شاید اور نادیدہ بہنوئی کی طرف اکٹیلے چلے گئے۔ بلکہ میں اس لیے پریشان ہو رہی ہوں کہ نہ کوئی اچھی بات نہیں۔ نہ ہمارے گھر میں دراڑ

لو گئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر نہ فیصلہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی کام۔
 ہاتھ نہیں ہوا بیٹا۔ اب تم دیکھنا، اس گھر میں غنی غنی باتیں
 ہوں گی۔ سنے سنے کام سر انجام دینے جائیں گے اور میرا گھر
 لوٹنا شروع ہو جائے گا۔“ ناہید بے حد پریشان تھیں۔ عاتشہ
 اور حاجی ان کی پریشانی سے پریشان ہوئی تھیں اور پھر وقت
 نے ثابت کر دیا کہ ناہید کی پریشانی بیجا نہ تھی۔ نادید نے شاہد کو
 مکمل طور پر اپنے قبضے میں گر رکھا تھا۔ اس نے جب سے
 بہنوں کو طبعاً عید کی اور مختلف مواقع پر گفتگو دینے کا سلسلہ
 شروع کیا تو بہنوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ اب
 ناہید اگر ان سے کوئی بات کرنا بھی چاہتیں تو وہ الٹا ماں کو
 سمجھانے بیٹھ جاتیں کہ نادید ہی آپ کی بیٹھ چوائیں ہے۔
 آہستہ آہستہ گھر میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جنم لینے
 لگیں۔ انہی دنوں شاہد نے عاتشہ کا ساتھ چھوڑ کے زید اور احد
 کو جو اس کی کرلیا۔ عاتشہ کی دکان کے برابر میں مزید دو دکانیں
 کھل گئی تھیں اس لیے خریدار کم ہو گئے تھے۔ سوشاہد نے اپنا
 حصہ وصول کیا اور احد اور زید کے ساتھ آ گیا۔ اب ایک غنی
 جنگ کا آغاز ہوا۔ یوں لگتے لگتے جیسے گھر کی لڑائی کا رد و بار تک جا
 پہنچی ہے۔ جب تک زید اور احد اکٹھے تھے، دونوں بڑے
 سکون سے کام کر رہے تھے، شاہد کے وہاں قدم بڑھتے ہی ایک
 فتنہ سا کھڑا ہو گیا۔ نادید نے اس دوران پورے گھر کو قابو کر لیا
 تھا۔ ناہید اور ہاشم پر تو جیسے کوئی جادو کر ڈالا تھا۔ اور اس جادو
 میں زیادہ کردار بیٹا کا ہی تھا۔ وہ ہر بات میں شاہد اور نادید کی
 حمایت کرتی۔ ماں کو جانے کیا کیا پٹیاں بڑھاتی کہ وہ کلی طور پر
 نادید کے گن گانے لگیں۔ ادھر کاروبار کا جھگڑا بڑھا تو یہ لڑائی
 گھر تک آ گئی۔ تب ناہید نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ کیا کہ
 بیٹیوں بیٹوں کو الگ کر دیں۔ احد تو ابھی کنوارا تھا اور اس نے
 لا محالہ ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ناہید اور ہاشم نے عاتشہ
 کو دکان سے بلوایا۔ اس کے سامنے سارا معاملہ رکھا گیا۔ وہ
 خود بھی روز روز کی اس دانتا کل کل سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس
 نے بھی ماں کے فیصلے پر سر جھکا دیا، مگر دل میں کہیں ارمان سا
 تھا کہ امی اسے ساتھ رکھیں۔ اس کی شادی کو بارہ سال بیت
 چکے تھے۔ اس کے بچے بھی بڑے تھے اور دادا دادی کے بغیر رہ
 بھی نہیں سکتے تھے، پھر عاتشہ سے آج تک ساس مندوں کی کوئی
 بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بہنوں نے
 بظاہر کوئی بات نہ کی ہو، مگر اب ان کے دل وہ نہیں رہے تھے،
 ان کے دلوں میں بغض بھرا جا چکا تھا، اور یہ کام نادید نے اتنی
 ہوشیاری سے کیا تھا کہ، خود کو بہت چالاک اور ہوشیار سمجھنے والی

اس کی کہیں بھی نہیں جان پاتی تھیں۔

”امی! آپ کس کو ساتھ رکھیں گی یہ بھی بتادیں۔ بیٹیوں
 بہنوں کو ایک ساتھ تو الگ نہیں کیا جاسکتا ناں، کسی ایک کو تو
 ساتھ رکھنا ہی پڑے گا آپ کو۔“ عاتشہ نے اپنے ڈوہڑے دل کی
 دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا تو ناہید بے اختیار
 شاہد کو دیکھنے لگیں۔

”میں نادید کو ساتھ رکھوں گی۔ تم اور زید اپنا چولہا چوکا
 علیحدہ کر لو۔“ ناہید نے بیٹا اور نادید کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا اور
 ایک ہی سانس میں اپنا فیصلہ سنایا۔

”بیٹا کی ماں! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں عاتشہ کو
 ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ اس کا حق پہلے بیٹا تھا۔ اور پھر اس کا
 مزاج بھی ایسا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اچھی طرح رہ سکتی ہے۔
 مگر تم نے نادید کے حق میں فیصلہ سنایا۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“

”پتا نہیں بیٹا کے ابا۔ مجھے خود نہیں پتا کہ میں نے کیا
 کہہ دیا۔ میں تو خود عاتشہ کے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی مگر
 جانے کیوں میرے من سے نادید کا نام نکل گیا۔“ وہ خود بھی
 پریشان تھیں۔ شاید جھجھکتا بھی رہی تھیں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا
 تھا۔

نادید کی بلاننگ میں یہ سب شامل نہیں تھا۔ وہ تو
 انگیر بڑوں کے مشہور معقولے ”ڈو اینڈ اینڈ رول“ پر پوری
 طرح عمل پیرا تھی، مگر یہاں تو اتنی آنتیں گلے ہی پڑ گئیں۔ وہ تو
 بھاپوں کو سب کی نگاہوں میں نچا دکھا کر خود اچھی بیٹنے کے چکر
 میں تھی، اور یہاں تو سارے گھر کا بوجھ ہی اس کے شانوں پر آ
 گیا۔ ماشاء اللہ بھرا پر اگر تھا اور تندوں کو ہر ہنسنے میسکے کا ہڑک اٹھا
 رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوئیں۔ ساری ہنسیں مل کر
 دھاوا بول دیتیں اور ایسے میں پہلے تو وہ بیٹیوں مل کر سب
 سنبھال لیتیں تھیں، مگر اب اسے ایسی کوئی سب کرنا تھا۔ اس
 نے پہلے تو چندوں جیسے تیسے ساری ذمہ داری سنبھالی، پھر ناہید
 کی برین واشنگ شروع کر دی۔ ہاشم کی برین واشنگ کا کام
 شاہد نے سنبھالا اور چند ہی ہفتوں کے بعد عاتشہ ایک بار پھر
 واپس ان کے ساتھ مل چکی تھی۔

☆.....☆

احد کی شادی طے ہو گئی۔ گھر کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا
 بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر کوئی پُر جوش ہو رہا تھا۔ نادید اور شاہد
 نے یہاں بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر سب کو حیران کر
 دیا۔ ایسے ایسے ٹھکان ایجاد کیے کہ بیٹا تک نے دانتوں تلے

انگلیاں دبا لیں۔ سنبل دلہن بن کر گھر آگئی۔ یہاں ایک بار پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ سنبل احمد کے لیے ایسا پارس ثابت ہوئی جس کے ساتھ کتنے ہی اجد سونا بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بڑا پس چھیلنا چلا گیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے کئی دکانیں کھول لیں۔ زید اور شاہد بھی اس کے ساتھ تھے مگر احدا کا شیئر سب سے زیادہ تھا۔ شادی کے بعد اس کے پرائفٹ میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر یہ سنبل کی قسمت تھی کہ احد استانی مون کے لیے سوئیزر لینڈ بھی لے گیا۔ یہ اعزاز گھر تو کیا خاندان میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ بظاہر سب خوش تھے، مگر کچھ دل ایسے بھی تھے جن میں حسد کی آگ بجڑ کر ابھی تھی۔ سوئیزر لینڈ سے واپسی کے بعد روٹین لائف شروع ہوئی اور پھر وہی روز کی جج جج۔ تینوں بھائی اپنی اپنی آمدن کے مطابق گذر بسر کر رہے تھے مگر شاہد کو اب زید کا ساتھ کھٹکنے لگا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بات کا ایٹو بنتا اور پھرتیوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک جھگڑے میں بات احدا اور زید کی رخ کلائی بڑے بڑے ہاتھ پائی تک پہنچی اور شاہد نے گلدان پھینک کر زید کا سر پھاڑ دیا۔ زید کا پچاس سر دیکھ کر ہاشم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عاصم کو خبر ملی وہ بھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگا چلا آیا۔ اور بھائی کو خوں خون دیکھ کر رو دیا۔

”شاہد! یہ کیا کیا تم نے۔ بھائی تو بھائیوں کا بازو ہوتے ہیں۔ مان ہوتے ہیں۔ اور تم نے اپنے بھائی کا خون بہا دیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہد۔“ عاصم کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

”میں نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ یہ خبیث اسی قابل تھا۔ بیوی کی زبان بولتا ہے۔ جب دیکھو اُن کی بات ہی کرتا ہے۔ اُن کی کھوپڑی کا انسان۔“ شاہد اپنی غلطی ماننے کی بجائے التا شیر کی طرح دھاڑتا پھر رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہما سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی میدان میں کود پڑی۔ شاہد کو جانے اس سے کیا پیر تھا، اس کی بات پوری سنی بھی نہیں اور اس پر چڑھ دوڑا۔ اگر جو ہاشم اور احد بیچ بچاؤ نہ کراتے تو شاید زید کی طرح ہما بھی پچاس سر لے کر کونے میں پڑی ہوتی۔

”تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ اس طرح لڑ بھڑ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے میرے سامنے بیٹھو، اور مکمل کر دل کی بات بتاؤ مجھے تاکہ اس روز روز کے لڑائی جھگڑے کا کوئی مستقل حل نکالا جاسکے۔“ ہاشم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سے کیا پوچھتے ہیں آپ! یہ سب کیا دھرا تو آپ کا

ہی ہے۔ نہ آپ تایا، تائی پر اتنی مہربانی کرتے، نہ انہیں اپنا آبائی حصہ دان کرتے تو نہ ہی آج ان کی لاڈلی زید کی آگاہ تارا بن کر ہم پر حکومت کرنے کی جرات کرتی۔ یہ سب آپ کی غلطی ہے۔ آپ قصور وار ہیں اس سب کے۔“ شاہد کسی ہم کی طرح چپٹا تھا۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ لڑائی تم تینوں کی ہے۔ اس میں تایا، تائی کہاں سے آگئے؟ اور یہ خناس تمہارے دماغ میں بھرا کس نے ہے کہ.....!“

”بچہ نہیں ہوں میں۔ سب جانتا ہوں، سمجھتا ہوں اچھی طرح سے۔ تایا، تائی کی نظریں آبائی گھر کے بعد اب ہمارے اس گھر پر ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹی کو زید کے پیچھے لگایا۔ اس ہمارے چیل نے جان بوجھ کر زید کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا اور اس سے شادی کی تاکہ ہمارے گھر، ہماری پر اپنی میں حصہ دار بن سکے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ایک شکا بھی اب تایا، تائی کو نہیں ملے گا یہاں سے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو ایسا کر کے دکھائے، پھر وہ ہوگا اور اس کا برا انجام۔ سب میں کان کھول کر سب۔ میں اب کسی کو بخشنے والا نہیں۔“ ناہید سے جھٹھ، جھپٹائی کی اسلٹ برداشت نہیں ہوئی تو وہ شاہد کو مال کے حق سے ڈانٹنے لگیں، مگر بھول گئیں کہ

وہ اب صرف ان کا بیٹا نہیں رہا تھا۔ وہ النان کی بات پر بدی طرح سے ہاتھ نچا نچا کر چلانے لگا تھا۔ اس کی باتوں سے عناد اور بغاوت کی ایسی بو آ رہی تھی کہ سب کے سانس رکنے لگے۔ ہما سے برداشت نہ ہوا تو وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو ناہید اور ہاشم کے دل پر گر رہے تھے، زید کو پہلے ہی خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے نڈھال پڑا تھا، ورنہ ایک محرکہ اور ہو جاتا تھا۔

”شاہد! ہوش کے ناخن لو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کون تمہیں اتنی غلط افکار میں دیتا رہتا ہے؟ تمہیں کیا پتا کہ ابونے تایا تائی کو کیا دیا اور کیا نہیں؟ تم تو اس وقت بہت چھوٹے تھے اور اتنے چھوٹے بچے کو کچھ یاد نہیں رہتا جب تک کہ اسے ہار بار یاد دہانی نہ کروائی جائے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، ہمارے گھر میں تو ایسی بات بھی کسی نے ہی نہیں۔ نہ امی نے نہ ابو نے تو پھر تمہیں یہ سب کون بتاتا ہے؟“ عاصم ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا ہوا بولا۔

”اور کون بتائے گا بھائی جان۔ یہ سب چنا بانی کے کارنامے ہیں۔ وہ آج تک نہ خود بھولی ہیں، اور نہ ہی ہمیں بھولنے دیتی ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے باقی باجیوں کے ساتھ کر لیا تائی کا خوب مذاق اڑاتی ہیں۔“ احد نے جھکے

کی ہر طرح سے مدد کی ہے، اس کا حساب بھی پورا پورا وصول کروں گا۔“

”تو اور کیا؟ پیسے کیا درختوں پر لگتے ہیں تایا جان جو بغیر سوچے سمجھے ہر کسی پر وار دیں۔ آپ تو ہیں سیدھے بندے، آپ کو کیا پتا دنیا کی چال اکیوں کا۔“ شاہد کی بڑھکیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ نادیاہ اس کی مورل اسپورٹ کے لیے بول اٹھی۔

”تم سچ میں مت بولو۔ یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ بھابھیاں اس سے دور ہی رہیں تو۔۔۔۔۔!“

”نادیہ بولے گی۔ ضرور بولے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کون روکتا ہے۔ یہ اس گھر کا حصہ ہے۔ بیوی سے میری اور اسے پورا حق حاصل ہے بولنے کا۔“ عاصم نے نادیاہ کو لڑائی جھگڑے سے دور رکھنے کے لیے روکنا چاہا تھا، مگر شاہد کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بڑے بھائی کا ادب لحاظ بھول کر اسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگ غصے سے پھڑک رہی تھی۔

”شاہد! امت بھولو، نادیاہ اس گھر کی بہو ہے تو عائشہ، ہما اور سنبل بھی اسی گھر کی بہو نہیں ہیں۔ اگر وہ بھائیوں کے کسی معاملے میں نہیں بولتیں تو نادیاہ کو بھی خاموش رہنا چاہیے۔ خاموشی ہی ان کے لیے بہتر ہے۔“ عاصم نے سرد انداز سے شاہد کو دیکھتے ہوئے کہا تو سب کی نگاہیں ایک ساتھ نادیاہ اور شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ نادیاہ نے جو سب کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے پایا تو منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر شاہد کے حواس معطل ہو گئے۔

”بھائی جان! میں برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری بیوی کی طرف میزمری آنکھ سے دیکھے۔ میں نادیاہ کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اور وہ بھی آپ میں سے کسی کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ جان سے مار دوں گا سب کو۔“ وہ پورے کمرے میں اشتعال کے عالم میں اچھلتا پھرتا ہوا تھا، نادیاہ کے رونے کی آواز اس کے اشتعال کو بڑھادی تھی اور سب دم سادھے بیٹھے یہ نیا تماشا دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆

شاہد اور احد باپ کی پراپرٹی میں سے اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے۔ ان کی اس لڑائی میں بنیانے بانی بہنوں کے ساتھ مل کر خوب فائدہ اٹھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاشم کے بچے دو پارٹیوں میں تبدیل ہو گئے۔ بچے تو پارٹی بازی کا شکار ہوئے ہی تھے، والدین کو بھی زبردستی اس میں ملوث کر لیا گیا اور اس

میں بھی مینا کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ ہاشم اپنے بیٹوں سے عشق کرتے تھے۔ انہوں نے آدھی عمر اکیلے، اور تنہا گذاری تھی۔ شادی کے بعد اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت دی تھی اور دل کھول کر دی تھی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں جھکتے تھے۔ مگر اب یہ نعمت ان کے لیے زحمت بنی جا رہی تھی۔ شاہد اور نادیہ کی لڑائی میں سارا گھر برباد ہو گیا۔ بہنوں نے بھائیوں کو ملانے کی بجائے انہیں لڑانے کا کام کیا۔ اس جلتی آگ پر تیل اس ہوشیاری سے ڈالا کہ کسی کو علم بھی نہ ہوا اور گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ مینا نے سب سے زیادہ ہوشیاری دکھائی۔ اس نے دونوں پارٹیوں کا ساتھ دیا۔ بی بی جلال کی طرح گھر گھر پھرتی اور سب کے دل میں بغض کے بیج بو دیتی اور پھر ان بیجوں کو پانی دینے کا کام شاہد اور نادیاہ پر انجام دیتے۔

شاہد اور احد کو اس گھر سے گئے چار سال ہو چکے تھے۔ ناہید اس گھر میں تھی مگر اب ان کی حیثیت کسی عضو معطل سے کم نہ تھی۔ ہاشم تو بیٹوں اور بیٹیوں کی پائرشن برداشت ہی نہیں کر سکے تھے اور ان کو لوگوں کے گھر چھوڑنے اور پراپرٹی سے حصہ مانگنے کا فیصلہ سنتے ہی ہمت ہار بیٹھے تھے۔ انہیں ہارٹ ایک ہوا، اور پہلا ایک ہی ایسا خاتم ثابت ہوا کہ ان کی جان لے کر ہی ملا۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تو سب غم میں ڈوبے رہے، مگر پھر آہستہ آہستہ اپنے اپنے مفاد کی خاطر سر اٹھانے لگے۔ اب ایک اکیلی ماں کا جو سب کو بھاریا لگنے لگا اور شاید وہ اس کو بچہ سے چھٹکارا پانے کو کچھ بھی کر جاتے اگر ہاشم نے اپنی پراپرٹی کا کافی بڑا حصہ ناہید کے نام نہ کر دیا ہوتا۔ بازار میں دکانیں تھیں، مکان تھے جو کرائے پر چڑھے تھے۔ ناہید کو براہ ایک اچھی خاصی رقم کرائے کی مدد میں مل جاتی جس سے

شہادہ اکتوبر 2017ء کی منتخب جج بنائیں

ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: ٹھکرانی ہوئی لڑکی..... سیرا (فیصل آباد)

☆ دوم: گلہ..... وسیم بن اشرف (ملتان)

☆ سوم: فرشتہ انکل..... شریل (ملتان)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جی منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

وہ اپنا گذار تو کر ہی لیتی تھی، بیٹوں کے کئی مسائل بھی اسی رقم سے حل ہوتے تھے۔ مگر میں، ایک بار پھر لڑائی جھگڑے سر اٹھانے لگے۔ ماہد کی برداشت اب ختم ہو چکی تھی۔ ہمارے عاتشہ خاموش تماشا شائی تھیں، جبکہ نادیا نے ہمدردی کا جال پھینک کر سنبھل اور احاد کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ احاد اسے ماں کی جگہ دیتا تو سنبھل ساس کی۔ عاصم بیوی بچوں کو لے کر پہلے ہی الگ ہو چکا تھا، اور اسے ہاشم نے اپنی زندگی میں ہی قریبی مگر میں خود شغف کروایا تھا۔ اب شاید احاد نے بھی اپنے حصے وصول کیے اور ایک دم منزلہ گھر کرانے پر لے کر وہاں سے دور چلے گئے۔

”احد! مجھے کچھ پیسے چاہیں۔ بچوں کے کپڑے بنانے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے اور ان کے سارے کپڑے چھوٹے ہو گئے ہیں۔“ سنبھل نے احد کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”ہاں تو، تم نادیا بھائی سے مانگ لو۔ وہ دے دیں گی تمہیں۔“ احد نے بے پروائی سے ٹرے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تو سنبھل اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”نادیا بھائی سے کیوں مانگوں؟ میرے شوہر آپ ہیں، نادیا بھائی نہیں۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوگی میں آپ سے ہی کہوں گی ناں۔“

”تم پاگل عورت۔ تمہیں ایک بات سمجھ نہیں آتی کیا؟“ نادیا بھائی اس کھر کی بڑی ہیں۔ میری ماں کی جگہ ہیں۔ اور میں سارے پیسے انہیں ہی تو دیتا ہوں۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس جھوٹی انا کے چکر میں مت پڑو اور چھوٹی ہو تو چھوٹی بن کر رہو۔ وہ بڑی ہیں، ان کی عزت کیا کرو۔ وہ جیسا کہتیں ہیں، بس ویسے ہی کیا کرو، سمجھیں۔“

”احد! وہ آپ کی ماں جیسی ہو سکتی ہیں، ماں نہیں۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس طرح اپنی ضرورتوں کے لیے تو بھی میں نے اپنی ساس کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا، جس طرح آپ مجھے جھٹانی کے سامنے لیٹ ڈاؤن کرواتے ہیں۔“

سنبھل پہلے تو خاموشی سے اس کی تقریبی رتی رہی پھر نہ رہ سکی تو یوں پڑی گی اور اسے یہ بولنا بہت ہنگام پڑا تھا۔ احد پر چلے کون سا جنون سوار ہوا کہ اس نے سنبھل پر ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ ان دونوں کے مابین پہلی لڑائی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھار آپس میں الجھ جایا کرتے تھے مگر نوبت کبھی مار پیٹ تک نہیں آئی تھی۔ باتوں کے گولے دونوں طرف سے دانے جاتے اور پھر سنبھل خود ہی خاموش ہو جاتی۔ احد بولنا بولنا باہر

نکل جایا کرتا اور بات آتی مٹی ہو جاتی۔

”احد! سنبھل کی زبان کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہوتی جارہی۔ وہ تو تمہاری کوئی عزت نہیں کرتی، تو ہماری کیا کرے گی؟ اسے کچھ سمجھاؤ۔ بار۔ مگر اس طرح نہیں چلا کرے۔“

شاید دکان میں بیٹھاس کی برین واشنگ کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ اس نے کچھ کہا ہے؟“

احد کے کان کھڑے ہو گئے۔ ابھی کل والی لڑائی کا غصہ اس کے دل سے گیا نہیں تھا کہ اب بھائی کو کتنی نئی داستان سنانے بیٹھ گیا تھا۔

”نہیں، مجھ سے تو کچھ نہیں کہا اس نے۔ مگر ناؤ کے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک نہیں۔ بہت کچھ کچھ رہنے لگی ہے۔ بچوں کو بھی اور پر نہیں آنے دیتی اور اگر ناؤ کوئی بات اس کے بھلے کوئی کہہ دے تو اٹا لڑنے بیٹھ جاتی ہے۔ طعنے دینے لگتی ہے کہ میرے میاں کی کمائی کھا رہے ہو اور مجھے ہی آنکھیں دکھاتے ہو۔“ شاید تاک تاک کر وار کر رہا تھا، احد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”دیکھو یار۔ تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ سب ”شرکیوں“ کی نظریں تمہاری دولت پر کڑی ہیں۔ چاہے وہ ہمیں ہوں یا بھائی۔ میں تمہاری حفاظت کے خیال سے تمہارے ساتھ گھربار بہن بھائی چھوڑ کر چلا آیا، ورنہ میری اپنی تو ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ اب ہم نے تمہارے لیے اتنی بڑی قربانی دی اور بدلے میں تمہاری بیوی کے طعنے سنیں، یہ تو ٹھیک بات نہیں ہے یار۔ تم خود سوچو۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا، اور وہ ساری باتیں جو اسے ناؤ نے رات کو ٹوٹوٹے کی طرح یاد کروائی تھیں، سب کی سب بھائی کے سامنے کر دیں۔

احد اس وقت تو کچھ نہیں بولا۔ اس کا تو سر ہی شرم سے جھک گیا تھا کہ اس کی کم گو اور خوش اخلاق بیوی اس کی پیٹھ پیچھے یہ سب بھی کر سکتی ہے؟ اسے یقین تو نہیں آ رہا تھا، مگر بھائی کے آنسو بھی سجے لگ رہے تھے۔ اور پھر احاد سنبھل کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا سکون تہہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ احد کو نادیا سے منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی، بس اس کے سامنے رونے والی صورت بنا کر شکایتی انداز سے سنبھل کو دیکھتے ہوئے گذر جاتی اور احد کا پارہ سوا نیزے پر پر جا پھینچتا۔ ادھر دکان میں شاید اس کی خوب برین واشنگ کرتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا البٹو بنا کر سنبھل سے لڑنے لگتا۔ وہ پہلے تو خاموشی سے سختی رہتی، جب برداشت ختم ہو جاتی تو جواب دے دیتی تھی اور

تھے۔ وہ ماں سے ملنے بھی جاتا اور نادو ہمیشہ اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ جہاں بھی جاتے، سنبل اور احد کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتے کہ دشمن خوش ہو جاتے اور دوستوں کے دل غم سے بھاری ہو جاتے۔ شاہد نے یہی بات عاصم اور عائشہ کے سامنے کی تو عائشہ سے رہنا نہ گیا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شاہد؟ احد بھائی ہے تمہارا اور سنبل بھائی۔ تم ان کا گھر توڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔ بجائے اس کے کہ انہیں سمجھاؤ، انہیں اور لڑا رہے ہو؟ اور چلو، فرض کیا، اگر احد سنبل کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس رہیں گے؟ ماں کے پاس یا باپ کے پاس؟ یہ بھی سوچا ہے تم نے نہیں؟“

”چھوڑیں بھائی۔ آپ کس زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ بچے تو خود ماں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ پاگل عورت تو اب بچوں کے بھی کسی کام کی نہیں، شوہر کے کیا کام آئے گی۔ اور یہی بات کہ بچے کس کے پاس رہیں گے تو ظاہر ہے، ابھی جس کے پاس رہتے ہیں، بعد میں بھی اسی کے پاس رہیں گے۔ وہ ماں سے زیادہ تانی سے اکتچ ہیں۔ رہ لیں گے ہمارے ساتھ۔۔۔ کیوں نادو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“

شاہد کا اطمینان دیدی تھا تو نادو کا سر بھی فخر سے بلند تھا۔ آخر کو دیور کی جایداد کی اکیلی مالکن بننے کا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ سنبل نفسیاتی مریشہ کے طور پر خاندان بھر میں بدنام ہو چکی تھی اور نادو کی فہم و فراست کا علم پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ عاصم اور عائشہ ان کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو چکے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر ایک دن کھانے پر احد اور بچوں سمیت مدعو کیا۔ سوئے اتفاق نادبہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی، ورنہ احد کی کہاں مجال تھی کہ بیوی بچوں کے ساتھ اکیلا ہی بھائی کے گھر چلا جاتا۔ کھانے کے بعد بچے اپنے کھیل میں لگ گئے تو عاصم نے ان دونوں کو سمجھایا۔ احد کو اس کی غلطیوں کا احساس دلایا، اور دے الفاظ میں شاہد اور نادو کی سوچ سے بھی روشناس کروایا۔ سنبل اس دوران خاموش بیٹھی سب کو دیکھتی رہی۔ عاصم نے جب اس سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے ایسا جواب دیا کہ احد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ ایک تک سنبل کو دیکھتا چلا گیا۔ اتنا مقبول اور ناپا حلا جواب کوئی پاگل نہیں ہو سکتا تھا، تو کیا اس کی بیوی کے بارے میں جو باتیں خاندان میں مشہور ہو چکی تھیں، وہ سب کی سازش کا نتیجہ تھیں؟

”احد! ابھی بھی وقت ہے میرے بھائی۔ اپنی مقل کا

اس کے منہ کھولتے ہی احد کا ہاتھ کھل جاتا۔ یہ تماشا اب ہفتے میں دو، چار بار ہونے لگا۔ جب ان کی لڑائی شروع ہوتی، نادو شاہد کو فون کر دیتی کہ ابھی گھر مت آنا، وہ لڑ رہے ہیں اور جب احد سنبل کو مارنے لگتا اس کے پیچہ روتے ہوئے تانی کے پاس مدد کو بھاگتے، تب وہ پھر شاہد کو فون کرتی کہ اب آ جاؤ، کام ہو گیا ہے۔ شاہد اس کا فون سنتے ہی بھاگ آتا۔ بھائی کو برا بھلا کہتا، بھادوچ ہے ہمدردی جتنا اور پھر بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ کر گاڑی نکالتا اور سنبل کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس دوران روتے بیٹھے بیٹھے تانی کے پاس پناہ گزین ہو جاتے۔ شاہد، احد اور سنبل کے گھر سے نکلنے ہی نادو بچوں کو سنبل کے خلاف بھڑکانے لگتی۔ وہ انہیں باور کروانے میں تقریباً کامیاب ہو ہی جاتی کہ ساری غلطی سنبل کی تھی۔ اسے شوہر کے سامنے بولنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پھر اپنی مثالیں دینے لگتی۔ اپنی تعریفیں کرتی، بچوں کو ماں سے خوب متنفر کرتی۔

”احد! بس، بہت ہو گئی یار۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے جو ایسی پاگل بیوی کے ساتھ گزارا کر رہے ہو۔ میری بیوی اگر ایسی ہوتی تو ایک منٹ نہ لگتا۔ تین حرف بھیج کے کب کا اپنی زندگی سے نکال چکا ہوتا اسے۔“

”تو اور کیا کروں، بیوی کو چھوڑ دوں، مگر بچوں کی ماں کو کیسے چھوڑوں؟ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اور وہ ابھی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بس، اسی لیے برداشت کیے جا رہا ہوں۔“ شاہد اب کسی نئے مشن پر تھا۔ احد کا روبرو بہت کمیل چکا تھا۔ شاہد کے شیر بچس فیصد تھے، مگر صرف کھاتے میں۔ ورنہ وہ مراعات ایسے ہی وصول تھا جیسے فنڈی فنڈی کا یازنر ہو۔ احد اس کے نادیدہ احسانوں کے بوجھ تلے دبا، اسے کچھ نہ کہتا اور بڑا بھائی سمجھ کر اس کی ہر بات ماننا چلا جاتا۔ مگر اب سنبل ان کے راستے کی رکاوٹ بنی جا رہی تھی۔ اس نے آرام سے بیٹھ کر شنڈے دل سے تجزیہ کیا تو سب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ احد کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر جواب میں ہمیشہ چار چوٹ کی کھائی۔ اب اس نے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ برداشت کرتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈپریشن کی مریشہ بن گئی۔ مانیگرین اور ڈپریشن نے اس کی رہی بھی بہت بھی نچوڑ ڈالی تو اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

شاہد اور نادبہ کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی جب احد نے سنبل کو بلیں چھوڑا تو انہوں نے اسے خاندان میں بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے رابطے سب بہنوں سے بحال

اچھی طرح واقف تھا، اسی لیے میرے اس کی ساری باتیں سن کر اپنے ہمیں اسے حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔

”حساب؟ کون سا حساب؟ میرا ہر چیز میں برابر کا حصہ ہے بھائی جان۔ اور میں ایک باپ بھی چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ سمجھے آپ۔“ اسے حسب توقع آگ لگ چکی تھی۔

”دیکھو شاید اسب جانتے ہیں کہ کاروبار میں احد 75 % کا مالک ہے اور تمہارے شیئرز صرف 25 % ہیں۔ رہی گھر اور پلاس کی بات تو وہ احد کی مہربانی ہے کہ اس نے ہر چیز میں تمہارا 25 % شیئر رکھا ہے، ورنہ یہ تو تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو کہ ہر چیز کا اصل مالک تو احد ہی ہے۔ بزنس میں اس کا پچاس زیادہ لگا تھا، سو شیئرز بھی اس کے ہی زیادہ بننے لگے۔“

”اچھا؟ اور میں نے جو اس کے لیے قربانیاں دیں، ان کا کیا؟ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال اس کے اور اس کے بچوں کے لیے برباد کیے۔ ان کا حساب کون دے گا؟ بدلے میں مجھے کیا ملا؟ صرف 25 % شیئر؟ نہیں بھائی جان۔ اب تو حساب برابری کی سطح پر ہی ہوگا۔ گھر ہو یا پلاس یا پھر کاروبار۔ ہر چیز میں سے فنی فنی کا حصہ وصول کروں گا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔“ وہ بغیر زبانی سے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”شاید! تم نے احد کے لیے قربانیاں نہیں دیں۔ بلکہ سر کے ساتھ انکشاف کیا تو ہاشم اور نامید کے منہ کھلے کے کھلے ہی رہ گئے۔“

”بیٹا؟ یہ آگ پٹیا کی لگا کی ہوئی ہے، اور ہم کیسے ماں باپ ہیں کہ ہمیں اپنی ہی اولاد کے کروت کی خیر نہیں۔ تف ہے ایسی بیٹی پر جو ماں باپ کی نیکیوں کو برباد کر دے۔ اپنے حسد اور انا کی آگ میں اپنی ماں جانیوں کو جھوٹ کر ان کی دنیا بھی خراب کر دے اور آخرت بھی۔“ نامید سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا، مگر ہاشم گہرے صدمے میں بھی بول اٹھے تھے۔

”رہنے دیں ابو آپ۔ باجی نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کیا۔ ہم اب بڑے ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی سب باتوں کا علم ہونا چاہیے۔ باجی نے تو ہمیں حقیقت بتا کر ہمارے حق میں اچھا ہی کیا ہے۔ اب تو میں تایا، تانی سے اپنے دادا کے گھر کا حصہ بھی لوں گا اور آپ نے اور بھائی جان نے جو آج تک ان

استعمال کرنا سیکھو۔ کاروبار کے معاملے میں تو تم بڑے ہوشیار ہو۔ اڑنی چڑیا کے پر مکن لیتے ہو، تو پھر گھر کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو؟ یہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری ذمہ داری۔ روز حشر اس کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ سوچو میرے بھائی، تمہاری بیوی کو تو شاید نے بدنام کر کے رکھ دیا، اور اپنی بیوی کے قصیدے وہ ایسے پڑھتا ہے کہ جیسے اس سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ نادو کا کوئی نام بھی ملے لے تو اسے آگ لگ جاتی ہے، تو پھر تم کیوں اس کے منہ سے اپنی بیوی کی برائیاں سنتے ہو، جبکہ وہ برائیاں اس میں ہیں بھی نہیں۔“ عاصم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی تو ٹھیک نشانے پر ہی لگی۔ سنبل کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور احد کی آنکھوں پر بڑی بچی کھانا شروع ہو گئی۔ اب اس نے ہر بات پر غور کرنا شروع کیا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آئی چلی گئی۔ اس دوران براہ ہوا کہ ان دونوں نے ایک مشترکہ پلاٹ خرید کر اس پر ڈبل اسٹوری گھر بنالیا تھا اور اس میں شفٹ بھی ہو چکے تھے۔ اب احد کو پچھتاوے تک کرنے لگے کہ کاش وہ اپنا گھر تو علیحدہ بنا لیتا۔ حالانکہ سنبل اور عاصم نے اسے کہا بھی تھا، مگر اس وقت بھائی کی محبت کا بخار سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس لیے اس نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

☆.....☆

”شاید! بس بہت ہو گیا۔ احد اگر سنبل کو چھوڑنے کو تیار نہیں تو اسے نہیں، فیصلہ کر لے۔ ہمارا حصہ ہمیں دے دے اور اپنی لاڈ کو لے جائے یہاں سے۔ میں جب جب اس کی شکل دیکھتی ہوں آگ لگتی ہے میرے سینے میں۔ کم بخت کبیل ہو کر چٹ گئی ہے جان ہی نہیں چھوڑ رہی۔ ہمارا سارا منصوبہ چوہٹ کر کے رکھ دیا اس ڈائن نے۔“

کہتے ہیں جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور نادو بی بی کی جو شامت آئی تو شاید کوئی پٹیاں پڑھانے بیٹھ گئی۔

”بس بھائی جان! بہت ہو گیا۔ اب میرا احد کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارا فیصلہ کروا دیں۔“ شاید اگلے دن ہی عاصم کے پاس جا پہنچا اور اس کے سامنے اپنے نادیدہ کھڑے رونے کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں احد سے۔ تم بھی اپنی طرف سے حساب لگا کر کھو کہ تمہارا کیا شیئر بنتا ہے۔ تاکہ مین وقت پر کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو سکے۔“ عاصم اس کی عادت سے

شرافت سے کہیں دور جا کر اپنی دنیا الگ بسالے تاکہ ایک دوسرے کی محبت دل میں زندہ رہے۔ تم بھی میری بات پر غور کرنا۔ اچھی نگاہ سے تو عمل بھی کر ڈالنا۔“ عائشہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تو شاید سر ہلا کر رہ گیا۔

”اور ایک بات اور۔ جو بھی بات کرنی ہے آئے سامنے بیٹھ کر کرنا۔ تم دونوں بھائی ہو۔ سگے بھائی۔ اور بھائی بھائیوں کے بازو ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنا بازو دکاٹ کر دنیا کے سامنے تماشا مت بن جانا۔“ عاصم نے بھی نرم لہجے سے کہا تو شاید بس ان دونوں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆.....☆

تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ مگر اس بار واقعات کا تسلسل بری طرح مجروح ہوا تھا۔ نادیدہ کو عاصم اور عائشہ کی کسی بات سے بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ان کی دی گئی تبادیل پر سنتے ہی تھکے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

”کیا؟ یہ سب بھائی جان نے کہا آپ سے، اور آپ چپ چاپ ان کی باتیں سن کر چلے آئے؟ کمال ہے شاید۔ میں تو آپ کو بڑا بہادر دیکھتی تھی، مگر آپ تو بڑے بزدل ہی نکلے۔“

”تو؟ کیا کرتا؟ بڑے بھائی بھائی ہیں وہ میرے۔ میں ان کے سامنے کیسے.....!“

”اچھا؟ وہ بڑے بھائی بھائی ہیں، تو میں اور آپ کون ہیں؟ میں بڑی بھائی نہیں ہوں اداوار سنبھل کی؟ آپ بڑے بھائی نہیں ہیں ان کے؟ جب ہماری کوئی عزت نہیں ان کی نگاہ میں تو ہم کسی کی عزت کیوں کریں۔“ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے انداز میں وہ چلا اٹھی تھی۔

”لیکن احد اور سنبھل نے کبھی میرے ساتھ تو کوئی بدتمیزی.....!“

”ہاں! ان کی بدتمیزیاں آپ کو کیوں دکھائی دینے لگیں۔ آپ کے تو سگے ہیں ناں وہ؟ وہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ایک جھوٹی تو میں ہی رہ گئی ہوں سارے زمانے کی۔ بے غیرت کہیں کے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چنے بنے ہیں۔ امی ابو نے بھی جانے کیا دیکھ کر میرا نصیب ان جابلوں کے خاندان میں پھوڑ دیا۔“ وہ اپنی آنٹی پر آنکھیں مچی، اور اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ سارے خاندان کو آگے لگا کر رکھنے والا شاید بھی نہیں۔ وہ بھی سر جھکائے اس کی گالیاں سن رہا تھا۔

”میں آپ کو آخری وار تنگ دے دی ہوں شاید۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے یہ گھر خالی چاہیے اور ساری پر اپنی میں برابر کا حصہ۔ اب آپ یہ سب کیسے کرتے ہیں۔ مجھے پوچھیں

اپنا مفاد دیکھا۔ زید کی طرح اگر تم بھی اکیلے بزنس کر رہے ہوئے تو آج تک اسی آبائی گھر میں بیٹھے ہوتے۔ نہ تمہارے نام کوئی پلاٹ ہوتا اور نہ ہی تم اپنے گھر کے مالک ہوتے۔ یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہو لیکن ماننا نہیں چاہتے۔ کیونکہ تم احسان فرماؤں ہو۔ تمہارے بھائی نے تم پر احسان کیا اور تم اس کا بدلہ اسے پورے خاندان میں بدنام کر کے دے رہے ہو۔ نہیں شاید، نہیں۔ تم کوئی اور ہی گیم کھیل رہے ہو اور میں تمہیں بتا دوں۔ میں اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“ عاصم کا صبر بھی جواب دے گیا۔ ان کا خاندانی جلال عود کر آیا تھا، اور اس جلال کو شاید بھی جانتا تھا، سو غصے کو ضبط کر ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے بھائی جان۔ لگتا ہے آپ کو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ ابھی میں چلتا ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گا تو آپ کو تفصیل سے سمجھاؤں گا۔“ اس نے میز سے ہائیک کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ شاید۔ بات ہوگی اور آج ہی ہوگی۔ آج میں یہ روز روز کی کل تک ختم ہی کر دوں گا۔ ابھی پلاٹا ہوں احد کو اور ابھی ہو جائے گا سب فیصلہ۔“ عاصم نے دینگ انداز سے کہا تو شاید پریشان ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ شاید! کھانا کھا کر جانا۔ ابھی احد بھی آتا ہوگا، پھر میں کھانا لگا دوں گی۔ پہلے کچھ کھانی لینا، پھر آرام سے ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عائشہ نے نرمی سے کہا تو وہ منہ بند ہوا تو بیٹھ گیا۔

”شاید! تم بڑے ہو، احد چھوٹا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ تم بس، اپنے غصے پر قابو رکھنا۔ کوئی ایسی دیکھی بات نہ کرنا کہ مزید بد مزگی ہو جائے۔ میں احد سے کہوں گا کہ تمہیں % 25 کی بجائے % 35 شیئرز دے دے۔ پلکے تم ایسا کرنا کہ سارے شیئرز احد کو ہی بیچ دیتا، اس سے نقد رقم لے کر اپنا خود کا بزنس اشارت کر لینا اور گھر بھی اپنی پسند کالے لینا۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔“ احد کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا، سو اس نے آنے سے معذرت کر لی۔ عاصم اور عائشہ نے شاید کو کھانا کھائے بغیر انھیں ہی نہیں دیا۔ اس دوران وہ پیار سے، نرمی سے اسے سمجھاتے رہے۔ بات معقول تھی اس کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اس لیے وہ بھی دھیمے پڑ گیا۔

”میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر اس طرح لڑ بھڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ رہتا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان

پریشان تھی کہ کیا کریں۔ اور عاصم کو جیسے ہی موقع ملا، وہ شاہد کو ایک کونے میں لے گیا اور لگا لگا کر اس کی کلاں لینے۔

”مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت تھا بھائی جان، اور احد میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ سب کچھ نادو کے نام لگا دے۔ مگر.....!“

”نادو کے نام؟ لیکن کیوں؟ یہ تم دونوں بھائیوں کے بیچ نادو کہاں سے آگئی؟ اور یہ ہفتے کا وقت تمہیں کس نے دیا۔“ عاصم حیرت سے اس کی بات کاٹنے ہوئے بولا تو شاہد نے جھکا سر اٹھا کر بھائی کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ عاصم کو اپنا سانس روک کر محسوس ہوا۔

”تو یہ سب تم سے تمہاری بیوی نے کروایا۔ وہ احد کا گھر توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس نے احد کو ہی توڑ ڈالا۔ اور تم نے ایک مرد ہو کر اپنی عقل ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی؟“ تف بے تم پر شاہد تفت ہے۔ میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ میں اب تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ عاصم کا پارہ چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شاہد چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے باہر چلا گیا اور عاصم شدید صدمے اور دکھ کی حالت میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆.....☆

”کاش شاہد۔ آپ عقل سے کام لے لیتے، اس قدر جذباتی نہ ہوتے، تو آج یہ گھر، ہمارا ہوتا۔ میں کسی نہ کسی طرح سنبل کو احد کی زندگی سے نکال ہی دیتی، مگر آپ کی جلد بازی نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔ آپ کی اس گھٹیا حرکت کے بعد اب مجھے بھی آپ کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ کہاں تو میں پوری کے خواب دیکھ رہی تھی اور کہاں اب آدمی بھی ہاتھ سے جانی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ بھی صرف آپ کی وجہ سے۔“ نادو کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ شاہد بھائیوں کی نگاہوں میں تو ذلیل ہوا ہی تھا، بیوی کی نگاہوں میں بھی اپنے لیے غصہ اور نفرت دیکھ کر کم مہم بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ”زن“ کو کیا جواب دے جس کی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچا تھا۔ اور وہ بھی کہ انہی تک اس کے گلے شکوے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔ اور تب..... جب اس نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ اس نے تین حرف کہے اور کرے سے نکل گیا۔

جو دوسروں کا حق غصب کرنا چاہتی تھی وہ آج اپنی ہی لگا لگی ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔

پتا۔ مگر مجھے میرا حق چاہیے۔ سمجھے آپ۔“

”ایک ہفتہ؟ اتنے کم وقت میں تو شاید کچھ بھی نہ ہو سکے۔ میری تو ابھی احد سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو پائی؟“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے آپ کو ایک ہفتے کا ٹائم دیا ہے اور ایک ہفتے کا مطلب ایک ہفتہ ہی ہے سمجھے آپ۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ نادو کے انداز نے شاہد کو شاید گرا دیا تھا۔

”ورنہ خود بھی مر جاؤں گی اور آپ کے بچوں کو بھی مار دوں گی۔ پھر ساری عمر سیدھی کرتے رہنا بھائی بھائیوں کی جوتیاں۔ کیونکہ پھر تو آپ ہمیشہ کے لیے ویلے ہی ہو جائیں گے ناں۔ نہ کوئی بیوی ہوگی اور نہ ہی بچہ۔ سارا سب اپنی قسم۔“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے زہر عمر کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

شیطان نے ایک بار پھر ایک زن کے دماغ پر قبضہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ہتھ پتے بستے گھر کو اجاڑنے کی پھر پور کوشش کر ڈالی۔

☆.....☆

”ابو! شاہد چاچو نے احد چاچو کو لی ماری۔ جلد ہی جیلے۔“ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔“ عاصم کا بیٹا گھبرا ہوا گھر میں داخل ہوا اور روتے ہوئے باپ کو یہ روح فرسا خبر سنائی۔ عاصم کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عاتشہ رونے لگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اسد عاصم کو بائیک پر بٹھائے اڑتا ہوا اسپتال پہنچا تھا۔ کوئی احد کی ٹانگ میں لگی تھی۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی پورا خاندان وہاں انٹھا ہو چکا تھا۔ شاہد بھی ان میں شامل تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بھائی کو زخمی تو کر چکا تھا مگر اب چچمتاؤں کے ٹانگ اسے ڈس رہے تھے۔ اس پر یہ خوف کہ اگر احد یا عاصم نے اس کے خلاف پرچہ کھوا دیا تو اس کا کیا بے گا؟

”اسپیکل صاحب! میں اپنی گن صاف کر رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ مگر کوئی جیپیر میں چھنسی ہوئی تھی، بس میری انگلی کے دباؤ سے ٹریگر دب گیا اور گولی میری ٹانگ میں مگس گئی۔“

عاصم کی التجا میری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے احد نے اپنا بیان حلقی ریکارڈ کر دیا اور شاہد کے سر پر ایک اور احسان رکھ دیا۔

”شاہد! ایم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ بھائی سے لڑنا مت۔ زمانے کو اپنا تماشا شامت دکھانا، مگر تم نے میری ایک نہیں سنی اور اپنی کر کے رہے۔ اب بتاؤ مجھے مل گیا تمہیں تمہارا حصہ؟ بن گئے فتنی فتنی کے پارتنز؟ کچھ تو بولو۔ اس طرح سر جھکا کہ کیوں بیٹھے ہو اب؟“ احد کا آبرو سن چل رہا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر ز بھی